عالمی اسلامی تحریکوں اور جامعہ ابوہریرہ کا ترجمان

ماہنامہ

القاسم

خالق آباد نوشہرہ

اشاعتِ خاص

تذکرہ و سوانح

حضرت مولانا

سید سلیمان ندوی ؒ

جلد 7 / رمضان تا ذی قعدہ 1424ھ / نومبر تا جنوری 2004ء / شمارہ 7 تا 9

زیرِ سرپرستی

مولانا عبدالقیوم حقانی

☆☆☆

مدیرِ مسئول

حافظ محمد قاسم

رابطہ کیلئے

جامعہ ابوہریرہ، برانچ پوسٹ آفس
خالق آباد، ضلع نوشہرہ، سرحد، پاکستان

بدل اشتراک

[illegible] 150 روپے
فی شمارہ 15 روپے
بذریعہ وی پی 180 روپے
بیرونی ممالک 30 امریکی ڈالر

☆☆☆

بذریعہ ڈرافٹ/چیک

اکاؤنٹ نمبر 21399-8
حبیب بینک نوشہرہ کینٹ

☆☆☆

فون نمبر
(0923)630237
فیکس : 630094

Marfat.com

جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں

نام کتاب : سوانح مولانا سید سلیمان ندویؒ

مرتب : مولانا عبدالقیوم حقانی

83955

کمپوزنگ : جان محمد جانؔ رُکن القاسم اکیڈمی

ضخامت : ۴۵۱ صفحات

تاریخِ اشاعت اوّل : رمضان المبارک ۱۴۲۴ھ/ نومبر ۲۰۰۳ء

تاریخِ اشاعت دوم : جمادی الثانی ۱۴۲۸ھ/ جولائی ۲۰۰۷ء

ناشر : القاسم اکیڈمی، جامعہ ابوہریرہ

برانچ پوسٹ آفس خالق آباد، ضلع نوشہرہ

☆☆☆

ملنے کے پتے

☆ صدیقی ٹرسٹ، صدیقی ہاؤس المنظر اپارٹمنٹس 458 گارڈن ایسٹ، نزد لسبیلہ چوک کراچی

☆ مولانا سید محمد حقانی ' مدرس جامعہ ابوہریرہ، خالق آباد، ضلع نوشہرہ

☆ مکتبہ رشیدیہ ' بیسمنٹ سردار پلازہ ' جی ٹی روڈ اکوڑہ خٹک ضلع نوشہرہ

☆ کتب خانہ رشیدیہ ' مدینہ کلاتھ مارکیٹ ' راجہ بازار ' راولپنڈی

☆ مکتبہ سید احمد شہید ' ۱۰ الکریم مارکیٹ ' اردو بازار ' لاہور

☆ مولانا خلیل الرحمٰن راشدی صاحب ' جامعہ ابوہریرہ ' چنوں موم ضلع سیالکوٹ

اس کے علاوہ پشاور کے ہر کتب خانہ میں یہ کتاب دستیاب ہے

Marfat.com

فہرستِ مضامین

نام مضمون	مضمون نگار	صفحہ
نقشِ آغاز	مولانا عبدالقیوم حقانی	۵
سوانح حیات	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	۹
مولانا سید سلیمان ندویؒ	مولانا سید ابوالحسن علی ندوی	۶۷
سید سلیمان ندویؒ کے دینی و علمی خدمات	شاہ معین الدین احمد ندوی	۱۰۷
ایک ہمہ جہت عالم، ایک گراں مایہ شخصیت	ڈاکٹر سید محمد ہاشم	۱۵۴
اجمالی تذکرہ و سوانح	عبدالرشید عراقی	۱۷۹
مولانا شبلیؒ کا جانشین	مولانا سعید احمد ملک	۱۹۱
بعض اہم علمی کام	مولانا محمد اویس ندوی	۲۰۸
تصانیف کے تراجم	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	۲۱۵
ایک عظیم انشاپرداز	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	۲۲۹
انتخابِ لاجواب	مولانا اللہ بخش ایاز ملکانوی	۲۵۳

Marfat.com

نام مضمون	مضمون نگار	صفحہ
علامہ سید سلیمان ندویؒ کی تفسیری نکتہ سنجیاں	محمد فرمان نیپالی ندوی	۲۵۹
علم سیرت کا ایک روشن چراغ	سلطان فریدی	۲۷۰
حضرتؒ کا سلوک وتصوف اور طریقۂ تربیت	مولانا سید عبدالرؤف	۲۷۱
حکیم الامتؒ سے رجوع اور بیعت	جناب ڈاکٹر غلام محمد	۲۸۹
سیرتِ سلیمانی کا عرفانی پہلو	جناب ڈاکٹر غلام محمد	۳۰۷
سید سلیمان کا مسلکِ طریقت	جناب ڈاکٹر نثار احمد فاروقی	۳۳۳
چند حسین یادیں	شیخ الحدیث مولانا فیض احمد	۳۴۱
ذوقِ شعر وادب	ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی	۳۴۳
غزل الغزلات	ڈاکٹر غلام محمد صاحب	۳۸۶
عارفانہ کلام اور تصوف میں مقام	جناب سید حسین	۳۹۷
عشقِ رسولؐ! نعتیہ کلام کی روشنی میں	پروفیسر محمد اشرف سلیمانی	۴۱۳
سفرِ آخرت	سید ابو عاصم ایڈوکیٹ	۴۲۳

Marfat.com

نقشِ آغاز

الحمد للّٰہ و کفٰی و سلامٌ علٰی عبادہ الذین اصطفٰی

اللہ کریم کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ماہنامہ ''القاسم'' اپنی پانچ کامیاب خصوصی اشاعتوں کے بعد چھٹی اشاعتِ خاص ''علامہ سید سلیمان ندویؒ نمبر'' پایۂ تکمیل کو پہنچا کر نذر قارئین کر رہا ہے۔ اس نمبر کی اشاعت میں قدرے تاخیر بھی ہوئی، تاہم خوشی کی بات یہ ہے کہ اس عرصہ میں علامہ سید سلیمان ندویؒ کی پُر عزم و بلند مرتبہ زندگی کے حالات و واقعات کے حوالہ سے انتہائی مفید اور اہم مواد اور معلومات حاصل ہوتی رہیں، جنہیں مناسبت سے شاملِ اشاعت کر کے مندرجات کو تصدیق اور حوالوں کو سند حاصل ہوئی ہے۔ خداوند قدوس اور خالق لم یزل کے خصوصی کرم و احسان اور توفیق و عنایت سے یہ اشاعت پایۂ تکمیل کو پہنچی اور محض اس کی توفیق سے ہم یہ اشاعت پیش کرنے میں کامیاب ہوئے۔ والحمد للّٰہ علٰی ذالک حمدًا کثیرًا۔

بعد از تکمیل الحمدللہ اطمینان ہے کہ یہ اشاعت اپنے موضوع کا ہمہ جہتی احاطہ کئے ہوئے ایک عظیم تاریخی اور جامع دستاویزی یادگار نمبر ہے، جو حضرت سید صاحب کے مستفیدین، متعلقین، عقیدت مندوں، علمی و دینی حلقوں، ارباب ذوق، عامۃ المسلمین، بالخصوص قارئینِ ''القاسم'' کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔

بظاہر کسی اسبابی تدبیر کے بغیر ہم نے اس عظیم اور ضخیم نمبر کی اشاعت کو اپنا ہدف اور مشن بنایا۔ اس خصوصی اشاعت کی اصل غرض و مقصد، اصل ارادہ و نیت سوائے اس کے

Marfat.com

اور کچھ نہیں کہ حضرت سید صاحبؒ کی زندگی کے نمایاں پہلوؤں اور روشن ابواب کا تذکرہ مرتب کر کے متلاشیان راہِ حق کی خدمت میں پیش کرنا مفید بلکہ بے حد مفید ہوگا اور خود ہم گناہ گاروں کے لئے بھی ایک مستقل نصیحت و وصیت کا کام دے گا۔ اس بات کا خصوصی خیال رکھا گیا ہے کہ اس اشاعتِ خاص میں جو کچھ شائع کیا جائے، اس کا اصل رُخ اسی افادیت کی طرف ہو ....

کوئی بزم ہو، کوئی انجمن، یہ شعار اپنا قدیم ہے
جہاں روشنی کی کمی ملی، وہیں اک چراغ جلا دیا

جن ہستیوں کو اللہ جل شانہٗ مدارج عالیہ سے نواز کر اپنا قربِ خاص عطا فرماتے ہیں، ان کے روحانی کمالات اور ارتقائی کیفیات کا صحیح و یقینی علم بھی صرف اس ذاتِ پاک کو ہوتا ہے، جس نے ان کو یہ مدارج و مقامات عطا فرمائے۔ کیونکہ ظاہر کو دیکھنے والی نگاہیں نہ وہاں تک پہنچ پاتی ہیں اور نہ ہی ان حقائق کا ادراک کر سکتی ہیں، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ مالک و مملوک اور عبد و معبود کے درمیان قائم ہونے والا یہ خصوصی قرب اور یہ حقیقی تعلق اتنا لطیف اور پاکیزہ ہوتا ہے کہ ....

میانِ عاشق و معشوق رمزیست
کراماً کاتبیں راہم خبر نیست

یہی وجہ ہے کہ حضرت سید صاحبؒ کے مدارج عالیہ اور کمالات روحانیہ پر قلم اٹھانا اور انہیں دائرۂ تحریر میں لانا ایک مشکل اور دشوار تر عمل ہے۔ تاہم خداداد کمالات و خصوصیات کے وہ ظاہری اور نمایاں پہلو اور سراپا علم و عمل کے وہ اعلیٰ اور قیمتی نمونے جو آپ کی نادرۂ روزگار شخصیت میں ظاہر کی آنکھ سے محسوس کئے جاتے تھے اور واضح و نمایاں نظر آتے تھے اور جو کردار و عمل بندگانِ خدا کی زندگیوں میں ایک صالح دینی انقلاب برپا کرنے کا باعث بنا، ان کو یکجا کر کے کماحقہٗ پیش کرنا اگرچہ مشکل ضرور تھا، مگر ناممکن نہیں۔ اس لئے اللہ جل شانہٗ کی ذاتِ عالی پر بھروسہ کرتے ہوئے آپ کی کتابِ زندگی کے

Marfat.com

کمالات وخصوصیات، اخلاق وصفات اور عادات ومعمولات کو اس خصوصی نمبر میں یکجا کر کے پیشِ قارئین کیا جا رہا ہے ....

من اگر والہ و مدہوش شوم معذورم
کہ در آئینہ عجب حسن و جمالے دیدم

سید صاحبؒ عربی وفارسی کے متبحر عالم، اردو کے بلند پایہ صاحبِ طرز ادیب اور سیّد المصنفین تھے۔ عبرانی انہوں نے سیکھی تھی، انگریزی وہ اچھی طرح پڑھ اور سمجھ لیتے تھے، فرانسیسی سے وہ آشنا تھے، ان کی علمی قابلیت ہر لحاظ سے مسلّم تھی۔ سید صاحبؒ ایک عہد ساز اور ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ دینِ حق کی خدمت کا شاید ہی کوئی میدان ہو، جہاں آپ کی خدمات سنہری حروف سے لکھنے کے قابل نہ ہوں۔ خدمت دین کے لئے آپ نے جس میدان میں بھی قدم رکھا، اللہ تعالیٰ نے اس میں آپ سے بھرپور کام لیا۔ انسانیت کی صلاح وفلاح اور مخلوق کا صحیح اور مضبوط تعلق اپنے خالقِ حقیقی سے جوڑنے کے لئے ایک عظیم اور بلند وبالا مقصد لے کر سید صاحبؒ نے عرب وعجم اور یورپ وایشیا کے متعدد سفر فرمائے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم اور آپ کے اخلاص سے بھرپور جذبۂ دعوت کی لاج رکھتے ہوئے ہر کاوش کے وسیع وعمیق نتائج وثمرات بھی ظاہر فرمائے۔ سید صاحب کی دینی وعلمی خدمات کو رہتی دنیا تک یاد رکھا جائے گا۔

"علامہ سید سلیمان ندوی نمبر" کی اس کاوش میں ہم کتنے کامیاب ہوئے، اس کا فیصلہ کرنا قارئین کا کام ہے۔ اُمید ہے اپنی رائے سے ضرور نوازیں گے۔ جو مضامین شاملِ اشاعت ہیں الحمد للہ افادی نوعیت کے حامل ہیں، جس کو ہم نے اس نمبر کے لئے ضروری سمجھا۔ ہم شکر گزار ہیں، ان حضرات کے جو اپنی تحریروں اور گرانقدر آراء سے نواز کر اس نمبر کے افادی پہلوؤں میں اضافہ کا باعث بنتے رہے۔ بالخصوص صدیقی ٹرسٹ کراچی کے بانی وچیئرمین جناب محمد منصور الزمان صدیقی صاحب کے جن کی تجویز وتحریک اور تشجیع وتحسین سے حوصلۂ کار بڑھتا رہا۔ واجرھم علی اللہ۔ (موصوف اپنے تذکرے اور

Marfat.com

شکریوں کی اجازت نہیں دیتے ، بلکہ شدید ناراض ہوتے ہیں ، یہاں صرف تاریخی ریکارڈ کی حفاظت کے لئے ان کا ذکر کردیا ہے)

ناسپاسی ہوگی ، اگر اس اشاعتِ خاص کے سلسلہ میں تعاون کا تذکرہ کرتے ہوئے جناب محترم ملک نواز احمد اعوان کراچی اور جناب محترم علی ارشد صاحب فیصل آباد کا ذکر نہ کیا جائے ، جنہوں نے اپنے قلبی ، روحانی اور علمی تعلق کی بنا پر اس خصوصی اشاعت میں بھرپور دلچسپی اور معاونت فرمائی ، ان کا تعاون ہمارے لئے بہت ہی راحت وسہولت کا باعث ہوا۔ اول الذکر نے بہت زیادہ مواد' نایاب کتابوں اور مضامین کی فوٹوسٹیٹ کاپیاں مرحمت فرمائیں اور بے پناہ مشاغل میں وقت نکال نکال کر ترسیلِ مضامین اور مفید تجاویز بھیجتے رہے ، جبکہ دوسرے صاحب نے اپنے ذاتی کتب خانہ میں حضرت سید صاحبؒ سے متعلق موجود چھوٹی بڑی تمام کتابیں مرحمت فرمائیں۔ **واجرهم علی الله۔**

القاسم اکیڈمی کے کارکنوں مولوی جان محمد نے کمپوزنگ کا سارا کام تنِ تنہا انجام دیا ، تصحیح اور معیار کے برقرار رکھنے میں تندہی سے کام کرتے رہے ، جناب شفیق عالم کشمیری اول سے آخر تک تصحیح وترتیب میں شریکِ عمل رہے ، مولانا سید محمد حقانی نے پریس کی تمام ذمہ داریاں اپنے سر لے کر ادارہ کے بارِ گراں کو آسان فرمایا۔ **و اجرهم علی الله۔**

اللہ کریم کے حضور دست بہ دعا ہوں کہ وہ اس خصوصی اشاعت کو نافع اور اصلاحِ اُمت کا ذریعہ بنائے اور ہمارے لئے وسیلۂ نجاتِ اُخروی بنائے اور اگر اس نمبر میں کوئی چیز ناپسندیدہ ہو تو اس سے درگزر فرماوے۔ (آمین) ....

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے

عبدالقیوم حقانی

جامعہ ابوہریرہؓ ' خالق آباد ، نوشہرہ ، سرحد ، پاکستان

۲۷ رمضان المبارک ۱۴۲۴ھ

Marfat.com

سیّد صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب

سوانحِ حیات

ولادت ووطن :

حضرت علامہ سیّد سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت بروز جمعہ بتاریخ ۲۲ر نومبر ۱۸۸۴ء مطابق ۲۳ر صفر ۱۳۰۲ھ میں دیسنہ ضلع پٹنہ، بہار میں ہوئی۔ یہ گاؤں پٹنہ کے سب ڈویژن بہار شریف سے مشرق کی جانب آٹھ میل پر واقع ہے اور ہمیشہ سے بڑا مردم خیز گاؤں رہا ہے اور یہاں بڑے بڑے اطباء، ڈاکٹر، انجنیر، اور سرکاری حکام کے علاوہ علماء، فضلاء، صلحاء اور اتقیاء پیدا ہوئے۔

خاندان :

سیّد صاحب اس گاؤں کے اُس خاندان کے لعل بے بہا تھے، جو دینی علوم کے ساتھ دینداری اور تقویٰ میں مدتوں سے ممتاز چلا آتا تھا۔ ننھیال کی طرف سے زیدی اور ددھیال کی طرف سے حسینی سیّد تھے۔ اُن کے دادا مولوی محمد شیر صاحب المعروف بہ حکیم میر محمدی اپنے زمانہ کے مشہور طبیب تھے اور صاحب دل صوفی بھی، اُن کی ایک کتاب نور محمدیہ معارف پریس اعظم گڑھ میں چھپی ہے، جس میں سہروردیہ اور قادریہ سلسلہ کے بزرگوں کے کچھ حالات ہیں، فن طب میں انہوں نے دو کتابیں قرابا دین محمدی اور مخزن الحکمۃ العلیاء لکھیں، اُن کی وفات کی تاریخ یہ ہے۔ گیا ہوا ثانی بقراط وارسطا طالیس (۱۳۰۳ھ)

سیّد صاحب کے والد بزرگوار جناب سیّد ابوالحسن صاحب بھی بڑے حاذق طبیب تھے۔ زہدو تقویٰ وراثت میں ملا تھا، متانت و سنجیدگی، تہذیب و شائستگی اور نفاست و نظافت

Marfat.com

کے بھی نمونہ تھے، پٹنہ ضلع کے مشہور قصبہ اسلام پور کے رئیس چودھری ظہور الحق اپنے زمانہ کے بڑے صاحب ثروت ووجاہت رئیس تھے۔ اُن کے گھر کے سب افراد حکیم سیّد ابوالحسن صاحب کا بیحد احترام کرتے اور اُن کے سامنے مؤدب ہوکر بیٹھتے تھے۔

سیّد صاحب کے بڑے بھائی جناب سیّد ابوحبیب صاحب بھی فنِ طب میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ اتباعِ سنت کا بڑا اہتمام رکھتے تھے۔ پوری عمر زہد وتقویٰ میں گذری۔ مجددی سلسلہ میں حضرت شاہ ابواحمد صاحب بھوپالی سے بیعت بھی تھے۔

سیّد صاحب اپنے بڑے بھائی سے اٹھارہ سال چھوٹے تھے۔ اُن کی تاریخِ وفات پر اُن کے دادا صاحب نے ایک قطعہ کہا تھا، جس کے دو شعر یہ ہیں ......

چو جسیتم تاریخ اوا زخسرد یکا یک سروشے زتاریخ وسال
بگفتا کہ بےداد شد مصرعے شدہ مہرتاباں زبُرجِ کمال

یہ تاریخ ایسی نیک ساعت میں کہی گئی تھی کہ سیّد صاحب واقعی بُرج کمال مہر بن کر چمکے، اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ یہ مہر صوبہ بہار کے ایک گاؤں میں ۲۲ رنومبر ۱۸۸۴ء کو طلوع ہوا اور انہتر سال کے بعد اسی تاریخ یعنی ۲۲ رنومبر ۱۹۵۳ء کو کراچی کے اُفق میں غروب ہوا۔

ابتدائی تعلیم :

مکتبی تعلیم اپنے گاؤں کے ایک معلم خلیفہ انور علی اور پھر مولوی مقصود علی اکھدوی سے پائی۔ اردو اور فارسی کی ابتدائی کتابیں ختم کرنے کے بعد عربی میں میزان ومنشعب اپنے بڑے بھائی مولوی ابوحبیب صاحب سے پڑھی۔ اس زمانہ میں اُن کے بڑے بھائی کو گاؤں کی مسلمان بیبیوں کو اسلام کی صحیح تعلیم سے آشنا کرنے کی دھن تھی، اور اس کے لئے وہ ہفتہ میں ایک دن اُن کے سامنے اس طرح وعظ وتلقین فرماتے تھے کہ سیّد صاحب بیبیوں کے بیچ میں بیٹھ کر مولانا اسماعیل شہیدؒ کی تقویۃ الایمان پڑھتے تھے اور اُن کے بڑے بھائی صاحب مرحوم پردہ کے پیچھے سے اس کی تشریح کرتے، اس طرح بھائی جو کچھ کہتے، وہ سیّد

Marfat.com

صاحب کے دل میں بھی بیٹھتا جاتا، چنانچہ اپنی ایک تحریر میں فرماتے ہیں :

''پہلی کتاب تھی جس نے مجھے دینِ حق کی باتیں سکھائیں اور ایسی سکھائیں کہ اثنائے تعلیم و مطالعہ میں بیسیوں آندھیاں آئیں اور کتنی دفعہ خیالات کے طوفان اٹھے، مگر اس وقت جو باتیں جڑ پکڑ چکی تھیں، ان میں سے ایک بھی اپنی جگہ سے ہل نہ سکی، علم کلام کے مسائل، اشاعرہ و معتزلہ کے نزاعات، غزالی و رازی و ابن رشد کے دلائل یکے بعد دیگرے نگاہوں سے گذرے، مگر اسماعیل شہیدؒ کی تلقین بہرحال اپنی جگہ پر قائم رہی''۔

بڑے بھائی سے تعلیم پانے کے بعد مزید تعلیم کے لئے اپنے والد بزرگوار کے پاس اسلام پور گئے۔ وہاں سے ۱۸۹۹ء میں پھلواری شریف پٹنہ آئے۔ یہاں ایک سال خانقاہ مجیبی میں رہ کر مولانا محی الدین (سجادہ نشین خانقاہ پھلواری شریف) سے عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں، خانقاہ کے بزرگوں کی صحبت میں علم و ادب کا شوق پیدا ہوا، خود سید صاحب اپنی تحریر میں فرماتے ہیں :

''یہاں خانقاہ میں ہر ہفتہ قوالی ہوتی تھی، اس کے اثر سے اس قصبہ میں شعر و سخن کا چرچا تھا، میں نے بھی اسی فضا میں سانس لی، اور یہیں سب سے پہلے مولوی عبدالحلیم شرر کا ناول منصور موہنا دیکھا، اس کا یہ اثر ہوا کہ جس وقت کتاب ختم کی، پھوٹ پھوٹ کر رو دیا''۔

یہاں کے قیام کے زمانہ میں شاہ سلیمان صاحب پھلواری سے منطق کے ابتدائی دو چار سبق بھی پڑھے۔ پھلواری سے مدرسہ امدادیہ دربھنگہ بھیج دیئے گئے۔ یہاں چند مہینے رہے اور داخلہ کے پہلے ہی ہفتہ میں وہاں کے طلبہ کی انجمن میں ''تعلیم نسواں'' پر ایک ایسا مضمون پڑھ کر سنایا کہ ہر طرف تحسین و آفرین کا نعرہ بلند ہوا، یہ مضمون پٹنہ کے مشہور اخبار الپنچ میں بھی چھپا۔

ندوہ میں داخلہ :

۱۹۰۱ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخل ہوئے۔ یہاں سات سال رہ کر

Marfat.com

تعلیم کی تکمیل کی۔ طالب علمی کے زمانہ میں بھی متانت وسنجیدگی، تہذیب وشائستگی، مہر ومحبت اور خلق ومروت میں ممتاز تھے۔ یہ اوصاف اُن کو اپنے والد بزرگوار سے ورثہ میں ملے تھے، عمر کے ساتھ یہ اوصاف بھی بڑھتے گئے اور ندوہ میں اُن کے علمی وادبی ذوق کی نشو ونما اور ترقی ہوتی رہی۔ دینی علوم کی تحصیل کے ساتھ شعر وسخن کا ذوق بھی ابتداء سے تھا، چنانچہ کم عمری ہی میں اپنے وطن دیسنہ کی انجمن اصلاح کے سالانہ جلسہ میں ایک طویل ترکیب بند لکھ کر پڑھا جس کا ایک شعر یہ ہے:

سچے کانوں سے نہیں سنتے ہیں ارشاد نبی
ہیں مسلمان بس اتنے ہی کہ کہلاتے ہیں

اسی زمانہ میں امیر مینائی سے زیادہ متاثر تھے۔ ان کا دیوان مرأۃ الغیب برابر مطالعہ میں رکھتے تھے۔ دارالعلوم کے مشاعروں میں امیر مینائی کا روپ بھرتے تھے۔

مضمون نگاری کی ابتداء:

ان کا سب سے پہلا مضمون ۱۹۰۳ء میں ''وقت'' کے عنوان سے مخزن لاہور میں چھپا، جس کے ایڈیٹر اس وقت اردو کے مشہور اہل قلم شیخ عبدالقادر تھے، اسی سال سیّد صاحب نے اپنے وطن کی انجمن الاصلاح کے سالانہ جلسہ میں ''علم اور اسلام'' پر ایک بسیط مضمون پڑھا، جس کو اہل علم نے پسند کیا، اور جو علی گڑھ کے مشہور رسالہ علی گڑھ منتھلی میگزین میں ایڈیٹر کے تعریفی نوٹ کے ساتھ چھپا۔

شاہ سلیمان پھلواری کی پیشن گوئی:

اس زمانہ میں ندوہ کے معتمد مولانا سیّد محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا شاہ سلیمان پھلواریؒ اُس کے رکن تھے، یہ دونوں بزرگ سیّد صاحب کی ذکاوت وذہانت کی وجہ سے اُن پر بے حد شفقت فرماتے تھے۔ خود سیّد صاحب بھی مولانا محمد علی مونگیری کی مذہبی اور

Marfat.com

دینی زندگی سے بہت متاثر ہوئے۔ غالباً ۱۹۰۳ء میں نواب محسن الملک دارالعلوم ندوۃ تشریف لائے اور طلبہ کا امتحان لیا اور اُن سے اخبارات پڑھوا کر سُنے اس امتحان میں سیّد صاحب اول آئے۔ انہوں نے نواب صاحب کی مدح میں اپنا ایک عربی قصیدہ بھی پڑھ کر سنایا، جس سے نواب صاحب بہت محظوظ ہوئے۔ اس زمانہ کے اخبارات میں مولانا شاہ سلیمان پھلواری نے اس قصیدہ کا ذکر کر کے لکھا تھا کہ ان شاء اللہ ہر زمانہ میں ایک سلیمان بہار کی سرزمین میں علم اور دین کی خدمت کے لئے موجود رہے گا۔

مولانا شبلیؒ کا سایۂ عاطفت :

۱۹۰۵ء میں جب مولانا شبلی دارالعلوم ندوہ کے معتمد تعلیم ہو کر لکھنو آئے، تو طلبہ نے اس خوشی میں جلسے کیے، تقریریں کیں، نظمیں لکھیں، سیّد صاحب نے بھی اپنی مسرت کا اظہار ایک فارسی قصیدہ میں کیا، جس کا مطلع یہ تھا :

بدہ ساقی مے کو بگفند جلباب ظلمانی
خرد را نور بخشد از چراغ طور ایمانی

یہ پورا قصیدہ حیاتِ شبلی میں درج ہے۔ مولانا شبلی میں جوہر شناسی کا خاص مادہ تھا، اس لئے ندوہ میں آتے ہی اس جوہر قابل کو اپنے دامنِ تربیت میں لے لیا۔ اُن کے پاس مصر و شام کے مشہور عربی رسائل اور جدید تالیفات رہتی تھیں، سیّد صاحب اُن کا برابر مطالعہ کرتے رہے، جس سے اُن میں جدید عربی ادب کا ذوق پیدا ہوا اور اتنا بڑھا کہ وہ جدید عربی کے بھی اچھے ادیب شمار کئے جانے لگے۔ ۱۹۰۴ء (جمادی الثانی ۱۳۲۲ھ) میں مولانا شبلی نے ندوۃ العلماء کی طرف سے الندوہ نکالنا شروع کیا۔ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی بھی اس کی ادارت میں شریک تھے۔ اسی زمانہ میں مولانا شبلی نے سیّد صاحب سے جرجی زیدان کی کتاب اللغۃ العربیہ کی تلخیص کرائی اور اس کو بہت پسند کیا اور جنوری ۱۹۰۵ء کے الندوہ میں شائع کیا۔ سیّد صاحب نے الندوہ کے لئے پہلا مضمون "علمِ حدیث" پر لکھا،

Marfat.com

جس کی داد مولانا حالی نے مولانا شبلی کو دی۔ مولانا نے سید صاحب کی علمی صلاحیت دیکھ کر اُن کی طالب علمی ہی کے زمانہ میں الندوہ کی دیکھ بھال کا کام اُن کے سپرد کر دیا۔

بنائے جامعیت :

مولانا شبلی کی تربیت میں ایک طرف اُن کی مضمون نگاری کی مشق جاری رہی، دوسری طرف اپنے اُستاد مولانا حفیظ اللہ سے علم حدیث اور ہیئت میں علمی شوق کی تشنگی بجھا رہے تھے۔ اسی زمانہ میں شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی کے رسالہ عجالۂ نافعہ کے پڑھنے سے اُن کو علم حدیث سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ پھر بستان المحدثین کے مطالعہ نے اس کا شوق اور بھی زیادہ کر دیا اور آخر میں ائمۂ محدثین میں سے امام مالکؒ نے اُن کے دل پر قبضہ کر لیا، اور موطا امام مالکؒ سے بڑی گرویدگی پیدا ہوگئی، پھر حافظ ذہبی کی تذکرۃ الحفاظ اور حافظ ابن حجر کی فتح الباری کے مطالعہ سے محدثین کے کارناموں سے زیادہ واقف ہوئے۔

حدیث کے شوق نے رجال کی طرف اور رجال نے تاریخ کی طرف رہنمائی کی اور اس سلسلہ میں ابن ندیم کی کتاب الفہرست حاجی خلیفہ کی کشف الظنون اور ابن خلکان کی وفیات کا مطالعہ کرتے رہے۔ اپنی ایک تحریر میں فرماتے ہیں کہ میں نے ابن خلکان کی کتاب اتنی دفعہ پڑھی کہ اس کے حواشی اور حوالوں سے اس کے اول و آخر کے صفحے بھر گئے۔

منطق، فلسفہ اور ادب عربی کا ذوق مولانا فاروق چریاکوٹی کے درس میں پیدا ہوا اور جب مولانا شبلی سے دلائل الاعجاز پڑھی، تو اُس سے بہت متاثر ہوئے اور اسی سے عربی لکھنے اور بولنے کی مشق پیدا کی۔ حماسہ اور نقد الشعر کے مطالعہ نے اس ذوق کو جلا دی اور ان میں عربی نظم کا بھی ذوق پیدا ہوگیا۔

فقہ مفتی عبداللطیف صاحب سے پڑھی، علم کلام کا شوق تمام تر مولانا شبلی کی تربیت کا نتیجہ تھا۔ طالب علمی ہی کے زمانہ میں شہرستانی اور ابن حزم کی الملل والنحل، ابن رشد کی کشف الادلہ اور شاہ ولی اللہ صاحب کی حجۃ اللہ البالغۃ کے مطالعہ نے یکے بعد دیگرے اپنا

Marfat.com

رنگ دکھایا۔

عربی میں مضمون نگاری :

دارالعلوم ندوہ میں مصر و شام سے عربی اخبارات المونداور اللواء وغیرہ آیا کرتے تھے۔ سید صاحب ان کو باالتزام پڑھتے تھے، لکھنؤ کے مشہور اخبار اودھ پنچ کے ادارہ نے ان سے عربی مضامین کے اردو ترجمے بھی کرانا شروع کیے۔ اس زمانہ میں مولانا عبداللہ عمادی عربی میں ایک رسالہ البیان نکالا کرتے تھے، سید صاحب نے بھی اس میں عربی کے چند مضامین لکھے اُن کی تحریریں مصر کے مشہور اخبار المنار میں بھی شائع ہوئیں۔

خطیبانہ انداز کی پسندیدگی :

۱۹۰۷ء میں ندوہ کے فارغ التحصیل طلبہ کی دستار بندی کا پہلا جلسہ رفاہ عام لکھنؤ ہوا۔ اس جلسہ کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں جدید و قدیم علوم کے ماہرین دارالعلوم ندوہ کے بلند بانگ دعوؤں کا امتحان کرنا چاہتے تھے۔ اس سلسلہ میں سید صاحب نے علوم جدید و قدیم کے موازنہ پر اردو میں تقریر کی۔ تقریر کے دوران میں کسی نے اٹھ کر کہا کہ اگر یہ عربی میں تقریر کریں تو ندوہ کی تعلیمی کرامات کا ہم یقین کریں۔ سید صاحب نے اسی وقت عربی میں ایسی تقریر کی کہ لوگ حیرت میں آگئے۔

مولانا شبلی نے کھڑے ہوکر فرمایا کہ یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ تقریر پہلے تیار کر کے لائے ہیں، اگر کوئی صاحب چاہیں تو اسی وقت موضوع مقرر کر دیں۔ یہ تقریر کریں گے۔ حاضرین میں سے خواجہ غلام الثقلین نے یہ موضوع دیا کہ ''ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کیونکر ہوئی''۔ سید صاحب نے بغیر کسی توقف کے فصیح و صحیح عربی میں تقریر شروع کر دی۔ یہ دیکھ کر پورا جلسہ محوِ حیرت ہوگیا اور ہر طرف سے نعرہ ہائے آفرین بلند ہونے لگے۔ مولانا شبلی نے غایت خوشی میں اپنے سر سے عمامہ اتار کر شاگرد کے سر پر باندھ دیا۔ یہ ہندوستان کی عربی تعلیم کی تاریخ میں بالکل نیا واقعہ تھا۔ اس لئے اس کا غلغلہ سارے ملک میں پھیل گیا۔

Marfat.com

الندوہ کی سب ایڈیٹری :

سید صاحب ۱۹۰۷ء میں جب ندوہ سے فارغ ہوئے تو مولانا شبلی نے اُن کو الندوہ کا سب ایڈیٹر مقرر کیا۔ اسی سال انہوں نے ''علم ہیئت اور مسلمان'' عربی زبان کی وسعت'' طبقات الارض'' کی انجیل'' مسئلہ ارتقاء اور قرآن مجید'' وغیرہ مختلف موضوعوں پر مضامین لکھ کر اپنے جامع الفنون ہونے کا ثبوت دیا۔ ان مضامین میں اُن کے استاد ہی کے تحقیقی اور ادبی رنگ کی جھلک تھی، جو رفتہ رفتہ اور بھی نمایاں ہوتی گئی۔ الندوہ کے مضامین سے اُن کی شہرت علمی حلقہ میں بڑھتی گئی اور اب وہ کبھی کبھی مولانا شبلی کے بجائے الندوہ کے شذرات بھی لکھنے لگے۔

۱۹۰۸ء کے الندوہ میں انہوں نے جو مضامین لکھے۔ ان میں ایمان بالغیب اور مکررات القرآن کی داد مولانا شبلی نے ایک مکتوب میں لکھ دی اور اُن کے تصنیفی سلیقہ پر اظہار مسرت کیا۔

ندوہ کی مدرسی :

۱۹۰۸ء میں وہ الندوہ میں علم کلام اور جدید عربی ادب کے استاد مقرر ہوئے اور اس درس و تدریس کے زمانہ میں انہوں نے دروس الادب کے نام سے دو عربی ریڈرین لکھیں جو اب تک مقبول ہیں۔

۱۹۰۹ء کے الندوہ کے مختلف نمبروں میں اُن کا مشہور مضمون'' خواتینِ اسلام کی شجاعت'' شائع ہوا، جو اس قدر پسند کیا گیا کہ اس کو علیحدہ رسالہ کی صورت میں بھی چھاپا گیا اور اس وقت سے اب تک اُس کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں اور اب اس کا ترجمہ انگریزی میں بھی ہو گیا ہے۔ اس زمانہ کے دوسرے مضامین میں'' اسلامی رصد خانے'' کو بھی بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور بعد میں اس کا بھی انگریزی میں ترجمہ ہوا۔

Marfat.com

تدوین لغاتِ جدیدہ :

فروری ۱۹۱۰ء تک الندوہ کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اسی سال ندوہ کے سالانہ اجلاس دہلی میں طے ہوا کہ عربی کے جدید الفاظ کی ایک ڈکشنری ترتیب دی جائے۔ یہ کام سیّد صاحب کے سپرد کیا گیا، جس کو انہوں نے دو برس میں پورا کر کے ۱۹۱۲ء کے اجلاس لکھنؤ میں جس کے صدر علامہ سیّد رشید رضاؒ مصری ایڈیٹر المنار تھے، پیش کیا، یہ ڈکشنری لغاتِ جدیدہ کے نام سے چھپ کر شائع ہوئی، جس سے اب بھی عربی مدارس کے طلبہ کو بڑی مدد ملتی ہے۔

سیرۃ النبی کی تالیف میں شرکت :

۱۹۱۰ء میں جب مولانا شبلی نے سیرۃ النبی کی تدوین و ترتیب کا ایک شعبہ قائم کیا تو سیّد صاحب اُس کے لٹریری اسسٹنٹ ہوئے اور اس کام میں استاد کی اعانت کے ساتھ ساتھ الندوہ میں مضامین بھی لکھتے رہے۔ اگست ۱۹۱۱ء میں الندوہ کی ادارت کا بار پھر ان پر ڈالا گیا اور وہ یہ خدمت مئی ۱۹۱۲ء تک انجام دیتے رہے، جس کے بعد اس الندوہ کا خاتمہ ہو گیا جس کے ایڈیٹر مولانا شبلی اور مولانا حبیب الرحمن خان شروانی تھے۔ اُن کے اس دور کے مضامین میں ''اشتراکیت اور اسلام'' ''اسماء القرآن اور'' ''فنائے مادہ'' کو زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ ۱۹۱۱ء کے وسط میں انہوں نے سیالکوٹ کی انجمن شبان المسلمین میں ایک خطبہ دیا جو ''مذہب اسلام اور عقل'' کے عنوان سے جولائی ۱۹۱۱ء کے الندوہ میں شائع ہوا۔

الہلال کی ادارت میں شمولیت :

۱۹۱۱ء میں اٹلی نے جب طرابلس پر حملہ کیا تو اس سے پورے ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک شور برپا ہو گیا اور اُن کی سیاسیات میں اُبال آ گیا۔ سیّد صاحب بھی اس سے متاثر ہوئے۔ ان کے استاد مولانا شبلی ملکی سیاست میں آزادی کے حامی تھے اور اسلامی

Marfat.com

سیاست میں اتحاد پر ایمان رکھتے تھے۔اس کا اثر اُن کے شاگردوں پر بھی ہوا، چنانچہ سیّد صاحب خالص علمی مشاغل چھوڑ کر سیاست میں آئے۔ جولائی ۱۹۱۲ء میں مولانا ابوالکلام آزاد نے جو مولانا شبلی کے صحبت یافتہ تھے،کلکتہ سے الہلال نکالنا شروع کیا،ملکی اور اسلامی سیاسیات میں اس کا مسلک وہی تھا جو مولانا شبلی کا تھا۔اس لئے مئی ۱۹۱۳ء میں سیّد صاحب الہلال کے اسٹاف میں شامل ہو گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ یورپ کی بڑی سلطنتوں کی شہ پا کر طبقان کی ریاستوں نے ترکی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا تھا، اور دوسرے اسلامی ممالک کی طرح ہندوستان کے مسلمانوں کے جذبات کا سمندر بھی جوش میں آ گیا تھا۔

ابھی یہ شورِ محشر بپا ہی تھا کہ اگست ۱۹۱۳ء میں کانپور کی مسجد کے انہدام کا واقعہ پیش آ گیا، جس میں نہتے مسلمانوں اور اُن کے معصوم بچوں پر بے دردی سے گولیاں چلائی گئیں۔ اس خونی سانحہ نے تمام ہندوستان کو پرشور بنا دیا۔ سیّد صاحب نے ۱۲؍اگست ۱۹۱۳ء کے الہلال میں اپنے خونِ دل سے ''شہیدِ اکبر'' کے عنوان سے ایک دردانگیز مضمون لکھا، جس کی ایک ایک سطر اور ایک ایک جملہ میں اُن کی مذہبی حمیت، ملی غم خواری اور قومی درد کا طوفان اُمڈ پڑتا تھا۔ یہ مضمون الہلال کے جس پرچہ میں شائع ہوا، وہ حکومت نے ضبط کر لیا۔ الہلال میں انہوں نے اور بھی پرزور مضامین لکھے، اُن کے طرزِ نگارش میں چونکہ ابوالکلام ہی کا رنگ تھا، اور مضمون نگاروں کے نام شائع نہیں ہوتے تھے، اس لئے بعض مضامین مولانا ابوالکلام آزاد کی جانب منسوب ہو گئے۔ خود سیّد صاحب نے رسالہ مستقل کراچی (اکتوبر ۱۹۴۹ء) میں تحریر فرمایا ہے:

''الہلال میں چونکہ مضمون نگاروں کے نام نہیں لکھے جاتے تھے، اس لئے الہلال کے مضمونوں کے مجموعوں کے شائع کرنے والوں نے بلاتحقیق ہر مضمون کو مولانا ابوالکلام آزاد صاحب کی طرف منسوب کر دیا ہے، حالانکہ یہ صحیح نہیں۔ الحریۃ فی الاسلام، تذکار نزول قرآن، حبشہ کی تاریخ کا ایک ورق، قصص بنی اسرائیل، شہیدِ اکبر وغیرہ میرے مضامین ہیں''۔

Marfat.com

دکن کالج پونہ کی پروفیسری :

سیاسی واقعات میں کچھ سکون پیدا ہوا تو سیّد صاحب پھر مولانا شبلیؒ کے دفتر سیرت میں لکھنؤ آ گئے، لیکن جلد ہی ۱۹۱۳ء کے آخر میں مولانا شبلی کے ایماء سے بمبئی یونیورسٹی کے ماتحت دکن کالج پونہ میں السنہ ومشرقیہ کی معلّمی قبول کرلی، اب وہ ملک میں ممتاز اہلِ علم کی صف میں شمار کئے جانے لگے، اس لئے مذہبی اور تعلیمی جلسوں میں اُن کی طلب شروع ہوئی۔

تدوین ارض القرآن :

ان مشاغل کے ساتھ پونہ کے قیام کے زمانے میں ایک اہم تصنیف ارض القرآن کی تالیف شروع کی، جس میں قدیم عرب کے جغرافیہ اقوام عرب کی پرانی مذہبی اور تمدنی تاریخ پر محققانہ بحث کی گئی ہے اور قرآن مجید کے بیانات سے اُس کی مطابقت دکھائی گئی ہے، جس زمانہ میں وہ دفتر سیرت میں کام کر رہے تھے، اُسی وقت سے اس کے لئے مواد کی فراہمی شروع کر دی تھی۔ پونا میں اُس کی پہلی جلد ترتیب دی اور دوسری جلد کے لئے مواد فراہم کیا اور یہیں بیٹھ کر الہلال کے لئے ''علومِ القرآن'' کے عنوان سے ایک مضمون بھی لکھا تھا۔

رحلتِ اُستاد :

پونہ گئے ہوئے ابھی ڈیڑھ سال بھی پورا نہ ہوا تھا کہ ۱۸/نومبر ۱۹۱۴ء کو مولانا شبلی جنت کو سدھارے۔ مرض الموت میں شفیق استاد نے محبوب شاگرد کو تار دے کر بلوایا اور جب وہ پہنچے تو مولانا نے معاہدہ کے طور پر شاگرد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر فرمایا، ''سیرت (سیرۃ النبی) میری تمام عمر کی کمائی ہے۔ سب کام چھوڑ کر سیرت تیار کرو''۔ سعادت مند شاگرد نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ''ضرور ضرور''۔

Marfat.com

وہ شفیق استاد اور مربی کی وفات سے بہت متاثر ہوئے اور تاثرات کا اظہار ''نوحۂ استاد'' میں کیا ہے، جس کا مطلع یہ ہے :

اے متاعِ عزت پیشیں کے پچھلے کارواں
آہ وہ بھی مٹ گیا باقی جو تھا تیرا نشان

اخبار ''دن'' میں یہ نوحہ شائع ہوا، تو عزیز لکھنوی، مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی اور مولانا حمید الدین فراہیؒ نے سیّد صاحب کی سخن وری اور سخن سنجی کی داد دی، لیکن عماد الملک بلگرامی نے اُن کو شعر و سخن کی طرف مائل ہونے سے روکا، اور انہوں نے اُن کی نصیحت قبول کی، کبھی کبھی اشعار کہہ لیتے تھے، لیکن اپنے کو ''غیر فطری شاعر'' کہتے تھے۔ گو اربابِ نظر نے اُن کی شاعری کی بھی داد دی ہے۔ ڈاکٹر اقبال اپنے ایک مکتوب میں مورخہ ۱۲ر نومبر ۱۹۱۶ء میں انکو لکھتے ہیں کہ :

''آپ کی غزل لاجواب ہے، بالخصوص یہ شعر مجھے بڑا پسند آیا،

ہزار بار مجھے لے گیا ہے مقتل میں
وہ ایک قطرۂ خوں جو رگِ گلو میں ہے

مولانا شبلی مرحوم و مغفور نے تاریخی واقعات کو نظم کرنا شروع کیا تھا اور جو چند نظمیں انہوں نے لکھی تھیں، وہ نہایت مقبول ہوئیں، غزل کے ساتھ وہ سلسلہ بھی جاری رکھئے''۔

شاید اسی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے سیّد صاحب کبھی کبھی اس قسم کی نظمیں کہہ لیا کرتے تھے۔

تاسیس دارالمصنفین :

مولانا شبلی نے اپنی وفات سے پہلے دارالمصنفین کا ایک خاکہ تیار کیا تھا، لیکن اس کو عملی جامہ پہنا نہ سکے تھے۔ سیّد صاحب اُن کی رحلت کے بعد پونہ کی ملازمت چھوڑ کر

Marfat.com

اعظم گڑھ چلے آئے اور مولانا مسعود علی صاحب ندوی کے انتظامی تعاون اور مولانا عبدالسلام صاحب ندوی کے علمی اشتراکیت سے ۱۹۱۵ء میں دارالمصنفین کی بنیاد ڈالی۔ یہ گویا بغداد کے دارالحکومت کا تخیل ہندوستان کے ایک شہر اعظم گڑھ کی سرزمین پر نمودار ہوا۔

سیّد صاحب نے اپنی تصنیف ارض القرآن کی پہلی جلد کی اشاعت سے دارالمصنفین کے تصنیفی کام کی ابتدا کی اور جب وہ اہل علم کے سامنے آئی تو ان کو دارالمصنفین کے عملی کام کی نوعیت اور سیّد صاحب کی تحقیقات اور اُن کے علم ونظر کی وسعت کا اندازہ ہوا۔

انجمن ترقی اردو کی صدارت :

اسی سال انجمن ترقی اردو کا سالانہ اجلاس پونہ میں ہوا، جس کی صدارت سیّد صاحب نے کی۔ اس میں انہوں نے جو خطبۂ صدارت پڑھا، وہ آگے چل کر اُردو کی تاریخ پر تحقیق کرنے والوں کے لئے دلیلِ راہ بنا۔

سیاسی مشاغل :

اس علمی وادبی زندگی کے ساتھ سیاسی مشاغل بھی جاری رہے۔ ۱۹۱۴ء کے آخر میں جب ترکی نے جنگ عظیم میں شرکت کی، تو ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی جوش پیدا ہوا اور اُن کے سیاسی لیڈر قید و بند میں ڈال دیئے گئے۔ اس موقع پر جو نیا گروہ اُن کی قائم مقامی کے لئے بڑھا، اُس میں سید صاحب بھی تھے۔ چنانچہ ۱۹۱۵ء سے لے کر ۱۹۱۶ء تک انہوں نے مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے ساتھ سیاسی تحریکات میں حصہ لیا۔

رسالۂ معارف کا اجراء :

لیکن اب اُن کا اصلی مرکز توجہ دارالمصنفین تھا۔ ابھی تک اس کا کوئی آرگن نہ تھا۔ اس لئے ۱۹۱۶ء میں رمضان المبارک میں معارف کا پہلا پرچہ اُن کی ارادت میں نکلا، اس کا اجراء ایسے مبارک مہینہ میں ہوا کہ اس کی روشنی سے علمی دنیا آج تک منور ہے۔ معارف کے

Marfat.com

پہلے نمبر میں اُن کا مقالہ ''روزہ'' پر تھا۔ شروع کے نمبروں میں بیشتر مضامین انہی کے ہیں۔ رسالہ کی ادارت کے فرائض کے ساتھ استاذ مرحوم کے چھوڑے ہوئے مسودات اور سیرۃ النبی ﷺ کی ترتیب وتبویب میں بھی مشغول رہتے۔ رفقاء کے لئے علمی لائحۂ عمل تیار کرنے اور دارالمصنفین کے مربیوں اور ہمدردوں کا حلقہ پیدا کرنے کا بار بھی اُن ہی پر تھا۔

علمی ریاضت:

دارالمصنفین کے قیام کے آغاز سے آخر وقت تک اُن کا معمول یہ تھا کہ فجر کی نماز کے بعد ناشتہ کر کے کتب خانہ میں آ جاتے۔ بارہ (۱۲) بجے دن تک دنیا و مافیھا سے بے خبر ہو کر کام کرتے، پھر کھانا کھا کر کچھ قیلولہ فرماتے، ظہر کی نماز کے بعد پھر کتب خانہ تشریف لاتے اور عصر تک کام میں مشغول رہتے۔ عصر کی نماز کے بعد چائے پیتے۔ اس وقت رفقائے دارالمصنفین سے علمی، مذہبی، سیاسی اور تفریحی باتیں کرتے، مغرب کی نماز کے بعد بھی کام کا سلسلہ جاری رہتا، مگر جب کثرتِ محنت سے صحت خراب رہنے لگی، تو رات کو کام کرنا چھوڑ دیا تھا، لیکن دن بھر محنتِ شاقہ کرتے، جب علمی مذہبی اور سیاسی جلسوں میں شرکت کے لئے سفر میں جاتے تو شاید علمی ریاضت سے چھٹکارا اور کچھ آرام مل جاتا۔

دارالمصنفین کے کتب خانہ، پریس اور دفتر کے تمام کارکنوں سے اس طرح مہر و محبت اور لطف وشفقت سے پیش آتے تھے کہ ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ سب سے زیادہ اسی کو محبوب رکھتے ہیں اور وہ اُن کی خوشنودی اور رضا مندی کی خاطر بڑی تن دہی اور دلسوزی سے کام کرتا، اُن کی زندگی کا اصل کارنامہ دارالمصنفین ہی ہے، جس کو وہ اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھتے تھے۔

اُن کے حسنِ نیت کی وجہ سے دارالمصنفین کا علمی وقار ملک میں جلد ہی قائم ہوگیا، چنانچہ ابھی اس کو قائم ہوئے دو سال بھی نہیں گذرے تھے کہ مہاراجہ بڑودہ کی طرف سے بڑے پیمانے پر موازنۂ مذہب کا ایک ادارہ ایک فرانسیسی کی نگرانی میں قائم ہوا تو اسلامی علوم

83955

Marfat.com

ومسائل کی تحقیقات ورفعِ شبہات کے لئے دارالمصنفین ہی مرجع قرار پایا۔

جلسۂ علمائے بنگالہ کی صدارت :

۱۹۱۷ء میں علمائے بنگالہ کے کلکتہ کے سالانہ اجلاس کی صدارت کی، جس میں تمام رہنمایانِ ہند شریک تھے۔ اسی کے ساتھ کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس بھی اُن ہی تاریخوں میں تھے۔ اس لئے مجلس علماء بنگالہ کا یہ جلسہ بڑا اہم تھا۔ اس میں سید صاحب نے جو خطبہ پڑھا، وہ بنگال میں بڑا اثر انداز ہوا۔ یہ پہلا خطبہ تھا، جس میں جنگ کے ہیبت ناک اثرات کے باوجود مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ کا نام جو اس زمانہ میں نظر بند تھے، جرأت کے ساتھ لیا گیا، اس سے لوگوں کے دلوں سے انگریزوں کا رعب اُٹھا۔

۱۹۱۷ء کے علمی کام :

۱۹۱۷ء کے علمی مضامین میں ''اہل السنّت والجماعت'' بڑا مقبول ہوا۔ پہلے یہ معارف کے کئی نمبروں میں شائع ہوا تھا، پھر رسالہ کی صورت میں چھپا، اس کا ترجمہ ملیالم، تلگو اور بنگلہ میں بھی ہوا۔ اسی سال اُن کی کتاب ''حیات امام مالکؒ'' شائع ہوئی۔ اُن کو امام مالکؒ سے خاص عقیدت اور اُن کی موطا صحیحین سے زیادہ پسند تھی۔ گو آخر عمر میں جزوی مسائل میں بھی امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کے پابند ہوگئے تھے، لیکن امام مالکؒ سے عقیدت قائم رہی۔ ۱۹۰۷ء کے الندوہ میں ''حیاتِ امام مالکؒ'' کے عنوان سے ایک طویل مقالہ لکھا تھا، جو کئی نمبروں میں شائع ہوا تھا اور تقریباً ۸۵ صفحات پر مشتمل تھا۔ اس کو اور زیادہ مکمل کرنے کا برابر ارادہ کرتے رہے، مگر دوسرے کاموں کی مشغولیت نے اس کا موقع نہ دیا، اس لئے اسی مضمون کو رسالہ کی صورت میں شائع کردیا۔ یہ کچھ ایسا مقبول ہوا کہ اس کی مانگ ابھی تک جاری ہے اور اس کے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

سیرۃ النبی ﷺ جلد اوّل کی اشاعت :

۱۹۱۸ء میں اپنے استاذ مرحوم کی سیرۃ النبی جلد اول کو مرتب کرکے ملک کے

Marfat.com

سامنے پیش کیا، جس کے غلغلہ سے ہندوستان کا گوشہ گوشہ گونج رہا تھا۔ اس کی اشاعت پر سید صاحب نے بجا طور پر لکھا تھا کہ........

ع شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

ارض القرآن جلد دوم کی اشاعت :

اسی سال اُن کی محققانہ تصنیف ارض القرآن کی دوسری جلد بھی شائع ہوئی، جس میں اقوام عرب کے لسانی، مذہبی، تجارتی اور تمدنی حالات پر بحث ہے۔ اس سے اُن کی علمی شہرت میں اور بھی زیادہ اضافہ ہوا۔ ۳۶ء میں مولوی سید مظفر الدین ندوی ایم اے نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور معلومات میں اضافہ کر کے اس میں انگریزی کے لحاظ سے بعض ترمیمیں اور تغیرات کیے۔

۱۹۱۸ء کے معارف میں اُن کے جو مضامین شائع ہوئے، اُن میں ''ہندوؤں کی علمی اور تعلیمی ترقی میں مسلمانوں کی کوششیں'' کی طرف خاص طور پر لوگوں کی نظر اُٹھی۔ اس میں ہندو مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اربابِ تحقیق کو اس سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ سید صاحب کی نظر تاریخِ ہند پر بھی کتنی گہری ہے۔ اس مضمون کا انگریزی ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

تحریکِ خلافت :

۱۹۱۹ء کا سال ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے بڑا پُر آشوب تھا۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد اسلامی ممالک خصوصاً ترکی پر سخت وقت آیا۔ اس کے حصے بخرے کیے جا رہے تھے، ترکی کا سلطان قسطنطنیہ میں اتحادیوں کے ہاتھوں بے بس ہو رہا تھا۔ اس وقت ہندوستان کے چند بہادر، غیور اور دردمند مسلمان رہنماؤں نے اپنی جانوں پر کھیل کر مجلس خلافت کے نام سے ایک مرکزی مجلس بمبئی میں قائم کی، جس کی شاخیں سارے ہندوستان میں پھیل گئیں۔ اس مجلس میں مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی نے ایسی تنظیمی قوت پیدا کر دی کہ

Marfat.com

پورا ہندوستان اُس کی آواز پر اُٹھتا اور بیٹھتا تھا۔ اس تحریک میں سید صاحب بھی پیش پیش رہے۔ اس کا پہلا اجلاس لکھنؤ میں ہوا، تو انہوں نے علماء اور اربابِ سیاست کے درمیان حلقۂ اتصال کا کام دیا اور ایسی پُر درد تقریر کی کہ مسندِ صدارت سے پائیں تک ساری مجلس بزم ماتم بن گئی۔ مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور چودھری خلیق الزمان وغیرہ کے سارے اختلافات خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے۔ اسی سال انہوں نے سیدالاحرار سیّد فضل الحسن حسرت موہانی کی رہائی کی تقریب میں ''نظر بندانِ اسلام'' کے عنوان سے معارف کے کئی نمبروں میں ایک مضمون لکھا، جو بہت پسند کیا گیا۔

وفد خلافت میں یورپ کا سفر :

فروری ۱۹۲۰ء میں مولانا محمد علی کی سرکردگی میں ترکی کے معاملات میں انصاف طلبی اور مسلمانانِ ہند کے جذبات کی ترجمانی کے لئے ہندوستان سے جو وفد خلافت یورپ گیا تھا، اس کے تین ممبروں میں ایک ممبر یہ بھی تھے۔ صدر مولانا محمد علی ارکان سید حسین اور سیّد صاحب اور سیکرٹری حسن محمد حیات تھے۔ یہ وفد انڈین نیشنلزم اور پین اسلام ازم کو متحد کر کے ہندوستان کی آزادی کی جنگ لڑنے چلا تھا۔ جب یہ لوگ پورٹ سعید پہنچے اور سید صاحب جامع عباسی میں نمازِ مغرب پڑھنے کے لئے گئے، تو وہاں ایک بزرگ فقہ کا درس دے رہے تھے۔ سید صاحب نے ان سے مل کر وفدِ خلافت کی نوعیت بتائی، تو تمام حلقۂ درس جوشِ مسرت سے لبریز ہو گیا اور سب نے وفد کی کامیابی کے لئے دعا کی اور جب سید صاحب مسجد سے نکلے، تو لوگوں کا اس قدر ہجوم ہوا کہ وہ بدقت جان چھڑا کر آگے بڑھ سکے۔ اس وفد کے ارکان اٹلی، فرانس اور انگلستان میں ترکی کے حقوق کے لئے زبان و قلم اور دعوت و اشاعت کے ذریعے لڑتے رہے۔ لندن میں وزیر اعظم لائڈ جارج، لارڈ فشر اور دوسرے ممتاز لیڈروں سے ملنے کے علاوہ حجاز و شام اور مصر کے وفود سے بھی ملاقات کی۔ حجاز و شام کے وفدوں کے سرکردہ نوری سعید پاشا اور حداد پاشا تھے۔ سید صاحب نے اُن سے مل کر خلافت و جزیرۃ العرب کے مسائل اور ہندوستان کے مسلمانوں کے جذبات اور

Marfat.com

اُن کے مذہبی مطالبات بیان کیے، تو وہ سب بہت متاثر ہوئے اور اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

اسی زمانہ میں سعد زاغلول پاشا بھی مصری وفد کے ساتھ لندن آئے ہوئے تھے۔ اُن سے بھی مل کر سید صاحب نے ہندوستانی مسلمانوں کے نقطۂ نظر کی وضاحت کی۔ سعد زاغلول نے اُن کی عربی سے متاثر ہو کر کہا کہ آپ ہم سے بھی اچھی عربی بولتے ہیں۔ اس سفر میں آرنلڈ، براؤن، اسٹوری اور مارگولیتھ سے بھی ملاقات رہی۔ پروفیسر مارگولیتھ اور ایک اطالوی مستشرق سے مسئلۂ خلافت پر علمی نبرد آزمائی بھی ہوئی اور اس مسئلہ پر مشہور انگریزی مجلّہ ''فارن افیرز'' میں جو مدلل اور جامع مضمون لکھا، اس کی تعریف مولانا محمد علی نے بار بار کی۔ وفد کے سیاسی کاموں کے ساتھ انڈیا آفس، برٹش میوزیم، آکسفورڈ اور کیمبرج کے کتب خانے بھی دیکھتے رہے، جس سے اُن کا یہ سفر علمی حیثیت سے بھی مفید رہا۔ لندن سے واپسی کے بعد ڈاکٹر اقبال نے اُن کو ایک خط میں تحریر فرمایا:

''مراجعت مع الخیر مبارک'' آپ نے بڑا کام کیا، جس کا صلہ قوم کی طرف سے شکر گزاری کی صورت میں مل رہا ہے اور دربارِ نبوی ﷺ سے نہ معلوم کس صورت میں عطا ہوگا۔ وزرائے انگلستان کا جواب وہی ہے، جو ان حالات میں ہمیشہ دیا گیا ...... تاہم مجھے یقین ہے کہ ہندی وفد کا سفر یورپ بڑے اہم نتائج پیدا کرے گا''۔

واپسی پر قصبہ بہار شریف ضلع پٹنہ کی خلافت کمیٹی نے اُن کا شاندار خیر مقدم کیا۔ انہوں نے اس کمیٹی کے بڑے اجلاس کی صدارت بھی کی۔ اس میں صوبہ کے اکابر علماء اور زعماء کے علاوہ بابو راجندر پرشاد (جو وقتِ تحریر صدر جمہوریۂ ہند) بھی تھے، جنہوں نے اپنی تقریر میں سید صاحب کی سیاسی بصیرت کو سراہا۔

سیرۃ النبی ﷺ جلد دوم کی اشاعت:

لندن جانے سے پہلے استاذ مرحوم کی سیرۃ النبی کی دوسری جلد چھپنے کے لئے دیدی تھی۔ اس کا دیباچہ لندن ہی سے لکھ کر بھیجا۔ پہلی جلد نبوت کے پُر آشوب عہد غزوات

Marfat.com

پر مشتمل تھی، دوسری جلد نبوت کے سہ سالہ امن کی زندگی کی تاریخ ہے۔

سیرتِ عائشہؓ :

ابھی وہ لندن ہی میں تھے کہ ان کی کتاب سیرۃ عائشہؓ شائع ہوئی۔ جس کا آغاز طالب علمی ہی کے زمانہ میں کیا تھا، مگر اس کی تکمیل بعد میں کی۔ اس کی اشاعت پر بیگم صاحبہ بھوپال نے پانچ سو روپے انعام مرحمت فرمایا۔ ڈاکٹر اقبال نے یہ کتاب پڑھی تو سید صاحب کو تحریر فرمایا کہ :''سیرۃ عائشہؓ کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ یہ ہدیہ سلیمانی نہیں، سرمۂ سلیمانی ہے، اس کتاب کو پڑھنے سے میرے علم میں بہت مفید اضافہ ہوا، خدائے تعالیٰ جزائے خیر دے''۔

ترکِ موالات :

۱۹۲۰ء کے آخر میں یورپ کے سفر سے واپس ہوئے، تو ترکِ موالات کی تحریک ہندوستان میں شروع ہوگئی اور مجلسِ خلافت اور کانگریس کے پلیٹ فارم مشترک ہوگئے۔ سید صاحب نے بھی دوسرے علماء اور زعماء کے ساتھ مل کر ترکِ موالات کی تحریک کے سلسلہ میں ملک کا دورہ کیا۔ اخبارات میں مضامین لکھے، جا بجا تقریریں کیں۔ ۱۹۲۱ء میں مجلسِ خلافت کا جو سالانہ اجلاس میرٹھ میں منعقد ہوا تھا، اس کی صدارت کی۔ اسی سال ''خلافتِ عثمانیہ اور دنیائے اسلام'' اور ''خلافتِ ہندوستان'' کے عنوان سے دو اہم تاریخی مضامین معارف کے کئی نمبروں میں لکھے، جو علیحدہ علیحدہ رسالوں کی صورت میں بھی شائع ہوئے۔ ان رسالوں سے تحریک خلافت کو بڑی مدد ملی۔ ۱۹۲۱ء کی کانگریس کے کاموں میں شریک رہے۔ جمعیۃ العلماء کی مجلسِ عاملہ کے بھی رکن مقرر ہوئے۔

دارالمصنفین کی شہرت :

۱۹۲۲ء تک دارالمصنفین کی شہرت کو چار چاند لگ چکے تھے۔ سیرۃ النبی کی دو

Marfat.com

جلدوں اور سید صاحب کی تصانیف کے علاوہ مولانا عبدالسلام ندوی کی اسوۂ صحابہ اور سیرۃ عمر بن عبدالعزیز، مولوی یونس فرنگی محلی کی روح الاجتماع، مولوی عبدالباری صاحب ندوی کی برکلے اور ''مبادی علم انسانی'' اور مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کی ''مبادی فلسفہ'' اور مکالمات برکلے، پروفیسر سجاد مرزا کی الاستدلال، تسہیل البلاغت وغیرہ جیسی سنجیدہ کتابوں اور معارف کے بلند پایہ علمی تحقیقی مضامین نے تمام اصحابِ علم ونظر کو اپنی طرف متوجہ کرلیا تھا اور اردو زبان کا لٹریچر ایک نئے نہج میں ڈھلنے لگا۔ ڈاکٹر اقبال نے معارف کے متعلق یہ خیال ظاہر کیا کہ یہی ایک ایسا رسالہ ہے جس کے پڑھنے سے حرارتِ ایمانی میں ترقی ہوتی ہے۔ مولانا محمد علی مرحوم کو بھی معارف سے بڑا اُنس ہوگیا تھا، چنانچہ وہ اپنے ایک مکتوب مورخہ ۴؍دسمبر ۱۹۱۹ء میں سید صاحب کو لکھتے ہیں :

''میرے متعدد انگریزی رسالوں کی جلدیں نہیں بندھی ہیں اور ممکن ہے کہ میرے عزیز دوست اور سارقِ کتب سید جالب صاحب اُن میں سے اکثر پر قبضہ بھی کر بیٹھے ہوں، یہ شرف خاص معارف کو حاصل ہوگا کہ مجلدات تیار کرالی جائیں گی''۔

مولانا ابوالکلام آزاد اپنے ایک خط میں سید صاحب کو تحریر فرماتے ہیں :

''معارف کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں صرف یہی ایک پرچہ ہے اور تو ہر طرف سناٹا ہے۔ بحمد للہ کہ مولانا شبلی مرحوم کی تمنائیں رائیگاں نہ گئیں، اور صرف آپ کی بدولت ایک جگہ ایسی بن گئی جو صرف خدمتِ علم وتصنیف وتالیف کے لئے وقف ہے''۔

معارف اور دارالمصنفین کی شہرت بیرون ہند میں بھی پھیلتی جارہی تھی۔ چنانچہ اسی زمانہ میں ڈاکٹر نکلسن (کیمبرج یونیورسٹی) نے اس ناقدانہ مباحث، علمی مقالات، مستشرقانہ معلومات اور مشرقی ومغربی علوم وخیالات کی آمیزش کی داددی اور اس حیثیت سے ہندوستان کی ترقی پر اپنی خوشی کا اظہار کیا، پھر فرانس کے مشہور مستشرق موسیو لوئز اسینان نے اپنے لیکچر

Marfat.com

''اسلام میں ہمیشہ کی اجتماعی حیثیت'' کے سلسلہ میں دارالمصنفین سے تعاون چاہا۔

بہار خلافت کانفرنس کی صدارت :

۱۹۲۳ء میں صوبہ بہار کی خلافت کانفرنس کی صدارت کی۔ اس کے خطبہ میں جزیرۃ العرب کی پوری تاریخی سرگذشت تھی۔

سیرۃ النبی جلد سوم کی اشاعت :

۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۳ء تک اپنی تصنیف سیرۃ النبی کی تیسری جلد کی تدوین میں مشغول رہے، جو ۱۹۲۴ء میں چھپ کر مشتاق نگاہوں کے سامنے آئی۔ اس میں معجزہ کی حقیقت، اس کے امکان و وقوع پر فلسفہ قدیمہ، علم الکلام، فلسفۂ جدیدہ اور قرآن مجید کے نقطہ ہائے نظر سے مبسوط تبصرہ ہے اور اس کے بعد مکالمۂ الٰہی، وحی، نزولِ ملائکہ، عالمِ رویا، معراج اور شرحِ صدر کا بیان ہے۔ اس کی ترتیب، واقعات کی تفتیش و تلاش اور مسائل و نظریات کی بحث و تحقیق میں جو محنت و کاوش اور دیدہ ریزی کی گئی ہے، اس سے اُن کا علمی پایہ اور بھی بلند ہوا ہے۔

وفدِ حجاز کی صدارت :

اسی سال یعنی ۱۹۲۲ء ہی میں ابنِ سعود اور شریف حسین میں جنگ کا آغاز ہوا۔ دونوں نے مجلسِ خلافت کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس وقت مسلمانانِ ہند نے سید صاحب کی قیادت میں ایک وفد حجاز کو بھیجا، تاکہ وہ فریقین کے سامنے مجلسِ خلافت کی تجاویز کو پیش کرے۔ سید صاحب نے دو ماہ جدّہ میں رہ کر مفوضہ فرائض انجام دیئے اور بڑی دلیری سے شریف حسین اور سلطان ابن سعود کی حکومتوں سے حجاز میں مسلمانوں کی ایک جمہوری حکومت کے قیام کے مسئلہ پر گفتگو اور خط و کتابت کرتے رہے۔ ایک جلسہ میں ایسی پرجوش تقریر کی کہ شریف حسین کے ایک حبشی سنتری نے تقریر کے بعد کہا کہ اگر یہ وفد انگریزوں کی

Marfat.com

پناہ میں نہ ہوتا تو ہم صدرِ وفد کو گولی مار دیتے۔ جب وفد کے مشن میں سید صاحب کو ناکامی ہوئی، تو مصر کا رُخ کیا اور وہاں کے علماء و اکابر سے مل کر حجاز کے معاملہ پر گفتگو کی۔ شیخ ازہر نے ان کی تجاویز سے اپنی رضامندی ظاہر کی۔ یہ اس وفد کی ایسی کامیابی تھی کہ دنیا کے تمام اخبارات نے اس کو نمایاں سرخیوں میں مشتہر کیا۔ اس سفر میں سید صاحب نے حجاز کے تعلیمی حالات کا بھی گہرا مطالعہ کیا، جس کو مضمون کی شکل میں معارف (مئی ۱۹۲۵ء) میں شائع کیا۔

ندوۃ العلماء کے کام :

یوں تو ندوہ کے معتمد تعلیمات کی حیثیت سے ہمیشہ اس سے دلچسپی لیتے رہے، لیکن ۱۹۲۵ء میں اس کی طرف خاص توجہ کی اور فروری میں اس کا سالانہ جلسہ بڑے اہتمام سے کرایا، جس میں علما اور خواص نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ ندوہ کو ایک دارالاقامہ کی سخت ضرورت تھی۔ سید صاحب کی تحریک سے اس جلسہ میں یہ قرار پایا کہ ہندوستان کے ہر صوبہ کی طرف سے دس دس کمروں کا ایک بلاک تیار کیا جائے۔ مختلف صوبوں کے اکابر نے اس پر آمادگی ظاہر کی، اور اس اجلاس کے بعد سید صاحب نے خود صوبہ بہار کا دورہ کر کے اس مقصد کے لئے ایک گران قدر رقم جمع کی۔

خطباتِ مدراس :

اسی سال اکتوبر اور نومبر میں مسلم ایجوکیشنل ایسوسی ایشن آف سودرن انڈیا کی دعوت پر سیرۃ نبوی ﷺ کے مختلف پہلوؤں پر آٹھ خطبے دیئے جو بعد میں خطباتِ مدراس کے نام سے شائع ہوئے۔ ان خطبوں کے خلاصے وہاں کے روزانہ انگریزی اخبارات ''ہندو'' اور ''ڈیلی ایکسپریس'' میں برابر نکلتے رہے اور بہت دلچسپی سے پڑھے گئے۔ یہ اپنے مضامین و مباحث، ادب و انشاء اور زورِ خطابت کے لحاظ سے اردو لٹریچر کے شاہکار سمجھے جاتے ہیں (اس کا انگریزی ترجمہ جناب سعید الحق صاحب (فی الحال نیوز ایڈیٹر پاکستان ریڈیو) نے Living Prophet کے نام سے کیا ہے) اسی سفر میں بنگلور، وانمباڑی

Marfat.com

اور تریانور جا کر بھی مختلف مذہبی عنوانات پر خطبے دیئے۔

جمعیۃ العلماء کی صدارت :

مارچ ۱۹۲۶ء میں جمعیۃ العلماء کا جو اہم سالانہ اجلاس کلکتہ میں ہوا، اس کے وہ صدر منتخب ہوئے۔ اس موقع پر انہوں نے جو خطبۂ صدارت پڑھا، وہ مسلمانوں کی سیاست میں یادگار ہے۔

پھر وفد حجاز :

اسی سال پھر وفدِ حجاز کے صدر منتخب ہوئے۔ اس وقت ہندوستان میں شدھی اور سنگھٹن کا زور تھا۔ اس موقع پر دہلی میں مجلسِ خلافت کا ایک خاص اجلاس ہوا اور حکیم اجمل خان مرحوم کی تحریک پر سید صاحب نے اس کی صدارت کی۔ اس اجلاس میں انہوں نے ہندو اور مسلمانوں کے تعلقات کی نسبت مسلمانوں کے نقطۂ نظر کو بڑی وضاحت سے پیش کیا۔ اس سے فراغت کے بعد وفد خلافت لے کر حجاز گئے۔ اس کے ممبر مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی اور شعیب قریشی تھے۔ سلطان ابنِ سعود نے مسئلہ حجاز کے سلسلہ میں تمام دنیا کے مسلمانوں کی ایک موتمر مکہ معظمہ میں طلب کی تھی، جس میں ترکی، مصر، افغانستان اور دوسرے اسلامی ملکوں کے نمائندے شریک ہوئے اور چند ہفتوں تک برابر اس کے جلسے ہوتے رہے۔ موتمر کے نمائندوں نے سید صاحب کو موتمر کا نائب رئیس منتخب کیا اور صدر موتمر کی غیر حاضری میں اس کی صدارت بھی کی۔ اس میں انہوں نے جو عالمانہ اور مبصرانہ تقریریں کیں، اُن سے ہندوستان کے مسلمانوں کی علمی و دینی عظمت شرکاء کے دلوں میں قائم ہوگئی۔ حجاز میں وفد کے کاموں کی مشغولیت کے باوجود اُن کا قلم بھی رواں دواں رہا۔ چنانچہ وہاں سے آنے کے بعد "حجاز کے کتب خانے" کے عنوان سے معارف کے کئی نمبروں میں ایک طویل مضمون لکھا۔

Marfat.com

مارگولیتھ سے علمی معرکہ :

اس وفد سے واپسی کے بعد زیادہ تر علمی ، مذہبی اور تعلیمی کاموں میں مشغول رہے۔ ۱۹۲۵ء میں مانچسٹر گارجین کے ایک عیسائی مضمون نگار نے حضور انور ﷺ سے متعلق نامناسب باتیں مارگولیتھ کی کتاب کے حوالہ سے لکھیں ، جو خود مارگولیتھ نے واقدی کے جرمن ترجمہ دلھاؤسن کے حوالہ سے لکھی تھیں ، اس پر واقدی کے معتبر اور غیر معتبر ہونے کی بحث چھڑ گئی۔ سید صاحب نے ۱۹۲۶ء کے معارف کے متعدد مضامین میں یہ ثابت کیا کہ واقدی کی حیثیت ایک داستان گو سے زیادہ نہیں ہے اور اس کا شمار معتبر مؤرخین میں نہیں ہے۔ تاریخ و سیر میں اس کا حوالہ دینا ایسا ہی ہے جیسے ملکہ ایلزبتھ کی سوانح عمری میں رینالڈس کا حوالہ دیا جائے۔ مارگولیتھ کے علاوہ ڈرہم یونیورسٹی کے عربی کے پروفیسر ڈاکٹر گولیم نے بھی اس بحث میں حصہ لیا تھا۔ سید صاحب نے دونوں کو اپنے محققانہ اور فاضلانہ مضامین سے خاموش کیا۔ مضامین کا انگریزی ترجمہ اسلامک ریویو وو کنگ میں بھی شائع ہوا اور ایک صاحب نے حجاز میں ان کا ترجمہ عربی میں بھی کیا۔

زہر کا تریاق :

۱۹۲۷ء میں ایک یورپین اہل قلم نے لکھا کہ ''مسلمان ارسطو کی گاڑی کے قلی تھے'' سید صاحب نے اپنے ایک مضمون میں اس کی فاضلانہ تردید کی ، جس کا انگریزی ترجمہ حیدر آباد دکن کے رسالہ اسلامک کلچر میں بھی شائع ہوا۔ اسی سال یہ پروپیگنڈا کیا گیا کہ اسلام کا قانون عورتوں کے لئے حد درجہ تنگ اور سخت گیر ہے۔ سید صاحب نے مسلمان عورتوں کے حقوق کے عنوان سے اس کی تردید میں ایک طویل مضمون لکھا ، اور یہ دکھایا کہ عورتوں کے ساتھ جتنی بے انصافیاں تھیں ، ان سب کا خاتمہ آخری ربانی پیغام اور تکمیلِ دین نے کیا اور اُن کے واجبی حقوق دے کر ان کا درجہ بلند کیا۔

Marfat.com

انجمن حمایتِ اسلام لاہور میں تقریر :

اسی سال وسطِ اپریل میں انجمن حمایتِ اسلام لاہور کی دعوت پر ''عہدِ رسالت میں اشاعت اسلام'' پر تقریر کی جو بہت پسند کی گئی۔ اس موقع پر لاہور کے تمام اصحابِ علم سے ملاقاتیں رہیں۔ ڈاکٹر اقبال نے بڑی تواضع سے ملنے میں پیش دستی فرمائی۔ ان کی قیام گاہ پر آئے اور بڑی گرم جوشی سے ملے اور پھر اُن کے اعزاز میں جتنی علمی صحبتیں رہیں، ان میں ڈاکٹر اقبال ہی شمع محفل رہے۔ چنانچہ سید صاحب نے پنجاب کے سفر سے واپسی پر شذرات میں تحریر فرمایا کہ .... انہوں نے (یعنی ڈاکٹر اقبال نے) ''شمع اور شاعر'' لکھا ہے، لیکن میں نے تو لاہور میں خود شاعر کو شمع دیکھا اور قدر شناسوں کو اس کا پروانہ پایا۔ اُن کی صحبت لاہور کے نوجوانوں کی دماغی سطح کو بلند کر رہی ہے۔ اُن کے فلسفیانہ نکات، عالمانہ افکار، شاعرانہ خیالات، اُن کے آس پاس کی دنیا کو ہمیشہ متاثر رکھتے ہیں''۔ اس ملاقات کے بعد دونوں میں اور زیادہ گہرے تعلقات پیدا ہوئے۔

جنوبی ہند کا سفر :

اسی سال کے اکتوبر میں مجلس العلماء کی صدارت کے لئے ترچنا پلی تشریف لے گئے۔ یہ مجلس تامل زبان میں اسلام کی تبلیغ اور اشاعت تعلیم کا کام انجام دیتی تھی۔ اس سفر میں ویشارام، امبور، عمر آباد، بنگلور، میسور اور حیدر آباد دکن میں بھی تقریریں کیں۔ اس لمبے سفر کا مقصد ندوۃ العلماء کے دارالاقامہ کی تعمیر کے لئے چندے کا حصول تھا۔ وہاں سے واپسی کے بعد نومبر میں ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاس میں شرکت کے لئے امرتسر گئے۔ اسی اجلاس میں ندوہ کے لئے نواب صاحب بھاولپور نے پندرہ ہزار کی رقم عطاء کی۔ امرتسر سے وہ جمعیۃ العلماء کے اجتماع میں شرکت کے لئے پشاور بھی گئے۔

دارالمصنفین کی روز افزوں شہرت :

۱۹۲۸ء میں خالص علمی کاموں خصوصاً سیرۃ النبی ﷺ جلد چہارم کی تدوین میں

Marfat.com

مشغول رہے۔ دارالمصنفین اب اپنے مذہبی، علمی، ادبی کارناموں کی وجہ سے ہنداور بیرونِ ہند میں بہت مشہور ہو چکا تھا۔ فرانس کے علمی رسالہ ''دنیائے اسلام'' میں اس کا ذکر کئی بار کیا گیا۔ مصر کے رسالہ الزہراء میں اس پر ایک مقالہ بھی شائع ہوا۔ ایک ترک نوجوان شہاب الدین آفندی نے جو مولانا روم کے خاندان سے تھے، اپنے ہموطن نادرۂ روزگار مہندس استاذ عیسیٰ اور اُن کے رفقاء کے حالات قلمبند کرنے کے سلسلے میں دارالمصنفین کی طرف رجوع کیا۔ امریکہ کے رسالہ ''مسلم ورلڈ'' اپریل ۱۹۲۸ء کے دو مضامین میں دارالمصنفین کا ذکر خاص طور پر کیا گیا۔ ترکی میں الفاروق اور سیرۃ النبی ﷺ کے حصہ اوّل، دوم، سوم، سیرۃ عائشہؓ اور سیرۃ الصحابہؓ کی بعض جلدوں کے ترجمے ترکی زبان میں کیے گئے اور وہاں کے علماء اور عام شائقین نے ان کتابوں کو توقع سے زیادہ پسند کیا۔

اس کی علمی شہرت سے ہندوستان کے سیاسی لیڈروں کی نظریں بھی اس کی طرف اٹھیں اور ایسا مرکز بن گیا جہاں مسلمان اور ہندو لیڈر بڑے فخر سے آتے تھے۔ مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی، بی اماں، مولانا حسین احمد، چودھری خلیق الزمان، ڈاکٹر محمود کے علاوہ گاندھی جی، مالوی جی، سروجنی نائیڈو، پنڈت موتی لال نہرو، اور پنڈت جواہر لال نہرو سب ہی یہاں آئے۔ پنڈت موتی لال نہرو پوربی اضلاع کے دورہ میں جب اعظم گڑھ آتے تو ہمیشہ دارالمصنفین ہی میں ٹھہرتے۔ شبلی منزل ان کا بے تکلف مہمان خانہ تھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو کا بھی ہمیشہ یہی طریقہ رہا۔ وہ جب بھی اعظم گڑھ آئے، دارالمصنفین میں آ کر ٹھہرے۔ گاندھی جی جب اپنے دورہ میں اعظم گڑھ آئے تو اُن کے قیام کا انتظام تو اور جگہ تھا، مگر وہ خود شبلی منزل آئے اور ایسے وقت آئے کہ اہل دارالمصنفین ایک کھلی جگہ میں مغرب کی نماز پڑھ رہے تھے۔ یہ دیکھ کر گاندھی جی نہایت ادب اور خاموشی سے کنارے بیٹھ گئے (اور ساتھ والوں کو باادب رہنے کے لئے اشارہ کیا۔ سید صاحب نے لالٹین کی روشنی میں اُن کو کتب خانہ دکھایا۔ دارالمصنفین کے ایک رفیق نے اُن کے سامنے دستخط کے لئے اپنی یادداشت کی کتاب پیش کی، تو انہوں نے اردو میں دستخط کیا۔

Marfat.com

۱۹۲۸ء میں سید صاحب نے ''ہندوستان اور علمِ حدیث'' کے عنوان سے ایک طویل مضمون لکھا، جو دلچسپی سے پڑھا گیا۔ اس موضوع پر اردو میں یہ پہلا مضمون تھا۔ اس کی اشاعت کے بعد دوسرے اہل قلم نے بھی اس موضوع پر مفید معلومات فراہم کیے۔ اسی سال حیدر آباد کے سفر کے موقع پر حضور نظام نے اُن سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی اور اس کے نتیجہ میں ریاست حیدآ باد سے دارالمصنفین کی سالانہ امداد جاری رکھی گئی۔

ساروا ایکٹ کے خلاف احتجاج :

۲۸ء و ۱۹۲۹ء میں ساروا ایکٹ یعنی نابالغوں کی شادی پر پابندی کے سلسلہ میں مسلمانوں میں بڑا ہیجان پیدا ہوا۔ انہوں نے اس کے خلاف سخت احتجاج کیا، لیکن اس قانون کے بعض مسلمان حامیوں نے فقہ اسلامی میں تحریف کرنے کی کوشش کی اور نابالغ لڑکیوں کے نکاح کو ناجائز بتایا اور زورِ استدلال میں حضرتِ عائشہؓ کی نابالغی کی عمر نکاح سے بھی انکار کردیا۔ سید صاحب نے معارف میں نکاح کے وقت حضرتِ عائشہؓ کی عمر پر محققانہ اور فاضلانہ بحث کر کے ایسے تمام لوگوں کا منہ بند کردیا اور یہ اعلان کیا کہ نابالغوں کا نکاح تو شرعاً جائز ہے، مگر ہر حال میں مستحسن نہیں، لیکن کسی غیر اسلامی حکومت کو مسلمانوں کے نکاح وطلاق کے سلسلہ میں قانون بنانے کا حق نہیں۔ غیر اسلامی حکومتوں میں مناسب اصلاحات کو قانوناً نافذ کرنے کی صورت صرف یہ ہے کہ وہ حنفی تصریحات کے مطابق مسلمان والی یا قاضی کے ذریعہ جاری کی جائیں۔ اسی سلسلہ میں انہوں نے اس طرف بھی توجہ دلائی کہ سوراج قائم ہونے کے بعد مسلمانوں کے پیشِ نظر جو معاملات ہیں، اُن میں ایک مطالبہ یہ بھی ہو کہ آئندہ حکومت میں مسلمانوں کے خالص مذہبی اور شخصی قوانین کے تحفظ، ترقی و اصلاح اور استحکام کے لئے ایک علیحدہ نظام ہونا چاہئے اور اس کے لئے ایک قابل عمل خاکہ پیش کیا جائے۔ اس طرح کلچرل اٹونومی کی صدا پہلی بار انہوں نے بلند کی اور یہ بھی لکھا کہ اگر آسمان کو دیکھ کر موسم کے انقلاب کی پیشن گوئی کی جاسکتی ہے تو موجودہ حالات کو دیکھ

Marfat.com

کر مجھے یقین ہے کہ اگر اس قسم کی تدبیر نہیں کی گئی، تو مسلمانوں کی ممتاز ہستی اس ملک میں قائم نہیں رہ سکتی۔

عرب و ہند کے تعلقات پر لیکچر :

۲۹ء کے مارچ میں ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کی دعوت پر "عرب و ہند کے تعلقات" پر لیکچر دیئے جن میں ہندو مسلمان دونوں کو اُن کا وہ زرّین عہد یاد دلایا، جب دونوں گوناگوں تعلقات کے رشتوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ یہ خطبات تلاش و تحقیق، محنت و کاوش اور حجت و استدلال کے اعتبار سے بے مثل سمجھے جاتے ہیں۔ اُن کا انگریزی ترجمہ جناب سعید الحق صاحب ایم، اے (فی الحال نیوز ایڈیٹر کراچی) نے کیا تھا، جو اسلامک کلچر حیدر آباد میں کئی سال تک شائع ہوتا رہا۔ (ان سطور کو لکھتے وقت یہ اطلاع ملی کہ یہ انگریزی ترجمہ کتاب کی صورت میں حکومت پاکستان شائع کرنے والی ہے)

ندوۃ العلماء کے لئے سرمایہ کی فراہمی :

۳۰ء میں زیادہ تر سیرۃ النبی جلد چہارم کی تدوین میں مشغول رہے۔ اسی کے ساتھ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی مالی حالت درست کرنے کی بھی فکر رہی۔ چنانچہ اُن کی تحریک پر مدراس کے مشہور مخیّر ساہوکارسی عبد الحکیم صاحب نے ندوہ کو پانچ ہزار روپے کی رقم عنایت کی۔

عربوں کی جہاز رانی :

۱۹۳۱ء کے مارچ میں "عربوں کی جہاز رانی" پر بمبئی گورنمنٹ کے شعبہ تعلیم کی سرپرستی میں چار خطبے دیئے، جو بڑی دلچسپی سے سنے گئے۔ اُن کے اقتباسات بمبئی کے انگریزی اور اردو اخبارات نے شائع کئے۔ ان میں یہ بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ موجودہ جہاز رانی کی ترقی میں عربوں کا کتنا حصہ ہے۔ ان خطبات کا بھی انگریزی میں ترجمہ اسلامک کلچر حیدر آباد میں شائع ہوا۔

Marfat.com

قلمی جہاد :

ان کا یہ سال زیادہ تر دشمنِ اسلام عناصر کے خلاف قلمی جہاد میں گذرا ، جو مسلمانوں کو اپنی تحریروں سے گمراہ کرنے کی کوشش میں تھے۔اسی زمانہ میں انگریزی اخبار اسٹیٹسمین میں ایک مضمون چھپا تھا ، جس میں واقعۂ کربلا کا حال ایسے انداز میں بیان کیا گیا تھا ، جو مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے قابلِ اعتراض تھا۔اس کے خلاف سید صاحب نے سخت احتجاج کیا۔اسی طرح پنجاب یونیورسٹی کے نصاب میں ڈاکٹر وائل کی کتاب تاریخ اقوام اسلامیہ اور ڈاکٹر نکلسن کی تاریخ ادبیات عربی داخل ہوئیں ، تو انہوں نے وہاں کے اربابِ علم کو اس طرف توجہ دلائی کہ ان دونوں کتابوں میں اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے متعلق نہایت گمراہ کُن نظریات اور لغو اعتراضات ہیں ، جن کو ایک مسلمان سننا بھی گوارا نہیں کرسکتا۔مسلمانوں کے اخبارات نے بھی احتجاج کیا ، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ کتابیں پنجاب یونیورسٹی سے خارج کردی گئیں۔اسی طرح جب رسالہ نگار لکھنؤ نے انبیاءِ کرام علیہم السلام ، رسالت مآب ﷺ اور اسلامی عقائد واعمال کے متعلق ، دل آزار مضامین لکھے ، تو سید صاحب نے اس کے خلاف بھی آواز بلند کی ، جس پر عام مسلمانوں نے اتنی مخالفت کی کہ ایڈیٹر نگار کو توبہ نامہ لکھنا پڑا ' جو نومبر ۱۹۳۱ء کے معارف میں بھی شائع ہوا۔

سیرۃ النبیؐ جلد چہارم :

۱۹۳۲ء میں سید صاحب کی مشہور تصنیف سیرۃ النبی کی چوتھی جلد شائع ہوئی ، جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ نبوت محمدیؐ نے دنیا میں کس عظیم الشان اصلاح کا فرض انجام دیا۔اُس کی اشاعت سے دارالمصنفین کی شہرت میں اور بھی چار چاند لگ گئے۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تقریریں :

مارچ ۱۹۳۳ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی انجمن اردوئے معلّٰی کی دعوت پر

Marfat.com

''ہندوستان میں ہندوستانی'' پر ایک خطبہ دیا، یہ جلسہ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی صدر یارِ جنگ بہادر کی صدارت میں یونین ہال میں ہوا جو اس موقع پر بھرا تھا۔ اس میں سید صاحب نے تاریخی حوالوں سے بتایا کہ اردو نام دراصل ہندوستانی تھا۔ انگریزوں کے آنے سے بہت پہلے دسویں صدی میں یہ زبان اسی نام سے پکاری جاتی تھی۔ اُن کی دوسری تقریر آفتاب ہوٹل کے طلبہ کے سامنے ہوئی، جس میں ان پر یہ اچھی طرح واضح کیا کہ ہماری یہ زندگی جو تمام تر دوسری قوم کی نقالی پر مبنی ہے، ہمارے اندر قومی روح کی سرگرمی نہیں پیدا کر سکتی ہے۔ ان کی تیسری تقریر طبیہ کالج کے ہال میں ہوئی۔ اس میں اسلامی طب کی تاریخ کے ساتھ وہاں کے طلبہ کو یہ نصیحت فرمائی کہ وہ ڈاکٹر بننے کے بجائے طبیب بننے کی کوشش کریں، کیونکہ ہندوستان کی صحت عامہ کا دارومدار دیسی طب پر ہے، جس کی اکثر دوائیں ہمارے ملک کی پیداوار ہیں۔ وہ مسلم یونیورسٹی کے کورٹ کے ممبر بھی ۱۹۳۳ء سے ۱۹۴۷ء تک رہے۔

تاج محل کے معمار کی تحقیق :

اپریل ۱۹۳۳ء میں ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور کے پہلے سالانہ اجلاس کی شرکت کے لئے لاہور تشریف لے گئے، جس کی صدارت ڈاکٹر سر محمد اقبال نے کی تھی۔ اس جلسہ میں انہوں نے اپنا ایک مقالہ پیش کیا، جس کا عنوان ''لاہور کا ایک مہندس خاندان جس نے تاج اور لال قلعہ بنایا'' تھا۔ اس میں اس خاندان کے تقریباً ڈیڑھ سو برس کے علمی کارناموں کی سرگذشت نامعلوم گوشوں سے بڑی تلاش و تحقیق سے مرتب کی گئی تھی اور تاریخ میں پہلی دفعہ اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ نادر العصر استاد احمد معمار شاہجہانی لاہور کے حالات بتائے گئے اور نہایت مستند شہادتوں سے یہ ثابت کیا گیا کہ تاج محل کا معمار درحقیقت یہی استاد احمد معمار شاہجہانی لاہوری ہے، جو ہندسہ، ہیئت اور ریاضیات کا بہت بڑا عالم تھا۔ اس حقیقت کے ظاہر ہونے کے بعد وہ تمام دعوے جو تاج کے کاریگروں اور

Marfat.com

معماروں سے متعلق مشہور تھے، بے سروپا ہو کر رہ گئے۔

مغربی ہند کا سفر :

جولائی ۱۹۳۳ء میں سیرت نبوی ﷺ پر تقریر کرنے کے لئے بڑودہ تشریف لے گئے۔ اس کا جلسہ ہزا کسلنسی دیوان بہادر کی صدارت میں بڑودہ کالج میں ہوا۔ بڑودہ سے بھروچ، بھروچ سے راندیر، راندیر سے سورت، سورت سے انکلشور اور وہاں سے ڈابھیل گئے اور ہر جگہ ایک ایک دو دو مذہبی تقریریں کیں۔

ضابطہ جنایات قتل وقصاص کی ترتیب :

اسی سال حکومت حیدر آباد نے دارالمصنفین کو فقہ حنفی کی رو سے ایک ضابطہ جنایات کی ترتیب وتدوین کی خدمت سپرد کی، چنانچہ سابق دولت عثمانیہ کی مجلۃ الاحکام کی طرح یہ قانون جنایات بھی دفعہ وار مرتب کیا گیا اور اس کا مسودہ سید صاحب نے حکومت حیدر آباد کو پیش کیا۔

خیام :

اسی سال اُن کی مشہور ومعروف تصنیف خیام شائع ہوئی، انہوں نے خیام پر پہلی دفعہ فروری ۲۴ء کے معارف میں ایک مضمون لکھا تھا، جو دراصل پروفیسر اقبال معلم فارسی اورینٹل کالج لاہور کے اس مقالہ کا جواب تھا، جو انہوں نے "شعر العجم اور عمر خیام" کے عنوان سے رسالہ اردو (اورنگ آباد دکن) میں تحریر کیا تھا۔ اس مضمون کو قلمبند کرتے وقت سید صاحب نے خیام کا ناقدانہ مطالعہ کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دسمبر ۱۹۳۰ء کی اورینٹل کانفرنس منعقدہ پٹنہ میں ایک مقالہ پیش کیا۔ ارباب نظر نے توقع سے بڑھ کر اس کی قدر کی، تو یہی مقالہ ایک کتاب کی صورت میں منتقل ہو گیا۔ اس کتاب کی ترتیب میں انہوں نے تحقیق وتطبیق، واقعات کی تلاش وتفتیش، ماخذوں اور سندوں کے حوالوں اور خیام کی فلسفیانہ

Marfat.com

تصانیف کی جستجو میں جو فکر و کاوش کی ہے۔ وہ ایک اہم علمی کارنامہ ہے۔ اس سے خیام ایک بالکل ہی نئے رنگ میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس تصنیف کی داد ہندوستان سے لے کر ایران، کابل اور یورپ تک کے فضلاء نے دی۔ فردوسی کی ہزار سالہ برسی کے موقع پر افغانستان نے ایران کو جو تحائف دیئے، ان میں ایک تحفہ "خیام" بھی تھا۔ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد نے اس پر پانچ سو روپے کا انعام دیا۔ ڈاکٹر اقبال نے اس کتاب کو پڑھ کر سید صاحب کو ایک مکتوب میں لکھا کہ "کہ عمر خیام پر آپ نے جو کچھ لکھ دیا ہے، اُس پر اب کوئی مشرقی یا مغربی عالم اضافہ نہ کر سکے گا"۔

سفرِ افغانستان :

اسی سال نادر خان شاہِ افغانستان کی طرف سے ایک تعلیمی و علمی دعوت ڈاکٹر سر اقبال، نواب سر راس مسعود وائس چانسلر یونیورسٹی اور سید صاحب کو موصول ہوئی کہ وہ افغانستان آ کر کابل یونیورسٹی کی ترتیب اور تنظیم اور وہاں کے تراجم و تالیف کے دائرے کو وسیع کرنے کے سلسلہ میں اپنے مفید مشورے دیں۔ چنانچہ سید صاحب ۲۳/ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو ہندوستان سے کابل روانہ ہوئے۔ پاسپورٹ کے ملنے میں تاخیر ہونے کے سبب وہ اپنے دوسرے رفقاءِ سفر کے ساتھ نہ ہو سکے اور کابل اُن کے پہنچنے کے بعد پہنچے۔ سرکاری طور پر وہاں ان معزز مہمانوں کی بڑی پذیرائی ہوئی۔ علمی انجمنوں نے اُن کو سپاس نامے پیش کئے اور عام لوگوں نے مختلف طریقوں سے اپنی محبت کا اظہار کیا۔ سید صاحب نادر خان سے ملے تو ان سے مسئلۂ تعلیم پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ افغانستان کی عربی و مذہبی تعلیم کا نصاب ایسا ہو کہ طلبہ میں موجودہ زمانے کے لحاظ سے سیاسی و اجتماعی اصلاحات کی طرف میلان بھی ہو اور اُن میں مذہبی شیفتگی بھی پیدا ہو۔ شاہِ افغانستان نے اس مشورہ کو پسند فرمایا۔ سید صاحبؒ نے اسی قسم کے مشورے وہاں کے ماہرین تعلیم کو بھی دیئے، جو انہوں نے قبول کیے۔ وہاں کے قیام کے زمانے میں انجمن ادبی کابل نے ہندوستان کے

Marfat.com

معزز مہمانوں کو ایک سپاسنامہ پیش کیا تو اس موقع پر افغانستان کے مشہور شاعر جناب قاری عبداللہ صاحب نے خیر مقدم کے عنوان سے ایک نظم پڑھی، جس میں سید صاحب کے متعلق یہ اشعار تھے ....

سوم سید کہ از ندوہ است
زدانش بہ ہندوستاں قدوہ است
زفیض دمش تازہ شد جانِ علم
در اقلیم دانش سلیمانِ علم
چہ کلکش بمعنی طرا زندہ شد
خیالاتِ شبلی از و زندہ شد
چہ درشاہراہ حقائق شتافت
معارف از درونقِ تازہ یافت
مضامینِ او جملہ محکم بود
نگارش بکلکش مسلّم بود

کابل سے چل کر غزنی آئے، جہاں حکیم سنائی اور محمود غزنوی کے مزار پر حاضری دی، پھر مقر، قلات، غلزی، قندھار، چمن، کوئٹہ اور ملتان کی سیاحت کرتے ہوئے اعظم گڑھ واپس آ گئے۔ رخصتانہ میں نادر شاہ نے افغانستان کے بنے ہوئے چار عمدہ قالین، کچھ پشمینے اور اونی کپڑے بھی نذر کئے۔ اس طویل سفر میں ان کے قلم کا مسافر بھی چلتا رہا، دن اور رات کے مختلف مشاغل کے باوجود سونے سے پہلے وہ سفر کے تمام کوائف قلمبند کر لیتے۔ چنانچہ آخر میں ایک سفر نامہ مرتب ہو گیا، جو معارف میں شائع ہوا اور بعد میں سفر نامۂ افغانستان کے نام سے ایک کتاب بھی مرتب ہو گئی۔ اس سفر میں ڈاکٹر اقبال اُن سے بے حد متأثر ہوئے۔ چنانچہ ایک موقع پر تحریر فرمایا کہ:

''آج سید سلیمان ندوی ہماری علمی زندگی کے سب سے اونچے زینے پر

Marfat.com

ہیں۔ وہ عالم ہی نہیں، امیر العلماء ہیں، مصنف ہی نہیں رئیس المصنفین ہیں، ان کا وجود علم و فضل کا ایک دریا ہے جس سے سینکڑوں نہریں نکلی ہیں اور ہزاروں سوکھی کھیتیاں سیراب ہوئی ہیں"۔

جامعہ ملّیہ کی توسیعی لیکچرز کی صدارت :

فروری ۱۹۳۴ء میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی دعوت پر ڈاکٹر بہجت وہبی جامعہ ملیہ آئے، یہ حضرت معاذ بن جبلؓ کی اولاد میں سے تھے۔ مصر کی طبی درسگاہ میں علم تشریح کے استاد رہ چکے تھے۔ وہاں سے سبکدوش ہونے کے بعد یورپ میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرنے لگے۔ ۱۹۲۰ء میں سید صاحب سے طربطے واقع سوئٹزر لینڈ میں ملاقات ہوئی تھی۔ اسلامی احوال و ماجریات پر اُن کا مطالعہ گہرا تھا۔ جامعہ ملیہ میں آکر چار خطبے دیئے۔ ڈاکٹر انصاری کے اصرار پر ان کے پچھلے دو خطبوں کے جلسوں کی صدارت سید صاحب ہی نے کی۔

سفرِ رانچی :

جون ۳۴ء میں صوبہ بہار واڑیسہ کے وزیر تعلیم آنریبل جناب سید عبدالعزیز کی دعوت پر عربی مدارس کے ترتیبِ نصاب کے سلسلہ میں رانچی تشریف لے گئے۔ ان کے ساتھ اُن کے عزیز دوست مولانا مناظر احسن گیلانی (صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن) بھی تھے۔ حکومت بہار نے اُن کو کئی بار مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے پرنسپل کے تقرر کے سلسلہ میں پبلک سروس کمیشن کا اکسپرٹ ممبر بھی نامزد کیا۔

تاریخ ہند کی تدوین کی اسکیم :

اسی سال کے آخر میں بہت سے ہمدردِ اہلِ علم کے تقاضے اور اصرار پر اسلامی ہند کی مکمل تاریخ کی تدوین و ترتیب کا ایک خاکہ ملک کے سامنے پیش کیا۔ مسلمانوں نے

Marfat.com

ہندوستان کو جو سیاسی، قومی، علمی و تمدنی حیثیت سے ترقی دی۔ اُس کی ایک مکمل اور جامع تاریخ کی ضرورت روز بروز بڑھتی جارہی تھی۔ سید صاحب نے دسمبر ۱۹۳۴ء کے معارف میں یہ تجویز پیش کی کہ ایسی تاریخ پندرہ جلدوں میں لکھی جانی چاہئے، پورے ملک نے اس تجویز کی تائید کی۔ چنانچہ دارالمصنفین میں بعض اہلِ علم کی خدمات حاصل کر کے اس اہم کام کو شروع کرا دیا گیا، جو اب تک جاری ہے۔

زنانہ جامعہ لاہور کا خاکہ :

جنوری ۳۵ء میں انجمن حمایت اسلام لاہور کی دعوت پر اس کی طلائی جوبلی میں شریک ہوئے۔ انجمن نے اس موقع پر ایک اسلامی زنانہ جامعہ قائم کرنا چاہا تو اُس کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی، جس کے ایک ممبر سید صاحب بھی تھے، انہوں نے علامہ اقبال کے ساتھ مل کر ایک خاکہ تیار کیا۔ اس سفر کے سلسلہ میں لاہور، لدھیانہ، سہارنپور، دیوبند اور دہلی کے علمی و تعلیمی اداروں اور کتب خانوں کی بھی سیر کی۔

ضابطۂ فوجداری حیدرآباد پر نظرثانی :

اسی سال ریاست حیدرآباد دکن نے شرعی حیثیت سے وہاں کے ضابطۂ فوجداری پر نظرثانی کرنے کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی، جس میں ایک سابق جج ہائی کورٹ، مفتی ریاست اور سید صاحب تھے۔ اس کمیٹی نے ایک مہینہ میں اپنا کام پورا کیا۔

سیرۃ النبیؐ جلد پنجم :

اسی سال اُن کی مشہور و معروف تالیف سیرۃ النبیؐ کی پانچویں جلد شائع ہوئی۔ اس کا موضوع عبادات تھیں۔ سیرۃ النبیؐ کی جلدیں ہند اور بیرون ہند میں بے حد مقبول ہو رہی تھیں۔ ہندوستان میں اس کی مانگ بڑھتی جارہی تھی اور ہر جلد کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ ترکی میں اُس کی تین جلدوں کا ترجمہ ہوا اور وہاں اُن کی

Marfat.com

مقبولیت کا اندازہ نواب فخر یارِ جنگ کے حسبِ ذیل مکتوب سے ہوگا، جو انہوں نے سید صاحب کو تحریر فرمایا:

''میں کچھ عرصہ ہواترکی گیا تھا ...... وہاں ایک بڑی جماعت ایسے لوگوں کی ملی، جو سیرۃ النبیؐ مبارک کی بڑی مداح ہے اور اس کا جو ترجمہ ترکی میں ہو چکا ہے۔ اس کو وہ بہت شوق سے مطالعہ کرتے ہیں، خود استنبول تو چونکہ مغرب زدہ ہو چکا ہے۔ وہاں زیادہ لوگ نہیں ملے، لیکن بروصہ میں جو شاہانِ عثمانیہ کا فتح استنبول سے پہلے قریب ڈیڑھ سو سال کے دارالحکومت رہا ہے۔ بہت سے احباب کو سیرۃ النبیؐ کا ذکر دلچسپی سے کرتے سنا، خدا آپ کے مساعی جمیلہ کو بارآور کرے''۔

فارسی میں بھی سیرۃ النبیؐ کی چند جلدوں کا ترجمہ کابل میں کیا گیا، مکہ معظمہ اور مصر میں اُس کے عربی ترجمہ کا خیال پیدا ہوا۔

اردو ہندی کا جھگڑا:

اکتوبر ۳۵ءمیں مرض ذات الجنب کا شدید حملہ ہوا، کئی مہینہ کے بعد شفا ہوئی، تو ڈاکٹروں نے چھ مہینے تک مکمل آرام لینے کی ہدایت کی۔ تین مہینے دہرہ دون جیسے صحت بخش مقام میں جا کر قیام بھی کیا اور آرام کے بعد اپنے علمی مشاغل پھر شروع کئے، تو اردو ہندی کے روز افزوں جھگڑوں سے اُن کو بہت دکھ پہنچا۔ معارف کے شذرات کے ذریعہ اپنے دردمندانہ خیالات کا اظہار کیا کہ ہندی اور اردو دونوں کے لئے الگ الگ ترقی کی راہیں کھلی رہنی چاہئیں، کیونکہ زمانہ یہ فیصلہ کر چکا ہے کہ نہ اُردو ہندی کو مٹا سکتی ہے اور نہ ہندی اردو کو دونوں اپنی اپنی راہیں چلتی رہیں گی۔ انہوں نے یہی خیالات علی گڑھ میں آل انڈیا اردو کانفرنس میں ظاہر کئے جو اکتوبر ۱۹۳۶ء میں ہوئی۔

فلسطین کانفرنس کی صدارت:

یہودیوں اور انگریزوں کی سازش سے فلسطین کا جو نیا نقشہ بننے کو تھا۔ اُس سے

Marfat.com

ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی بڑا سیاسی اُبال اور مذہبی جوش پیدا ہوا۔ مدت کی سیاسی خاموشی کے بعد سید صاحب نے فلسطین کے مسئلہ میں اپنی آواز بلند کی اور مولانا شوکت علی اور مفتی کفایت اللہ کے اصرار پر ۶ ر نومبر ۱۹۳۶ء کی آل انڈیا فلسطین کانفرنس دہلی کی صدارت کی۔ اس میں جو خطبہ پڑھا۔ وہ دنیائے اسلام میں بڑا مقبول ہوا، مصر اور شام کے اخبارات نے اُس کے ترجمے چھاپے، مجلس اعلیٰ فلسطین کے صدر مفتی سید امین الحسینی نے خاص طور پر تار کے ذریعہ اُن کا شکریہ ادا کیا۔

ایک ناخوشگوار واقعہ :

وہ فلسطین کانفرنس کی صدارت کر رہے تھے کہ ایک برخود غلط اہل قلم نے ۵ صفحے کا ایک رسالہ "علامہ سید سلیمان ندوی کی قرآنی غلطیاں" لا کر اُن کے ہاتھ میں دیا۔ جس میں اُن کی تصنیفات میں سے گیارہ غلطیاں فراہم کر کے یہ الزام لگایا تھا کہ ان کی تحریروں سے الحاد واہمال کے جراثیم پیدا ہوتے ہیں۔ دسمبر ۳۶ء کے معارف میں ان اعتراضات کا جواب شائع ہوا، تو رسالہ کے مرتب نے مطمئن ہونے کے بجائے سید صاحب کو ایک عدالتی سمن کے ذریعہ دہلی کی عدالت میں طلب کرنے کی کوشش کی، لیکن دہلی کے اس زمانہ کے مشہور وکیل جناب عبدالرحمٰن صاحب کی وکالت اور وساطت سے یہ مقدمہ عدالت سے خارج ہو گیا اور سید صاحب کو عدالت میں حاضر ہونے کی نوبت نہیں آئی۔

ہندوستانی اکیڈمی کے جلسہ کی صدارت :

جنوری ۳۷ء میں لکھنؤ کی نمائش گاہ میں ہندوستانی اکیڈمی کی ایک کانفرنس کے شعبہ اردو کی صدارت کی۔ اس اکیڈمی کا مقصد ہندوستان کو ادب کی راہ سے ایک کرنا تھا، لیکن اس کانفرنس میں اردو اور ہندی کے دو خیمے علیحدہ علیحدہ تھے۔ ایک کے ادیب نے دوسرے کی صورت تک نہ دیکھی۔ اس سے سید صاحب کو بڑا دکھ ہوا اور اسی وقت اُن کو یہ خیال پیدا ہوا کہ شاید ہندو مسلمانوں کے دل ایک دوسرے سے جدا ہو رہے ہیں، جیسا کہ

Marfat.com

انہوں نے فروری ۳۷ء کے معارف میں اظہار کیا ہے۔

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی طلائی جوبلی :

مارچ ۱۹۳۷ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی طلائی جوبلی علی گڑھ میں ہوئی تو اس کے شعبہ علوم وفنون اسلامی کی صدارت کی۔ اس میں خطبۂ صدارت کے علاوہ اپنا ایک مقالہ ''عرب اور امریکہ'' کے عنوان سے پیش کیا، جس میں یہ دکھایا کہ کولمبس سے پہلے عرب جہاز ران امریکہ پہنچ چکے تھے، کیونکہ ان کو زمین کی گولئی اور اس کے تحتانی اور فوقانی حصوں کا علم تھا۔ اسی لئے ماورائے بحرظلمات تک پہنچنے کی کوشش کی۔

سفرِ مدراس وحیدرآباد :

اکتوبر ۱۹۳۷ء میں جامعہ دارالسلام عمر آباد مدراس کا خطبۂ اسناد دینے کے لئے وہاں تشریف لے گئے۔ مدراس کو اُن سے اور اُن کو مدراس سے ذاتی اُنس ہوگیا تھا۔ مدراس سے حیدرآباد آئے، وہاں اُن کی آمد کی اطلاع اخبار میں حضور نظام کی نظر سے گذری، تو اُن کے لئے خاصہ بھیجا اور ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا۔ اس قیام کے زمانہ میں دائرۃ المعارف حیدرآباد نے اُن کے اعزاز میں نواب مہدی یارِ جنگ کی صدارت میں ایک جلسہ کیا، جس میں انہوں نے اپنا ایک مقالہ عربی زبان میں ''ابوالبرکات بغدادی اور اُس کی کتاب المعتبر'' کے عنوان سے پڑھا۔ اسی روز سر مہاراجہ یمین السلطنت بہادر کشن پرشاد نے اپنے یہاں مدعو کر کے ایک خلعت عطا کیا۔ اس سفر سے اعظم گڑھ واپس آئے، تو حضور نظام نے اُن کے لئے سو روپے ماہانہ کا ذاتی وظیفہ مقرر کر کے ان کے علم وفضل سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا۔

ودیا مندر اور واردھا سکیم :

۱۹۳۸ء میں سی پی میں ودیا مندر کے نام سے جبری تعلیم کی مہم شروع ہوئی۔ اس میں اردو پڑھانے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ اس لئے مسلمانوں میں ہیجان پیدا ہوا، تو سید

Marfat.com

صاحب نے بھی اس کے خلاف احتجاج کیا اور معارف کے ذریعہ اعلان فرمایا کہ مخالفت اور دشمنی کی اسپرٹ سے نہیں بلکہ اپنے صحیح حق کو حاصل کرنے اور ملک میں اپنی پوزیشن حاصل کرنے کے لئے اردو زبان سے قطع نظر کرنا ہمارے لئے قطعاً محال ہے، پھر مسلمانوں نے جب کانگریسی وزارتوں کی واردھا سکیم کی مخالفت شروع کی تو سید صاحب نے اُن کو بے جا جوشِ عمل کے اظہار سے روکنے کی کوشش کی۔ اور یہ مشورہ دیا کہ اسلامی صوبوں کی وزارتیں، دارالقضا اور مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم وغیرہ کی تجویزوں پر غور کریں اور ان کو عمل میں لائیں تاکہ اس باب میں غیر اسلامی صوبے بھی اُن کے نقشِ قدم پر چل سکیں''۔ مگر افسوس کہ اسلامی صوبے اس کام کو اب تک انجام نہ دے سکے ہیں۔

سیرۃ النبیؐ جلد ششم :

۳۹ء میں اُن کی سیرۃ النبیؐ کی چھٹی جلد شائع ہوئی۔ اس میں اسلام کی اخلاقی تعلیمات کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ یہ سیرت کے سلسلہ کی بڑی اہم جلد ہے۔ یوں تو تمام جلدیں جدید علم کلام کی اساس ہیں۔

نقوشِ سلیمانی :

اسی سال اُن کی کتاب نقوشِ سلیمانی بھی شائع ہوئی۔ یہ ان خطبوں، تحریروں اور مقدموں کا مجموعہ ہے جو اردو ادب و زبان سے متعلق اُن کے قلم سے نکلے۔ یہ گویا پچھلی چوتھائی صدی کی ادبی تحریکوں کا ایک مرقع ہے۔ اس لئے یونیورسٹیوں کے نصاب میں جلد داخل ہوگئی۔

سفرِ دکن :

۴۰ء کا آغاز ادبی اور علمی سفروں سے کیا۔ ۲۵ر جنوری کو وہ ندوۃ العلماء کے کام سے حیدرآباد دکن گئے۔ وہاں سے پونہ آئے اور دکن کالج میں ایک تقریر مسلمانوں کے

Marfat.com

تحفظ پر کی۔ اس میں مسلمانوں کو خود یہ تجزیہ کرنے کو کہا کہ اسلامی کلچر کو وہ اپنے ہاتھوں تباہ کر رہے ہیں یا اُس کو غیر برباد کر رہے ہیں۔ پونہ سے بمبئی آئے، وہاں کے اسمٰعیل کالج کی مسجد میں جمعہ کی نماز کے بعد ایک تقریر کی، جس میں فرمایا کہ دنیا کی قوموں نے جب کبھی ترقی کی ہے، تو اُس کی قوت پرواز کے دو ہی پر ہوتے ہیں، ایمان اور عمل۔ ہمارے نوجوان ان دونوں سے بے پروا ہو کر ترقی کا خواب نہیں دیکھ سکتے۔ اسماعیل کالج کے ہال میں ایک دوسری تقریر دکن اور گجرات میں اردو زبان کی تاریخ پر کی۔

سفرِ سرحد و پنجاب :

اس سفر سے واپسی کے بعد ابھی تھکان بھی دور نہیں ہوئی تھی کہ پشاور، بہاولپور اور لاہور کا سفر کرنا پڑا۔ اسلامیہ کالج پشاور کے سامنے ایک تجویز یہ تھی اس میں ایک ایسا شعبہ کھولا جائے، جس میں بعض پڑھے لکھے نوجوانوں کو مختصر عربی، دینیات اور طب کی تعلیم دی جائے، جو گاؤں میں پھیل کر اپنی روزی بھی کمائیں اور مسلمانوں کی مذہبی خدمت بھی کریں۔ اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے سید صاحب مدعو کئے گئے۔ وہاں پہنچ کر مجوزہ نصاب کی ترتیب دینے کے علاوہ مختلف عنوانات پر کئی تقریریں کیں، جن میں وہاں کے نوجوانوں کو یہ تلقین کی کہ وہ مسلمانوں کے اکثریت کے صوبے میں رہنے والے کی حیثیت سے اپنے کو ایمان و عمل میں اتنا ممتاز بنالیں کہ سارے ہندوستان کے مسلمان اُن کے پیچھے چلیں۔ پشاور سے لاہور آئے۔ یہاں کے اصحابِ علم نے بڑی پذیرائی کی۔ مختلف دعوتوں میں علمی و قومی مسائل پر مبادلۂ خیال کرتے رہے، لاہور سے بہاولپور آ گئے، جہاں کی جامعہ عباسیہ ۱۹۲۵ء میں ندوۃ العلماء لکھنؤ ہی کے طرز پر قائم ہوئی تھی۔ یہاں کے وزیرِ تعلیم میجر شمس الدین اُس کے نصاب میں مزید اصلاح چاہتے تھے۔ سید صاحب نے پہنچ کر ضروری اصلاح کی۔ اس موقع پر وہاں کے صادق ایجرٹن کالج کی تقسیمِ اسناد کا جلسہ ہوا، تو خطبۂ اسناد سید صاحب ہی نے دیا۔ دوسرے دن رات کو اسی کالج کے ایک بہت بڑے

Marfat.com

جلسہ میں ''خصائص اسلامی'' پر ڈیڑھ گھنٹہ تک تقریر کی، پھر شہر کی جامع مسجد میں ''فضائل نبویؐ'' پر ایک وعظ میں مسلمانوں کو نسبتِ نبوی کے شرف کی بنا پر اشرف الامم ہونے کی حیثیت سے خیر الامم بننے کا شوق دلایا اور اولاد کو اسی رنگ میں تعلیم دینے کا مشورہ دیا۔

رحمتِ عالم :

اسی سال بچوں کے لئے ''رحمتِ عالمؐ'' لکھی، جس میں سلیس اور آسان زبان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ پاک ہے۔ گو یہ بچوں کے لئے لکھی گئی تھی، لیکن جوان اور بوڑھے سب اس سے مستفید ہو رہے ہیں۔

مسلم یونیورسٹی کی طرف سے اعزازی ڈگری :

۱۹۴۰ء کے نومبر میں ان کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی طرف سے ڈی، لٹ کی اعزازی ڈگری ملی۔ یہ گویا مسلم یونیورسٹی کی طرف سے اُن کے علمی و ادبی کمال کا اعتراف تھا لیکن اُن کے علمی فضائل اس رسمی ڈگری سے بہت بلند ہو چکے تھے۔ اس لئے انہوں نے اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر لکھنا پسند نہیں کیا۔ فرماتے تھے، جس وقت اس قسم کے اعزاز کی تلاش تھی، اس وقت یہ ملے نہیں، اب ان کی کوئی خواہش نہیں۔ اس لئے نام کے ساتھ ڈاکٹر لکھنے سے کیا فائدہ۔

روحانی انقلاب :

اسی سال ان میں ایک بڑا روحانی انقلاب پیدا ہوا۔ اب وہ اپنی زندگی کی اس منزل میں تھے، جب کہ ہندوستان کیا، بلکہ عالمِ اسلام کے ایک متبحر عالم، ایک بلند پایہ مفسر، ایک جلیل القدر متکلم، ایک دقیقہ سنج فقیہ، ایک بے مثل ادیب، ایک وسیع النظر مؤرخ، ایک اچھے سیاسی مفکر اور ایک زبان آور خطیب کی حیثیت سے مشہور ہو چکے تھے۔ اُن کی نجی زندگی بھی بڑی پاک و صاف رہی اور اُن کے نزدیک رہنے والوں کو یہ کہنے میں تامل نہ ہوتا کہ

Marfat.com

ع ماند حرم پاک ہے تو میری نظر میں

لیکن اپنی دینی عظمت اور علمی جلالت کا لحاظ کئے بغیر حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ العزیز کے آستانہ پر جا کر اپنا سر نیاز جھکا دیا۔ حضرت مولانا کو بھی علم وفن کے ایک شہباز اور گلستانِ رسالت کے ایک عندلیب خوشنوا کو اپنے سایۂ عاطفت میں لینے میں بڑی مسرت ہوئی۔ اس تعلق کے بعد سید صاحب کے لیل ونہار ہی بدل گئے۔ اگرچہ ان کی پوری زندگی دینداری اور پرہیزگاری میں گذری تھی، لیکن بادۂ طریقت سے سرشار ہونے کے بعد اُن کی دینداری میں تقویٰ اور تورع کا اور بھی زیادہ گہرا رنگ پیدا ہو گیا۔ عبادت و ریاضت بڑھ گئی۔ ذکر خفی کے ساتھ ذکر جلی بھی کرنے لگے، تقریر و خطابت نے وعظ و پند کی شکل اختیار کر لی، زیادہ وقت علمی مذاکروں کے بجائے رشد و ہدایت میں صرف ہونے لگا۔ اس انقلاب کے بعد اپنی تمام پرانی تحریریں پر نظر ثانی کی اور جس میں ذرا بھی جمہور اُمت سے اختلاف کا شائبہ یا خلاف احتیاط کوئی بات نظر آئی، اس سے رجوع کیا۔ چنانچہ ''رجوع و اعتراف'' کے عنوان سے جنوری ۱۹۴۳ء کے معارف میں ایک تحریر شائع کی، جس میں فرماتے ہیں کہ

''مذہبی مسائل کی تحقیقات میں میرا یہ عمل رہا ہے کہ عقائد میں سلفِ صالحین رحمہم اللہ تعالیٰ کے مسلک سے علیحدگی نہ ہو۔ البتہ فقہیات میں کسی ایک مجتہد کی تقلید بتمامہ نہیں ہو سکی، بلکہ اپنی بساط بھر دلائل کی تنقید کے بعد فقہاء کے کسی ایک مسلک کو ترجیح دی ہے، لیکن کبھی کوئی ایسی رائے نہیں اختیار کی جس کی تائید ائمہ حق میں سے کسی ایک نے بھی نہ کی ہو۔ خصوصیت کے ساتھ مسائل کی تشریح میں حافظ ابن تیمیہؒ، حافظ ابن قیمؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی تحقیقات پر اکثر اعتماد کیا ہے۔ ایسا بھی دو چار دفعہ ہوا کہ ایک تحقیق کے بعد دوسری تحقیق سامنے آئی ہے اور اپنی غلطی ظاہر ہوئی ہے تو بعد کے ایڈیشن میں اس کے مطابق تبدیل کر دی ہے۔ مثلاً معراج بحالتِ بیداری و

Marfat.com

تجسیم ہونے پر قرآن پاک سے صحیح استدلال مجھے نہیں مل سکا اور بعد کو اللہ نے مجھے اپنی توفیق سے صحیح دلیل سمجھا دی تو دوسرے ایڈیشن میں اس کو بڑھا کر مقام کی تصحیح کر دی۔ اسی طرح فنائے نار کے مسئلہ میں پہلے حافظ ابن تیمیہ اور ابن قیم کی پیروی میں کچھ لکھا گیا، بعد کو جمہور کی رائے کا اضافہ کر کے دونوں کے دلائل کی تشریح کر دی اور اب بحمد للہ کہ اس باب میں جمہور ہی کے مسلک کا حق ہونا سمجھ میں آ گیا ہے''۔

اسی طرح وہ پہلے تصویروں کے کھنچوانے کو جائز سمجھتے تھے اور زیوروں میں زکوۃ کے عدم وجوب کے قائل تھے، لیکن اس رجوع کے بعد جمہور علماء کا مسلک اختیار کیا۔ اس سلسلہ میں تحریر فرمایا:

''یہ باتیں کسی معترض کے خوف سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں اپنی ذمہ داری کو محسوس کر کے لکھ رہا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ بارالہا مجھے صراط مستقیم پر قائم رکھ اور جب کبھی تقاضائے بشری سے مجھ سے غلطی ہو تو مجھے متنبہ اور معاف فرما اور مسلمانوں کو اس کے شر سے محفوظ رکھ اور مجھے راہ صواب دکھا''۔

اس رجوع واعتراف کو اُن کے مرشد نے بہت پسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ اُن کو مرشد کی طرف سے خلافت بھی عطا ہوئی تھی، جس کے بعد وہ خاص خاص لوگوں کو بیعت بھی کرنے لگے تھے۔ جولائی ۱۹۴۳ء میں اُن کے مرشد کا وصال ہوا تو بڑے سوز ودرد اور غم کے ساتھ ''موت العالم موت العالم'' کے عنوان سے ماتم کیا۔ اُن کی رحلت کے بعد ان کی سوانح عمری لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے، لیکن یہ پورا نہ ہو سکا۔

اصلاحی کام:

جنوری ۱۹۴۱ء میں نواب صاحب چھتاری کی صدارت میں اسلام کے سیاسی اور اقتصادی نظام کی ترتیب کے لئے ایک مجلس بنائی گئی، جس کا پہلا اجلاس دارالعلوم ندوۃ

Marfat.com

العلماء میں ہوا۔اس کے ارکان سید صاحب کے علاوہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا شبیر احمد عثمانی اور ڈاکٹر ذاکر حسین بھی تھے۔اس میں یہ طے پایا کہ مستند علماء اور لائق جدید تعلیم یافتہ اہل علم کی باہمی معاونت سے پہلے اسلامی سیاست و اقتصاد پر ایک معتبر کتاب لکھی جائے اور پھر اُس میں اس حصہ کو الگ کیا جائے، جو موجودہ زمانہ میں اور نئے ہندوستان میں قابلِ عمل ہو۔اس تجویز کو عمل میں لانے کے لئے سید صاحب نے اپنے ایک ندوی عزیز سے ایک کتاب بھی لکھوائی۔آگے چل کر وہ معارف کے ذریعہ اس کی برابر تلقین فرماتے رہے کہ ''مسلمانوں کو اپنے اصولِ حکومت، اصولِ اقتصاد، اصولِ معاشرت، معاملات، قانون اور احکام کے متعلق یہ سوچنا نہیں ہے کہ اُن کی جگہ پر کیا ہو، کیونکہ اس کے معنی تو یہ ہیں کہ ان کا دین کیا ہو، بلکہ یہ سوچنا ہے کہ اُن کو کس طرح رائج کیا جائے اور نئی مشکلوں کے لئے اسلامی اصول کے مطابق کیا فیصلہ کیا جا سکتا ہے''۔(معارف جولائی ۱۹۴۶ء)

حیاتِ شبلیؒ :

دارالمصنفین کی تاسیس کے وقت ہی سے وہ اپنے اُستاد کو مختلف شکلوں میں خراجِ عقیدت پیش کر رہے تھے۔چنانچہ ۱۹۴۲ء تک مولانا شبلیؒ کے مختلف مضامین، خطبات اور مکتوبات کو جمع کر کے گیارہ جلدوں میں شائع کیا۔کثرتِ کار کی وجہ سے اُن کی صحت خراب رہنے لگی، تو اُن پر استاد کی اس وصیت کا خیال غالب رہنے لگا کہ ''جب تم اور دنیا کے کاموں سے فارغ ہونا تو تم ہی میری سوانح عمری لکھ دینا''۔

چنانچہ ۱۹۴۰ء میں اس کام کو شروع کر دیا اور تین برس کی جانکاہ محنت کے بعد فروری ۱۹۴۳ء میں ۸۴۶ صفحے کی ''حیاتِ شبلی'' لکھ کر اہلِ علم کے سامنے پیش کی۔یہ ضخیم کتاب ایک شخص کی سوانح عمری ہی نہیں بلکہ مسلمانانِ ہند کے پچاس برس کے علمی، ادبی، سیاسی، تعلیمی، مذہبی اور قومی واقعات کی تاریخ بھی ہے۔سید صاحب کی یہ آخری تصنیف

Marfat.com

ہے۔ سیرۃ النبیؐ کی ساتویں جلد کے صرف دو باب ہی لکھنے پائے تھے کہ جہان رنگ و بو سے رخصت ہو گئے۔ اُن کی رحلت کے بعد اردو زبان کے دیرینہ خدمت گذار اور ممتاز ترین ادیب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی مدظلہ العالی نے اُن کے علمی و ادبی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے تحریر فرمایا :

''چھوٹی بڑی، نئی پرانی، دینی، علمی، ادبی، درجنوں کتابوں کے مصنف اور بے شمار مقالات کے راقم کو کوئی اردو خواں بھلانا چاہے تو بھی کیسے بھلا سکتا ہے۔ اپنی چالیس سالہ تصنیفی زندگی میں ادب صالح سے اردو کے ذخیرہ کو جتنا مالا مال اس مرنے والے نے کیا ہے، اس سے بڑھ کر اور کون کر سکا ہے''۔

ہسٹاریکل کانگریس کی صدارت :

۴۴ء کا زیادہ تر حصہ صحت کی خرابی میں گذرا، لیکن اس سال کے آخر میں انڈین ہسٹاریکل کانگریس کی طرف سے شعبۂ تاریخ ہند از منۂ وسطیٰ کی صدارت کا دعوت نامہ پہنچا تو اُن کے بعض علمی جذبات اُبھر آئے۔ اُن کو عرصہ سے اس بات کا دکھ تھا کہ غیر مسلم اہل قلم ہندوستان کے اسلامی عہد کو بدنام کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، چنانچہ اس تلخ حقیقت کے اظہار کے لئے یہ صدارت قبول کر لی، کیونکہ اس کے اظہار کا اور کوئی بہتر موقع نہیں ہو سکتا تھا۔ اپنی خرابی صحت کے باوجود مدراس کا لمبا سفر کیا اور اپنے خطبہ میں جس حقیقت کا اظہار کیا، اس کو کانفرنس کے سمجھدار لوگوں نے اچھی طرح سمجھا۔

تبلیغی تقریریں :

اسی سفر میں مدراس کے دوسرے مقامات میں بھی اُن کی تقریریں ہوئیں۔ ویلور وشارام میں تقریر کا عنوان ''ملتِ محمدیہ کی حقیقت'' اور دارالسلام عمر آباد میں ''عبدیت'' تھا۔ دارالسلام کی مسجد میں دو روز صبح کے وقت قرآن پاک کے درس بھی دیئے۔ پریم پٹ میں بھی فجر کی نماز کے بعد ایک مسجد میں درس ہوا۔ مدراس سے بمبئی تشریف لے گئے تو

Marfat.com

وہاں کی جمعیۃ العلماء کی دعوت پر سورۃ الحمد کی تفسیر کے ضمن میں مسلمانوں کے حال پر تبصرہ فرمایا، پھر شہر کی انجمن اسلام ہال میں ''اردو'' اور صابو صدیق ہال میں ''ہندوستان میں علوم عربی کی خدمت'' اور ایک مخصوص مجمع میں توبہ وانابت کے صحیح طریقے پر تقریریں کیں۔ بمبئی سے حیدرآباد کا رخ کیا۔ وہاں ندوۃ العلماء کی مالی امداد کا کام کرتے رہے۔

سفرِ واردھا :

حیدرآباد ہی میں تھے کہ گاندھی جی نے اپنے ہاتھ سے اردو میں سید صاحب کو ایک خط لکھ کر قومی زبان کے مسئلہ میں مشورہ کے لئے واردھا بلایا۔ چنانچہ حیدرآباد سے واپسی میں واردھا اتر گئے اور وہاں جو جلسہ ہوا، تو گاندھی جی کے سامنے اپنی تقریر میں ایک ملکی زبان کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے فرمایا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی زبان میں اسی حد تک فرق ہونا چاہئے، جس حد تک ان کے مذہبوں اور تمدنوں میں فرق ہے۔ اس لئے جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، ان کی مذہبی وتمدنی اصطلاحوں اور لفظوں کا ماخذ عربی، فارسی اور ترکی ہونے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں اور ایسی ہی اجازت ہندوؤں کو بھی ان کے مذہبی اور تمدنی خصوصیات کے لئے ہونی چاہئے۔ اس کے بعد لفظوں کی صحت کا مدار لغت کی کتابوں کے بجائے بازار کے چلن اور عوام کے رواج پر ہونا چاہئے اور اس وقت ہماری زبان میں عربی، فارسی اور ہندی، سنسکرت اور انگریزی کا جو لفظ جس صورت میں بولا جاتا ہے، اسی کو برقرار رکھنا چاہئے، اس قسم کے خیالات وہ ۳۷ء سے پیش کر رہے تھے۔

چنانچہ ۳۷ء کے اگست میں جب راجندر عبدالحق پیکٹ ہوا تھا تو اس میں یہی طے ہوا تھا کہ ہندوستان میں جو سرکاری زبان ہو، وہ اردو اور ناگری دونوں رسم الخط میں لکھی جانی چاہئے اور اس زبان میں الفاظ کے انتخاب کا یہ معیار ہو کہ ان کا عام بول چال میں کس حد تک رواج ہے۔ اسی پیکٹ کے بعد حکومتِ بہار نے ایک ہندوستانی کمیٹی مقرر کی تھی، جس کے ایک ممبر سید صاحب بھی تھے، لیکن بہار اور واردھا دونوں مشترکہ قومی زبان کا مسئلہ

Marfat.com

حل نہ کر سکے اور یہ سیاست کے سیلاب کے تیز دھارے میں بہہ گیا۔

راندیر اور سورت کا سفر :

سید صاحب کا مدراس، بمبئی، حیدرآباد اور واردھا کا سفر دسمبر ۴۴ء میں شروع ہوا تھا اور اپریل ۴۵ء میں ختم ہوا۔ اُن کی صحت برابر گرتی جا رہی تھی، پھر بھی اُن کے عقیدتمندوں کا اصرار ہر جگہ سے ہوتا کہ وہ اپنے قدوم لزوم میمنت سے اُن کے علمی جلسوں اور تعلیمی کاشانوں کو شرف بخشیں۔ ان کو بھی اپنے دینی اور علمی مشن کو جلد از جلد تکمیل کرنے کی دھن ایسی تھی کہ دور دراز مقامات کا سفر کرنے میں اپنی خرابی صحت کا خیال مطلق نہ کرتے، چنانچہ جولائی ۴۵ء میں راندیر کے جامعہ حسینیہ اور مدرسہ اشرفیہ کی دعوت پر وہاں تشریف لے گئے اور جامعہ حسینیہ میں ''الجید الجہاد لعلمی المعاش والمعاد'' کے عنوان سے ایک تقریر کی اور مدرسہ اشرفیہ میں ''خشیت الٰہی'' پر خطبہ دیا۔ اسی سفر میں کچھ دنوں بمبئی اور سورت میں بھی مقیم رہے۔

شدید علالت :

اعظم گڑھ واپس آئے تو حوائی قلب میں ریاحی درد کا سخت دورہ پڑا اور حالت بہت ہی نازک ہوگئی۔ شفا ہوئی تو اطبا نے دماغی اور علمی کام چھوڑ دینے کا مشورہ دیا، لیکن عمر بھر کی لگی ہوئی عادت کا چھوٹ جانا مشکل تھا۔ اس لئے معارف کے صرف شذرات اور ہلکے پھلکے مضامین ہی لکھنے پر اکتفا کیا۔ معارف کے شذرات کے ذریعہ مسلمانوں کو دینی اور ملی احیاء کی تلقین فرماتے رہے اور اُن کو ''تہند'' اور ''تفرنج'' دونوں کے خطرات سے آگاہ کیا۔

ندوہ میں قیام کی تجویز :

صحت کی خرابی کے بعد اُن کا ارادہ تھا کہ ندوۃ العلماء لکھنؤ میں مستقل قیام کر کے اس کی تعلیمی و مالی حالت درست کریں۔ وہ تقریباً چالیس سال تک ندوہ کے معتمد تعلیمات

Marfat.com

رہے اور اعظم گڑھ سے ندوہ برابر آتے جاتے رہے اور وہاں کے ہر معاملہ کو اپنا ذاتی معاملہ سمجھ کر نپٹانے کی کوشش کرتے۔ کبھی اساتذہ کی باہمی کشمکش کو دور کرتے، کبھی اس کی مالی اصلاح کے لئے طرح طرح کی تجویزوں کو عمل میں لاتے، کبھی معلّم بن کر درس و تدریس کا سلسلہ قائم کرتے، وہاں کے طلبہ کا اعتراف ہے کہ وہ کسی درجہ میں صرف و نحو پر باتیں کرتے، تو معلوم ہوتا کہ سیبویہ اور زمخشری کی روح بول رہی ہے۔ ادبِ عربی کی فصاحت و بلاغت پر کچھ کہتے، تو اندازہ ہوتا کہ جاحظ اور جرجانی سامنے ہیں، ابوعلی سینا کی مشہور کتاب نجاۃ کبھی پڑھا دیتے تو طلبہ کی آنکھیں کھل جاتیں، اگر بخاری یا مسلم کے درس میں اپنے نکات بیان فرماتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ ساری عمر اسی فن کی تحصیل میں گذاری ہے، فقہ اور اصول میں بھی بڑی عقدہ کشائی کرتے۔

قیام بھوپال :

ندوۃ العلماء میں اُن کے مستقل قیام کی صورت ممکن نہ ہوسکی۔ اسی اثناء میں نواب حمید اللہ خان والیٔ بھوپال نے اُن کو دعوت دی کہ وہ ریاست کے دارالقضاۃ اور عربی مدارس کو اپنی نگرانی میں لے کر خالص مذہبی اور شرعی رنگ میں کر دیں۔ ۳۹۔۱۹۴۰ء میں نواب صاحب موصوف نے ریاست کے عربی مدارس کے انحطاط و تنزل سے متاثر ہوکر سید صاحب کی صدارت میں ماہرینِ تعلیم کی ایک مجلس مقرر کی تھی، جس نے ان مدارس کے لئے ایک نیا نصاب تیار کیا اور اُن کی اصلاح و تنظیم کے لئے ضوابط بنائے۔ اس خاکہ کو عملی صورت میں لانے کے لئے نواب صاحب سید صاحب کو بھوپال برسوں سے مدعو کر رہے تھے۔ بقول جناب شعیب صاحب قریشی "قاضی ریاست کا عہدہ تو اُن کو اپنی طرف متوجہ نہ کرسکا، لیکن عربی تعلیم کی اصلاح و ترقی کے موقع کو وہ انکار نہ کرسکے"۔

چنانچہ جون ۱۹۴۶ء میں وہ بھوپال کے قاضی القضاۃ اور جامعہ شرقیہ کے امیر کے عہدہ پر مامور ہوئے، لیکن دارالمصنفین اور ندوۃ العلماء سے تعلقات بدستور سابق قائم

Marfat.com

رہے، جس مقصد کے لئے بھوپال تشریف لے گئے تھے، اس کی تکمیل کے لئے وہاں اکتوبر ۴۹ء تک قیام کیا، لیکن اگست ۴۷ء کے انقلاب کے بعد ریاست کے لیل ونہار ہی بدل گئے۔ اس اثناء میں وہ معارف کے لئے کوئی مستقل مضمون تو نہ لکھ سکے، لیکن وفیات کے عنوان سے اپنے معاصرین کی رحلت پر اپنے غمناک تاثرات کا اظہار کرتے رہے۔ وفیات لکھنا ان کا خاص فن ہوگیا تھا، چنانچہ اُن کے معاصر جناب عبدالماجد صاحب دریابادیؒ نے ایک موقع پر تحریر فرمایا کہ ''سید صاحب کا وہ معاصر خوش قسمت ہے، جو اُن کے سامنے وفات پا جائے اور اُن کی ماتم گساری کی دولت اس کے حصہ میں آئے''۔ کبھی کبھی معارف میں شذرات بھی لکھ دیتے۔ اُن کے آخری شذرات جو ۵۰ء کے معارف میں شائع ہوئے، جس کا آخری ٹکڑا یہ ہے :

> ''ہم ہندو مسلمانوں کے میل ملاپ اور میل جول پر دل سے یقین رکھتے ہیں لیکن یہ قطعاً ضروری نہیں سمجھتے کہ اس غرض کو دین دھرم کا فرق مٹا کر ہی حاصل کیا جا سکتا ہے، بلکہ ہندو ہندو اور مسلمان مسلمان رہ کر بھی اس غرض کو حاصل کر سکتے ہیں، جس کی مثالیں انگریزوں کی دی ہوئی تعلیم سے پہلے ہندوستان میں کثرت سے تھیں اور اب بھی ہیں''۔

یہ گویا ہندوستان والوں کے نام اُن کا آخری پیام تھا۔

عشقِ رسولؐ :

۴۹ء کے اکتوبر میں وہ اپنی اہلیہ اور صاحبزادے سلمان سلمہٗ کے ساتھ حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے، جس جہاز سے وہ روانہ ہوئے اس کے امیر بنائے گئے اور حجاز پہنچ کر شاہ ابن سعود کے مہمان خاص رہے۔ ابن سعود نے کئی بار اُن کو اپنے ساتھ کھانے پر مدعو کیا۔ حج کے بعد مدینہ منورہ میں ایک مہینہ قیام فرمایا۔ بارگاہ نبوی میں رسول اکرم ﷺ کے سوانح نگار نے اپنے درد و عشق، عقیدت و محبت، عجز و نیاز، کیف و سرور کا اظہار

Marfat.com

ایک نعتیہ غزل میں کیا، جس کے چند اشعار یہ ہیں :

مکی ، مدنی ہاشمی و مطلبی ہے
آدم کے لئے فخر یہ عالی نسبی ہے
پاکیزہ تر از عرش و سماء جنت و فردوس
آرامگہِ پاکِ رسولِ عربی ہے
آہستہ قدم ، نیچی نگہ ، پست ہو آواز
خوابیدہ یہاں روحِ رسولِ عربی ہے
بجھ جائے تری چھینٹوں سے اے ابرکرم آج
جو آگ میرے سینہ میں مدت سے دبی ہے

مدینہ منورہ میں عالم اسلام کے علماء کا جب کوئی چھوٹا بڑا اجتماع ہوتا تو اس میں وہ بھی مدعو کئے جاتے اور ہندی زائرینِ حج کا بیان ہے کہ وہ تقریر یا گفتگو کرتے تو سب میں ممتاز نظر آتے۔

حج سے دسمبر ۱۹۴۹ء میں واپس ہوئے تو بمبئی پہنچ کر سخت علیل ہو گئے۔ وہاں اعظم گڑھ کے سیٹھ عبدالعزیز انصاری صاحب نے بڑے اخلاق و محبت و فیاضی سے اُن کی تیمار داری کی۔ شفا پائی تو جنوری کے وسط میں بھوپال آئے۔ وہاں سے اپریل کے آخر میں اپنا تعلق ختم کر دیا۔ اہل و عیال کو لے کر اپنے منجھلے داماد کے یہاں کانپور آ گئے۔ وہاں سے لکھنؤ ہوتے ہوئے مئی میں اعظم گڑھ آئے۔ بھوپال سے کئی بار اعظم گڑھ آتے جاتے رہے، لیکن اس مرتبہ کی آمد سے رفقاء دارالمصنفین خوش تھے کہ وہ پھر مستقل قیام کے لئے یہاں آجائیں گے اور وہی اگلی رونق اور چہل پہل قائم ہو جائے گی۔ ان کو مکمل راحت اور سکون کی بھی ضرورت تھی۔

ہجرت :

لیکن کارکنانِ قضا و قدر نے ان کو مسلمانوں کی ایک نوزائیدہ سلطنت کی آخری

Marfat.com

خدمت کے لئے جون ۵۰ء میں کراچی پہنچا دیا۔ وہ کراچی گئے تو ہندوستان میں اپنی ساری چیزیں اور ساری املاک چھوڑ کر گئے۔ اس ہجرت سے اُن کو شدید مالی نقصان پہنچے۔ رحمۃ للعالمین ﷺ کے سیرت نگار کو رب العالمین نے سب کچھ عطا فرمایا تھا۔ ایک ہجرت کی سعادت باقی تھی، وہ بھی پوری ہوگئی۔ رسول اکرم ﷺ کے سوانح نگار کو اپنے محبوب رسول کی طرح مہاجر ہی بن کر اپنی زندگی کا خاتمہ بالخیر کرنا تھا۔ وہ پاکستان کے شہری بن گئے، تو ۵۱ء میں معارف پر سے نہایت دکھ کے ساتھ بعض مجبوریوں کی بنا پر ان کا اسم گرامی ہٹانا پڑا، جو اس کے سرورق پر دُرِ آبدار کی طرح ۱۹۱۶ء سے چمکتا رہا تھا، لیکن معارف پر اُن کا نام رہے یا نہ رہے، یہ اُن ہی کی یادگار ہے۔ اس علمی رسالہ نے ملک کا جو بلند پایہ علمی ذوق بنایا اور مضمون نگاروں کو تحقیق و تلاش اور دقت نظر سے مضامین لکھنے کا جو سلیقہ سکھایا، پھر مستشرقین یا گمراہ مسلمان اہل قلم نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جب کبھی زہر اگلا، اس کے خلاف اس میں جو تریاق پیش ہوا، وہ سب معارف ہی کے فیوض ہیں، اگر وہ کوئی اور علمی کام نہ بھی کرتے تو صرف معارف کی ادارت ہی اُن کو زندہ جاوید رکھنے کے لئے کافی تھی۔

اب وہ دارالمصنفین کے ناظم بھی نہیں رہ گئے تھے اور یہ اس ادارہ کی زندگی کی سب سے بڑی ٹریجیڈی تھی کہ وہ اپنی زندگی ہی میں اس سے علیحدہ ہوگئے۔ گو وہ اس پر خوش تھے کہ اپنی زندگی ہی میں موت کے بعد اس کا نقشہ دیکھ لیا، لیکن درحقیقت اس کے جریدہ پر ان ہی کا دوام ثبت ہے۔ سید سلیمان ہی دارالمصنفین ہیں اور دارالمصنفین سید سلیمان ہے۔ ایک اسم کے دو مسمیٰ اور ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ وہ ہندوستان میں علوم وفنون کا ایک تاج محل بنا کر پاکستان چلے گئے۔ اُن کے بعد جب کوئی علمی سیاح اس تاج محل کو دیکھنے آتا، تو اس کو دیکھتا تو ضرور، لیکن اُن کی عدم موجودگی میں اس تاج کو چودھویں رات کی چاندنی میں دیکھنے سے محروم رہتا۔

Marfat.com

اہل پاکستان کی مسرت :

جب سید صاحب پاکستان کے باضابطہ شہری بن گئے، تو وہاں کے خواص و عوام کو بڑی خوشی تھی کہ رسول اکرم ﷺ کا سیرت نگار اور عالم اسلام کا ایک متبحر عالم اُن کی مملکت کا باشندہ ہو گیا ہے۔ حکومت پاکستان نے دستور بنانے کے سلسلہ میں ادارۂ تعلیماتِ اسلام کے نام سے علماء کا ایک بورڈ قائم کیا تھا۔ سید صاحب کو اس کی صدارت ڈیڑھ ہزار ماہانہ پر پیش کی گئی، لیکن انہوں اس کو قبول کرنے سے انکار کیا اور رضا کارانہ طور پر وہاں کے مذہبی، قومی، تعلیمی اور علمی کاموں میں لگ گئے۔

۵۰ء کے نومبر میں انجمن ترقی اردو پاکستان نے اُن کے اعزاز میں ایک علمی جلسہ کیا، جس کی صدارت ڈاکٹر محمود حسین وزیر مرکزی کابینہ نے کی اور سید صاحب نے اپنا ایک مقالہ ''ہندوستان کے نومسلم حکمران'' پڑھا، لیکن اُن کے پاکستان جانے کی جو اصلی غایت تھی، اس کو اس عاجز راقم کو ایک مکتوب لکھ کر اس طرح ظاہر فرمایا :

''یہاں اصلی کام دین کی خدمت اور حکومت اور اصحابِ اقتدار کو ادھر متوجہ کرنا ہے، مسلمانوں سے اس کی اشاعت اور علوم دین کی حفاظت کا کام مقدم ہے''۔

ان ہی باتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے وہ اربابِ حکومت سے ملتے اور موقع بہ موقع اُن کو تلقین کرتے رہے، پھر اس خیال سے اپنی قیامگاہ کے قریب ہی زیر تعمیر جامع مسجد میں قرآن پاک کا درس دینا شروع کیا۔ اس جامع مسجد کا نام انہی کے نام پر جامع سلیمانی رکھا گیا۔ اس درس میں شرکاء کی تعداد اتنی بڑھی کہ لاؤڈ سپیکر لگانے کی ضرورت ہوئی۔ اس مسجد کے چاروں طرف درس و تبلیغ کے کمرے ایک کتب خانہ اور ایک علمی ادارہ بھی بنانے کا خیال تھا، لیکن یہ اُن کی زندگی میں پورا نہ ہو سکا۔

سلہٹ جمعیۃ العلماء کی صدارت :

جمعیۃ العلماءِ اسلام کی دعوت پر جنوری ۵۱ء ڈھاکہ، چاٹگام اور سلہٹ کا ایک

Marfat.com

دورہ بھی کیا۔ سلہٹ کے جمعیۃ العلماء اسلام کے ایک جلسہ میں ایک پرمغز صدارتی خطبہ بھی دیا، جس میں مذہبی اور دینی خدمت کی ترغیب دینے کے علاوہ پاکستان کی اقلیتوں سے فیاضانہ سلوک کرنے کی بھی نصیحت کی۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

"میں نے جب کبھی پاکستان میں غیر مسلم اقلیت پر کسی زیادتی کا حال سنا، تو بحیثیت مسلمان کے اس پر شرمندگی محسوس کی۔ مسلمانوں کا فرض ہے کہ خواہ کسی دوسرے ملک میں اُن کے ہم مذہبوں پر جو کچھ گذرے، مگر وہ اپنے ملک کی اقلیت کی پوری پوری حفاظت کریں اور اسی طرح دوسرے ملک میں وہ اپنے بھائیوں کی مدد کر سکتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا جو کوئی غیر مسلم اقلیت (معاہد) پر ظلم کرے گا تو قیامت کے دن خدا کے سامنے اس کا دامن پکڑوں گا، اور یہ بھی فرمایا کہ جو اس پر ظلم کرے گا، وہ جنت کی خوشبو نہ سونگھے گا۔ اس سے اندازہ لگانا چاہئے کہ ایک مسلمان پر غیر مسلم اقلیت کی جان و مال، عزت و آبرو کا خیال رکھنا کتنا بڑا فرض ہے"۔

تعلیمی وقومی سرگرمیاں:

وہاں سے واپسی کے بعد موتمر اسلامی کا جلسہ تھا، جس میں انہوں نے شرکت فرمائی۔ اس کے بعد ہی ٹانڈو میں ایک دینی درسگاہ قائم ہوئی، تو اُس کی تاسیس میں پورا حصہ لیا اور اس کے سرپرست مقرر ہوئے۔ اسی سال پنجاب یونیورسٹی کا ایک کمیشن مقرر ہوا، تو اُس کے ممبر بنائے گئے۔ نومبر ۵۱ء ملتان میں ایک تبلیغی جلسہ ہوا، تو اس میں شرکت کی، پھر قائداعظم کی یادگار میں ایک مجوزہ دارالعلوم کی جو کمیٹی بنی، اس کے بھی رکن ہوئے، اور اس کے لئے لاہور، ملتان اور راولپنڈی کا سفر کیا۔ دستور ساز اسمبلی کے بنیادی حقوق کی سب کمیٹی کے بھی ممبر مقرر کئے گئے۔ اس کمیٹی میں ان کا سب سے بڑا کام یہ ہوا کہ اس کے ارکان کو قرآن وسنت کے اتباع کی اہمیت یہ واضح کر کے بتائی کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے اُمت کو کتاب اور سنت کی جو دو نعمتیں عنایت فرمائیں، ہدایت الٰہی انہی دونوں کے اندر مضمر

Marfat.com

ہے۔اب جو بھی ایک کو چھوڑ کر صرف دوسری پر قناعت کرے گا، وہ یقیناً گمراہ ہوگا اور وہ ضلالت کی خودکشی سے کبھی بچ نہیں سکتا۔سید صاحب نے اس نکتہ کی وضاحت بار بار کی، چنانچہ مذکورۂ بالا کمیٹی کے ممبروں کی سمجھ میں یہ بات اچھی طرح آ گئی اور انہوں نے اپنی رپورٹ میں یہ دفعہ رکھی کہ کوئی ایسا قانون نہ بنایا جائے گا، جو قرآن پاک اور سنت کے خلاف ہو۔

فروری ۵۲ء میں انہوں نے اسلام کے تمام علماء کو کراچی میں مدعو کیا۔یہ کانفرنس احتفال علماء اسلام کے نام سے منعقد ہوئی۔اس کی کامیابی کے متعلق اپنے ایک مکتوب میں عاجز راقم کو تحریر فرماتے ہیں:

''احتفال علمائے اسلام کی مشغولیت کے سبب سے جواب نہ دے سکا۔احتفال کامیاب رہا۔گو جامعہ ازہر کے علماء کی شرکت نہ ہوسکی۔تاہم مختلف ملکوں کے علماء یکجا ہو گئے۔خصوصاً ایران اور نجف کے علماء کی آمد سے سُنّی اور شیعہ علماء کے درمیان توافق بحمد للہ پیدا ہوا،اور ہم آہنگی ہوگئی''۔

مارچ ۵۲ء میں لاہور میں پاکستان ہسٹاریکل کانفرنس کے شعبۂ اسلامی تاریخ کی صدارت کی اور اس میں ایک مقالہ بھی ''دیبل'' کے عنوان سے پیش کیا،وہاں عربی زبان وادب کی بھی ایک کانفرنس ہوئی،اس کی بھی صدارت انہوں نے فرمائی،پھر اسی مہینہ پنجاب یونیورسٹی میں اُن کا ایک توسیعی لیکچر بھی ہوا۔

اسی سال عرب ممالک کی سب سے بڑی علمی اکیڈمی مجمع الفواد الاول نے اُن کو اپنا رکن بنایا۔ابوعلی سینا کی ہزار سالہ جوبلی کے موقع پر حکومتِ عراق نے ان کو اپنے یہاں مدعو کیا،لیکن اس میں شرکت نہ فرما سکے۔

اپریل ۵۲ء کا پورا مہینہ ملتان اور راولپنڈی میں گذارا۔یہاں عربی مدارس کے سالانہ جلسے ہوتے رہے۔ان کی تنظیم کے لئے مفید مشورے دیے۔ملتان کو قائداعظم کے

Marfat.com

مجوزہ دار العلوم کے لئے پسند فرمایا۔

کراچی یونیورسٹی قائم ہوئی تو اس کے سینٹ کے ممبر نامزد کئے گئے۔ جناب لیاقت علی خان مرحوم کی یاد میں حکومت نے پانچ لاکھ کے سرمایہ سے ایک کتب خانہ قائم کرنا چاہا تو اس کی تاسیس وتشکیل کی خدمت انہی کے سپرد ہوئی۔

ان کے ذریعہ پاکستان کے مذہبی وقومی کام تو انجام پا رہے تھے، لیکن خود ان کے لئے وہاں اب تک کوئی معاشی صورت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ ایک مکتوب میں اس راقم کو تحریر فرمایا کہ معاشی صورت پیدا کرنے کے لئے ارادہ ہے کہ وہی پیشہ قدیم کتب فروشی اختیار کیا جائے۔ چنانچہ مکتبۃ الشرق کے نام سے کتابوں کی ایک دوکان کھولی۔ پاکستان کے آئین کے سلسلہ میں وہاں کی حکومت نے ادارۂ تعلیمات اسلام قائم کیا تھا۔ اس کی صدارت ان کو برابر پیش کی جارہی تھی، لیکن وہ اس کو قبول کرنے سے انکار کرتے رہے، لیکن ہجرت کے تقریباً ستائیس مہینے کے بعد یہ عہدہ کچھ شرائط کے ساتھ قبول فرمایا، وہ اپنے ایک مکتوب مورخہ ۱۸/اگست ۵۲ء میں اس حقیر کو تحریر فرماتے ہیں کہ:

"یہ (یعنی عہدۂ صدارت ادارۂ تعلیمات اسلام) دو برس پہلے میرے سامنے پیش کیا گیا تھا، مگر میں نے بعض شروط رکھے تھے۔ وہ اب پورے ہو رہے ہیں، یعنی آئین کے ساتھ قانون رائج کرنے کی اصلاح کا کام اب شروع ہوا ہے، تو میں نے ۲/اگست کو قبول کر لیا تاکہ پورے مسودۂ آئین پر رائے دی جا سکے، گو آئین کا کام اب ختم ہو رہا ہے"۔

یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اپنے شرائط پر عہدہ قبول کیا تو کتنا الاؤنس لینا پسند فرمایا۔

۵۲ء کے آخر میں جمعیۃ العلماء اسلام کے صدر مقرر ہوئے اور اس نے پاکستان کے دستور کو اسلامی بنانے میں جو مساعی کی۔ اس میں اُن کا حصہ نمایاں رہا۔

۵۲ء کے مارچ میں پاکستان ہسٹاریکل کانفرنس کی صدارت کے لئے ڈھاکہ تشریف لے گئے۔ وہاں خطبۂ صدارت میں اردو اور بنگالی کے تنازع کے سلسلہ میں اپنے

Marfat.com

دردمندانہ خیالات کا اظہار کیا، جو وہاں کے ناعاقبت اندیش طلبہ کو پسند نہیں آئے۔ اس لئے جب کانفرنس کا اجلاس دوسرے روز شروع ہوا، تو انہوں نے ہنگامہ برپا کرنے کی کوشش کی، جس سے اجلاس کو ملتوی کرنا پڑا اور جب سید صاحب موٹر پر بیٹھ کر اپنی قیامگاہ کو واپس جانے لگے، تو شرارت پسند طلبہ نے اُن کی موٹر گھیر لی۔ ناروا الفاظ استعمال کیے اور تشدد پر آمادہ ہو کر اُن کی اہانت پر اُتر آئے، لیکن وہ اُن کی اہانت نہیں کر رہے تھے، بلکہ علم وحکمت، تحقیق وبصیرت، فکر وتدبر، عظمت وجلالت اور متانت ووقار کی تذلیل کر رہے تھے۔ مشرقی بنگال کے طلبہ کا یہ شرمناک رویہ اُن کی قومی زندگی پر ہمیشہ کے لئے ایک بدنما داغ بن کر رہے گا۔

یہ طوفان بدتمیزی ختم ہوا، تو ڈھاکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے سید صاحب کی قیامگاہ پر آ کر اظہارِ ندامت کیا اور معافی مانگی، لیکن اُن کی ذات والا صفات ان رسمی باتوں سے بہت ہی بلند تھی۔ ڈھاکہ سے کراچی واپس جانے لگے، تو ہندوستان میں اپنے منجھلے داماد جناب سید حسین صاحب ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ فتح پور ہنسوا کے یہاں آ کر ٹھہرے۔ یہیں دارالمصنفین کا ایک چھوٹا سا قافلہ سراپا محبت بن کر ان کی قدم بوسی کے لئے حاضر ہوا۔ وہ اپنے کفش برداران کو دیکھ کر بیحد مسرور ہوئے۔ بڑے لطف ومحبت سے پیش آئے اور وعدہ فرمایا کہ اس سال رمضان المبارک کے بعد دو مہینے دارالمصنفین میں آ کر گذاریں گے، جس سے دارالمصنفین میں اُن کی روحانی اولادیں بہت خوش ہوئیں۔ اسی سفر میں دارالعلوم ندوہ کی مقناطیسی قوت نے اُن کو اپنی طرف کھینچا اور وہ فتح پور سے کھنچ کر ندوہ چلے گئے۔ وہاں کے طلبہ اپنے بچھڑے ہوئے باپ سے بڑے والہانہ انداز سے ملے اور وہ بھی اپنے مہجور فرزندوں سے مل کر اشکبار ہوئے۔ اُن کے اعزاز میں جمعیۃ الاصلاح کی طرف سے جمالیہ ہال میں ایک جلسہ ہوا، تو پورا بھر گیا، جب سید صاحب نے ہال کے زینہ پر قدم رکھا تو عمارت پر حسرت بھری نگاہ ڈالی اور درد بھری آواز میں یہ شعر پڑھا ......

Marfat.com

میں اپنے گھر میں آیا ہوں مگر انداز تو دیکھو
میں اپنے آپ کو مانند مہماں لے کے آیا ہوں

اس کے پڑھنے پر اُن کی طرح اور لوگوں کی بھی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ جلسہ کی کاروائی، تلاوت قرآنِ پاک سے شروع ہوئی۔ قاری نے شروع میں یہ آیت پڑھی

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيرُ قَالَ اَبُوْهُمْ اِنِّي لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ لَوْلَا اَنْ تُفَنِّدُوْنَ.

(یوسف)

(جب کہ قافلہ چلا تو ان کے باپ (یعنی حضرت یعقوبؑ) نے کہا کہ میں یوسف کی خوشبو پا رہا ہوں، اگر تم مجھ کو بے وقوف نہ بناؤ)

اس کو سُن کر تمام حاضرین متاثر ہوئے، خود سید صاحب ضبط نہ فرما سکے، بے اختیار اُن کی آنکھوں سے آنسوؤں کا تانتا بندھ گیا۔ ایک طالب علم نے عربی میں سپاسنامہ پڑھا، جس کے بعد سید صاحب نے بڑے درد بھرے انداز سے تقریر شروع کی۔ پوری تقریر سوز و درد کا مرقع تھی۔ اس میں پاکستان کی ہجرت کے اسباب بیان فرمائے اور آخر میں اپنے عزیز طلبہ کو یہ پیام دیا ....

سبق پھر پڑھ صداقت کا شجاعت کا عدالت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

ندوہ کے طلبہ کے نام ان کا یہ آخری پیام تھا، جو ان کی مادرِ درسگاہ کے ہر زمانہ کے طلبہ کے لئے باقی و جاری رہے گا۔

دارالمصنفین کے خدام رمضان المبارک کے بعد اعظم گڑھ اُن کی تشریف آوری کا انتظار کر رہے تھے کہ پہلے ایک خط میں مواقعِ سفر کے اسباب لکھے، پھر اپنی علالت کی اطلاع دی۔ آخری خط میں اُن کے رو بصحت ہونے کی بشارت تھی، لیکن ۱۴ ربیع الاول ۱۳۷۳ھ، مطابق نومبر ۱۹۵۳ء کو عشاء کے بعد یکایک ریڈیو سے خبر ملی کہ وہ اللہ کو پیارے

Marfat.com

ہوئے۔آہ! ......

ع عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

وہ ہم سے رخصت ہو گئے اور زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں:

رفتم و از رفتنِ من عالمے تاریک شد
من مگر شمعم چو رفتم بزم برہم ساختم

مگر عالمِ بالا میں اُن کو دیکھ کر فرشتے پکار رہے ہوں گے ....

ع جگہ خالی کرو مدّاح آتا ہے محمدؐ کا

☆☆☆☆☆

ماہنامہ القاسم کا اشاعتِ خاص

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نمبر

تالیف : مولانا عبدالقیوم حقانی

عالم اسلام کے عظیم رہنما، بین الاقوامی شہرت کے حامل، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی سیرت وسوانح، اخلاق واعمال، دعوت وتبلیغ، اتحادِ اُمت کی مساعی اور تصنیف وتالیف کا جامع اور مفصل تذکرہ ....

صفحات 600 .... قیمت : 240 روپے

القاسم اکیڈمی جامعہ ابوہریرہ برانچ پوسٹ آفس خالق آباد نوشہرہ

Marfat.com

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

مولانا سید سلیمان ندویؒ

مولانا سید سلیمان ندویؒ سے ہمارے خاندان کے ایسے گوناگوں تعلقات اور ایسے عزیزانہ روابط تھے کہ وہ کسی دور میں بھی ہم لوگوں کے لئے اجنبی اور نامانوس نہیں تھے۔ وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے نہ صرف تعلیم یافتہ اور فاضل بلکہ اس کے لئے سرمایۂ افتخار و نازش تھے۔ وہ میرے والد کے عزیز شاگرد اور بھائی صاحب کے ایسے دوست تھے، جو عمر میں بڑے اور فضیلت وشہرت میں بڑھے ہوئے تھے۔ ہماری درسگاہ کے ایک طرح کے مربی وسرپرست بھی تھے۔ میرے استاذ مولانا خلیل عرب صاحب کے ساتھ بھی ان کا تعلق کچھ ایسا ہی تھا کہ عرب صاحب کی طرف سے احترام کا معاملہ بھی تھا اور بے تکلفی ومزاح و ظرافت کا معمول بھی، عرب صاحب نے اس دور میں ندوہ میں تعلیم پائی تھی۔ جب سید صاحب وہاں کے اساتذہ میں شامل تھے، اگر عرب صاحب کو ان سے پڑھنے کی نوبت آئی بھی ہوگی، تو برائے نام، اس کے بعد جب دیکھا، دونوں کا ایک دوسرے کے ساتھ معاملہ خوش طبعی وبے تکلفی کا دیکھا۔ سید صاحب اپنے بے تکلف احباب میں بڑے ظریف، نکتہ سنج وسبک روح اور خوش مذاق تھے، لیکن ان کے مذاق میں بھی ایک علمی وادبی شان ہوتی تھی۔ عرب صاحب بھی باوجود اس کے کہ ان کا زیادہ تر سابقہ عربی سے تھا۔ اردو کا اچھا مذاق رکھتے تھے اور لکھنؤ میں طویل مدت گزارنے کی وجہ سے زبان کی باریکیوں اور مزاح و ظرافت کی نزاکتوں سے واقف تھے کہ ذرا سی بے احتیاطی سے مذاق کس طرح ابتذال اور

Marfat.com

خوش طبعی کس طرح اشتعال کے حدود میں داخل ہو جاتی ہے۔

سید صاحب کو اوّل اوّل قریب سے خواجہ سید رشید الدین مودودی مرحوم کی کوٹھی پر دیکھا، وہ جب لکھنؤ تشریف لاتے تھے، اکثر انہیں کی کوٹھی پر قیام کرتے تھے، خواجہ سید رشید الدین جو ''اچھے صاحب'' کے نام سے یاد کئے جاتے تھے، نواب سید نورالحسن خان مرحوم کے داماد تھے، اوران کے برادر خورد نواب سید علی حسن خان مرحوم ناظم ندوۃ العلماء ان کے برادر نسبتی تھے۔ اچھے صاحب کا بنگلہ نواب نورالحسن خان مرحوم کی کوٹھی (جو بھوپال ہاؤس کے نام سے معروف تھی) کے بغل میں تھا۔ ۲۳، ۲۴، ۲۵ء میں بھائی صاحب کا قیام جو اس وقت میڈیکل کالج لکھنؤ میں زیر تعلیم تھے۔ اسی کوٹھی پر رہتا تھا اور میں مہینوں ان کے ساتھ قیام کرتا تھا۔ میری عمر اس وقت ۱۱، ۱۲ سال کی تھی۔ سید صاحب جب اچھے صاحب کے یہاں تشریف لاتے تھے، تو ہم لوگ ان کو قریب سے دیکھتے تھے، لیکن اس وقت کی کوئی بات ذہن میں نہیں ہے۔

۲۶، ۲۷ء سے ہم لوگ بازار جھاؤلال منتقل ہوئے اور بھائی صاحب نے مطب شروع کیا، ہمارا اور عرب صاحب کا مکان آمنے سامنے تھا۔ اسی زمانہ میں میری عربی تعلیم عرب صاحب کے یہاں شروع ہوئی، اس دور میں سید صاحب اور مولانا مسعود علی صاحب بھائی صاحب یا عرب صاحب سے ملنے کبھی کبھی تشریف لاتے اور کچھ دیر صحبت رہتی۔ سید صاحب کا نقشہ اسی وقت سے آنکھوں میں ہے۔ سراپا وقار، متانت، قد میانہ مائل بہ پستی چہرہ سے معصومیت اور شرافت نمایاں، دیکھ کر دل شہادت دیتا تھا کہ ان میں دوسروں کو ایذا پہنچانے اور دل دکھانے کی صلاحیت ہی نہیں۔ لباس نہایت صاف ستھرا جس پر کہیں نکتہ چیں اور دوربیں کو بھی کوئی دھبہ یا شکن نظر نہ آئے، ہر چیز نفاست اور نستعلیقی پر دال، شیروانی کسی قدر لانبی، عمامہ سر پر نہایت سفید اور صاف اور اس کے پیچ نہایت خوبصورتی سے دیئے ہوئے فرمایا کرتے تھے کہ میں نے عمامہ کی عادت تمہارے والد کو دیکھ کر اختیار کی۔ آواز

Marfat.com

پست جو قرب کے باوجود بغیر قدر دانی اور شوق کے سنی نہ جا سکے۔ بالعموم کم گو اور بقدر ضرورت بولنے والے، آنکھوں سے حیا اور ذہانت کا اظہار کچھ نہاں کچھ آشکار، جب کہیں تشریف لاتے، مخالف اور موافق فضل وکمال کے معترف اور ان کے منکر دونوں احترام پر مجبور ہو جاتے۔ ہمارے استاذ خلیل عرب صاحب ان کے فضل وکمال کے کچھ زیادہ معتقد نہ تھے، بلکہ کسی حد تک ناقد، لیکن ان کو بھی ان کا ہمیشہ ہی احترام کرتے دیکھا۔

۲۹ء سے میرا دارالعلوم ندوۃ العلماء سے باقاعدہ استفادہ اور طالب علمی کا تعلق قائم ہوا۔ اس وقت سید صاحب دارالعلوم کے معتمد تعلیم تھے۔ ندوہ کے جلسۂ انتظامی کے علاوہ بھی تشریف لاتے اور کئی دن قیام کرتے، کبھی کبھی درجوں اور طلباء کے جلسوں میں بھی تشریف لے آتے۔ ایک مرتبہ طلباء کا عربی جلسہ ہو رہا تھا، جب میری تقریر کی باری آئی تو میں نے اپنی عادت کے مطابق حاضرین کو مخاطب کر کے بلا کسی خطبۂ مسنون کے تقریر شروع کر دی۔ سید صاحب نے ٹوکا اور وہ حدیث یاد دلائی جس میں فرمایا گیا ہے کہ جو تحریر و تقریر حمد وثنا سے شروع نہ کی جائے، وہ ناقص اور عیب دار ہے۔ میرے لئے بڑی دشواری پیش آئی کہ اسی وقت حمد وثنا کے مناسب الفاظ اور موضوع کی رعایت سے خطبہ پڑھوں، جس کے لئے میں نے تیاری نہیں کی تھی، میں کچھ دیر خاموش رہا اور پھر تقریر شروع کر دی۔ سید صاحب نے پھر ٹوکا، میں نے کہا کہ میں نے آہستہ سے پڑھ لیا ہے، سید صاحب مسکرائے اور فرمایا ''کذا قال الشارح، کذا قال الشارح''۔

ستمبر ۳۰ء میں علامہ تقی الدین ہلالی مراکشی دارالعلوم میں ادب عربی کے استاد اعلیٰ ہو کر آئے اور نہ صرف دارالعلوم میں بلکہ ایک طرح سے ہندوستان میں (جہاں تک عربی زبان کا تعلق ہے) ایک نئے دور کا آغاز ہوا، ہلالی صاحب نے غالباً ۳۱ء کے آخر میں ایک سفر مشرقی اضلاع بنارس، اعظم گڑھ، مؤ مبارک پور کا کیا۔ انہوں نے از راہ کرم و شفقت مجھے اپنی رفاقت اور معاونت کے لئے انتخاب فرمایا اور میں اس پورے سفر میں ایک

Marfat.com

خادم اور ترجمان کی حیثیت سے ان کے ساتھ رہا۔ رمضان کا زمانہ تھا اور دسمبر یا جنوری کا مہینہ، اس سفر میں کئی روز دارالمصنفین میں قیام رہا۔ یہ میری دارالمصنفین کی پہلی حاضری تھی۔ افطار تو سب ساتھ ہی کرتے تھے، البتہ سحری کے لئے ہم دونوں کو سید صاحب کے دولت کدہ پر جانا ہوتا تھا۔ دونوں یگانہ فاضلوں کو دیر تک علمی و ادبی گفتگو کرتے سنا، اسی سفر میں دارالعلوم سے ایک عربی رسالہ کے اجراء کا فیصلہ ہوا، جس کے نگراں و سرپرست سید صاحب اور ہلالی صاحب اور ایڈیٹر ہمارے دوست مولانا مسعود عالم صاحب ندوی منتخب ہوئے۔ یہ سید صاحب کے پرانے علمی و ادبی ذوق کی تجدید اور ایک عربی رسالہ نکالنے کے دیرینہ خواب کی تعبیر تھی۔ اس رسالہ کا پہلا شمارہ محرم ۱۳۵۱ھ رمئی ۱۹۳۲ء کو نکلا، اس کا افتتاحیہ سید صاحب نے لکھا اور خوب لکھا۔ یہ ان کی عربی انشا پردازی کا بہترین نمونہ ہے، کہیں سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ان کی عربی لکھنے کی مشق چھوٹی ہوئی ہے اور قلم کے مسافر کو ایک نئی وادی درپیش ہے۔ سید صاحب نے اس مضمون میں ہندوستان میں عربی صحافت کا مختصر جائزہ بھی لیا ہے اور اس کی ضرورت بھی بیان کی ہے۔ اس مضمون میں کہیں کہیں جسارت کی بے ساختگی، بے تکلف مسجع اور استعارات و تشبیہات کی ندرت ان کے پرانے عہد کی یاد تازہ کرتی تھی۔

اس کے بعد سید صاحب کو عربی نثر میں لکھنے کا اتفاق تو بہت کم ہوا، زیادہ تر ان کی نظمیں اور قصائد شائع ہوئے اور ان کے اردو کے بعض تحقیقی مضامین کے ترجمے، جو زیادہ تر مولانا مسعود عالم صاحب ندوی کے قلم سے ہوتے تھے۔ شائع ہوئے۔

سید صاحب سے قرب اور ان کی شفقتوں اور نوازشوں سے مستفید ہونے کا موقع دارالعلوم میں تدریسی تعلق کے بعد ہوا۔ اس انتخاب اور تقرر میں بھی مولانا مسعود علی صاحب ندوی کی تحریک اور سید صاحب کی تائید کو دخل تھا۔ میرا تقرر یکم اگست ۱۹۳۴ء کو بحیثیت استاد تفسیر و ادب ہوا۔ سید صاحب دارالعلوم تشریف لاتے۔ تعلیمی مشورے دیتے،

Marfat.com

درجوں میں تشریف لے آتے، اکثر خود ہی درس شروع کردیتے، بعض اوقات کئی کئی گھنٹے درس جاری رہتا اور طلبہ سے زیادہ ہم لوگوں کو استفادہ کا موقع ملتا' کئی کئی روز مہمان خانہ میں قیام رہتا۔ طلباء کم اور اساتذہ زیادہ حاضر باش اور مصروف استفادہ رہتے۔ سید صاحب کو طلبا کی اس بے توجہی اور ناقدری کا نہ صرف احساس بلکہ قلق بھی تھا۔ ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا کہ مولوی علی صاحب (سید صاحب اکثر مجھ سے خطاب اسی طرح کرتے تھے) طلباء میرے پاس آنے سے کیوں گھبراتے ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ آپ امتحان بہت لیتے ہیں۔ سید صاحب کا تدریسی ذوق آخری وقت تک نہیں گیا تھا۔ انہوں نے صرف ونحو کی تعلیم قدیم طریقے پر پائی تھی۔ (یہاں ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ ہم چند اساتذہ نے جن میں مولانا مسعود عالم صاحب ندوی، شیخ محمد العربی المراکشی خاص طور پر قابل ذکر ہیں، عربی زبان کی تعلیم کا دارالعلوم میں نیا تجربہ شروع کیا تھا، جس میں صرف ونحو کی صرف مشق کرائی جاتی تھی۔ قواعد واصطلاحات کا طلباء پر بار نہیں ڈالا جاتا تھا۔ ایک دن سید صاحبؒ درجہ اول میں تشریف لے آئے، جہاں اس جماعت کا سبق ہو رہا تھا اور مولانا مسعود عالم صاحب ندوی پڑھا رہے تھے۔ سید صاحب نے طلبا سے کسی لفظ کی تعلیل پوچھی، طلبا نے غالباً یہ لفظ بھی نہیں سنا تھا، وہ جواب نہیں دے سکے۔ سید صاحب نے مولوی مسعود عالم صاحب کی طرف دیکھا، انہوں نے کہا صرف کا گھنٹہ علی میاں کے پاس ہے۔ میری طلبی ہوئی، سید صاحب نے فرمایا کیوں صاحب! آپ نے ان طلبا کو تعلیل نہیں سکھائی۔ میں نے کہا تعلیل تو آسانی سے ان کو سکھائی جا سکتی ہے، مگر یہ ایک سوال کرتے ہیں، جس کا میرے پاس جواب نہیں۔ فرمایا کیا؟ میں نے عرض کیا کہ میں جب ان سے کہتا ہوں کہ قال اصل میں قول تھا، واؤ متحرک ماقبل اس کا مفتوح واؤ کو الف سے بدل دیا قال ہو گیا، تو سید صاحب پوچھتے ہیں کہ یہ کس زمانہ میں تھا اور عرب کب قال کے بجائے قول بولتے تھے، میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔ سید صاحب مسکرائے اور بات ختم ہوگئی) اور اس کی اہمیت اور

Marfat.com

اس کا ذوق ان پر آخر تک غالب رہا۔ ان کو لغت و اشتقاق سے بھی بہت دلچسپی تھی۔ ہر درجہ کے طالب علم سے اس کی استعداد اور سطح کے مطابق صرف ونحو اور لغت کے سوالات کرتے، عربی کا کوئی شعر پڑھتے اور مطلب پوچھتے، طلبا فطرتاً امتحان سے گھبراتے ہیں، پھر اچھے اچھے لوگ سید صاحب کی جرح کی تاب نہیں لا سکتے تھے۔ ان میں سے ایک بڑی تعداد سید صاحب کے مقام و مرتبہ سے ناآشنا بھی تھی، پھر سید صاحب کی مجلس کا وقت بالعموم اپنی ضروریات کے لئے بازار جانے یا کھیلنے کا ہوتا تھا، اس لئے طلباء ان کی مجلس میں بہت کم نظر آتے تھے۔ سید صاحب نے فرمایا کہ اچھا میں امتحان نہیں لیا کروں گا، تم طلبا کو سمجھا دو، میں نے طلبا کو ان زریں موقعوں سے فائدہ اٹھانے اور ان تاریخی مجلسوں کو غنیمت بلکہ نعمت سمجھنے کی ترغیب دی، کہنے سننے سے کچھ طلبا آئے بھی، لیکن بعض اوقات سید صاحب پر وہ پرانا ذوق غالب آ گیا اور انہوں نے پھر کوئی سوال کر دیا اور بعض اوقات طلبا کو ان مجلسوں میں اپنی دلچسپی کا کوئی سامان نظر نہ آیا اور ان کی تعداد میں کوئی نمایاں اضافہ نہ ہوا، اور سید صاحب کو اس کا قلق اور ہم لوگوں کو اس کی شرمندگی ہی رہی کہ طلبا نے گھر آئی ہوئی اس دولت اور اس ہمائے علم و ادب کے سایہ سے فائدہ نہ اٹھایا۔

سید صاحب کو سال میں کئی مرتبہ علی گڑھ کا سفر پیش آتا، وہ یونیورسٹی کورٹ کے ممبر بھی تھے۔ اساتذہ کے انتخاب کے لئے بھی بحیثیت ماہر خصوصی (EXPERT) ان کو بلایا جاتا۔ یونین بھی کبھی ان کو مدعو کرتی، دہلی اور مغربی، شمالی ہندوستان کے سفر بھی پیش آتے، ہر مرتبہ وہ آتے جاتے لکھنؤ ٹھہرتے اور کئی کئی روز ٹھہرتے، فرماتے کہیں جاؤ یا آؤ ندوہ پہنچ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنے گھر آ گئے۔ بالاستقلال بھی کئی کئی ہفتے قیام کرتے۔ اس دوران میں ہم چند اساتذہ کو انہوں نے فلسفۂ قدیم کی ایک کتاب پڑھانی شروع کی، جس کا سلسلہ کچھ زیادہ دن قائم نہیں رہا، لیکن فلسفۂ یونان کے متعلق بعض بنیادی حقائق معلوم ہوئے، جو بعد میں بہت کام آئے۔

Marfat.com

سید صاحب کے لئے علم کا معاملہ کسی پیشے یا ضرورت یا کسی مجبوری اور مصلحت کا معاملہ نہ تھا۔ علم ان کا گوشت پوست بن گیا تھا اور ان کے خون میں جاری وساری ہو گیا تھا۔ وہی ان کی غذا تھی، وہی ان کی تفریح اور وہی ان کا اوڑھنا بچھونا، اکثر دیکھا کہ ان کا تانگہ دارالعلوم کے پھاٹک میں داخل ہوا، اور جو پہلا شخص ملا، اس سے کہا فلاں فلاں استادوں کو خبر کر دو یا کتب خانہ سے فلاں فلاں کتاب لے آؤ، مہمان خانہ پہنچ کر شیروانی اتاری، ہاتھ منہ دھویا اور چائے کے انتظار میں بیٹھے، حدیث وفقہ کے استاذ آ گئے اور کسی علمی مسئلہ پر مذاکرہ شروع ہو گیا۔ کتب خانہ سے کتاب پہنچ گئی، اس کا مطالعہ شروع ہو گیا۔ اس میں کسی فن کی تخصیص نہ تھی، کبھی حدیث کا مسئلہ ہوتا، کبھی فقہ کا، کبھی کوئی تاریخی بحث ہوتی، کبھی تذکرے اور تراجم کی کوئی بات، جب تک قیام رہتا ان کی مجلسوں میں علمی مذاکرے اور بحث وتحقیق کے سوا کوئی موضوع نہ چھڑتا، کسی سیاسی شخص یا عمائد شہر میں سے کسی کے آ جانے سے کچھ موضوع بدل جاتا، لیکن اس کی جملہ معترضہ سے زیادہ حیثیت نہ ہوتی۔ البتہ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی یا مولانا مسعود علی صاحب ندوی اور مولانا عبدالباری صاحب ندوی کے آنے سے کچھ تفریحی گفتگو، گذشتہ دور کی یاد اور مشترک دلچسپی اور تعلقات کی باتیں ہونے لگتیں۔ بہت کم لوگوں کو اس کا علم ہو گا کہ سید صاحب ضلع جگت، لفظی رعایت اور نکتہ آفرینی میں بڑا کمال رکھتے تھے، ان کے اس ذوق نے ان کے بڑھے ہوئے وقار اور متانت اور سنجیدگی کو خشکی اور یبوست تک پہنچنے نہیں دیا تھا، یہ ذوق اس وقت خاص طور پر نمایاں ہوتا تھا، جب مولانا عبدالماجد صاحب جیسے خوش مذاق اور زبان کے اداشناس یا لکھنوی مذاق کے کوئی بزرگ تشریف لے آتے، بھائی صاحب مرحوم کے آنے سے یا مہتمم صاحب دارالعلوم کے تشریف رکھنے سے کچھ ندوہ اور دارالعلوم کے معاملات اور مسائل پر گفتگو ہوتی، لیکن اصل ذوق اور موضوع وہی تھا، جو طبیعت ثانیہ بن گیا تھا اور اس سے مفارقت شدید بیماری میں بھی گوارہ نہ تھی۔

Marfat.com

سید صاحب کی مجھ پر خصوصی شفقت اس وقت سے شروع ہوئی، جب اللہ تعالیٰ نے مجھے سیرت سید احمد شہیدؒ لکھنے کی توفیق عطا فرمائی، یہی وہ زمانہ تھا کہ سید صاحب کا ذوق وذہن مردہ نقوش سے اکتا کر، زندہ نقوش وصورت سے ہٹ کر، حقیقت اور خبر سے سیر ہو کر نظر کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ غالباً ۳۷ء کا آخر ۳۸ء کا آغاز تھا۔ ایک مرتبہ وہ لکھنؤ تشریف لائے اور ہمارے ہی مکان پر ایک دو روز قیام رہا۔ میں نے ان کی خدمت میں سیرت سید احمد شہید کا مسودہ پیش کیا۔ انہوں نے پورے مسودہ پر نظر ڈالی۔ اس میں جا بجا والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحئی صاحب کے سفر نامہ وروزنامچہ ارمغان احباب کے حوالے تھے۔ سید صاحب نے اصل کتاب کے جو اس وقت مصنف کے مسودہ کی شکل میں تھی، دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ مسودہ پیش کر دیا گیا، سید صاحب نے اس کی نقل کی فرمائش کی، جس کی تعمیل کی گئی۔ انہوں نے اس کو اپنے تعارفی کلمات کے ساتھ معارف میں بالاقساط ''دہلی اور اس کے اطراف'' کے عنوان سے شائع فرمایا، خود ہی اس پر ذیلی عنوان قائم کئے اور کتاب پر جا بجا اپنے قلم سے حواشی اور تشریحی نوٹ اضافہ فرمائے۔ (یہ سلسلہ جنوری ۱۹۳۹ء سے شروع ہو کر جون ۱۹۳۹ء تک چلتا رہا۔ بعد میں کتابی شکل میں ''دہلی اور اس کے اطراف انیسویں صدی میں'' کے نام سے کتب خانہ انجمن ترقی اردو جامع مسجد دہلی اور مکتبہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی طرف سے شائع ہوا)

اسی موقع پر میں نے ان سے سیرت پر مقدمہ لکھنے کی فرمائش کی، فرمایا کہ جب کتاب چھپ جائے تو بھیج دینا، میں اس پر کچھ لکھ دوں گا۔ ۱۹۳۸ء کے آخر یا ۱۹۳۹ء کے اوائل میں جب اس کی طباعت مکمل ہوئی تو میں نے اس کو کتابی شکل دے کر اُن کی خدمت میں بھیج دیا۔ سید صاحب کو جب یہ کتاب ملی، تو انہوں نے حسبِ ذیل مکتوب ارقام فرمایا، جو غالباً میرے نام اُن کا پہلا شفقت نامہ تھا۔ مکتوب بجنسہٖ درج ہے۔

Marfat.com

دارالمصنفین اعظم گڑھ

عزیزی رزقکم اللہ علماً نافعاً

کتاب ملی جا بجا سے پڑھی، بعض حصے تو بہت مؤثر ہیں۔ جن کو پڑھ کر آنکھیں پُر آب ہو گئیں۔ آپ کا انداز اور انشاء دلپذیر ہے۔ اللہ کرے حسن رقم اور زیادہ۔

آپ نے لکھنے کے لئے کیا چھوڑا، جو میں لکھوں، چاہتا ہوں کہ کتاب کی روح چند لفظوں میں کھینچ لوں، چند صفحے ہوئے ہیں، کچھ اور ہو جائیں تو بھیج دوں۔ تراجم علمائے حدیث کا دیباچہ آپ نے دیکھا ہے؟ اسی پرداز پر ہوگا۔

ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں سلام کہئے، علی گڑھ کی کامیابی پر مبارکباد۔ (یونیورسٹی کی طرف سے اعلان ہوا تھا کہ بی اے کے طلباء کے لئے دینیات کی ایک کتاب مطلوب ہے، جس میں عقائد' اصولِ دین، سیرت طیبہ اور ضروری مسائل آجائیں۔ راقم سطور نے بھی اس کے لئے پیش کش کی تھی، جو منظور ہوئی۔ کتاب پسند کی گئی اور اس پر معاوضہ عطا ہوا۔ سید صاحب کا اشارہ اسی کامیابی کی طرف ہے)

والسلام

سید سلیمان (۱۳ر فروری ۱۹۳۹ء)

سید صاحب نے مقدمہ لکھا اور دل کھول کر لکھا۔ ان کی اس تحریر میں بڑی دلآویزی، آمد اور ادبیت ہے اور غالباً یہ مقدمہ اپنی بعض خصوصیات کے لحاظ سے ان کی تحریروں میں نمایاں مقام رکھتا ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس میں دماغ کے ساتھ دل اور علم و زورِ انشاء کے ساتھ عشق و وجدان بھی شامل ہے۔ مقدمہ لکھنے کے بعد دوسرا شفقت نامہ باعثِ سرفرازی ہوا۔ اس کتاب کے پڑھنے اور اس سے جو تعلق پیدا ہوا تھا، غالباً اسی کا نتیجہ تھا کہ مجھے ایک قریبی سفر میں جو کرنال اور پانی پت کی طرف ہونے والا تھا، معیت اور

Marfat.com

ہمر کابی کا ایما ہوا، مکتوب درج ذیل ہے۔

اعظم گڑھ

برادرم سلمہٗ اللہ تعالیٰ۔

دیباچہ مرسل ہے۔ پسند آئے تو شاملِ کتاب کیجئے گا۔ کتاب چھپنے کے بعد ایک نسخہ مکمل بھیج دیجئے گا۔ آپ کو اپنی اس کتاب کے کچھ نسخے دارالمصنفین میں فروخت کے لئے کمیشن پر رکھوانا چاہئے۔

مارچ کے شروع میں کرنال کے مدرسہ اسلامیہ کے معائنہ کے لئے جانا ہے۔ آپ بھی چلنے کو تیار رہئے، علی گڑھ کی کامیابی پر مبارکباد، اس مضمون کی رسید سے مطلع کیجئے۔

سید سلیمان

۱۹۳۹ء

یہ میرا پہلا سفر تھا، جو سید صاحب کی معیت میں ہوا۔ یہ سفر کئی حیثیتوں سے یادگار اور میرے لئے سرمایۂ عزت و افتخار تھا۔ سید صاحب کے پایہ کے ایک عالم و محقق وادیب کی ہمہ وقت صحبت، دینی و علمی مرکزوں کا سفر، تاریخی مقامات اور آثارِ قدیمہ کی سیر، بڑے بڑے اہل علم وفضل سے ملاقات، علمی و ادبی مجلسیں، ہر حیثیت سے یہ سفر میرے لئے وسیلۃ الظفر بن گیا۔ سید صاحب پہلے کرنال تشریف لے گئے، جہاں ان کو شمشیر جنگ نواب عظمت خان رئیس کرنال کے وقف کردہ مدرسہ کا معائنہ کرنا تھا اور وہاں کے بعض اساتذہ کے متعلق جن سے منتظمین مطمئن نہ تھے، رائے دینی تھی۔ اس وقت اس مدرسہ میں جو جامع مسجد کرنال میں قائم تھا، مولانا حمد اللہ صاحب پانی پتی صدر مدرس تھے۔ مولانا، شیخ الہند محمود حسن صاحب کے تلمیذِ رشید اور ان کی تحریک کے ایک کارپرداز اور معتمد رہ چکے تھے اور ان کا ریشمی خطوط کے قضیہ کے سلسلہ میں بار بار نام آیا تھا، میں نے بھی ان کی زیارت کی۔ منتظمین ان کی سن رسیدگی اور ضعف کی وجہ سے ان کو ہٹانا چاہتے تھے، لیکن اس کی جرأت

Marfat.com

نہیں کرتے تھے۔ سید صاحب کو دراصل انہوں نے اسی مقصد سے بلایا تھا کہ ان کے صاد کر دینے کے بعد پھر قیل وقال کی گنجائش نہیں تھی، لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوئے اور سید صاحب نے ان کو اپنے عہدہ پر برقرار رکھا۔ اس وقت ضلع کرنال کے ڈپٹی کمشنر حافظ عبدالمجید صاحب آئی، سی، ایس تھے، ان کا پڑاؤ اس وقت تھانیسر میں تھا۔ وہ سید صاحب کے علم وفضل سے غائبانہ واقف اور دارالمصنفین کی خدمات سے متاثر تھے۔ انہوں نے لنچ پر مدعو کیا۔ میں نے بھی اس سفر کی برکت سے تھانیسر، جو مولوی محمد جعفر صاحب تھانسیری مصنف ''سوانح احمدی'' اور ''کالا پانی'' کا وطن تھا' کی زیارت کی۔ سب سے پہلے میں نے یہیں مغربی طرز پر کھانا کھایا اور سید صاحب نے جو یورپ کا سفر کر چکے تھے، میری رہنمائی کی۔ اسی کھانے پر میں نے پہلی مرتبہ ایک شریک مجلس سے مولانا محمد الیاس صاحبؒ اور ان کی تبلیغی مساعی کا ذکر سنا۔

کرنال کے کام سے فارغ ہو کر ہم لوگ پانی پت آئے اور حسنِ اتفاق کہ ہم لوگ خواجہ الطاف حسین حالی مرحوم کے فرزند ارجمند خواجہ سجاد حسین مرحوم کے مہمان ہوئے، انہوں نے بھی اس مکان میں ٹھہرایا، جو مولانا حالی کی آخری رہائش گاہ تھی اور وہیں سے انہوں نے سفرِ آخرت اختیار کیا۔ ان کی بعض مشہور نظمیں خصوصاً ''چپ کی داد'' وہیں لکھی گئیں۔ اس نظم کا نام آ گیا تو یہ بھی سنتے چلئے کہ خواجہ سجاد حسین مرحوم نے سنایا کہ خواجہ غلام الثقلین یا ان کے بھائی (مجھے اس وقت نام میں شبہ ہو گیا ہے) خواجہ غلام الحسنین نے ایک دن مولانا حالی سے تعجب کے لہجہ میں کہا کہ اس سفر میں ایک صاحب یہ کہہ رہے تھے کہ مولانا حالی کی بہترین نظم اور ان کا شاہکار ''چپ کی داد'' ہے۔ مولانا نے ان سے کہا کہ تمہارا کیا خیال ہے، انہوں نے اس میں کچھ تردد کا اظہار کیا۔ مولانا نے اس شخص کی تصویب فرمائی اور فرمایا کہ وہ ٹھیک کہتا ہے۔ اسی زمانۂ قیام میں اردو کے مشہور مصنف منشی ذکاء اللہ صاحب دہلوی مرحوم کے صاحبزادہ جو خود بڑے مصنف اور اردو کے کامیاب ترین مترجم سمجھے جاتے

Marfat.com

ہیں، مولوی عنایت اللہ صاحب بی اے مرحوم بھی پانی پت میں مقیم تھے۔ سید صاحب ان سے ملنے گئے، خواجہ سجاد حسین بھی ہمراہ تھے۔ فرمایا کہ ''اس وقت اردو کے تین انشاء پردازوں اور اردو کے معماروں کے فرزندووارث موجود ہیں۔ مولانا حالی کے فرزندار جمند خواجہ سجاد حسین، منشی ذکاءُ اللہ صاحب کے چشم و چراغ مولوی عنایت اللہ اور مولانا شبلی کا فرزند معنوی میں''۔

اس سفر میں سید صاحب نے اولیائے پانی پت کے مزارات کی زیارت کی۔ سلسلۂ چشتیہ صابریہ کے دو نامور شیخ اور سرحلقہ، خواجہ شمس الدین ترک پانی پتیؒ، اور کبیر الاولیاء شیخ جلال الدین پانی پتیؒ یہیں آسودۂ خاک ہیں۔ حضرت خواجہ بوعلی قلندرؒ کی درگاہ بھی یہیں ہے۔ سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کے ایک شیخ کامل وفاضل اجل حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ بھی یہیں آرام فرما ہیں اور مولانا غوث علی شاہ صاحبؒ بھی یہیں مدفون ہیں، کچھ سادات کرام کے مزارات بھی ہیں، جو غالباً شہر کے باہر ہیں۔ سید صاحب جہاں جاتے اپنے تاریخی معلومات سے ہم لوگوں کو مستفید کرتے۔ مولانا غوث علی شاہ صاحب کے مزار پر فرمایا کہ یہ صوبۂ بہار کے تھے۔ یہ بھی غالباً فرمایا کہ سب سے زیادہ سادات کرام کے مزارات پر جی لگا، سید صاحب غالباً مولانا قاری عبدالرحمٰن صاحب پانی پتی کے مکان پر بھی حاضر ہوئے۔ ان کے پوتے جن کا نام غالباً مولانا عبدالسلام صاحب تھا، خود بھی ملنے آئے اورانہوں نے جمعہ کے بعد جامع مسجد میں تقریر کی فرمائش کی۔ سید صاحب نے تقریر فرمائی، جس میں پانی پت کی تاریخی اہمیت اور عظمت کا اظہار اور اس کے علماء اور مشائخ اور اس کی خاک کے گنجہائے گرانمایہ کی طرف عالمانہ اور مؤرخانہ اشارات کئے۔ پانی پت کا تاریخی میدان بھی دیکھا، جہاں مرہٹوں نے شکست فاش پائی تھی اور مسلمانوں کے اقتدار کو وقتی طور پر زندگی کی ایک قسط اور اس ملک میں کچھ عرصہ باعزت رہنے کی مہلت مل گئی تھی۔ پانی پت کا یہ میرا پہلا اور آخری سفر تھا اور اب دس بار بھی جانا ہو تو ایک مؤرخ عظیم کی معیت

Marfat.com

کہاں نصیب ہو سکتی ہے۔

پانی پت سے دہلی واپسی ہوئی، راستہ میں ایک صاحب کا ساتھ ہو گیا، جو "طلوع اسلام" کے نائب ایڈیٹر تھے۔ طلوع اسلام اس وقت جناب غلام احمد صاحب پرویز کی ادارت میں دہلی سے نکلتا تھا اور اس نے حدیث و سنت کو عرصہ سے نشانہ بنا رکھا تھا۔ وہ صاحب سید صاحب سے اس موضوع پر دیر تک بحث کرتے رہے، انہوں نے خیال کیا کہ یہ کوئی مولوی صاحب ہیں، جو اتفاق سے ہاتھ لگ گئے ہیں۔ ان کی بدولت سفر ذرا لطف سے طے ہو گا۔ سید صاحب نے بھی اپنا تعارف نہیں کرایا اور گفتگو میں حصہ لیتے رہے۔ دہلی کا اسٹیشن آیا اور سید صاحب اُتر گئے اور میں سامان کے انتظام کے لئے ٹھہر گیا۔ اسی اثناء میں انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ یہ کون مولوی صاحب ہیں؟ میں اس سے بے خبر تھا کہ سید صاحب نے مصلحتاً اپنا نام نہیں بتلایا۔ میں نے حیرت کا اظہار کیا اور کہا کہ آپ نے ابھی تک نہیں پہچانا؟ یہ مولانا سید سلیمان ندوی تھے، یہ سن کر وہ کچھ سناٹے میں آ گئے، لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ میں نیچے اُترا ...... سید صاحب نے مجھ سے دریافت کیا کہ تم نے ان صاحب کو میرا نام تو نہیں بتایا؟ میں نے کہا میں نے تو بتلا دیا۔ فرمایا کہ بڑی غلطی کی، سفر میں نام نہیں بتلایا کرتے، پھر یہ شعر پڑھا ......

صوفی نشود صافی تا درنہ کشد جامے
بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے

دہلی میں قیام جامعہ ملیہ کے مہمان خانہ میں ہوا۔ اس وقت جامعہ ملیہ قرول باغ میں تھی۔ مجھے یاد ہے کہ مہمان خانہ پہنچتے ہی ایک ندوی فاضل سے جو اس وقت جامعہ میں پڑھتے تھے، ملاقات ہوئی، ملتے ہی فرمایا کہ کیا تمہارے کتب خانہ سے قنوج کی تاریخ پر فلاں انگریزی کتاب مل سکتی ہے؟ شام کا وقت تھا اور سید صاحب کی آنکھوں میں تکلیف بھی تھی، مجھے یاد نہیں کہ اس وقت کتاب دستیاب ہو گئی یا اگلے دن ملی، بہرحال سید صاحب

Marfat.com

نے اسی سفر میں کتاب سے استفادہ کیا۔ غالباً وہ اس زمانہ میں ''حیاتِ شبلی'' لکھ رہے تھے اور پورب کے تاریخی شہروں کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات جمع کرنے کے لئے ساعی تھے۔ اگلے روز ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، شیخ الجامعہ کے یہاں دوپہر کا کھانا تھا، ڈاکٹر صاحب کو قریب سے دیکھنے اور ان کی سادہ زندگی، ذہانت اور ظرافت کا نمونہ دیکھنے کا وہیں موقع ملا۔ وہیں پہلی مرتبہ خان عبدالغفار خان کو دیکھا، جن کو شیخ شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم تعلیم بالغان کا مرکز اور اس کا کام دکھانے کے لئے لائے تھے اور غالباً سید صاحب کو بھی زحمت دی تھی۔

اکتوبر ۱۹۳۵ء میں سید صاحب سخت علیل ہوئے۔ ان کے احباب اور معتقدین دور دور سے عیادت کے لئے گئے۔ بھائی صاحب نے بھی پہلی مرتبہ اعظم گڑھ کا سفر کیا اور دو ایک دن دارالمصنفین میں قیام کیا۔ مرض ذات الجنب کا شدید حملہ تھا، جس سے قلب بھی متاثر تھا۔ ڈاکٹروں نے ہر طرح کی مشغولیت اور فکر سے علیحدہ رہنے اور مکمل آرام کا مشورہ دیا تھا، لیکن بھائی صاحب کا بیان ہے کہ ان کا دماغ برابر کام کرتا رہتا تھا۔ اس پر ایک لطیفہ بھی سن لیجئے۔ بھائی صاحب نے کہا کہ ضرورت ہے کہ آپ کچھ عرصہ کے لئے اپنے دماغ کو مکمل سکون اور آرام دیجئے اور مضامین کی ترتیب اور ان کے لئے علمی مواد کی تلاش اور ذہن میں بھی ان کا خاکہ بنانے سے مکمل احتراز کیجئے۔ سید صاحب نے کہا کہ ایسا کیسے ممکن ہے۔ بھائی صاحب نے جواب دیا کہ اس کی دو تین تدبیریں ہوسکتی ہیں۔ تاش اور شطرنج تو آپ کے شایانِ شان نہیں، جس میں مکمل استغراق ہو جاتا ہے، ناول اور افسانے بھی آپ نہیں پڑھیں گے۔ ایک یہ کہ آپ الیکشن لڑیئے، جس میں دین و دنیا دونوں سے بے نیازی ہو جاتی ہے۔ دوسرے شاعری شروع کر دیجئے کہ اس میں بھی کسی کی سدھ بدھ نہیں رہتی۔ ایک زیرِ لب تبسم پر یہ مکالمہ ختم ہو گیا اور سید صاحب اس مشورہ پر عمل نہیں کر سکے۔

سید صاحب کو جب اس علالت سے افاقہ ہوا اور ملاقات کی اجازت ہوئی تو

Marfat.com

دارالعلوم کے چند اساتذہ بھی عیادت اور مبارکباد کے لئے اعظم گڑھ گئے۔ ان میں ہمارے استاذ اور دارالعلوم کے شیخ الحدیث مولانا حیدر حسن خاں بھی تھے۔ مولانا مسعود عالم صاحب بھی اور راقم سطور بھی۔ سید صاحب ہم لوگوں سے بڑی محبت اور شفقت سے ملے۔ احتیاط و اعتدال کے ساتھ علمی مذاکرات بھی شروع ہو گئے اور سید صاحب کا قدیم علمی اور تدریسی ذوق اُبھر آیا۔ ایک روز مجلس میں سورہ جمعہ پر اور اس کی آیات کے باہمی ربط اور نظام پر ایسی فاضلانہ تقریر فرمائی اور ایسے علمی نکتے بیان کئے کہ ہم لوگ یہ سمجھے کہ سید صاحب کا اصل موضوع تفسیر اور تدبر قرآن ہی ہے۔ اس تقریر کو قلمبند نہ کرنے کا اب تک افسوس ہے۔

اس علالت سے صحت یاب ہو کر سب سے پہلے لکھنؤ تشریف لے آئے۔ ہم لوگوں نے ان کے استقبال اور اپنے جذبات و مسرت کے اظہار کے لئے بڑے بڑے منصوبے بنائے۔ ایک پروگرام یہ تھا کہ ان کو اساتذہ دارالعلوم اور طلبائے دارالعلوم کی طرف سے عربی میں سپاسنامے پیش کئے جائیں، جب سپاسناموں کی ترتیب کا مسئلہ سامنے آیا تو اساتذہ کی طرف سے سپاسنامہ لکھنے کا کام میرے سپرد ہوا اور طلباء کی طرف سے سپاسنامہ لکھنے کا کام مولانا مسعود عالم صاحب ندوی نے اپنے ذمہ لیا۔ ہم دونوں نے پوری دلچسپی اور توجہ کے ساتھ سپاسنامے لکھے۔ میں نے اپنے سپاسنامہ میں اس کی رعایت کی کہ سید صاحب کی تمام اہم تصنیفات کے نام تلمیح اور اشارہ کے پیرایہ میں آ جائیں۔ ہم مرتبہ ان کو خطاب کرنے میں بھی نیا اسلوب اختیار کیا۔ غرض یہ سپاسنامے علماء اور معززین شہر کی موجودگی میں ۱۵؍ مارچ ۱۹۴۶ء میں انجمن الاصلاح کے ہمالیہ ہال میں پیش کئے گئے۔ وہ بھی ایک عجیب منظر تھا۔ علمائے فرنگی محل، عمائد شہر، نامور مسلم وکلاء، ہائی کورٹ کے بعض مسلمان جج موجود تھے اور سب سید صاحب کے احترام اور اس فاضل یگانہ کی صحت سے مسرور، سید صاحب نے آخر میں اردو میں تقریر کی، جس میں اپنے عزیزوں اور اپنے علمی

Marfat.com

خاندان کے افراد کی محبت کا شکریہ، اپنی زندگی کے بعض تجربے اور طلباء کو مفید نصائح تھے۔

میرے دور کی تاریخ میں یہ واقعہ بھی یاد رہے گا۔ یہ ایک بزرگ خاندان کا جشنِ صحت نہ تھا، علم و ادب، فکر و نظر اور بحث و تحقیق کی تازگی اور رعنائی اور نئے عزم سفر کی تہنیت تھی۔

سید صاحب کی دلچسپی دارالعلوم کے ساتھ برابر بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ اس عہد کہن کو تازہ کرنے کی فکر میں رہتے تھے، جب دارالعلوم ان کے استاذ مولانا شبلی کی رہنمائی اور سربراہی میں ہندوستان کے اہل علم و ذوق کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا، اور اس کا رسالہ ''الندوہ'' ہندوستان کے علمی مطلع پر ایک نئے سیارہ کی حیثیت سے طلوع ہوا تھا، سید صاحب نے الندوہ کے دوبارہ اجرا کا حکم دیا اور وہ راقم سطور اور رفیق محترم مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی استاذ دارالعلوم کی ادارت میں ۔۱۹۴۰ء سے نکلنا شروع ہوا۔ سید صاحب نے اس میں متعدد مضامین لکھے اور ان کی مختلف تقریریں بھی اس میں شامل ہوئیں۔ نومبر ۱۹۴۰ء سے اس میں ''میری محسن کتابیں'' کے عنوان سے ایک سلسلۂ مضامین شروع ہوا۔ اس میں سب سے پہلا مضمون نواب صدر یارِ جنگ مولانا حبیب الرحمان خان شیروانی کا تھا۔ دوسرا سید صاحب کا، سید صاحب اس کی توسیع اشاعت اور اس کے معیار کے بلند کرنے کی فکر میں رہتے تھے، لیکن کچھ تو ملک میں ایسے سنجیدہ رسالوں کا رواج نہ تھا، دوسرے ہم لوگ بھی اپنی تدریسی مصروفیتوں اور نوعمری کی وجہ سے اس کا معیار کچھ زیادہ بلند نہ کر سکے، بالآخر فروری ۱۹۴۲ء میں تقریباً دو سال جاری رہ کر اس کو بند کرنا پڑا۔

۴۰-۱۹۴۱ء کا زمانہ تھا کہ سید صاحب علم و تحقیق کے چشموں سے سیراب ہو کر اور علوم دینیہ اور تاریخ و ادبیات کے سمندر میں بار بار غوطہ لگانے کے بعد اپنی روح کی پیاس اور ''قلب کی کسی اور چیز کی تلاش'' محسوس کرنے لگے تھے اور اپنے محبوب دوست اور نامور معاصر علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں خلوتوں میں (زباں حال سے) زیرلب اس طرح گویا

Marfat.com

ہوتے تھے کہ ....

تیری نظر میں ہیں تمام میرے گذشتہ روز و شب
مجھ کو خبر نہ تھی کہ ہے علم نخیل بے رطب
تازہ مرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا
عشق تمام مصطفیٰ عقل تمام بولہب

شائد علمائے معاصرین کم سے کم ہندوستان کے فضلاء مدارس میں کسی کے ضمیر میں عقل و عشق، قدیم و جدید، مشرق و مغرب اور دین و ادب یا دین و فلسفہ کا یہ معرکہ اس طرح برپا اور تازہ نہ ہوا ہوگا، جس طرح ندوہ کے اس فاضل، سیرت النبی ﷺ کے اس مصنف، میدانِ سیاست اور بزمِ ادب کے اس محرم راز، اور یورپ کے اس سیاح کے ضمیر میں ہوا تھا، انہوں نے اس نخیل علم کی آبیاری بھی کی تھی۔ اس کی گھنی چھاؤں میں برسوں آرام بھی کیا تھا۔ اس کی تاریخ بھی لکھی تھی۔ اس کی زندگی اور موت کا فلسفہ بھی بیان کیا تھا، لیکن ان کے قلب سلیم اور روح بے تاب کی شہادت تھی (اگرچہ ان کے بہت سے معتقدین، تلامذہ اس کے ماننے کے لئے تیار نہ تھے کہ سید صاحب میں کوئی کمی اور تشنگی ہے) کہ وہ اس کے تازہ اور شاداب رطب سے فیضیاب نہیں ہو رہے تھے۔ ان کی کتابوں نے بالخصوص ''خطبات مدراس، سیرت النبیؐ کے مضامین'' اور ''سیرت عائشہؓ'' کے صفحات نے ہزاروں کو حلاوت ایمانی سے لذت آشنا کیا تھا، لیکن ان کی ہمت عالی اور اس کا طائر بلند پرواز خود اس دولت بیدار کا طالب تھا، جس کو حدیث میں احسان اور قرآن مجید میں تزکیہ کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے اور جس طرح ان کو علم و ادب کی وادی کو کامیابی و فتح مندی کے ساتھ طے کرنے کے لئے علامہ شبلیؒ جیسا خضر طریق ملا تھا۔ احسان اور تزکیہ کی وادی کے لئے بھی ایک خضر اور ایک مرد حق آگاہ کی تلاش تھی۔ اس سلسلہ میں ان کی کہانی اور ان کے واردات قلبی، حجۃ الاسلام امام غزالی کی کہانی اور واردات قلبی سے بہت مشابہ نظر آتے ہیں

Marfat.com

کہ ان کو بھی علم و شہرت کے بامِ عروج پر پہنچنے کے بعد اپنی علمی زندگی اور ذہنی کدو کاوش، سراب نظر آنے لگی اور علم و یقین کے چشمۂ حیوان کی تلاش میں نکلے اور سیراب و کامیاب واپس آئے۔

یہ خضر راہ ان کو حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی شکل میں مل گیا اور چونکہ عراقی کی طرح ان کا باطن اس حرارت وحلاوت کو قبول کرنے کے لئے بالکل تیار تھا، اس لئے انہوں نے سالوں کی راہ مہینوں میں اور مہینوں کی راہ ہفتوں اور دنوں میں طے کی اور شیخ وقت کے اعتماد و استناد سے بہت جلد سرفراز اور ان کے خلیفہ مجاز ہوئے۔

سید صاحب کا تعلق اپنے شیخ سے اور شیخ کی شفقت ان کے حال پر برابر بڑھتی جا رہی تھی کہ ۱۶/رجب ۱۳۶۲ھ (جولائی ۱۹۴۳ء) میں مولانا تھانویؒ نے سفر آخرت اختیار کیا۔ سید صاحب کو یہ خبر سنتے ہی لکھنؤ کا سفر پیش آیا۔ اس وقت ان پر کچھ عجیب ازخود رفتگی اور حزن و قلق کی کیفیت طاری تھی، حکمت الٰہی کہ انہیں دنوں مولانا محمد الیاس صاحبؒ بھی لکھنؤ تشریف لے آئے۔ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب اور ایک تبلیغی جماعت بھی اس وقت ندوہ میں ہی مقیم تھی۔ دونوں کا قیام ندوہ کے مہمان خانہ میں تھا، مولانا الیاس صاحبؒ کی اس صحبت اور ان کے تبلیغی جلسوں کی شرکت نے ان کے زخمی دل کے لئے مرہم کا کام دیا۔ سید صاحب مولانا کے ساتھ اسی احترام اور تواضع سے جیسے کوئی مسترشد اپنے شیخ کے ساتھ پیش آتا ہے، مولانا بھی ان کا بڑا احترام کرتے تھے، اور ان کے علم، ان کے مقام، ان کی طلب صادق اور اخلاص کے بڑے معترف اور قدرداں تھے۔ اس زمانہ میں سید صاحب پر ذکر جہر کا بہت غلبہ تھا، دونوں حضرات کا قیام مہمان خانہ ہی میں تھا۔ مولانا محمد الیاسؒ سید صاحب کے اس ذوق کو دیکھ کر بہت مسرور تھے۔ سید صاحب مولانا کے ساتھ کانپور بھی تشریف لے گئے اور حلیم مسلم کالج کے ایک جلسہ میں بڑی پر اثر تقریر فرمائی۔ معارف کے شذرات میں بڑے بلند الفاظ میں ان کا اور ان کی دعوت کا تعارف کرایا، پھر

Marfat.com

مولانا کے انتقال کے بعد میری کتاب ''مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت'' پر بطور مقدمہ کے ایک عالمانہ مضمون لکھا، جس کے لفظ لفظ سے عقیدت اور تاثر کا اظہار ہوتا ہے۔ بھوپال جانے اور پاکستان منتقل ہونے کے بعد بھی ان کا تعلق تبلیغی جماعت سے قائم رہا، وہ اس جماعت کے اخلاص وللٰہیت اس کے بانی کی عظمت ومقبولیت، اور اس کام کے خالص دینی مزاج اور نہج سلف پر ہونے کے بڑے قائل تھے۔ بالعموم جماعت کے رفقاء ان سے تبلیغی جلسوں میں شرکت اور رخصت ہونے والی جماعتوں کے لئے دعا کی درخواست کرتے اور وہ بے تکلف اس کو قبول فرماتے، اس کے لئے انہوں نے صحت کے تقاضوں سے بے پروا ہو کر بعض طویل سفر بھی کئے۔

رجحان اور ذوق کی تبدیلی اور عمر کی ترقی کے ساتھ ساتھ سید صاحب کا دارالعلوم کے بارے میں ذوق ورجحان بھی خاصہ بدل گیا تھا۔ اب وہ اس کو محض ایک علمی ادارہ اور پڑھنے پڑھانے اور علوم جدیدہ سے بقدر ضرورت واقفیت کا مرکز سمجھنے پر قانع نہ تھے، دوسرے مختصر وبلیغ الفاظ میں دبستان العصر اکبر الہ آبادی کی اس تعریف کو پسند نہیں کرتے تھے، جو انہوں نے فضلائے ندوہ کا امتیاز بیان کرنے کے لئے خود سید صاحب کی نوجوانی میں کی تھی ...... ع اور ندوہ ہے زبان ہوشمند

وہ ندوہ کو قلب دردمند، ذہن ارجمند اور زبان ہوشمند، تینوں کا مجموعہ دیکھنا چاہتے تھے اور اسی ترتیب وتناسب کے ساتھ کہ پہلا مقام قلب دردمند کا ہو، دوسرا ذہن ارجمند کا اور اس کے بعد ان کی ترجمانی کے لئے زبان ہوشمند ہو۔ ندوہ میں دینی شخصیتوں اور دینی مرکزوں سے جو بیگانگی عرصہ سے چلی آ رہی تھی، اس میں کچھ کمی تو خود سید صاحب کے اس جدید تعلق اور رجحان سے پیدا ہوئی جس کا اوپر تذکرہ ہوا اور کچھ کمی مولانا الیاس کے اس ہفت روزہ قیام سے جو ندوہ ہی کے مہمان خانہ میں تھا اور جس میں انہوں نے اس ندوں و پورے طور پر اپنے سوز دروں اور اپنی روح اور اپنے جسم کی بے تابی سے بے چین اور متحرک

رکھا، لیکن سید صاحب اس سے زیادہ چاہتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ اب ندوہ کے فرزند دارالعلوم کے طلباء ادب اور تاریخ ہی کو اپنی کوششوں اور فتوحات کا نشانہ اور اپنے سفر کی آخری منزل نہ سمجھیں وہ دوبارہ اقبال کی زبان میں گویا تھے ....

خودی کی یہ ہے منزل اولیں　　مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں

وہ چاہتے تھے کہ فرزندِ ندوہ کے سامنے وہی شخصیتیں قابلِ تقلید اور منتہائے کمال نہ ہوں، جو علم و ادب اور تاریخ کے لئے ایک رمز و علامت بن گئی ہیں، بلکہ وہ اپنی تحریک کے داعیوں اور اپنی درسگاہ کے بانیوں میں سے ان لوگوں کو بھی مثالی نمونہ کے طور پر سامنے رکھیں اور ان کی پیروی کی کوشش کریں، جو اپنی دینداری اور صلاح اور اپنی دینی و دنیوی اور علمی و ادبی جامعیت میں بھی امتیاز خاص کے مالک تھے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ایک مرتبہ دارالعلوم کی عمارت کے عقبی حصہ سے نکلتے ہوئے فرمایا کہ مولوی علی صاحب ہر جماعت اور ہر دانش گاہ کے لئے ایک آئیڈیل ہوتا ہے۔ وہ اس کے تمام افراد کے دل و دماغ اور تخیل پر چھایا ہوا ہوتا ہے، اس سے ان کو اپنی زندگی کے لئے پیام اور اپنے کاموں کے لئے جوش و نشاط حاصل ہوتا ہے۔ میرے نزدیک دارالعلوم کے لئے آئیڈیل چار شخصیتیں ہو سکتی ہیں۔ مولانا محمد علی مونگیریؒ، مولانا شبلی نعمانی، آپ کے والد ماجد مولانا حکیم سید عبدالحئیؒ اور نواب سید علی حسن خان کہ یہ سب علم و دین کے مختلف شعبوں پر حاوی تھے اور ان سے مل کر ایک جامعیت پیدا ہوتی ہے۔

سید صاحب کے ان نئے رجحانات نے طلباء میں وہ مقبولیت اور کامیابی حاصل نہیں کی، جو ان کے مقام کے لحاظ سے متوقع تھی، بلکہ اس سے ایک ذہنی کشمکش پیدا ہوئی۔ اس کا نقطۂ عروج و ارتقاء طلباء کی وہ اسٹرائک تھی، جو ۱۹۴۳ء میں پیش آئی۔ آغاز اس کا اگرچہ انتظامی معاملات سے ہوا، لیکن اس کے اندر بے اطمینانی اور کشمکش کی یہی روح کام کر رہی تھی۔ اس اسٹرائک کی قیادت ہمارے بعض عزیز شاگرد کر رہے تھے، جو دارالعلوم کے

Marfat.com

بہترین طلباء تھے اور ان سے ہم نے اور دارالعلوم نے بڑی بڑی توقعات قائم کی تھیں، ان میں سب سے زیادہ نمایاں میرے عزیز ترین شاگرد علی احمد کیانی تھے، مجھے اپنے دس سال کے تدریسی دور میں اور اس کے بعد بھی جب میں نے بحیثیت نائب معتمد اور معتمد کے کام کیا، اس نوجوان سے زیادہ ذہین، ذی استعداد اور سلیم الطبع طالب علم نہیں دیکھا۔ دوسرے اور تیسرے درجہ سے اس کا یہ حال تھا کہ صرف ونحو کی غلطی اس سے ہونی بہت مشکل تھی۔ میرے استاذ خلیل عرب صاحب نے ایک مرتبہ ان کے امتحان کی کاپی دیکھ کر جب وہ درجہ دوم یا سوم میں پڑھتے تھے، یہ کہا کہ یہ کاپیاں مجھے دیدو اور جتنا کہو میں ندوہ کے لئے چندہ لے آؤں، چوتھے، پانچویں درجہ میں پہنچ کر وہ برجستہ عربی میں تقریر کرنے لگے تھے۔ حافظہ اس بلا کا تھا کہ ہزاروں شعر اقبال و اکبر اور ظفر علی خاں کے نوک زبان تھے۔ میرے بعض عربی مضامین کا ترجمہ بھی کیا تھا، وہ اسٹرائک کے بعد جب کراچی گئے، تو اپنی نوعمری کے باوجود کراچی کی علمی مجلسوں میں علامہ کیانی کے نام سے مشہور ہوئے۔ جیسا کہ طلباء کے ہنگاموں میں ہوا کرتا ہے، وہ طوعاً و کرہاً طلباء کے نمائندہ اور اسٹرائک کے قائد بن گئے، ان کے سب استادوں کو اور بالخصوص مجھے ان کے ہنگامہ میں نہ صرف شریک ہونے بلکہ قائد بننے سے سخت قلق تھا۔ زیادہ تر اس وجہ سے کہ اس اسٹرائک کی زد سید صاحب کی شخصیت اور ان کی معتمدی پر پڑتی تھی، بلکہ وہ اس وقت ندوہ کے حقیقی مربی اور سرپرست اور اس کے لئے سینہ سپر تھے۔ سید صاحب کے دل کو بھی اس ہنگامہ سے بڑی چوٹ لگی، ان کے دل میں ندوہ کی خدمت اور طلباء کی تربیت کی بڑی بڑی امنگیں تھیں، ان کو اس سے اپنی تمناؤں کا خون اور اپنی کوششوں کی ناکامی کا منظر نظر آیا اور بہت دل شکستہ اور افسردہ ہو گئے۔ انہیں دنوں میں علی احمد مرحوم پر جنون کا دورہ پڑا اور حالت یہاں تک پہنچی کہ ان کو گھر والوں نے رسیوں سے باندھ دیا۔ ان کے بھائی میرے برادر معظم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب مرحوم و ان کو دکھانے کے لئے گھر لے گئے۔ میں بھی خصوصی تعلق کی بنا پر ساتھ ہو گیا۔ مرحوم و جب

Marfat.com

رسیوں سے بندھا ہوا دیکھا تو آنکھ میں آنسو آ گئے کہ یہ نوجوان جو اپنی ذکاوت اور صحیح الدماغی میں اپنے ساتھیوں کے لئے بھی قابل رشک تھا، اس حالت میں ہے۔ بھائی صاحب نے نسخہ لکھا اور تشریف لے آئے۔

سید صاحب اس زمانہ میں اتنے دل برداشتہ تھے کہ دارالعلوم میں قیام بھی نہیں فرمایا، ہمارے ہی گھر میں مقیم تھے، میں نے ایک مرتبہ تنہائی میں موقع پا کر عرض کیا کہ میرا خیال ہے کہ علی احمد کی زبان سے آپ کی شان میں کوئی لفظ نکل گیا۔ اس طوفان بے تمیزی میں کچھ بعید نہیں کہ ان پر جذباتیت غالب آئی ہو اور ناگفتنی کا ارتکاب کیا ہو۔ حدیث شریف میں آتا ہے "من اذیٰ لی ولیًا فقد آذنته بالحرب" اور آپ تو ان کے محسن اور مربی بھی تھے۔ سید صاحب نے اس کے جواب میں تواضع اور فروتنی کے الفاظ فرمائے اور کہا میں کیا چیز ہوں میں نے دوبارہ عرض کیا اور دعا کی درخواست کی۔ سید صاحب نے اس پر سکوت فرمایا۔ دوسرے یا تیسرے دن مجھ سے فرمایا کہ مولوی علی صاحب میں نے آپ کے حکم کی تعمیل کر دی۔ اب اس واقعہ کو سید صاحب کی کرامت سمجھا جائے یا اس کو کسی اور بات پر محمول کیا جائے کہ عزیز موصوف بالکل اچھے ہو گئے اور جہاں تک مجھے علم ہے، یہ دورہ پھر کبھی نہیں پڑا۔ افسوس ہے کہ یہ شعلۂ مستعجل بالکل نوعمری میں ۱۹۵۰ء میں گل ہو گیا۔

ع حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

سید صاحب بعض خاص اسباب کی بنا پر جولائی ۱۹۴۶ء میں قاضی ریاست امیر دارالعلوم احمدیہ اور دینی امور تعلیم کے مشیر ہو کر ریاست بھوپال چلے گئے اور اکتوبر ۱۹۴۹ء تک وہیں رہے۔ انہوں نے بھوپال سے دارالعلوم کے ساتھ تعلق قائم رکھا۔ دارالعلوم کی حیثیت ایک فرزند کی سی تھی اور وہ اس کی یاد کو کسی وقت بھی دل سے جدا نہ کر سکتے تھے۔ شفقت ناموں سے کارکنانِ ندوہ کا حوصلہ بڑھاتے اور تعلیمی رہنمائی فرماتے، یہاں پر بھوپال کا ایک مکتوب جو بعض حیثیتوں سے بڑی اہمیت رکھتا ہے اور ان کے صحیح جذبات و

Marfat.com

خیالات کا آئینہ دار ہے، اور جس میں زندگی کی بعض تلخ حقیقتیں اور ناخوشگوار تجربے بھی اشارتاً آگئے ہیں، درج کیا جاتا ہے۔ اس مکتوب پر ۱۸ر اپریل ۱۹۴۸ء کی تاریخ درج ہے۔

"بھوپال

عزیز گرامی ...... وفقکم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

آپ کی واپسی (میری حجاز سے واپسی مراد ہے۔ میں جون ۱۹۴۷ء سے جنوری ۱۹۴۸ء تک حجاز ہی میں مقیم رہا) کا جب معلوم ہوا، آپ کو خط لکھنے کو دل چاہ رہا تھا، مگر یہاں کے لیل ونہار ایسے ہیں، جن میں اصل سے زیادہ فروع پر وقت صرف ہوتا ہے۔ میں یہاں بڑے جذبات کے ساتھ آیا تھا، ہمیشہ سے حسرت تھی کہ ندوہ میں گداگری کر کر کے کہاں سے روپیہ لایا جائے کہ اصل کام کا موقع ملے کاش کوئی ریاست یا سلطنت ادھر متوجہ ہو اور سرمایہ سے بےفکر کردے کہ اصل کام پر قوت صرف ہو، مگر یہاں آکر ڈیڑھ برس میں تجربہ ہوگیا کہ کاروبار سلطنت کے زیر سایہ یہ مقصد کسی طرح پورا نہیں ہوسکتا۔ اس لئے میں خود چاہتا ہوں کہ جلد از جلد یہاں سے اپنا بستر اٹھالوں۔ تذبذب ہے، تو اس قدر کہ ابھی اٹھالیا جائے یا موسم حج تک وسعت دی جائے۔

یہ تو اپنے یہاں کے قیام کا حال ہے۔ باقی اپنی قوت جسمانی اب اس قابل نہیں کہ پورے ولولہ اور جوش سے کام کیا جائے۔ اسی لئے میں نے کو لگایا تھا کہ ان کی طاقت اور میرا دماغ کام کرے، مگر آپ کی غیر موجودگی میں اساتذہ کی باہمی کشاکش نے ان کے خلاف محاذ قائم کیا۔ میں نے کہا بہتر ہے، اب آپ میں سے کوئی صاحب ہوں، چنانچہ (جہاں نقطے ہیں، وہاں ندوی فاضلوں کے نام ہیں، جو یکے بعد دیگرے منصب اہتمام پر فائز ہوئے) .... ہوئے اب معلوم ہوا کہ ان سے بھی نہیں بنتی۔

Marfat.com

ع چیست یاران طریقت بعد ازیں تدبیر ما

دار العلوم کی ضرورت اور اہمیت مسلم ہے، لیکن مدت سے میرے دل میں ازروئے تجربہ یہ خیال بیٹھ گیا کہ مسلمانوں سے اجتماعی کام کرنے کی صلاحیت سلب کر لی گئی ہے۔ زمانہ کے حالات اور ملک کے انقلابات نے مذہبی تعلیم کی ضرورت کو روز بروز مسلمانوں کے لئے ضروری سے ضروری تر کر دیا ہے۔ مگر افسوس کہ مسلمانوں کی غفلت بھی ہر روز گراں سے گراں تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ مجھے تو کبھی ایسا نظر آتا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ یہ سرزمیں اکال الامم' بقول حالی مسلمانوں کو بھی نگل لے۔ خیر یہ داستان تو دراز ہے۔

ع کبھی فرصت سے سن لینا بڑی ہے داستاں میری

ندوہ کے متعلق میرے جذبات وہی ہیں، جو آپ کے ہیں، میری تو ہمیشہ سے یہی رائے ہے کہ اب آپ اس بارگراں کو اپنے سر اُٹھالیں۔

ع جواں ہو تم لب بام آچکا ہے آفتاب اپنا

میں ہر حال میں آپ کی مدد کروں گا اور اگر کہیں تو کچھ قیام بھی کروں بشرطیکہ آپ کے خیالات کی تائید میں دوسرے اساتذہ بھی شریک ہوں۔

ڈاکٹر صاحب کا بھی خط آیا ہے، ان کی صحت کاملہ عاجلہ کے لئے دعا ہے۔ انہوں نے بھی بلایا ہے، مگر اس وقت اپریل تک حاضری مشکل ہے۔ کاش آئندہ امتحانات تک جس کو ایک دو ماہ ہوں گے، معاملات تھم سکتے۔

آپ نے میری نسبت حجاز کے اہل علم کے جس حسن ظن کا اظہار کیا ہے، وہ میرے لئے سرمایۂ سعادت ہے، کاش کہ میں ایسا ہی ہوتا۔

والسلام

سید سلیمان

۱۸/اپریل ۱۹۴۸ء

Marfat.com

سید صاحب نے یہ سمجھ کر کہ بھوپال میں رہ کر وہ دارالعلوم کی تعلیمی نگرانی پوری طرح نہیں کر سکیں گے۔ مجھے نائب معتمد بنائے جانے کی تحریک کی، جس کو مجلس دارالعلوم نے ۷ر جنوری ۱۹۴۹ء کو منظور کیا اور میں نے ان کی رہنمائی اور سرپرستی میں کام شروع کیا۔ اہم امور میں ان کی طرف رجوع کرتا تھا، اور وہ بھی ازراہِ شفقت بزرگانہ پورا اعتماد فرماتے تھے۔ یہاں پر ایک مکتوب درج کیا جاتا ہے، جس میں بعض اہم تاریخی اشارات آ گئے ہیں، جن سے ان کی سوانح کی ترتیب میں بڑا کام لیا جا سکتا ہے اور اس ذہنی کشمکش کا بھی کسی قدر اندازہ ہو سکتا ہے، جو سید صاحب کو اپنی علمی و دینی سرگرمیوں کے میدان کے انتخاب میں درپیش تھی۔ یہ مکتوب ۱۵ر جون ۱۹۴۹ء کا ہے اور وہ سید صاحب کے وطن دیسنہ سے لکھا گیا ہے، جہاں سید صاحب اس وقت مقیم تھے۔

''دیسنہ، پٹنہ ۵ر جون ۱۹۴۹ء

اخی العزیز رفع اللہ شانکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

آپ کا خط ملا تھا۔ خط میں دو باتیں تھیں، ایک میرے قیام کے متعلق، دوسرے نصاب کے متعلق، میں منتظر رہا کہ آپ نصاب کا مسودہ مجھے بھیج رہے ہیں یا بھیجا ہے، مگر وہ اب تک مجھے نہیں ملا۔ اب انتظار کے بعد جواباً لکھتا ہوں، میرا دور اور میرا عصر عمل گذر چکا، ''لکل عصر رجال'' اب اس دور کے لئے آپ کا خاکہ موزوں ہوگا۔ مجھے چونکہ آپ پر اعتبار و اعتماد ہے، اس لئے دیکھے بغیر میں اس کو پسند کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نافع فرمائے۔

جائے قیام سے متعلق ہنوز فیصلہ نہ ہو سکا۔ میں نے اعظم گڑھ دماغی سکون، ذہنی امن و امان اور باہمی تصادم سے بچنے کے لئے چھوڑا اور فوری طور سے حیدرآباد کی تعلیمی خدمات کے بجائے بھوپال کی مذہبی خدمت قبول کی۔ اگرچہ ریاست کے انقلاب کے دست و برد سے اب تک میری جگہ وہاں محفوظ ہے، گو اصل رائے تو وہاں پہنچ کر ہی معلوم

Marfat.com

ہو گی، مگر چونکہ نفسیاتی طور سے اب اسلامی ریاست کا تصور نہیں رہا، اس لئے سمجھتا ہوں کہ وہاں اب دل نہیں لگے گا اور بہتوں کا خیال ہے کہ مجھے اب وہاں سے ہٹنا پڑے گا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض گوشوں سے میری طلب جاری ہے۔ ایک ہمسایہ (جمہوریہ پاکستان مراد ہے) ملک کی طرف سے گفتہ آید در حدیث دیگراں، کے عنوان سے بعض مذہبی امور و آئین شرع کے سلسلہ میں مجھے یاد کیا جا رہا ہے اور اس خدمت کے لئے دینی و دنیاوی عام تعلیم میں کیوں کر انقلاب بر پا کیا جائے اور کیا اصلاحی تجویزیں پیش کی جائیں، میرا نام لیا جا رہا ہے، لیکن ابھی تک میری طبیعت یکسو نہیں ہوئی ہے۔

وطن آیا تھا کہ گوشہ عزلت کی زندگی نبھ سکتی ہے یا نہیں، مگر بعض بزرگوں کی تبرک جائیدادوں اور اعزاء کے عناد و خلش نے یہاں بھی مطمئن ہونے نہیں دیا

دارالعلوم ندوہ کی خدمت ہمیشہ سے زندگی کا مقصد رہا اور اب بھی اس کی خدمت سے انکار نہیں، مگر ندوہ کے لئے جو اس وقت سب سے ضروری چیز مالی امداد ہے، یعنی چندوں کا جمع کرنا، میں اس کے لئے بیکار ہوں، پھر میری اقتصادی اور مع اہل وعیال کی قیامی شکل کا حل وہاں کوئی مجھے نظر نہیں آتا۔

غرض حالات نے قوت فیصلہ کو معطل کر رکھا ہے اور راستہ صاف دکھائی نہیں دیتا، سردست حج کا سفر پیش نظر ہے۔ اس کے انجام کے بعد شاید کوئی راہ انشراح قلب کے ساتھ نظر آئے۔

آج ۱۵؍ جون ہے۔ ۱۷؍ جون کو یہاں سے روانہ ہونا ہے، لکھنؤ اور اناؤ (اناؤ میں اس وقت سید صاحب کے داماد حسین صاحب ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ پر فائز تھے) کی راہ سے بھوپال قبل رمضان تک پہنچنے کا خیال ہے۔ اُمید ہے کہ بعض الجھنیں وہاں پہنچ کر دور ہوں گی۔ اگر آپ بھوپال کے پتہ سے مجھے مشوروں سے مستفید کر سکتے ہوں تو شکریہ۔

والسلام

سید سلیمان

Marfat.com

جیسا کہ اس خط میں اشارہ کیا گیا ہے۔سید صاحب بھوپال کچھ دن قیام کر کے حج کے لئے روانہ ہو گئے۔ان کا یہ دوسرا یا تیسرا حج تھا، جو ۱۳۶۸ھ/ ۱۹۴۹ء میں ہوا۔حجاز کی تبلیغی جماعت نے سید صاحب کے قیام سے فائدہ اٹھایا اور ان کی ترجمانی اور تائید سے حجاز سعودی عرب کے علمی و دینی حلقوں، نیز باہر سے آئے ہوئے اہل علم حجاج میں اس دعوت کی وقعت اور وزن پیدا ہوا۔سید صاحب نے حسب معمول اس خدمت سے دریغ نہیں فرمایا اور مجالس تبلیغ میں شرکت کر کے وہاں کے رفقائے جماعت اور کارکنوں کی ہمت افزائی فرمائی۔ واپسی پر میں نے شاید کوئی عریضہ لکھا، جس میں ان کی اس سرپرستی اور ہمت افزائی کا مناسب الفاظ میں تذکرہ تھا۔سید صاحب نے اس کے جواب میں جو مکتوب تحریر فرمایا، وہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

''بھوپال ۲۴ر جنوری ۱۹۵۰ء

عزیز محترم ...... وفقکم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہٗ!

عیادت نامہ ملا۔شکر گزار ہوں، الحمد للہ بخیر و عافیت ہوں۔ضعف بھی دور ہو رہا ہے۔

میری شرکت کو جو جماعت تبلیغ کے کاموں میں حجاز میں ہوئی ہے، آپ صاحبوں نے بڑی اہمیت دی۔مولانا یوسف صاحب اور مولانا زکریا صاحب تک نے اس کے لئے ...ریے ادا کئے اور دعائیں دیں۔دعائیں تو ٹھیک ہیں کہ میں ان کا محتاج، مگر شکریہ کس ...ت کا؟ کوئی نماز پڑھے تو اس کا شکریہ ادا کیا جائے گا؟ میں نے اس لئے لکھا کہ بعض ...حبوں نے ایسا کیا ہے۔

بے شبہ جو چیز آپ کے لئے آثار سعادت میں سے ہے، وہ یہ ہے کہ بحمد اللہ تعالیٰ ...دو سال گزرنے کے بعد بھی آپ کے نام اور کام کو میں نے زندہ پایا، بلکہ آپ کی نسبت

Marfat.com

سے مجھے بزرگی ملتی رہی۔

آپ کی ملاقات اور ندوہ کی حالات سننے کا مشتاق ہوں۔ اب تو آپ بھوپال کے لئے پابرکاب ہوں گے۔

والسلام

سید سلیمان

سید صاحب کو اس سفر حج ہی میں پاکستان آنے کی دعوت پاکستان کی بعض نہایت ذمہ دار شخصیتوں کی طرف سے بعض موقر شخصیتوں کے ذریعہ پہنچی اور ان کو وہاں خدمتِ اسلام کے نہایت وسیع امکانات اور اس نوخیز اسلامی مملکت کی اس رہنمائی کی توقعات دلائی گئیں، جو سید صاحب سے بہتر کوئی اور عالم دین انجام نہیں دے سکتا تھا۔ پاکستان میں اسلامی آئین کی ترتیب کا مسئلہ بھی درپیش تھا اور وہاں کی تعلیم کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کا معاملہ بھی زیر غور تھا اور ان دونوں بنیادی مسائل سے سید صاحب کو ذاتی لگاؤ اور طبعی ذوق تھا، لیکن وہ عرصہ تک اپنی طبیعت کی کمزوری اور مسئلہ کی نزاکت کی بنا پر پاکستان جانے کا فیصلہ نہ کر سکے۔ بالآخر اس بات کے لئے ایک مناسب تقریب پیدا ہوگئی کہ وہ وہاں کے حالات کو بچشم خود دیکھ لیں، وہاں کے ذمہ داروں سے ملاقات اور ان کے خیالات سے واقف ہونے کا موقع ملے اور پھر وہ اطمینان سے کوئی رائے قائم کریں۔

جون ۱۹۵۰ء میں دہلی سے معزز ہندوستانی مسلمانوں کا ایک خیر سگالی کا وفد روانہ ہونے والا تھا، جس میں مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی پیش پیش تھے۔ سید صاحب سے بھی اس وفد میں شرکت کی درخواست کی گئی اور انہوں نے غالباً انہیں مصالح کی بناء پر منظور کیا، وہ ۱۴؍ جون ۱۹۵۰ء کو صبح کراچی پہنچے۔ سید صاحب کی واپسی طے شدہ تھی اور اس بارے میں ان کے ذہن میں کوئی تردد نہ تھا، لیکن وہاں کے قریبی اعزاء نے جن میں ان کی صاحبزادی، داماد اور اہل خاندان بھی شامل تھے، ان کی اس غیر متوقع آمد سے فائدہ اٹھایا اور ایسے

Marfat.com

حالات پیدا کر دیئے کہ سید صاحب کے لئے واپسی ناممکن ہوگئی۔ سید صاحب کو اپنے عزیزوں اور دوست واحباب کے اصرار کورد کر دینے اور اپنے فیصلہ پرسختی سے قائم رہنے کی پہلے سے عادت نہ تھی اور اب تو طبیعت اور زیادہ کمزور ہوگئی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے رخت سفر کھول دیا اور پاکستان کے قیام کا فیصلہ کرلیا۔ اس سے ان کے ان تمام نیاز مندوں، قدردانوں اور احباب کو ذہنی صدمہ پیش آیا، جو ہندوستان میں ان کے قیام کی ضرورت سمجھتے تھے اور ہندوستان کو اس علم وفضل کے خزانہ سے محروم ہونے کو ایک ملی حادثہ تصور کرتے تھے، لیکن جو کچھ ہونا تھا، وہ ہوگیا اور اب کف افسوس ملنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، اب تو سب کی یہ دعائیں تھیں کہ یہ نوخیز اسلامی مملکت جس سے دنیا کے بہت سے مسلمانوں کی بڑی بڑی اُمیدیں قائم تھیں اور جو خوش قسمتی یا بدقسمتی سے اسلامی تعلیمات اور آئین اسلامی کی زندگی اور معاشرہ کی رہنمائی کرسکنے کی صلاحیت ایک نازک امتحان اور سوالیہ نشان بن گیا تھا۔

سید صاحب کی ذات سے ان کے کمالات سے اور ان کے وسیع تجربات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائے، لیکن افسوس ہے کہ ایسا نہیں ہوسکا، وہ توقعات پوری نہیں ہوئیں اور ان کی ذات سے شایانِ شان فائدہ نہیں اٹھایا گیا، ان کو وہاں کے قیام میں بہت سے ناخوشگوار حالات اور بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، جن کی یاد ان کے تمام نیازمندوں کے لئے قلق کا موجب بن گئی۔ یہاں ان اسباب اور تفصیلات سے بحث نہیں، اس میں کیا کیا مجبوریاں اور کون کون سے اتفاقات پیش آئے، اس کی ذمہ داری کس طبقہ پر ہے، اس میں کہاں تک سید صاحب کے طبعی ضعف اور اضمحلال کو دخل ہے۔ اس کا فیصلہ کرنا مشکل اور ان سطور کے لکھنے والے کے موضوع سے خارج ہے۔

مارچ ۱۹۵۳ء میں سید صاحب ایک بار (اور آخری بار) ہندوستان تشریف لائے۔ سید صاحب ڈھاکہ کی ہسٹری کانگریس کی صدارت کے لئے تشریف لے گئے تھے، جو اسی مہینہ کی کسی تاریخ کو ہوئی تھی۔ وہاں انہوں نے اپنا وہ فاضلانہ اور فکر انگیز خطبہ

Marfat.com

صدارت پڑھا، جس میں بنگالی مسلمانوں کو مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ بنگالی اسی طرح فارسی رسم الخط میں لکھیں، جیسے وہ انگریزوں کے دور سے پہلے لکھی جاتی تھی، سید صاحب نے ثابت کیا کہ یہ تبدیلی ایک گہری سازش کے ماتحت ہوئی اور اس تبدیلی نے بنگالیوں کو اسلامی ثقافت اور اسلامی تہذیب سے بہت دور کر دیا۔ اب بیگانگی کی اس خلیج کو دور کرنے کے لئے جو بنگالی مسلمانوں اور ہندوستان و پاکستان کے مسلمانوں میں پڑ گئی ہے۔ یہی صورت ہے کہ بنگالی فارسی رسم الخط اختیار کریں۔ ظاہر ہے کہ یہ مشورہ بڑا مخلصانہ اور انقلاب انگیز تھا اور اس میں وہ فراست اور دور بینی جھلک رہی تھی، جس کو اقبال نے اس شعر میں ادا کیا ہے

ولے با من بگو آں دیدہ ور کیست
کہ خارے دید و احوال چمن گفت

اور جس کی تصدیق ان افسوسناک واقعات نے کی، جو ۱۹۷۱ء کے آواخر ۱۹۷۲ء کے اوائل میں پیش آئے اور جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کی کثیر آبادی کا یہ ملک پاکستان سے علیحدہ ہو گیا۔

بنگالیوں نے بالخصوص یونیورسٹی اور کالج کے طلباء نے اس مخلصانہ مشورہ کا جس طرح استقبال کیا وہ تاریخ میں افسوسناک واقعہ کی طرح ہمیشہ یاد رہے گا۔ وہ اس طوفان کی خبر دیتا تھا، جو خون برساتا ہوا اور پورے ملک کو زیروزبر کرتا ہوا سروں پر سے گزر گیا۔ طلباء اور نوجوانوں نے اس فاضل یگانہ اور اس پیر کہن پر جو ملت اور اسلامی علم وثقافت کی آبرو تھا، بے تحاشہ سنگ باری شروع کر دی۔ ڈاکٹر محمود حسین خاں صاحب اور ان کے چند رفقاء نے سید صاحب کو اپنے گھیرے میں لے لیا اور کسی نہ کسی طرح انہیں موٹر پر سوار کرایا اور کھڑکیاں بند کر دیں۔ اس طرح ان کا جسم محفوظ رہا، لیکن ان کا دل چکنا چور ہو گیا۔ اس کے بعد ہی وہ ہندوستان آئے۔ ہم لوگوں نے دیکھا تو وہ بالکل بجھ کر رہ گئے تھے۔ ان میں کوئی امنگ

Marfat.com

شوق اور اُمید پائی نہیں جاتی تھی اور کسی مسئلہ سے دلچسپی باقی نہیں رہی تھی۔ میری فرمائش پر جو وہ بہت کم ٹالتے تھے، انہوں نے دارالعلوم کے طلباء کے سامنے مسجد ہی میں بعد نماز مغرب کچھ دیر تقریر کی، جس میں ان کو فقہ کی طرف توجہ کرنے کا مشورہ دیا، لیکن تقریر میں کسی قسم کا جوش اور نشاط نہیں تھا۔ ایک شب انہوں نے لکھنؤ کے تبلیغی مرکز واقع کچہری روڈ میں گزاری، لیکن ان پر سکوت طاری تھا، صبح مولانا عبدالماجد دریابادیؒ جن سے وہ بہت بے تکلف تھے اور جب وہ سامنے آجاتے تھے، ان کی طبیعت کھل جاتی تھی اور ادبی نوک جھونک، ضلع جگت اور تفریحی فقرے شروع ہو جاتے تھے۔ ملنے تشریف لے آئے، اور انہوں نے بہت چاہا کہ سید صاحب کھلیں، لیکن طبیعت میں بالکل شگفتگی نہ تھی۔ مولانا محمد اویس صاحب نگرامی ندوی اور مولانا ابوالعرفان صاحب ندوی جو سید صاحب کے ساتھ اناؤ تک گئے تھے، کا بیان ہے کہ سید صاحب پورے راستہ خاموش رہے، صرف گنگا کا جب پل آیا تو فرمایا کہ کیا یہ گنگا ہے۔

پاکستان پہنچ کر سید صاحب زیادہ دن اس دنیا میں نہیں رہے۔ ان کو قلب کی شکایت پرانی تھی۔ مئی ۱۹۴۵ء میں ان پر استسقائے قلبی کا حملہ ہوا تھا، حوادث اور زندگی کے ان تجربوں نے اور زیادہ دل شکستہ اور نیم مردہ کر دیا تھا۔ بالآخر ۱۴ ربیع الاول ۱۳۷۳ھ (۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء) کو آخری ساعت آ پہنچی اور ہم نے ہندوستان میں دفعتہً سنا کہ انہوں نے اس دنیا سے رحلت فرمائی اور رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے۔

یہاں تک جو کچھ لکھا گیا، وہ ذاتی تعلقات، مشاہدات تجربات اور خطوط کی روشنی میں تھا۔ اب سید صاحب کے ذات و کمالات کے بعض اہم پہلوؤں پر بہت اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی جاتی ہے، جو راقم سطور کی نگاہ میں ان کی سیرت اور گوناگوں کمالات کے چوکھٹے میں مرکزی مقام اور نمایاں حیثیت رکھتے ہیں اور جن سے ان سطور کا لکھنے والا خاص طور سے متاثر ہوا۔

Marfat.com

سید صاحب کی زندگی کا سب سے نمایاں اور ممتاز پہلو طبقۂ علماء میں ان کی جامعیت اور ان کے علوم و مضامین کا تنوع ہے۔ان کی ذات اور ان کی علمی زندگی میں قدیم و جدید واقفیت، علمی تبحر اور ادبی ذوق، نقاد و مؤرخ کی حقیقت پسندی اور سنجیدگی، ادباء و انشا پردازوں کی شگفتگی اور حلاوت اور فکر و نظر کا لوچ اور مطالعہ کی وسعت اس طرح جمع ہو گئی تھی، جو شاذ و نادر جمع ہوتی ہے۔سید صاحب جس زمانہ کے طالب علم ہیں، اس زمانہ میں جدید و قدیم کے درمیان شدید رقابت تھی، ایک شخص بیک وقت دونوں قلمروؤں سے راہ و رسم نہیں رکھ سکتا تھا۔قدیم و جدید نمائندوں کا بھی ایک جگہ مجتمع ہونا مشکل تھا (اور شاید ندوۃ العلماء کے جلسوں میں وہ پہلی مرتبہ جمع ہوئے تھے) دینی علوم اور ملک کی زبان و ادب کے درمیان بھی سرحدیں قائم ہو گئی تھیں اور ان کو پار کرنا بڑی جرأت کا کام تھا، وہ دور جس نے نذیر احمد، حالی و شبلی جیسے عالم اور صاحب طرز انشا پرداز پیدا کئے تھے، ختم ہو رہا تھا، اب یک فنی علماء کا دور تھا، جو ادب و شاعری کو ثقاہت کے خلاف سمجھتے تھے۔ایسے بھی بہت سے لوگ تھے، جو جیتی جاگتی زبان اور سلیس و شیریں اردو میں تصنیف کرنا اپنی عالمانہ شان کے خلاف سمجھتے تھے۔جغرافیہ و تاریخ سے ناواقفیت علماء کا شعار سمجھا جانے لگا تھا، علوم قدیم میں بھی بالعموم مغایرت تھی، جو فقیہ و محدث ہوتے تھے، وہ ادیب نہیں ہوتے تھے، جو ادیب تھے، ان کو علوم دینیہ سے سروکار نہ تھا۔مدرس تصنیف و تحریر کے لائق اور مصنف و مقرر تدریس کا اہل نہیں سمجھا جاتا تھا۔ندوۃ العلماء کی بنیاد ''جامعیت'' کے تخیل پر تھی۔زندگی پر اثر انداز ہونے اور قوم کی دینی رہنمائی کے لئے بھی ضروری تھا کہ ملک کے علمی و ادبی رجحانات سے واقفیت اور علمی زندگی میں شرکت ہو، خود ندوۃ العلماء کے منتظمین میں شعر العجم و موازنۂ انیس و دبیر کے مصنف اور اردو کے صاحب طرز انشا پرداز (مولانا شبلی) تذکرۂ گل رعنا کے مصنف (مولانا حکیم سید عبدالحیؒ) اور غالب کی سلاست و برجستگی کی یادگار (مولانا حبیب الرحمن خان شیروانی) جیسے علماء و ادباء تھے۔اس درسگاہ کے سب سے نمایاں اور کامیاب طالب علم

Marfat.com

مولانا سید سلیمان ندوی تھے، جنہوں نے نصف صدی سے زیادہ علماء کی اس قدیم جامعیت کو زندہ اور نمایاں رکھا اور دینی و علمی و ادبی حلقوں میں بیک وقت نہ صرف باریاب بلکہ اکثر صدر نشین رہے۔ ان کی زندگی اور وہ مختلف ذمہ داریاں جو انہوں نے مختلف وقتوں میں سنبھالیں، خود ان کی جامعیت کا ثبوت ہیں۔

وہ ایک زمانہ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے استاد ادب اور ''الندوہ'' کے نائب ایڈیٹر نظر آتے ہیں، پھر ''الہلال'' جیسے عہد آفریں صحیفہ کے ادارت اور ''مشہد اکبر'' جیسے زندہ جاوید مقالہ کے مضمون نگار ہیں، جس نے سارے ملک میں جوش و حمیت کی ایک لہر پیدا کر دی تھی۔ اسی عرصہ میں جب مجلس خلافت مولانا محمد علی کی سرکردگی میں اپنا وفد انگلستان بھیجنا طے کرتی ہے، تو اس کی رکنیت اور مسلمانانِ ہند کی دینی نمائندگی کے لئے اس کی نظر انتخاب اسی نوجوان عالم پر پڑتی ہے۔ دفعتہً وہ اپنے مربی و استاد (مولانا شبلی) کا معاون و رفیق نظر آتا ہے اور ان کے انتقال کے بعد مجلس دارالمصنفین کا ناظم و روح رواں اور معارف جیسے بلند پایہ رسالہ کا مدیر اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کا معتمد تعلیم دکھائی دیتا ہے۔ مجلس خلافت سلطان ابن سعود کی دعوت پر موتمر اسلامی میں شرکت اور مسلمانانِ ہند کے خیالات کی ترجمانی کے لئے ایک وفد مرتب کرتی ہے، تو اس کی قیادت کے لئے اس سے زیادہ موزوں شخص نظر نہیں آتا، جو عالم اسلام کے اس نمائندہ و منتخب مجمع میں عربی میں اظہار خیال کی قدرت رکھتا ہو اور مسلمانانِ ہند کی دینی علمی عظمت کا نقش قائم کر سکے۔ نادر خان شاہ افغانستان اپنے ملک کی تعلیم کا ایسا خاکہ اور نظام تعلیم مرتب کرانا چاہتے ہیں، جو بیک وقت قومی و دینی تقاضوں کو پورا کر سکے اور دین کے اصول اور عصر حاضر کی ضروریات پر حاوی ہو۔

اس نازک اور دشوار کام کے لئے ان کی نظر ہندوستان کی تین ہی ہستیوں پر پڑتی ہے۔ ایک ڈاکٹر سر محمد اقبال دوسرے سر راس مسعود تیسرے مولانا سید سلیمان، پھر اس

Marfat.com

پورے عرصہ میں ہم ان کو کانگریس کے مخصوص جلسوں میں شرکت کرتے اور خلافت و جمعیۃ العلماء کے سالانہ جلسوں کی صدارت کرتے دیکھتے ہیں، ہر جگہ ان کی رائے کا وزن، ان کی شخصیت کا وقار اور ان کی واقفیت کا اعتراف پاتے ہیں، اسی کے ساتھ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس جامعہ ملیہ، انجمن ترقی اردو، اور ہندوستانی اکاڈمی ان کے گراں قدر علمی خطبات و مقالات سے مالا مال ہے، پھر ان تمام مصروفیتوں اور سفروں میں ان کے علمی انہماک اور تصنیفی تسلسل میں فرق نہیں آتا اور اسی عرصہ میں ان کی وہ محققانہ کتابیں شائع ہوتی ہیں، جن کو پڑھ کر بالکل اندازہ نہیں ہوتا کہ ان کا مصنف ملک کی سیاسی زندگی میں شریک اور ملک کے انقلابی تقاضوں اور اُمنگوں کو سمجھنے والا اور ان کا ساتھ دینے والا ہے، پھر ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے علمی و ادبی فتوحات پر قانع اور خالص تصنیفی زندگی اور علمی تحقیقات پر راضی نہیں بلکہ زبان ہوشمند، ذہن ارجمند اور فکر بلند کے ساتھ دل دردمند کی دولت سے فیض یاب ہے اور اپنے زمانے کے ایک مسلم الثبوت شیخ (مولانا اشرف علی تھانویؒ) کی نسبت و صحبت سے اس شعبہ کی بھی تکمیل چاہتا ہے، اور بالآخر قلیل عرصہ میں ان کے اعتماد اور استناد سے مشرف ہوتا ہے، پھر ہم نے زندگی کے آخری دور میں اس ادیب اور مؤرخ کو بھوپال کی مسند قضا پر شرعی مقدمات کا فیصلہ کرتے اور فقہی رائے دیتے ہوئے پایا، پھر دنیا کے ایک بڑے اسلامی جمہوریہ کے دستور مملکت کی ترتیب میں دینی رہنمائی کرتے ہوئے دیکھا، یہ گوناگوں مشاغل و خدمات سید صاحب کی ہمہ گیر طبیعت اور ان کے علم و ثقافت (کلچر) کے تنوع اور وسعت کا بہترین ثبوت ہیں۔

ان کی تصنیفات پر اجمالی نظر ڈالنے سے بھی یہ حقیقت کھلتی ہے کہ ان کا ذوق و مطالعہ اور ان کی علمی مناسبت کس قدر متنوع واقع ہوئی تھی۔ ان کی تصنیفات میں ایک طرف سیرت النبیؐ کے چار ضخیم دفتر نظر آتے ہیں (جن کی مثال کسی اسلامی زبان میں نہیں ہے) اور خطبات مدراس جیسا سیرت نبوی کا عطر (جس سے بہتر طریقہ پر ابھی تک سیرت کو

Marfat.com

نہیں پیش کیا گیا) دوسری طرف عرب و ہند کے تعلقات اور عربوں کی جہاز رانی پر ان کے محققانہ مقالات اور عمر خیام پر ان کی ناقدانہ تصنیف ہے، جو ایک بڑے مصنف و محقق کا پورا سرمایہ زندگی بن سکتا ہے۔

قرآن مجید میں جن ممالک اور شہروں کا ذکر آیا ہے، ان کے جغرافیہ اور تاریخی معلومات پر ان کی ابتدائی تصنیف ''ارض القرآن'' ہے، ابھی تک اردو میں آخری چیز اور اس موضوع پر سب سے بڑا ماخذ ہے، پھر ان کی جامعیت کا یہ پہلو تقریباً ان کی ہر تصنیف پر نمایاں ہے کہ وہ علم و ادب کا رشتہ کہیں ٹوٹنے نہیں دیتے، کیسا خشک سے خشک مضمون اور خالص علمی موضوع ہو، ان کا بہار آفریں قلم اور ان کا فطری ادبی ذوق (جو مولانا شبلی سے ان کو ورثے میں ملا تھا) مضمون کو شگفتہ اور تازہ بنا دے گا اور اس کا ادبی عنصر پڑھنے والے پر کتاب کو بار نہیں ہونے دے گا۔

سیرت النبی ﷺ میں معجزات کی بحث پڑھیے یا ارض القرآن میں جغرافیائی و تاریخی تحقیقات ہر جگہ آپ کا ادبی حاسہ اپنی غذا پائے گا اور آپ سے پڑھنے کی سفارش کرے گا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سید صاحب کی تحریر میں مولانا شبلی کی برجستگی و بے ساختگی اور فارسی ترکیب کی چستی نہیں، مگر شیرینی و سلاست اور ادبی محاسن پورے پورے موجود ہیں اور ان کی علمی تصنیفات تک کے بعض ٹکڑے ادبی شہ پارے معلوم ہوتے ہیں۔ خطبات مدراس کے بعض پیراگراف' سیرت النبی ﷺ کے بعض صفحات اور معارف کے بہت سے شذرات وہ تحریریں ہیں، جن پر ہمارے ادب عالی کو ملکیت کا دعویٰ ہے۔ نقوش سلیمانی کے بعض نقش ادبی حیثیت سے تعویذ بنا کر رکھے جانے کے قابل ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ میں نے ہندوستان و بیرون ہند کی سیاحت اور ممالک اسلامیہ سے قریبی واقفیت کے سلسلہ میں مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی جیسا جامع اوصاف اور مولانا سید سلیمان ندوی جیسا جامع فنون اور متنوع الذوق نہیں دیکھا۔

Marfat.com

اردو کے علاوہ عربی ادب وانشاء میں ان کا ایک خاص طرز تھا، جس میں کلاسیکل ادب کی پختگی وصحت اور جدید طرز کی سہولت اور سلاست دونوں شامل تھیں، مولانا حمید الدین فراہی کی کتاب ''ارمغان'' کا مقدمہ اور عربی رسالہ ''الضیاء'' کا افتتاحی مقالہ بتلا رہے ہیں کہ اگر وہ عربی تحریر وانشاء کا مشغلہ جاری رکھتے تو اس میں بڑا امتیاز کر سکتے تھے۔

یہاں برسبیل تذکرہ اتنا اور عرض کروں کہ عام طور پر لوگ سید صاحب کو مؤرخ یا ادیب کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ خصوصاً علماء کے قدیم حلقہ میں ان کا تعارف اسی سلسلہ سے ہے، لیکن مجھے سید صاحب کی علمی صحبتوں اور ذاتی استفادہ سے معلوم ہوا کہ ان کا امتیازی مضمون قرآن مجید اور علم کلام ہے۔ میں نے معاصر علماء میں کسی شخص کا مطالعہ قرآن مجید اور علوم قرآن کا اتنا وسیع اور گہرا نہیں پایا۔ علم کلام اور عقائد پر سید صاحب کی نظر بہت عمیق و وسیع تھی اور ان کو علم کلام کو سلف کے اصول اور کتاب وسنت کی روشنی میں عصر حاضر کے ذہن اور روح کے مطابق پیش کرنے کا خاص ملکہ حاصل تھا اور یہ غالباً مولانا حمید الدین فراہی کی طویل صحبت، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی کتابوں کے مطالعہ اور سیرت النبی ﷺ کی تالیف کے سلسلہ میں طویل غور وفکر کا نتیجہ تھا۔

یہاں اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ سید صاحب اپنے علم وتحقیق اور وسعت مطالعہ میں اپنے استاد ومربی مولانا شبلی مرحوم سے بہت آگے بڑھ گئے تھے۔ نئی نئی کتابوں کی اشاعت، مسلسل غور وفکر اور محنت ومطالعہ کی بنا پر اس میں کوئی تعجب کی بات بھی نہیں۔

کسی فن میں کامل اور نامور ہونا اور بات ہے اور اس کا تصنیفی ذوق اور اس میں شغف وانہماک اور بات ہے۔ اپنی مختصر زندگی میں اکثر یہ دیکھا کہ اکثر لوگ خاص ماحول اور خاص اوقات میں، صاحب علم اور صاحبِ ذوق نظر آتے ہیں۔ باقی اوقات میں ان میں کوئی علمی دلچسپی شوق ومطالعہ، جستجو اور کتابی ذوق نظر نہیں آتا۔ درحقیقت ان میں طالب

Marfat.com

علمانہ روح نہیں ہوتی۔ اس بارے میں میں نے دو شخصیتوں کو مستثنیٰ پایا، ایک مولانا انور شاہ کشمیریؒ، دوسرے مولانا سید سلیمان ندوی۔ اول الذکر کو کم دیکھا اور ان کی مجلسوں میں شرکت کا اتفاق ایک دوبار ہوا، مگر ان کی مجلسوں کو علمی تذکروں اور تحقیقات و افادات سے معمور پایا، لیکن سید صاحب کو خوب دیکھا۔ سفر و حضر میں رفاقت رہی اور کئی کئی دن مسلسل ساتھ رہنا ہوا۔ ان کا علمی ذوق ہر جگہ اور تقریباً ہر وقت قائم رہتا۔ مطالعہ، غور و فکر علماء و اہل فن سے تبادلۂ خیال اور بحث و نظر کا سلسلہ جاری رہتا، وہ فطرتاً طالب علم تھے، اور ان کا اصلی ذوق اور افتادِ طبع یہی تھی۔ مطالعہ ان کی غذا اور ان کا لازمۂ زندگی تھا۔ بیماری میں بھی ان کا ذہن کام کرتا رہتا تھا اور نقاہت و ضعف کی حالت میں بھی ان کا مطالعہ جاری رہتا، دیکھنے میں یہ معمولی بات ہے، لیکن قدیم و جدید حلقوں میں اب جو علمی بے تعلقی و بے ذوقی بڑھتی جارہی ہے اس کے پیش نظر کسی زمانہ میں یہ ایک یادگار بات ہوگی۔

سید صاحب میں علمی کام کرنے کا بڑا ولولہ اور اس کی قوت (ENERGY) تھی۔ وہ ہر تصنیف کو اس طرح مکمل کرنا چاہتے تھے اور اسی طرح اس کی طرف متوجہ ہوتے تھے، گویا یہ زندگی کی اصلی اور آخری تصنیف ہے۔ وہ اس کے سلسلہ میں اپنے امکان بھر کوئی کمی نہیں کرتے تھے۔ اس کے لئے ہزاروں صفحات کا مطالعہ کرتے، معلومات و اقتباسات جمع کرتے، پھر مرتب کرتے، اس سے فارغ ہوتے ہی بجائے آرام کرنے کے کوئی دوسرا سلسلہ شروع کردیتے اور اسی انہماک و نشاط کے ساتھ اس میں مصروف ہو جاتے' اس چیز نے ان کی صحت پر برا اثر ڈالا تھا، ان پر عرصہ سے کبر سنی اور ضعف کے آثار شروع ہو چکے تھے، انہوں نے کئی بار مجھے فرمایا کہ تمہارے والد (مولانا حکیم سید عبدالحئی ناظم ندوۃ العلماء) نے مجھ سے فرمایا تھا...... ع من نکردم شما حذر بکنید

مجھے تصنیف و مطالعہ نے قبل از وقت بوڑھا اور ضعیف کر دیا۔ تم احتیاط کرنا، فرماتے تھے کہ مجھ سے تو اس وصیت پر عمل نہ ہو سکا۔ اب یہ امانت تمہارے سپرد کرتا ہوں۔

Marfat.com

واقعہ یہ ہے کہ جو علمی مزاج اور طبیعت وہ لے کر آئے تھے۔ اس کے بعد ان کے لئے ممکن نہ تھا کہ وہ اپنا علمی انہماک کم کرسکیں، وہ اپنے علمی و تصنیفی کاموں میں برابر مشغول رہے اور اتنا بڑا تصنیفی ذخیرہ چھوڑا، جو ایک پوری جماعت کو مصنف بنانے کے لئے کافی ہے۔ یورپ و ایشیا میں کئی کئی آدمی مل کر زندگی کی تمام راحتوں اور سہولتوں کے ساتھ بعض اوقات اتنا علمی و تصنیفی کام نہیں کرتے، جو سید صاحب نے تنہا انجام دیا۔ تنہا سیرت النبیؐ (جو صرف سیرت کی کتاب نہیں بلکہ اسلامی عقائد و اخلاق کا انسائیکلو پیڈیا ہے) ان کی کارکردگی کی صلاحیت اور قوت عمل کا نمونہ ہے۔ حیاتِ شبلی دیکھنے میں ایک نامور عالم کی شخصی سوانح ہے، مگر حقیقتاً مسلمانوں کی ایک صدی کی دینی، علمی، تہذیبی اور فکری ارتقاء کی تاریخ ہے، جس کے بغیر مسلمانوں کے قومی مزاج اور موجودہ دور کو سمجھنا مشکل ہے۔ اس میں تقریباً تمام معاصر تحریکات اور اداروں کی سرگزشت بھی آگئی ہے۔ تنہا اس کتاب میں سید صاحب نے ہزاروں صفحات کا نچوڑ اور بیسیوں کتابوں کا مواد جمع کر دیا ہے۔

اس موقع پر اس کا اظہار بے محل نہ ہوگا کہ سید صاحب فطرتاً مطالعہ و تصنیف اور ذہنی و تعمیری کاموں کے لئے پیدا کئے گئے تھے اور اسی قسم کا مزاج اور طبیعت لے کر آئے تھے، وہ میدانی اور ہنگامہ خیز زندگی اور سیاسی تحریکات کے لئے موزوں نہ تھے، انہوں نے اپنی ذات اور ملت پر احسان کیا کہ اپنی اصلی طاقت اور زیادہ تر وقت تصنیفی و تعمیری کاموں میں صرف کیا۔ جب انہوں نے حالات کے دباؤ یا طبیعت کی ہمہ گیری کی وجہ سے اس دائرہ سے قدم نکالا، ان کو یہ محسوس ہوا کہ ان کا یہ میدان نہیں تھا۔ اسی طرح یہ بھی واقعہ ہے کہ وہ فطرتاً عوامی مقرر اور اسٹیج کے خطیب نہیں تھے۔ اس کا اصل جوہر غور و فکر تلاش و تحقیق اور تصنیف و تالیف تھا اور اس میں وہ پورے طور پر کامیاب تھے۔

سید صاحب نے جن اساتذہ اور علمی سرپرستوں کی رہنمائی اور جس ماحول میں ذہنی و علمی تربیت حاصل کی تھی، اس کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ ان کی نظر میں وسعت اور ان کی

Marfat.com

طبیعت میں اعتدال تھا، نہ ان میں بہت سے قدیم علماء کا سا جمود اور گروہی عصبیت تھی، نہ جدید طبقہ کی عجلت وسطحیت اور یورپ کی مرعوبیت تھی، وہ اپنے تعلیمی خیالات سے لے کر فقہی مسلک تک وسیع النظر، وسیع القلب اور معتدل تھے، اگر یہ صفت ان میں نہ ہوتی، تو ان کو مولانا محمد علی کی رفاقت، موتمر اسلامی کی شرکت، سفر افغانستان، علی گڑھ اور جامعہ ملیہ کے تعلقات ہر جگہ دشواری محسوس ہوتی، یہی نظر کی وسعت اور قلب کی فراخی تھی کہ انہوں نے ہندوستان کی ایک نامور علمی جماعت اور مشہور ادارہ کے سب سے بڑے آدمی ہوتے ہوئے اور اپنے مخصوص تعلیمی واصلاحی خیالات رکھنے کے باوجود مولانا اشرف علی تھانوی سے رجوع واستفادہ کیا اور اس میں ان کو کوئی رکاوٹ محسوس نہیں ہوئی، وسعت نظر کی ایسی مثالیں طبقۂ علماء میں کم ملیں گے۔

آخری چیز جو ان کی پوری زندگی میں نمایاں رہی، وہ ان کی طبیعت کی شرافت و مروت تھی، وہ بالکل بے آزار اور غیر منتقمہ طبیعت کے آدمی تھے۔ ان کے لئے ظالم کے بجائے مظلوم بننا بہت آسان تھا۔ ان کی یہ صفت اس درجہ تک پہنچی ہوئی تھی، جو کمزوری سے تعبیر کی جاتی تھی، ایک ایسی سوسائٹی میں جو اس طرح کی صفات کی قدر کرنے کی عادی نہیں، ان کو اپنی اس افتادِ طبع کی بڑی قیمت ادا کرنی پڑی اور اپنی رضامندی کے خلاف بہت سے فیصلے کرنے پڑے۔ اس طویل زندگی اور وسیع تعلقات میں شاید کوئی ایسا شخص مل سکے جو بیان کرے کہ سید صاحب نے اس کو کبھی نقصان پہنچایا یا اپنی ذات کا انتقام لیا۔ میرے سامنے ایک مرتبہ امین آباد میں ایک نوجوان نے سید صاحب سے بطور یادگار ایک منتخب شعر لکھنے کی فرمائش کی۔ سید صاحب نے خواجہ حافظ کا مشہور شعر لکھا

آسائش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است
بادوستاں تلطف با دشمناں مدارا

میرے خیال میں ان کا یہ انتخاب محض اتفاقی اور رسمی نہ تھا۔ یہ ان کا اصول

Marfat.com

زندگی تھا، جس پر وہ ہمیشہ کاربند رہے۔

یہ چند نقوش وتاثرات ہیں، جو اس وقت حوالہ قلم ہوئے، سوانح وسیرت لکھنے کے لئے اور ان کی زندگی کی مختلف حیثیتوں کو نمایاں کرنے کے لئے مستقل ادارے اور بڑے بڑے صاحبِ قلم موجود ہیں اور خاص طور پر ان کے جانشین اور بزم شبلی کے موجودہ صدر نشین برادر محترم مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی ناظم دارالمصنفین مستقل سوانح حیات لکھ رہے ہیں، جس میں ان کی زندگی اور کمالات کا پورا مرقع آجائے گا (مقام مسرت ہے کہ یہ کتاب ''حیاتِ سلیمانی'' کے نام سے شائع ہوگئی) یہاں تو کچھ ذاتی مشاہدات اور تاثرات اور اپنے تعلق سے کچھ واقعات اور تجربات پیش کرنے ہیں۔ اس سے دوسروں کی ضیافت طبع کا سامان اور ان کی معلومات میں اضافہ ہو یا نہ ہو اپنے قلب حزیں کی تسکین اور اپنے منت شناس دل کے اطمینان کا ضرور ذریعہ ہے ....

ہم نے اپنے آشیانے کے لئے
جو چبھے دل میں وہی تنکے لئے

خطباتِ حقانی

.... افادات : مولانا عبدالقیوم حقانی

دین وشریعت، علم وعمل اور مختلف اہم عنوانات پر مولانا عبدالقیوم حقانی کے مؤثر خطبات اور ولولہ انگریز تقاریر کا مجموعہ .... صفحات : 333 .... قیمت 100 روپے

ابوحنیفۂ ہند مولانا مفتی کفایت اللہؒ نمبر

ترتیب : مولانا عبدالقیوم حقانی

بڑی سائز، مضبوط جلد، الجمعیۃ ''دہلی'' کا ۲۳ رفروری ۱۹۵۳ء اور ۱۳ رمئی ۲۰۰۰ء میں شائع کردہ ''مفتی اعظم نمبر'' نئی ترتیب اور جدید اضافوں کے ساتھ۔ صفحات : 231

القاسم اکیڈمی جامعہ ابوہریرہ برانچ پوسٹ آفس خالق آباد، ضلع نوشہرہ، سرحد، پاکستان

Marfat.com

شاہ معین الدین احمد ندوی

سیّد سلیمان ندویؒ کے دینی و علمی خدمات
(اُن کی تصانیف کی روشنی میں)

حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ جیسی جامع کمالات شخصیتیں کہیں صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں۔ وہ اپنے کمالات میں ائمہ اسلاف کی یادگار تھے۔ جملہ اسلامی علوم پر اُن کی نظر نہایت گہری اور وسیع تھی اور بعض علوم میں امامت و اجتہاد کا درجہ حاصل تھا اور اُن میں اپنی علمی و دینی بصیرت اور تلاش و تحقیق کی ایسی یادگاریں چھوڑیں جو مدتوں علمی دنیا کی رہنمائی کا کام دیتی رہیں گی۔ ان کا علمی درجہ اتنا بلند اور ان کے علمی و دینی خدمات کا دائرہ اتنا وسیع اور گوناگوں اور اتنا متنوع ہے کہ اس کی تفصیل کے لئے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے۔ ایک مضمون میں اس کو سمیٹنا دریا کو کوزہ میں بند کرنے کی سعی لاحاصل کرنا ہے۔ اس لئے اس مضمون میں صرف اُن کی اہم تصانیف کی روشنی میں ان کے علمی کمالات پر اجمالی تبصرہ کیا جائے گا اور اُن کی تصنیفی خصوصیات دکھانے کی کوشش کی جائے گی، جس سے اُن کے علمی درجہ اور ان کی دینی و علمی خدمات کا سرسری اندازہ ہو سکے۔

اُن کی علمی و دینی خدمات کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے اس کے پس منظر سے واقفیت ضروری ہے۔ اس کے بغیر اس کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ اٹھارہویں خصوصاً اُنیسویں صدی میں مسلمانوں کے سیاسی زوال کے ساتھ پوری اسلامی دنیا کے ہر شعبۂ زندگی میں ایک عام جمود و انحطاط طاری ہو گیا تھا، اور حکومت کے ساتھ دین، ملت، علم و

Marfat.com

اخلاق اور تہذیب و روایات بھی رخصت ہو رہے تھے۔ مغربی قوموں کی یلغار ایک طرف اسلامی حکومتوں کو ختم کر رہی تھی، دوسری طرف ان کے علوم و فنون اور نظر فریب تہذیب مسلمانوں کے مذہب و اخلاق اور تہذیب و تمدن کے قلعوں کو مسمار کر رہے تھے اور مسلمان یورپ کی سیاسی غلامی کے ساتھ ساتھ اس کی ذہنی غلامی میں بھی مبتلا ہوتے جا رہے تھے، جو سیاسی غلامی سے بھی زیادہ سخت تھی۔

یہی حال ہندوستان کے مسلمانوں کا بھی تھا۔ خصوصاً ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد وہ اور بھی پست و پامال ہو کر رہ گئے تھے۔ عوام کو اس کا احساس نہیں تھا، اونچا طبقہ اس وقت بھی تعیش میں مبتلا اور خوابِ غفلت میں مدہوش تھا۔ علمائے کرام کا بڑا طبقہ اس انقلاب کے نتائج سے بے خبر پرانی بے روح مدرسی تعلیم، فقہی جزئیات کی ردوقدح اور فروعی مسائل میں جنگ و مناظرے میں مشغول تھا، تاہم اُن میں کچھ نفوس ایسے ضرور تھے، جن میں مسلمانوں کی اس زبوں حالی کا احساس اور اُن کی سیاسی و مذہبی تجدید و اصلاح کا جذبہ موجود تھا اور ان میں مجاہدانہ روح بھی تھی، مگر وہ بھی نئے حالات اور اس کے مقابلہ کے اسباب و ذرائع سے واقف نہ تھے اور صرف مذہبی تعلیم، اور مذہبی اصلاح کو مسلمانوں کی دینی اور دنیوی فلاح کا ذریعہ سمجھتے تھے، اور ان کی ساری کوششیں اسی دائرے کے اندر محدود رہیں۔ ان میں سے بعض مجاہدین قوت کے ذریعہ نئی حکومت کا تختہ اُلٹنا چاہتے تھے، مگر اس میں کامیابی کا کوئی امکان نہیں تھا۔

اس کے مقابلہ میں ایک نیا گروہ تھا۔ اس کا مقصد بھی مسلمانوں کی فلاح تھا۔ وہ نئے حالات اور اس کے مقابلہ کے وسائل سے بھی واقف تھا، مگر نئی حکومت، اس کے علوم و فنون اور اس کی تہذیب سے اس قدر مرعوب تھا کہ وہ محض جدید تعلیم اور مغربی تہذیب کی نقل و تقلید ہی کو مسلمانوں کی نجات کا ذریعہ سمجھتا تھا۔ اس لئے اس کی کوششیں زیادہ تر اسی دائرہ کے اندر محدود رہیں اور ان دونوں کوششوں سے مسلمانوں کو فائدہ پہنچا، اگر علماء کا طبقہ

Marfat.com

نہ ہوتا، تو ہندوستان سے دینی علوم اور دینی روح کا خاتمہ ہوجاتا اور نئے طبقہ کی کوششیں نہ ہوتیں، تو دنیاوی حیثیت سے مسلمانوں کا وجود ختم ہوجاتا، اس لئے ان دونوں کی کوششیں امت کے شکریہ کی مستحق رہیں۔

ان حالات میں سب سے سخت مرحلہ مسلمانوں کے مذہب اور ان کی تہذیب اور روایات کی مدافعت اور ان کے تحفظ کا تھا، جن پر دو سمتوں سے حملے ہورہے تھے۔ ایک عیسائی مشنریوں کا تبلیغی حملہ، دوسرے علم وتحقیق کی راہ سے، مشنریوں کا طریقہ تو پرانے بحث ومناظرے کا تھا۔ اس لئے اس دور کے علماء اور بعض نئے تعلیم یافتہ لوگوں نے اس کا پوری کامیابی سے مقابلہ کیا اور ان کے خطرات کو بڑی حد تک روک دیا، مگر مشنریوں سے کہیں زیادہ خطرناک، اور ضرر رساں مستشرقین اور فضلائے مغرب کی جماعت تھی، جس نے پرانے طرز کے اعتراضات اور بحث ومناظرے کی بجائے جن کی اس عقل ودانش کے زمانہ میں کوئی قدر وقیمت نہ رہ گئی تھی۔ ایک نیا علمی اور سائنٹفک طریقہ اختیار کیا، انہوں نے عربی زبان سیکھی اور اس کی نادر ونایاب کتابیں تلاش کر کے بڑی محنت سے تصحیح وتحشیہ کے ساتھ ان کو شائع کیا اور خود مسلمانوں کی کتابوں سے غلط اور غیر معتبر واقعات وروایات ڈھونڈ کر اور صحیح روایات میں تدلیس وملمع سازی کر کے علم وتحقیق کے رنگ میں مذہب اسلام اور اسلامی تاریخ وتہذیب پر اعتراضات شروع کردیئے اور ان کو ایسی بدنما شکل میں پیش کیا کہ انہیں پڑھ کر خود مسلمانوں کو شرم آنے لگی، ان مستشرقین میں ایسے بھی ہیں، جو مذہب اسلام اور اسلامی تہذیب کے بڑے مداح ہیں اور انہوں نے بڑی کشادہ دلی سے اسلام کی خوبیوں اور ساری دنیا خصوصاً یورپ پر مسلمانوں کے علمی وتمدنی احسانات کا اعتراف کیا ہے اور اس پر مستقل کتابیں لکھی ہیں، لیکن ایسے کم ہیں، جن کا دامن بالکل پاک ہو اور انہوں نے کسی نہ کسی پہلو سے کوئی نہ کوئی زہر چکانی نہ کی ہو۔

اس قسم کی تحریروں کا اثر نہ صرف دوسری قوموں بلکہ ان تعلیم یافتہ مسلمانوں پر بھی

Marfat.com

جو اپنے مذہب اور اپنی تاریخ سے واقفیت نہیں رکھتے، برا اثر پڑتا تھا اور اسلام کے متعلق ایک عام غلط فہمی پھیل رہی تھی۔ اس حملہ کے مقابلہ کے لئے دینی علوم میں پوری مہارت اور دینی بصارت کے ساتھ اسلامی تاریخ میں وسعتِ نظر، تلاش و تحقیق کے جدید طریقوں، مغربی زبانوں، جدید افکار و تصورات اور نئے رجحانات سے واقفیت ضروری تھی اور ان تمام باتوں کا اجتماع نہ پرانے علماء میں تھا اور نہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں، علماء کا بڑا طبقہ سرے سے ان حالات ہی سے بے خبر تھا، نیا طبقہ جو باخبر تھا، اس میں صحیح دینی روح نہ تھی، تاہم سب سے پہلے اسی طبقہ کے فضلاء میں سر سید احمد خان اور مولوی چراغ علی وغیرہ نے اپنی بساط کے مطابق اس فرض کو انجام دیا اور مستشرقین کے اعتراضوں کے جواب میں مضامین اور کتابیں لکھیں، مگر یہ لوگ دینی علوم کے ماہر نہ تھے اور نہ صحیح بصیرت رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ مغربی علوم اور مغربی تہذیب سے اس قدر مرعوب تھے کہ ہر چیز میں اسی کو رد و قبول کا معیار سمجھتے تھے، اس لئے حُسنِ نیت کے باوجود انہوں نے بھی وہی غلطی کی جو اسلام کی ابتدائی صدیوں میں یونانی فلسفہ کے اعتراضات کے جواب میں متکلمین فلاسفہ معتزلہ اور باطنیہ کر چکے تھے، لیکن جن اعتراضات کا جواب نہ بن پڑا، ان میں خود اسلامی عقائد و تعلیمات میں ایسی تاویلیں کیں، جن کو حقیقت سے کوئی علاقہ نہ تھا، تاہم انہوں نے حسنِ نیت سے اپنے مقدور بھر اس فرض کو انجام دیا اور اس سے ایک طبقہ کو فائدہ بھی پہنچا۔

علماء کی جماعت میں مولانا شبلی پہلے شخص ہیں، جن میں یورپین فضلاء کے اس علمی حملہ کے مقابلہ کے شرائط بڑی حد تک موجود تھے۔ وہ اسلامی علوم کے بھی ماہر تھے، اسلامی تاریخ پر بھی اُن کی نظر بہت وسیع تھی، نئے خیالات و رجحانات اور مستشرقین کے اعتراضات سے بھی ان کو ایک حد تک واقفیت تھی، اس لئے اُن کی نظر اس فتنہ کے تمام گوشوں تک پہنچی اور ہر گوشہ سے انہوں نے اس کو روکنے کی کوشش کی اور ان کے زمانہ میں جن اعتراضات کا زیادہ شہرہ تھا، اُن کے نہایت محققانہ جوابات دیئے۔ الجزیہ، کتب خانہ،

Marfat.com

سکندریہ اورنگزیب عالمگیر اور الانتقاد علی التمدن الاسلامی وغیرہ اس سلسلہ کے معرکۃ الآراء مضامین ہیں۔

اس سلسلہ میں اُن کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ متفرق اعتراضات کے جواب کے ساتھ انہوں نے مذہب اسلام، اسلامی تاریخ اور اسلامی تہذیب کو ایسے محققانہ اور دلنشین انداز میں پیش کرنے کا اس سلسلہ شروع کیا، جس میں اعتراض کی گنجائش باقی نہ رہے اور معترضین بھی اُن کی عظمت ماننے پر مجبور ہو جائیں اور اس سلسلہ میں بکثرت مضامین اور مستقل کتابیں لکھیں۔ یہ مضامین مقالات شبلی میں موجود ہیں اور اُن کی بیشتر تصانیف اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں اور اُن کی ساری تصانیف کا مرکز و محور ایک ہی نقطہ ہے، خواہ وہ کسی موضوع سے تعلق رکھتی ہوں۔ اس سے ایک نیا علم کلام پیدا ہوا، جس کی بنیاد پرانے فلسفہ اور منطق کے بجائے عقل و درایت اور تنقید و تاریخ پر ہے اور اس سلسلہ کی سب سے اہم کتاب سیرۃ النبی ﷺ ہے۔

بعض مستشرقین نے اسلام کے خلاف سب سے بڑا حربہ یہ اختیار کیا تھا کہ نعوذ باللہ پیغمبر اسلام ﷺ کی ذاتِ اقدس ہی کو اعتراضات کا نشانہ بنا کر مجروح کر دیا جائے۔ اس سے خود بخود اسلام کی پوری عمارت منہدم ہو جائے گی۔ چنانچہ انہوں نے آنحضرت ﷺ پر مختلف قسم کے اعتراضات کا سلسلہ شروع کیا۔ علامہ شبلی مرحوم نے ان متفرق اعتراضات کا جواب دینے کے ساتھ ساتھ سیرۃ النبی ﷺ پر ایک مبسوط کتاب لکھنے کا ارادہ کیا، جس میں سوانح نبویؐ کے ساتھ اسلام کے عقائد و احکام و اعمال کی بھی تفصیل آ جائے اور وہ سیرت پاک اور اسلام کا ایسا صحیح اور دلکش مرقع ہو، جس میں کسی اعتراض کی گنجائش ہی باقی نہ رہے اور جسے دیکھ کر مخالفین کو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے لائے ہوئے مذہب کی حقانیت و صداقت اور عظمت و جلالت کا یقین ہو جائے۔ چنانچہ بڑے سر و سامان سے اس کتاب کی تالیف شروع کی، مگر ابھی اس کی دو جلدیں لکھی تھیں اور

Marfat.com

وہ شائع بھی نہ ہوئی تھیں کہ ان کا وقت آخر آ گیا اور وہ اس کام کی تکمیل اپنے لائق شاگرد مولانا سید سلیمان ندوی کے سپرد کر گئے۔ جنہوں نے نہ صرف اس عظیم الشان کام کو مکمل کیا، بلکہ اسلامی علوم و فنون میں تلاش و تحقیق اور اس کی تعبیر و ترجمانی کی نئی نئی راہیں نکالیں اور اس کی مختلف شاخوں میں اپنے علم و نظر کی وسعت اور تحقیق و تلاش کے بے مثال نمونے چھوڑ گئے۔

ان کے علمی و دینی خدمات کا دائرہ نہایت وسیع ہے، مگر ان سب کی غرض و غایت تقریباً ایک ہے، یعنی اسلامی احکام و تعلیمات کی صحیح اور دلنشین تعبیر و ترجمانی اور اسلامی علوم و فنون، اسلامی تاریخ، اسلامی تہذیب و ثقافت اور مسلمانوں کے علمی تمدنی کارناموں کی محققانہ مرقع نگاری، یہ موضوع اتنا وسیع ہے کہ اس میں پوری اسلامی تاریخ آ جاتی ہے اور ان کی بیشتر بلکہ تقریباً کل تصانیف اور مضامین کا محور و مرکز یہی نقطہ ہے گو اُن کے ہمہ گیر علم و قلم کی عنان کبھی کبھی خاص علم و ادب کی جانب بھی مڑ جاتی تھی، مگر بہت کم مضامین ایسے نکلیں گے، جو کسی نہ کسی حیثیت سے اصل مرکزی مقصد سے تعلق نہ رکھتے ہوں۔ ان کی نظر تمام اسلامی علوم پر یکساں تھی، مگر قرآن مجید، قدیم و جدید عام کلام اور اسلامی تاریخ اُن کا خاص موضوع تھے اور اُن کے بیشتر مضامین و تصانیف اسی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں سیرۃ النبیؐ ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں اُن کے خاص فنون کا اجتماع ہے اور ان کے علم و تحقیق کی تمام شانیں نمایاں نظر آتی ہیں۔

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

یہ کتاب اپنی خصوصیات میں سیرۃ کے سارے ذخیرۂ کتب میں خواہ وہ کسی زبان میں لکھی گئی ہوں، منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ حتیٰ کہ عربی میں بھی اس نوعیت کی ایسی جامع کوئی سیرت نہیں لکھی گئی۔ سیرۃ النبی کی تالیف سے پہلے اردو میں سیرۃ نبویؐ پر جس قدر کتابیں لکھی

Marfat.com

گئیں، وہ زیادہ تر مغازی اخلاق وشمائل نبویؐ پر مشتمل ہیں اور اُن میں روایات کی صحت اور تحقیق وتنقید کا کوئی اہتمام نہیں کیا گیا اور وہ ہر قسم کی رطب ویابس روایات کا مجموعہ ہیں، صرف بعض کتابیں مثلاً قاضی سلیمان صاحب منصور پوری کی رحمۃ للعالمین اور اس قسم کی چند کتابیں اس سے مستثنیٰ تھیں، مگران کا نقطۂ نظر بھی دارالمصنفین کی سیرۃ النبیؐ سے مختلف تھا اور وہ صرف دیندار مسلمان کے ذوق کی تھیں، ان میں مستشرقین کے اعتراضات کے جوابات اور جدید ذوق ورجحان کی تشفی کا کوئی سامان نہ تھا۔ اس لحاظ سے اردو میں یہ پہلی کتاب سیرۃ ہے، جس میں ان تمام ضروریات کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے اور جس میں سوانح اور شمائل نبویؐ اور اسلام کی تعلیمات کو ایسے محققانہ اور دلنشین انداز میں پیش کیا گیا ہے، جس سے منکرین ومخالفین بھی اُن کی صداقت وعظمت ماننے پر مجبور ہو جائیں۔ اس کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں کہ وہ تنہا سوانح نبویؐ نہیں ہے بلکہ اس میں اسلام کے عقائد، عبادات، معاملات اور اخلاق کا خلاصہ آ گیا ہے، اور اس حیثیت سے وہ اسلامی تعلیمات کی دائرۃ المعارف کہلائی جا سکتی ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ روایات کے رد وقبول میں بڑی احتیاط برتی گئی ہے اور اُن کی تحقیق میں نقد وجرح اور روایت ودرایت کے تمام محدثانہ اور محققانہ اصولوں کو کام میں لایا گیا ہے اور صرف معتبر اور مستند روایتیں لی گئی ہیں۔ اس سلسلہ میں سیرۃ النبیؐ کا مقدمہ جس میں سیرت نبویؐ کے عربی ماخذوں اور روایت ودرایت کے اصولوں پر بحث کی گئی ہے، نہایت اہم چیز ہے۔

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اسلام اور آنحضرت ﷺ پر ان تمام اعتراضوں کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے، جو مخالفین کرتے ہیں اور مناظرانہ بحث ومباحثہ اور اعتراض وجواب میں پڑنے کے بجائے نفس واقعہ کو ایسے محققانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ اعتراض خود بخود اٹھ جاتا ہے اور جو اعتراضات غیر معتبر روایات پر مبنی ہیں، وہ ان کی تنقید ہی سے رد ہو جاتے ہیں۔ اسی کے ساتھ جدید دور کے سیرت نگاروں اور متکلمین کی غلطیوں سے پورا احتراز کیا گیا

Marfat.com

ہے اور محض اعتراض سے بچنے کے لئے نہ کسی صحیح واقعہ کا انکار کیا گیا ہے اور نہ غلط تاویل کی گئی ہے، بلکہ اعتراض پر محققانہ نگاہ ڈالی گئی ہے، جو اعتراضات غلط فہمی یا قصورِ نظر کا نتیجہ ہیں، اُن میں غلط فہمی کا ازالہ کیا گیا ہے، جو غیر معتبر روایات پر مبنی ہیں، ان پر تنقید کر کے ان کی بے اعتباری ظاہر کر دی گئی ہے اور جو معترضین کے خودساختہ نقطۂ نظر کا نتیجہ ہیں، اُن میں نقطۂ نظر ہی کو غلط ثابت کیا گیا ہے اور کسی مسئلہ میں صحیح اسلامی نقطۂ نظر سے قلم ہٹنے نہیں پایا ہے اور سارے مسائل کو قرآن مجید اور احادیث نبویؐ کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے اور کسی عقیدہ وخیال میں سلفِ صالحین کے عقیدہ سے انحراف نہیں کیا گیا ہے۔

یہ کتاب چونکہ اسلامی تعلیمات کا بھی خلاصہ ہے، اس لئے اس میں مذہبی عقائد، شرعی قوانین، اخلاقی اصول اور تاریخی واقعات ہر قسم کے مسائل زیرِ بحث آئے ہیں، جن میں عالمِ غیب، وحی، ملائکہ، یومِ آخرت، جزاوسزا، دلائل ومعجزات وغیرہ جیسے مابعد الطبیعی نازک مسائل بھی ہیں، جن کو ایمانی ذوق اور وجدانِ سلیم کے بغیر تنہا عقل اور مادی حواس کی مدد سے سمجھنا مشکل ہے اور ایسے موقعوں پر بڑے لوگوں سے چوک ہو جاتی ہے، مگر مصنف نے ادنیٰ لغزش کے بغیر اس خوبی سے ان نازک مراحل کو طے کیا ہے کہ کہیں بھی نقل و روایت اور کتاب وسنت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا ہے اور کسی صحیح عقیدہ کی غلط تاویل نہیں کی گئی ہے، دوسری طرف ہر بحث عقل و درایت کی حیثیت سے اس قدر مدلل، دلپذیر اور دلنشین ہے کہ عقلِ سلیم کے لئے اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ غرض سیرت نبویؐ علم ونظر کی وسعت، تحقیق وتنقید، دیدہ وری ونکتہ سنجی دلائل کی دلنشینی اور اسلامی تعلیمات کی صحیح اور حکیمانہ تعبیر وترجمانی کا ایسا شاہکار ہے اور اس میں مصنف کے علمی کمالات کے ایسے گوناگوں جلوے ہیں کہ اُن کی ایک جھلک بھی اس مضمون میں دکھانا ممکن نہیں، اگر سیرۃ النبیؐ کے مباحث کی طرف سرخیاں نقل کی جائیں تو بھی ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے گی۔ ایسی حالت میں ایک مختصر مضمون میں اس پر تبصرہ کی گنجائش کہاں سے نکل سکتی

Marfat.com

ہے۔ اس لئے صرف ہر جلد کے موضوع اور اس کے مباحث کا اجمالی خاکہ پیش کرنے پر اکتفا کی جائے گی، جس سے ان مباحث کی نوعیت کا اندازہ ہو سکے۔

سیرۃ النبیؐ چھ ضخیم مجلدات میں ہے۔ پہلے دو حصے علامہ شبلی کے قلم سے ہیں اور باقی چار مولانا سید سلیمان ندوی کی تالیف ہیں۔ پہلے حصہ میں فنِ سیرت پر ایک مبسوط مقدمہ ہے، جس میں سیرۃ نبویؐ کی اہمیت وضرورت اور سیرت نگاری کی مختصر تاریخ ہے اور اس کے قدیم ماخذوں کا جائزہ لیا گیا ہے اور سیرت سے متعلق حدیث، مغازی وسیرت اور تاریخ کی روایات کے ردوقبول کے بارہ میں محدثانہ اصول سے ناقدانہ بحث کی گئی ہے اور آخر میں سیرت کے یورپین مصنفین اور اُن کی تصانیف پر مختصر تبصرہ کیا گیا ہے۔ یہ مقدمہ اپنے معلومات ومباحث کے لحاظ سے ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے بعد دوسرے مقدمہ میں عرب کی قدیم سیاسی ومذہبی تاریخ ہے، جس میں خانہ کعبہ کی تعمیر اور حضرت اسمٰعیلؑ کے ذبیح ہونے کی بحث بھی آ گئی ہے۔

اس کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے۔ اس میں آنحضرت ﷺ کی ولادت سے لے کر پہلے حج تک غزوات وسرایا کے مفصل اور محققانہ حالات ہیں۔ اس میں اسلامی جہاد، غزواتِ نبویؐ، یہود خیبر کی جلاوطنی اور بعض ازواج مطہرات سے آنحضرت ﷺ کے نکاح کے متعلق جو اعتراضات کئے جاتے ہیں، ان کا محققانہ جواب بھی دیا گیا ہے۔ آخر میں غزوات پر مجموعی تبصرہ ہے، جس سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ اسلام کا مقصود (غزوات سے) قتل وخونریزی اور ملک گیری نہیں، بلکہ صرف اسلام کی پرامن تبلیغ اور عرب میں امن وامان کا قیام تھا اور یہ لڑائیاں محض کفار ومشرکین کی مزاحمت اور اُن کی زیادتیوں کی وجہ سے پیش آئیں۔ اس کے باوجود اسلام نے نہایت منصفانہ اصول جنگ اختیار کئے اور پرانے وحشیانہ طریقوں کا خاتمہ کر کے اسلامی جہاد کو عبادت اور کارِ خیر بنا دیا۔

دوسرے حصے میں نبوت کی پرامن زندگی یعنی اسلام کی تبلیغ واشاعت قبائلِ عرب

Marfat.com

کا قبولِ اسلام، مدینہ میں اسلامی حکومت کی تاسیس کے سادہ نظام، مذہبی انتظامات، شریعت کی تکمیل، اس کے اصولی عقائد، عبادات، معاملات، حلال وحرام، حجۃ الوداع، خطبۃ الوداع، وفات نبویؐ، آپؐ کے شمائل و معمولات، اخلاق وسیرت، ازواجِ مطہرات، اولاد اور اہل بیت کی زندگی کے حالات ہیں اور ان تمام حالات و واقعات کو خواہ وہ تبلیغ اسلام سے تعلق رکھتے ہوں یا میدانِ جنگ سے' خانگی زندگی سے متعلق ہوں یا پبلک زندگی سے پیغمبر کی حیثیت سے ہوں یا عام انسان کی حیثیت سے' دشمنوں سے متعلق ہوں، یا دوستوں سے، غرض زندگی کے جس شعبہ سے بھی تعلق رکھتے ہوں، اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ جس سے آپؐ کی پیغمبرانہ صداقت، اور اخلاقی عظمت پوری طرح نمایاں ہو جاتی ہے اور آپؐ کے خلقِ کریم کو دیکھ کر مخالف بھی آپؐ کی عظمت ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

جہاں تک خالص سیرت نبویؐ کا تعلق ہے، وہ ان دونوں حصوں پر ختم ہو جاتی ہے، مگر اس سیرت کی تالیف کا ایک اہم مقصد محمد الرسول اللہ ﷺ کے سوانح کے ساتھ آپ کے لائے ہوئے مذہب کو بھی پیش کرنا تھا۔ اس لئے باقی حصوں میں اسلامی تعلیمات کی تفصیلات ہیں۔ اس میں سب سے اہم مسئلہ دلائل و معجزات کا ہے، اگرچہ معجزات اور خوارق عادات تمام مذاہب میں مشترک ہیں، مگر عقل پرستوں کے عقل کی سمائی سے سب سے زیادہ وہی باہر ہیں۔ اس لئے تیسری جلد خاص دلائل و معجزات پر ہے۔ اس میں پہلے نفس معجزہ کی حقیقت اور قرآن مجید، قدیم وجدید فلسفہ اور علم کلام کی روشنی میں معجزہ کے امکانِ وقوع پر بڑی مبسوط بحث کی گئی ہے اور یہ دیکھا گیا ہے کہ خود نوامیس فطرت کے لحاظ سے بھی خوارقِ عادت یا معجزہ میں کوئی عقلی استبعاد نہیں ہے۔ اس میں حسبِ ذیل بحثیں ہیں۔ دلائل و معجزات کی حقیقت، دلائل و معجزات اور فلسفۂ قدیم و علم کلام، معجزات اور فلسفۂ جدید، معجزات کا امکان اور استبعاد، معجزات کا یقین، اس کی غرض و غایت، آیات و دلائل اور قرآن مجید، ان مباحث کے بعد خصائل نبوت یعنی مکالمۂ الٰہی، نزولِ ملائکہ، رویا اور معراج

Marfat.com

وشرح صدر کا بیان ہے، پھر ان آیات ومعجزات کا ذکر ہے، جو قرآن مجید اور معتبر روایات سے ثابت ہیں۔ اس کے بعد غیر معتبر روایات پر تنقید کی گئی ہے، پھر بعثتِ نبوی کی ان بشارتوں کا تذکرہ ہے، جو قدیم الہامی صحیفوں میں ہیں اور آخر میں خصائص محمدی ﷺ کا ذکر ہے۔ ان مباحث میں اس جامعیت اور استقصاء کے ساتھ معجزات پر بحث کی گئی ہے کہ اس کا کوئی گوشہ اور کوئی رخ چھوٹنے نہیں پایا ہے اور ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ معجزات کے صدور میں کوئی عقلی استحالہ نہیں ہے، اور نہ وہ نوامیس فطرت کے خلاف ہیں۔ دنیا میں بہت سے ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں، جن کی کوئی عقلی توجیہ نہیں ہوسکتی۔ اس لئے اگر خالقِ کائنات قادرِ مطلق کسی حق کے اثبات اور کسی پیغمبر کی تائید کے لئے خرق عادت اشیاء کا ظہور کردے تو اس میں کوئی عقلی استحالہ نہیں ہے اور معجزات کا مقصد صرف عوام کی تشفی ہوتا ہے، خواص کے لئے اس کی ضرورت نہیں ہوتی۔

چوتھی جلد اسلام کے بنیادی عقائد پر ہے اور اس میں نبوت، وحی، ملائکہ، قیامت، سزا و جزاء اور جنت و دوزخ وغیرہ جیسے مابعد الطبیعی مسائل پر بحث ہے۔ اس لئے وہ تیسری جلد سے بھی زیادہ اہم ہے۔ اس میں پہلے منصب نبوت پر ایک مبسوط مقدمہ ہے، جس میں نبوت کی حقیقت، اس کی اہمیت وضرورت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کے لوازم و شرائط بیان کئے گئے ہیں، پھر آنحضرت ﷺ کی بعثت کے وقت دنیا کی تمام قوموں کی مذہبی حالت، اور اُن کی اخلاقی اور روحانی پستی کا نقشہ دکھایا گیا ہے۔ خصوصاً عرب کے حالات زیادہ تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں، پھر آنحضرت ﷺ کی بعثت اور عربوں کی اصلاح میں آپ کو جو گوناگوں دشواریاں پیش آئیں اور بالآخر اسلام نے جو عظیم الشان انقلاب پیدا کیا، اس کی تفصیل ہے۔ اس کے بعد اسلام کے بنیادی عقائد یعنی اللہ تعالیٰ پر ایمان، فرشتوں، انبیاء ورسل اور کتب سماوی پر ایمان کی تفصیل ہے، پھر عالم برزخ، جزا وسزا، دوزخ وجنت اور قضا وقدر کے مباحث ہیں اور آخر میں ایمان کے نتائج کا ذکر ہے اور ان تمام نازک

Marfat.com

اور دقیق مسائل کو جن کا محض عقل و مادی حواس کے ذریعہ سمجھنا بہت دشوار ہے، ایسے حکیمانہ اور دلنشین انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ قلبِ سلیم کی تشفی کے لئے بالکل کافی ہے۔

پانچواں حصہ عبادات پر ہے۔ اس میں پہلے اعمالِ صالحہ کی اہمیت دکھائی گئی ہے اور اس کے اقسام بیان کئے گئے ہیں، جن میں سب سے زیادہ اہم عبادت ہے۔ اس کے بعد اسلامی عبادات کیلئے خصوصیات اس کے اعتدال و توازن پر روشنی ڈالی گئی ہے، پھر جسمانی عبادات یعنی نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج اور جہاد کی تفصیل اور ان کی حکمتوں اور مصلحتوں کی تشریح ہے، پھر قلبی عبادات جو جسمانی عبادات کی روح کی حیثیت رکھتی ہیں، مثلاً تقویٰ، اخلاص، توکل، اور صبر و شکر وغیرہ کی تفصیل اور اُن کی ایسی حکیمانہ تشریح ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسانی اخلاق کے تزکیہ و تطہیر اور تعلق مع اللہ کا سب سے بہتر وسیلہ اسلامی عبادات ہیں۔ اس سلسلہ میں دوسرے مذاہب کی عبادات سے اسلامی عبادتوں کو موازنہ بھی آ گیا ہے۔

چھٹا حصہ اخلاق پر ہے، دنیا کا سارا نظام اور انسانیت کا سارا شرف اخلاق ہی سے وابستہ ہے۔ اس لئے تمام مذاہب میں اخلاق کی اہمیت ہے اور اس حیثیت سے کہ اُن کا تعلق زیادہ تر حقوق العباد سے ہے۔ وہ عبادات سے بھی زیادہ اہم ہیں اور اسلام میں اُن کی سب سے زیادہ اہمیت ہے۔ یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی بعثت کا مقصد ہی مکارم اخلاق کی تکمیل بتلایا ہے۔ اس حیثیت سے یہ حصہ بھی نہایت اہم ہے، اور اس میں فلسفہ، اخلاق اور اس کی تمام جزئیات پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے، اور اسلامی اخلاق کے امتیازی پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا ہے۔ اس میں پہلے اسلام اور اخلاق حسنہ کا تعلق ظاہر کیا گیا ہے اور اسلام میں اس کی اہمیت دکھائی گئی ہے، پھر دنیا کے تمام اخلاقی معلموں میں آنحضرت ﷺ کا امتیاز نمایاں کیا گیا ہے، پھر اسلام کے فلسفۂ اخلاق پر روشنی ڈالی گئی ہے اور دوسرے مذاہب کی اخلاقی تعلیمات کی خامیاں اور کمزوریاں اور اُن کے مقابلہ میں

Marfat.com

اسلام کی اخلاقی تعلیمات کی جامعیت و کاملیت دکھلائی گئی ہے، پھر تعلیم اخلاق کے مختلف طریقوں کو بتلا کر آنحضرت ﷺ کے طریقۂ تعلیم کی خوبی ظاہر کی گئی ہے، پھر انسانوں کے باہمی حقوق و فرائض اور اخلاقِ فاضلہ اور اخلاقِ رزیلہ کی تفصیل ہے۔ آخر میں آدابِ معاشرت کا اجمالی ذکر ہے۔ اس طرح یہ کتاب اسلام کی اخلاقی تعلیمات کا مرقع ہے اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام نے اخلاق کو کتنی اہمیت دی ہے اور اس کی اخلاقی تعلیمات کس قدر جامع، کامل اور حکیمانہ ہیں۔

اسلام درحقیقت کوئی نیا مذہب نہیں ہے، بلکہ قدیم الہامی مذاہب کی اصلاح شدہ ترقی یافتہ اور آخری تکمیلی شکل ہے۔ ان مذاہب میں دو قسم کی خامیاں تھیں، ایک انسانوں کی پیدا کردہ، دوسری فطری۔ انسانوں کا پیدا کردہ نقص یہ تھا کہ انہوں نے اپنے حسبِ منشاء تصرفات کر کے اُن کی شکل اس قدر بدل دی تھی اور اُن میں اس قدر آمیزش کر دی تھی کہ اصل شکل کا پہچاننا مشکل تھا اور ان کا اصل مقصد ہی فوت ہو گیا تھا۔ اسلام نے اُن کو بیرونی آمیزش سے پاک کر کے اصلی شکل میں جلوہ گر کیا۔

فطری نقص یہ تھا کہ مذاہب درحقیقت انسانیت کی تکمیل کا نصاب ہیں اور نصاب تعلیم کی ترقی کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ اس لئے انسانی ارتقاء کے ساتھ مذاہب کی تعلیمات بھی بدلتی رہیں اور ہر دور کے انسانوں کی عقل و دانش، اُن کے حالات و ضروریات کے مطابق ان میں تغیر اور ترقی ہوتی رہی۔ قدیم انسانوں کی قوت، ادراک تعقل ادنیٰ درجہ کی تھی اور اُن کی ضروریات بھی سادہ اور محدود تھیں اور اُن کا دائرہ خاص خاص قوموں تک محدود تھا۔ ہاں ان میں عالمگیریت نہ تھی، اُن کے مذاہب بھی اس کے مطابق تھے، پھر جیسے جیسے انسان عقل و شعور میں ترقی کرتا گیا، اس کی ضروریات بڑھتی گئیں اور اس کی انسانیت کا دائرہ پھیلتا گیا، اسی قدر اُن کے مذاہب میں بھی بلندی، وسعت، گہرائی اور عالمگیریت آتی گئی اور پرانے مذاہب کی وہ تعلیمات جو ترقی یافتہ دور کے انسانوں کے لئے موزوں نہ رہ

Marfat.com

گئی تھیں، منسوخ ہوتی گئیں اور اُن کی جگہ نئی موزوں تعلیمات آتی گئیں اور مذہب کا ارتقاء انسانی ارتقاء کے ساتھ برابر جاری رہا۔ تا آنکہ انسان عقل و دانش کے کمال تک پہنچ گیا اور اس کے ساتھ اس کی ضرورتیں بھی نہایت وسیع ہوگئیں۔ ایسے ترقی یافتہ انسانوں کے لئے ایسے جامع، کامل، عالمگیر اور دائمی مذہب کی ضرورت تھی، جو اس کی جملہ دینی و دنیوی ضروریات کا کفیل ہو۔

یہی آخری تکمیل مذہب اسلام ہے، جو ایک مکمل نظام زندگی ہے اور جس کے دائرہ سے انسانی زندگی کا کوئی شعبہ بھی باہر نہیں ہے اور اس کی تعلیمات جملہ دینی و دنیوی اور مادی و روحانی ضروریات پر حاوی ہیں۔ سیرۃ النبی ﷺ میں اسلام کی اسی جامعیت و کاملیت اور اس کی تعلیمات کے حِکم و مصالح کو اس طرح دکھایا گیا ہے کہ گذشتہ تمام مذاہب کے مقابلہ میں اسلام کا امتیاز نمایاں اور ظاہر ہوجاتا ہے۔ اس لحاظ سے سیرۃ النبی ﷺ جدید علم کلام کی بڑی معرکۃ الآراء کتاب ہے اور اسلام کا ایسا کامل مرقع ہے، جس میں اس کے سارے خدوخال نمایاں ہیں۔

خطباتِ مدراس

اس سلسلہ کی دوسری اہم کتاب خطباتِ مدراس ہے۔ یہ وہ خطبات ہیں، جو مدراس کے بعض دیندار مسلمانوں کی فرمائش پر اکتوبر ۱۹۲۵ء میں مدراس میں سیرۃ نبویؐ کے مختلف پہلوؤں پر دیے گئے تھے، انہیں بعد میں کتابی شکل میں شائع کر دیا گیا۔ یہ کل ڈیڑھ سو صفحوں کی کتاب ہے، مگر اپنے معلومات کی وسعت، مباحث کی ندرت اور افادہ کے لحاظ سے سیرت کی ضخیم کتابوں پر بھاری اور تنہا یہ کتاب مصنف کے فخر کے لئے کافی ہے۔ اس میں ایک نئے نقطۂ نظر اور نئے اسلوب سے سیرۃ نبویؐ کے ان پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے، جن کی جانب بہت کم توجہ کی گئی ہے، یعنی آنحضرت ﷺ کی تاریخی حیثیت، آپؐ کی جامعیت و کاملیت اور آپؐ کی زندگی کے عملی پہلو پر اس طرح روشنی ڈالی گئی ہے، جس

Marfat.com

سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام میں ساری دنیا کے لئے نمونۂ عمل آپؐ ہی کی ذاتِ مقدس ہو سکتی ہے۔

آنحضرت ﷺ سے پہلے جس قدر بھی انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوئے، وہ سب اپنے زمانہ کے پیغمبر برحق تھے، لیکن بعثت کسی خاص قوم، خاص خطۂ زمین اور ایک محدود زمانہ تک اور ایک محدود مقصد کے لئے تھی۔ اس لئے ان کی تعلیمات کا دائرہ بھی محدود تھا اور وہ ان کے زمانہ کے بعد منسوخ ہو گئیں۔ اس لئے ان کے حالات اور ان کی تعلیم میں آئندہ زمانہ کے لئے تاریخی استناد اور جامعیت و کمال کی ضرورت ہی نہ تھی، اس لئے قدرت کی جانب سے بھی اس کا انتظام نہیں کیا گیا۔ چنانچہ جن جن پیغمبروں کے نام معلوم ہیں اور جن کے مذاہب موجود ہیں، ان میں سے کسی کے مستند تاریخی حالات نہیں معلوم، بلکہ بعض کی شخصیت تک مشتبہ ہے اور جن کے حالات کچھ معلوم ہیں، وہ اتنے ناقص اور غیر معتبر ہیں کہ اُن سے زندگی کے کسی شعبہ میں بھی رہنمائی نہیں ہو سکتی، مگر خاتم النبیین ﷺ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں تھا اور اسلام ساری دنیا کے لئے دائمی مذہب بنا کر بھیجا گیا تھا اور آپؐ کی ذات جامع کمالات بنائی گئی تھی۔ اس لئے آپؐ کے حالات کی حفاظت کے لئے قدرت کی جانب سے یہ اہتمام کیا گیا کہ تیرہ صدیاں گذر جانے کے بعد بھی آپؐ کی پوری زندگی کا ایک ایک واقعہ اور ہر ہر پہلو اس تفصیل اور اس تاریخی استناد کے ساتھ محفوظ ہے کہ دنیا کی کوئی تاریخ بھی صحت و استناد میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ خطبات مدراس میں آنحضرت ﷺ کی اسی تاریخیت، آپؐ کے حالات کی جامعیت اور آپؐ کی تعلیمات کی کاملیت پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

پہلے خطبہ میں دکھایا گیا ہے کہ انسانیت کی تکمیل صرف انبیاء علیہم السلام کی سیرت ہی سے ہو سکتی ہے اور تاریخی شواہد سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ وہ سلاطین و کشور کشا جنہوں نے دنیا کا نقشہ بدل دیا، وہ مدبرین و سیاست دان، جنہوں نے قوموں کی قسمتیں پلٹ دیں، وہ

Marfat.com

مقننین جنہوں نے بڑی بڑی حکومتوں کے دستور بنائے اور وہ حکماء وفلاسفر جنہوں نے بہتر سے بہتر فلسفے پیدا کئے، انسانیت کے امراض کا مداویٰ اور دلوں کی دنیا منور نہ کر سکے اور آج دنیا میں جہاں کہیں بھی اخلاق و روحانیت کا نور نظر آتا ہے، وہ صرف انبیاء علیہم السلام کا فیض ہے۔

دوسرے خطبہ میں آنحضرت ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے دائمی اور عالمگیر نمونۂ عمل ہونے پر بحث کی گئی ہے، اور اس سلسلہ میں سیرتِ محمدیؐ کے تاریخی و تکمیلی پہلوؤں اور اُس کی جامعیت وعملیت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ دکھایا گیا ہے آج ہم کو جن پیغمبروں کے نام معلوم ہیں، ان میں صرف رسول اللہ ﷺ کے مستند تاریخی حالات کا علم ہے اور اس جامعیت کے ساتھ کہ آپؐ کی پوری زندگی کا ہر پہلو پوری طرح محفوظ ہے اور اس میں ہر شعبۂ زندگی کے لئے اسوۂ عمل موجود ہے، پھر آئندہ خطبات میں اُن میں ہر ایک پہلو پر تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔

تیسرے خطبہ میں سیرتِ نبویؐ کے تاریخی پہلو پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے، اور یہ دکھایا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی سیرت پر جس قدر تاریخی مواد موجود ہے، اتنا مواد دنیا کے کسی بڑے سے بڑے انسان کے حالات میں نہیں مل سکتا اور اس سلسلہ میں سیرت کے تمام ماخذوں قرآن مجید، کتبِ حدیث، مغازی وسیرت، تاریخ اور دلائل وشمائل نبویؐ کے پورے ذخیرہ کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس میں ان علوم کی اجمالی تاریخ آ گئی ہے، اور پھر محدثانہ اصول سے اس ذخیرہ پر بحث وتنقید کی گئی ہے، ان بحثوں سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی سیرت پر جتنا مستند ذخیرۂ معلومات موجود ہے، اس کے عشر وعشیر غیر مستند حالات بھی کسی پیغمبر کے نہیں مل سکتے۔

چوتھے اور پانچویں خطبہ میں آپؐ کی جامعیت وکاملیّت پر بحث کی گئی ہے۔ یہ دونوں چیزیں درحقیقت ایک ہی چیز کے دو رُخ ہیں۔ کاملیت سے یہ مراد ہے کہ شروع

Marfat.com

زندگی سے وفاتِ نبویؐ تک آپؐ کی زندگی کا ہر واقعہ محفوظ ہے۔ مثلاً خاندان، آباء و اجداد، پیدائش، شیرخوارگی، بچپن، سنِ شعور، جوانی، اس زمانہ کے مشاغل، پیشہ، شادی، احباب، قبل از نبوت، قریش کے معاہدہ میں شرکت، امین کا خطاب، آثارِ نبوت، تنہا پسندی، غارِ حرا کی خلوت نشینی، اور چلہ کشی نبوت کا آغاز وحی، اسلام کا ظہور، اس کی دعوت، اس راہ کے مشکلات و مصائب، ہجرت، قیامِ مدینہ، غزوات کے حالات، دعوتِ اسلام کے خطوط، اسلام کی اشاعت و تکمیل، حجۃ الوداع اور وفات وغیرہ کے تمام حالات محفوظ و معلوم ہیں۔ اسی طریقہ سے زندگی کے تمام معلومات اور عادات و خصائل کے حالات شمائل کی کتابوں میں موجود ہیں، جن سے آپؐ کی زندگی کے جزوی سے جزوی واقعہ کا علم ہو سکتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ واقعات بھی جن میں وحی کے ذریعہ آپؐ کو تنبیہ کی گئی ہے اور ایسے واقعات بھی جن پر مخالفین اعتراض کرتے ہیں' بجنسہٖ محفوظ ہیں، یہ سیرتِ نبویؐ کا تکمیلی پہلو ہے۔

اس کا دوسرا پہلو اس کی جامعیت ہے یعنی مختلف انسانی طبقات اور اُن کی زندگی کے ہر پہلو اور ہر انسانی ضرورت کے متعلق آپؐ کی زندگی میں اسوۂ عمل موجود ہے۔ مثلاً شاہ و گدا، حاکم و محکوم، فاتح و مفتوح، امیر و غریب، تاجر و مزدور، عزیز اور دوست وغیرہ مختلف حالتوں اور حیثیتوں سے آپؐ نے زندگی بسر کی ہے۔ اس لئے ان سب کی حیثیت اور اُن کے تعلقات و فرائض کا سبق بھی ہم کو سیرتِ پاک سے مل سکتا ہے، پھر ہر انسان کے معمولاتِ زندگی اور روزانہ کے کاروبار مثلاً اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، سونے جاگنے، ہنسنے بولنے، لین دین، تعلیم و تعلم، عبادت و ریاضت وغیرہ ان تمام معمولات و مشاغل کا سبق بھی جو روزانہ کی زندگی میں پیش آتے ہیں، ہم حیاتِ طیبہ سے سیکھ سکتے ہیں، حتیٰ کہ انسانی اوصاف اور اُن کے ذہنی و جذباتی کیفیات و احوال مثلاً خوشی و رضامندی، غم و غصہ، عزم و استقلال، صبر و توکل، شجاعت و شہامت، استغناء و قناعت، جود و سخا، تواضع و انکسار وغیرہ تک کی تعلیم بھی ہم کو اسوۂ نبیؐ سے ملتی ہے۔ غرض انسانی زندگی کے ہر شعبہ اور ہر حالت اور

Marfat.com

اس کے سارے مظاہر کا سبق ہم سیرتِ نبویؐ سے سیکھ سکتے ہیں۔

چھٹے خطبہ میں سیرت نبویؐ کے عملی پہلو کو دکھایا گیا ہے، یعنی آپؐ نے جو اخلاقی تعلیمات دی ہیں، آپؐ خود اُن کا عملی نمونہ تھے، اس سلسلہ میں آپؐ کی زندگی سے ہر قسم کے اخلاقِ فاضلہ کے واقعات نقل کئے گئے ہیں۔

ساتویں خطبہ میں دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں پیغامِ محمدیؐ کی جامعیت و عالمگیریت اور اس کی پیدا کردہ اصلاحات اور دوسری انقلاب انگیز خصوصیات پر بحث کی گئی ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ جملہ مذاہب کی مشترک اور بنیادی تعلیمات یعنی ایمان و عمل صالح، عقائد و عبادات اور اخلاق و معاملات وغیرہ کو اسلام ہی نے تکمیل تک پہنچایا اور دوسرے مذاہب کی کتابیں اور اُن کے صحیفے اس حیثیت سے بالکل ناقص ہیں۔ چنانچہ توراۃ وانجیل میں عقائد و عبادات تک کی تعلیمات اتنی مبہم، غیر واضح اور ناصاف ہیں کہ ان سے عیسائی اور یہودی مذاہب کے عقائد و عبادات کی تفصیل نہیں معلوم ہو سکتی، توراۃ میں دنیاوی قوانین البتہ کسی قدر تفصیلی ہیں، مگر اوّلاً وہ نہایت سخت ہیں، جس کا تحمل انسانی طاقت کے لئے دشوار ہے، دوسرے بعض حیثیتوں سے ناقص بھی ہیں، پھر اُن کا دائرہ صرف بنی اسرائیل تک محدود ہے۔ اسلام نے ان کی سختی کو کم اور اُن کی خامیوں کو دور کر کے اُن کو معتدل اور عالمگیر بنایا۔ اسی طرح اخلاق کے ناقص حصہ کی تکمیل کی۔ اسلام سے پہلے انسان ہر اس قوت کے سامنے جس سے اس کے وہم میں ضرر کا اندیشہ یا فائدہ کی اُمید ہوتی، سربسجود ہو جاتا تھا، جس سے بے شمار دیوی اور دیوتا پیدا ہو گئے تھے۔ عیسائی اور یہودی مذہب میں اگرچہ اس قسم کے معبودانِ باطل کی پرستش نہیں ہوتی تھی، مگر ان میں قسیسین اور رہبانوں کو خدائی کا درجہ حاصل تھا۔ اسلام پہلا مذہب ہے، جس نے انسان کو اشرف المخلوقات قرار دے کر اس کی عظمت نمایاں کی اور یہ بتلایا کہ انسان کائنات کے لئے نہیں پیدا کیا گیا ہے، بلکہ کائنات اس کی خدمت کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ اس لئے دنیا کی کوئی

Marfat.com

چیز بھی اُس کی پرستش کے لائق نہیں ہے۔ توحید کا یہ پہلا سبق اسلام ہی نے پڑھایا۔ دنیا کے تقریباً تمام مذاہب نے انسان کو فطرۃً خطا کار قرار دیا ہے، جس سے نجات پانا دشوار ہے۔ اسی سے آریائی مذاہب میں تناسخ کا اور عیسائیوں میں کفارہ کا عقیدہ پیدا ہوا، مگر اسلام نے انسان کو فطرۃً معصوم اور گنہگاری کو بُرے اعمال کا نتیجہ قرار دیا اور ہر انسان کے لئے نجات کی راہ کھلی رکھی۔ اسلام سے پہلے انسانیت نسلی اور جغرافیائی حدود میں بٹی ہوئی تھی۔ اسلام نے ان حدوں کو توڑ کر عالمگیر انسانی برادری قائم کی۔ دوسرے تمام مذاہب میں درمیانی واسطوں کے بغیر خدا تک نہیں پہنچا جا سکتا تھا، اسلام نے ان واسطوں کو ختم کر کے براہِ راست ہر انسان کا خدا سے تعلق قائم کیا۔ پیغمبروں اور صلحاء واخیار کے ساتھ فرطِ عقیدت نے شرکت و بت پرستی کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اسلام نے ان کا صحیح درجہ متعین کر کے شرک کے ایک بڑے وسیلہ کو ختم کیا۔

آٹھویں خطبہ میں پیغامِ محمدیؐ کی بنیادی تعلیمات کو بتلایا اور دکھایا گیا ہے کہ اسلام سے پہلے کسی مذہب میں بھی خالص توحید نہیں تھی، جن مذاہب میں کسی حد تک تھی بھی تو وہ خدا اور بندہ کے تعلق کی تشبیہ و تمثیل اور اس کی ذات وصفات میں التباس واشتباہ اور افعالِ خداوندی کی نیرنگیوں کی غلط تعبیر کی وجہ سے شرک میں بدل گئی تھی۔ اسلام نے اس سارے التباس واشتباہ کو دور کر کے شرک کا ہر دروازہ بند کر دیا اور دنیا میں توحیدِ خالص کو پہلی مرتبہ پیش کیا۔ اسی طرح عبادت کے غلط مفہوم یعنی ترکِ دنیا، رہبانیت اور جسمانی اذیت کو مٹا کر اس کی صحیح شکل بتلائی اور اس کا اصلی مقصد و منشاء واضح کیا۔

اسلام سے پہلے انسانی جان کی کوئی قیمت نہ تھی اور وہ دوسروں کی ملک سمجھی جاتی تھی۔ آقا غلام کو قتل کر سکتا تھا، دیوی اور دیوتا پر انسانوں کی قربانی عام تھی، عورت شوہر کی نعش کے ساتھ ستی ہو جاتی تھی، لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیا جاتا تھا۔ اسلام نے انسانی جان کا احترام قائم کیا اور کسی انسان کو خود اپنی جان کا بھی مالک نہیں بنایا، چنانچہ خودکشی تک حرام قرار

Marfat.com

دی۔ حسب ونسب کی تفریق کو مٹا کر تقویٰ کو معیارِ فضیلت اور اسلام کے عالمگیر تصور کے ماننے والوں کو آپس میں بھائی بھائی قرار دیا اور اس قبیل کی دوسری خطبات اور اس کے مباحث کا اجمالی خلاصہ یہ ہے جس سے اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ درحقیقت یہ تنہا کتاب اسلام اور پیغمبر اسلام کی صداقت وعظمت اور دوسرے مذاہب پر اس کی برتری کے ثبوت کے لئے کافی ہے۔

سیرتِ عائشہؓ

سلسلۂ سیرت کی تیسری کتاب سیرتِ عائشہؓ ہے، اگرچہ وہ حضرت عائشہؓ صدیقہ کی سوانح عمری ہی نہیں، ایک حیثیت سے وہ بھی سیرتِ نبوی کا ضمیمہ ہے، انسان کی زندگی میں اس کی رفیقۂ حیات کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ خصوصاً اگر بیوی تعلیم یافتہ اور ہوشمند ہو، تو شوہر کے کاموں کی تکمیل میں بڑی مدد ملتی ہے اور اس کے حالات سے شوہر کی زندگی کے مختلف رُخوں پر روشنی پڑتی ہے۔ اس حیثیت سے ازواجِ مطہراتؓ کے حالات بھی سوانح نبویؐ کا جزء ہیں۔ یوں تو بہت سی ازواجِ مطہرات تھیں، لیکن وہ بیویاں جن کو آں حضرت ﷺ کے مزاج میں زیادہ دخل تھا اور جنہوں نے کسی نہ کسی حیثیت سے دین کی خدمت کی، اور جن سے اسلام کی تبلیغ واشاعت میں مدد ملی، دو تھیں، حضرت خدیجہؓ اور حضرت عائشہؓ۔ حضرت خدیجہؓ نے سب سے پہلے آپؐ کی نبوت کی تصدیق اور اس زمانہ میں آپؐ کی تشفی و دلدہی کی، جب مکہ کا ذرہ ذرہ آپ کا دشمن ہو رہا تھا اور اُن کی دولت ووجاہت سے اسلام کی ابتدائی تبلیغ واشاعت میں بڑی مدد ملی، مگر ان کا انتقال ہجرت نبویؐ سے کئی سال پہلے ہو گیا تھا اور اسلام کی ترقی کا زمانہ انہوں نے نہیں پایا۔

حضرت عائشہؓ اس کے بعد آنحضرت ﷺ کے عقد میں آئیں اور وفاتِ نبوی ﷺ تک برابر ساتھ رہا اور اس کے بعد تقریباً نصف صدی تک زندہ رہیں۔ اس

Marfat.com

لئے اسلام کے عروج و ترقی کا پورا زمانہ انہوں نے آنکھوں سے دیکھا اور اس زمانہ کے بعض واقعات و حوادث میں بھی انہوں نے حصہ لیا۔ وہ اپنی ذاتی صلاحیتوں اور گوناگوں اوصاف و خصوصیات کے اعتبار سے اپنے دور کی نسوانی دنیا میں امتیازی درجہ رکھتی تھیں، اور اسلام کی ابتدائی تاریخ میں مختلف حیثیتوں سے ان کا نمایاں حصہ رہا ہے۔

وہ بڑی ذہین و ذکی اور ابتداء سے علم و تعلیم کی شائق تھیں اور اُن کے شعور کی آنکھیں تعلیم و تربیت گاہِ نبوت میں کھلیں، جہاں ہر وقت دینی تعلیم کا چشمہ اُبلتا رہتا تھا۔ اس لئے حضرت عائشہؓ پوری طرح اس چشمہ سے سیراب ہوئیں اور تعلیم کے جو مواقع بھی ان کو ملے، اُن سے انہوں نے پورا فائدہ اٹھایا اور اُن کو سب سے زیادہ اس کے مواقع حاصل تھے۔ اس لئے اُن کے ذوق و شوق اور تعلیم نبوی نے ان کو اپنے زمانہ کی بڑی عالمہ بنا دیا اور تفسیر و حدیث، فقہ و فتاویٰ وغیرہ و دینی علوم میں اُن کو بڑی دستگاہ حاصل تھی اور تفقہ کلام و عقائد اور اسرارِ دین تک پر اُن کی نگاہ بڑی گہری اور مجتہدانہ تھی، جس کا اندازہ ان کی روایات اور اُن کے فقہی مسائل سے ہوتا ہے۔ ان علوم میں وہ نہ صرف عورتوں بلکہ جماعتِ صحابہؓ میں امتیازی درجہ رکھتی تھیں اور بڑے بڑے صحابہؓ، محدثین، اور ائمہ اُن سے استفادہ کرتے تھے۔ وہ باقاعدہ دینی علوم کا درس دیتی تھیں، جن میں بڑے بڑے علماء شریک ہوتے تھے۔ حج کے زمانہ میں جب مکہ میں ساری دنیائے اسلام کا اجتماع ہوتا تھا، اُن کا حلقۂ درس قائم ہوتا تھا۔ اُن کے پاس دور دراز سے فتاویٰ آتے تھے۔ خلفائے راشدینؓ اور اکابر صحابہؓ تک ان مسائل میں جو اُن کے علم میں نہ ہوتے تھے، اُن کی جانب رجوع کرتے تھے، اگر اُن کے فتاویٰ کو جمع کیا جائے، تو کئی ضخیم جلدوں میں آئیں گے۔ اُن کے تلامذہ کی فہرست بڑی طویل ہے۔ غرض حضرت عائشہؓ کے ذریعہ دینی علوم کی بڑی اشاعت ہوئی۔ خصوصاً عورتوں سے متعلق بیشتر دینی احکام و مسائل انہی سے مروی ہیں۔ دینی علوم کے علاوہ، وہ اس زمانہ کے دوسرے مروّجہ علوم، انساب شعر و ادب اور تاریخ وغیرہ میں بھی

Marfat.com

مہارت رکھتی تھیں۔

انہوں نے طویل عمر پائی اور حضرت امیر معاویہؓ کے زمانہ تک زندہ رہیں۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد جو انقلاب برپا ہوا اور جس نے مسلمانوں کی مرکزیت کا شیرازہ منتشر کر دیا اور اُن کی تلواریں آپس ہی میں بے نیام ہوگئیں تو اس نازک صورتِ حال کی اصلاح کے لئے حضرت عائشہؓ نے اس زمانہ کی سیاست میں بھی حصہ لیا اور آخر تک اصلاحِ حال کی کوشش کرتی رہیں، مگر فریقین کے فتنہ انگیز عناصر کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکیں، جس میں شرکت کا انہیں بعد میں بڑا افسوس رہا۔

غرض دینی علوم کی مسند سے لے کر رزمگاہ سیاست تک حضرت عائشہؓ کے نہایت نمایاں کارنامے ہیں اور اسلام نے عورتوں کو صالح ترقی کے جو حقوق عطا کئے ہیں، حضرت عائشہؓ کی ذات اس کا عملی نمونہ تھی۔ انہوں نے اپنی ذہانت و قابلیت سے جنس نسوانی کا درجہ بلند کر دیا اور عملاً ثابت کر دکھایا کہ ایک مسلمان عورت نسوانی حدود میں رہ کر بھی علمی، اجتماعی اور سیاسی کاموں اور دنیا کے دوسرے حقوق و فرائض کی ادائیگی میں مردوں کے دوش بدوش کام کر سکتی ہے۔ وہ عورت تھیں، اس لئے اسلام میں عورتوں کے حقوق کی تعیین و تصریح اُن کے تحفظ اور عورتوں کی عظمت و وقار قائم کرنے میں اُن کا بڑا حصہ ہے اور ان امور سے متعلق اُن کی بکثرت روایتیں اور واقعات حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں۔ اس لئے سیرتِ نبویؐ کے اس پہلو کی وضاحت، اسلام میں جنس نسوانی کے حقوق کی تعیین، اس کے تحفظ و نگہداشت اور اس کی عملی مثال کی حیثیت سے سیرت نگار نبویؐ ہی کے قلم سے حضرت عائشہؓ کی سوانح نگاری کی ضرورت تھی۔

چنانچہ اسی نقطۂ نظر سے سیرتِ عائشہؓ لکھی گئی ہے، جس میں اُن کے حالات، اُن کے اوصاف و کمالات، اُن کے علمی و دینی اور سیاسی خدمات کو بڑی تفصیل سے دکھایا گیا ہے، اور ان کے اور حضرت علیؓ کے تعلقات اور جنگ جمل کے بارہ میں جو غلط واقعات

Marfat.com

مشہور ہیں اور اس سلسلہ میں بعض اسلامی فرقے اور آنحضرت ﷺ کی خانگی زندگی کے متعلق مستشرقین جو اعتراضات کرتے ہیں، اُن کی پوری تنقید وتردید کی گئی ہے۔ اس سوانح عمری سے یہ پوری طرح نمایاں ہوجاتا ہے کہ اسلام نے عورتوں کو کتنے حقوق عطا کئے ہیں اور اُن کا درجہ کتنا بلند کیا ہے اور اس پہلو سے حضرت عائشہؓ نہ صرف اپنے زمانہ کے اعتبار سے بلکہ موجودہ دور کے نسوانی ترقی کے صحیح اسلامی تصور کے لحاظ سے بھی کتنے بلند درجہ پر فائز تھیں اور آج بھی ایک مسلمان عورت اُن کی تقلید کے ذریعہ صحیح اور صالح ترقی کے بلند سے بلند مدارج تک پہنچ سکتی ہے۔

ارض القرآن

اس سلسلہ کی تیسری کتاب ارض القرآن ہے، اگرچہ اس کا موضوع سیرت سے جدا ہے، مگر بقولِ مصنف اس کو سیرۃ النبی کا دیباچہ سمجھنا چاہئے۔ اس کا مقصد کلام مجید کے بعض تاریخی اور جغرافیائی بیانات پر مستشرقین کے اعتراضات کا جواب اور عرب کے قدیم جغرافیہ اور تاریخ کی تحقیق وتنقید ہے۔ اسلام سے پہلے عربوں میں لکھنے پڑھنے کا رواج برائے نام تھا اور اُن کی پرانی تاریخ کا دارومدار زیادہ تر زبانی روایات اور قومی داستانوں پر تھا، جس میں غلط وصحیح کی آمیزش ناگزیر ہے۔ اس لئے ایک زمانہ تک عربوں کی قدیم تاریخ پردہ رہا، اسلامی عہد میں جب تاریخ نگاری شروع ہوئی تو عربوں کی زبانی روایات کی بنا عرب قبل از اسلام کی تاریخ کے بارہ میں صحیح وغلط ہر قسم کے واقعات شامل ہوگئے۔

مستشرقین نے جب عربوں کی تاریخ پر تحقیقات شروع کی، تو انہوں نے قدیم یونانی اور رومی مؤرخین وجغرافیہ نویسوں کے بیانات اور جدید اثری اکتشافات اور پرانے کتبات وغیرہ سے ایسے معلومات حاصل کئے جو عربوں کی قدیم روایات کے خلاف تھے۔

کلام مجید میں عبرت وبصیرت کے لئے عرب کی قدیم قوموں، اُن کے انبیاء و

Marfat.com

رسل اور اُن کے اماکن و آبادیوں کا ذکر کیا گیا ہے، جس کے بعض بیانات مستشرقین کی تحقیقات سے مطابقت نہیں کرتے۔ اس پر مستزاد یہ ہوا کہ بے احتیاط مفسرین نے ان بیانات کی تفسیر میں عربوں کی بہت سی زبانی روایات و اسرائیلیات نقل کر دیں۔ اس سے مستشرقین کو اور بھی اعتراض کا موقع مل گیا، جس سے اُن کے نزدیک قرآن مجید کی صداقت مشتبہ ہو جاتی تھی۔ ارض القرآن ان اعتراضات کے جوابات اور عرب کی قدیم تاریخ کی تحقیق میں لکھی گئی ہے، مگر سیرۃ نبویؐ کی طرح اس کا طرز بھی مناظرانہ کے بجائے تحقیقی و تنقیدی ہے۔ اس میں قدیم و جدید دونوں ماخذوں سے قدیم عرب کی محققانہ تاریخ اور اس کا جغرافیہ پیش کیا گیا ہے۔ کلام مجید کے بیان کردہ واقعات پر مستشرقین کے اعتراضات کی تنقید و تردید کا خصوصیت سے لحاظ رکھا گیا ہے، جس سے دونوں میں مطابقت پیدا ہو جاتی ہے۔ یا مستشرقین کی تحقیقات کی غلطی اور کلام مجید کے بیان کی صداقت ظاہر ہو جاتی ہے، یہ اگرچہ مصنف کی ابتدائی تصنیف ہے، مگر علم و نظر کی وسعت اور تحقیق و تنقید کے لحاظ سے دورِ کمال کی تصانیف سے کم نہیں ہے اور اس کے شروع کا حصہ جس کو کتاب کا مقدمہ سمجھنا چاہئے اور جس میں عرب کی تاریخ و جغرافیہ کے قدیم و جدید مآخذ (یعنی قرآن مجید، تفسیری روایات، اسرائیلیات، کلامِ عرب، عربِ قدیم کی تاریخ کے اسلامی مصنفین، اُن کی تاریخوں، کتب جغرافیہ، انسابِ عرب، اسرائیلی لٹریچر، رومی و یونانی مصنفین کی کتابوں، عربوں کی قدیم روایات اور جدید اثری اکتشافات پر بحث و تنقید ہے۔ بڑا فاضلانہ اور محققانہ ہے اور اس بحث و تنقید ہی سے اعتراضات کا میدان بہت تنگ ہو جاتا ہے۔

اس مقدمہ کے بعد عرب قدیم کا مفصل جغرافیہ، اس کی قدیم تاریخ اور کلام مجید میں جن اقوام و قبائل اور مقامات کا ذکر ہے، ان کی تاریخی و اثری تحقیق ہے اور دوسرے حصہ میں قرآن مجید، توراۃ، یونانی و رومی مصنفین کے بیانات اور اثری اکتشافات کی روشنی میں بنو ابراہیم کی تاریخ، عربوں کی قبل از اسلام تجارت، اور اُن کے مذاہب پر تفصیل کے

Marfat.com

ساتھ بحث اور جدید ماخذوں سے کلام مجید کے بیانات کی تائید وتوثیق کی گئی ہے اور مستشرقین کے بیانات کا رد کیا گیا ہے۔اس طرح یہ کتاب گویا عرب کی قدیم اقوام وملل اور اماکن ومقامات کے متعلق کلام مجید کے بیانات کی تاریخی ،جغرافیائی اور اثری تفسیر ہے اور اس کی روشنی میں اس کے بہت سے تاریخی وجغرافیائی بیانات کی تائید ووضاحت ہوجاتی ہے۔

عرب وہند کے تعلقات

مذکورۂ بالا علمی ومذہبی تصانیف کے علاوہ متعدد خالص علمی تصانیف بھی ہیں ،مگر وہ بھی متکلمانہ مقصد سے خالی نہیں ہیں ۔ان میں عرب وہند کے تعلقات اور خیام زیادہ اہم ہیں اور اپنے معلومات کی وسعت اور تلاش وتحقیق میں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہیں اور ان کو یورپین زبانوں کی اعلیٰ سے اعلیٰ تصانیف کے مقابلہ میں بلاتکلف پیش کیا جاسکتا ہے۔

ان دونوں میں عرب وہند کے تعلقات امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ کتاب اگرچہ خالص علمی وتاریخی ہے ،مگر اس کا مقصد ہندوؤں ومسلمانوں کے تعلقات کے متعلق بعض غلط فہمیوں کا ازالہ اور ان دونوں کے تعلقات کی قدامت سے ایک یہ بھی ہے کہ ہندوؤں سے مسلمانوں کا تعلق محض فاتحانہ اور حاکمانہ رہا ہے اور وہ سندھ کی اسلامی حکومت کو چھوڑ کر ہندوستان سے مسلمانوں کا تعلق غزنوی عہد سے شروع کرتے ہیں ،جن کا مقصد اُن کے نزدیک ہندوستان کی دولت کا سمیٹنا تھا اور اسی مقصد کے ماتحت بعد کے مسلمان حکمران خاندانوں نے ہندوستان کو فتح کیا ،مگر حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان سے عربوں کا تعلق اس کی فتح ، بلکہ اسلام کے ظہور سے بھی صدیوں پہلے سے تھا۔عرب ایک تاجر قوم اور مشرق ومغرب کے درمیان تجارتی کڑی تھے ،وہ مصر وافریقہ اور شام وعراق کا تجارتی سامان ہندوستان ،سیلون ،برہما ،انڈونیشیا اور چین تک لے جاتے تھے اور ان ملکوں کی چیزیں مذکورۂ بالا ملکوں میں پہنچاتے تھے ،پھر ظہورِ اسلام کے بعد ہندوستان میں اسلامی حکومت کے قیام

Marfat.com

سے بہت پہلے مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان علمی، مذہبی اور تمدنی ہر قسم کے تعلقات پیدا ہو گئے تھے اور ہندوستان کے جنوبی ساحلی علاقوں میں ان کی بڑی بڑی آبادیاں قائم ہو گئی تھیں اور اُن کے محاسن اخلاق کی وجہ سے ہندو راجہ ان کا بڑا لحاظ اور اُن کے ساتھ بڑی رعایت کرتے تھے، جہاں اُن کی زیادہ آبادی تھی، وہاں ان کا مستقل مذہبی نظام قائم تھا، اور اُن کے معاملات کے فیصلہ کے لئے قاضی مقرر تھے۔

''عرب و ہند کے تعلقات'' میں تعلقات کے ان تمام پہلوؤں کو بڑی تفصیل سے دکھایا گیا ہے۔ یہ کتاب پانچ ابواب میں منقسم ہے۔ پہلے باب میں ہندوستان سے عربوں کے تعلقات کی ابتداء پر بحث کی گئی ہے اور تجارتی تعلقات کی قدامت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بھی ثابت کیا گیا ہے کہ دنیا کی پہلی بحری تجارتی قوم فینشین عرب تھے، جو شام کے ساحل پر بس گئے تھے اور اُن کے علمی اثرات ظہورِ اسلام سے بہت پہلے ہندوستان پر پڑ چکے تھے۔ اس کے بعد ہندوستان پر مسلمانوں کے ابتدائی حملہ اور سندھ کی فتح کا مختصر تذکرہ ہے ...... بطوطا ۷۱۹ھ وغیرہ کی کتابوں سے جو خود ہندوستان آئے تھے اور اپنی کتابوں میں اس زمانہ کے ہندوستان کے حالات لکھے ہیں اور وہ ہند قدیم کی تاریخ کا سب سے بڑا ماخذ ہیں، ہندوستان کے حالات نقل کئے ہیں اور یہ دکھایا ہے کہ تاریخی حیثیت سے ان جغرافیہ نویسوں نے ہندوستان کی کتنی بڑی خدمت انجام دی ہے۔ ان بیانات سے ہندوستان کے عام حالات کے ساتھ ہندو مسلمانوں کے تعلقات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اس کے بعد ان جغرافیہ نویسوں اور مؤرخین کا تذکرہ ہے، جو خود تو ہندوستان نہیں آئے، مگر اپنی کتابوں میں اس کے حالات لکھے ہیں۔

دوسرے باب میں تجارتی تعلقات پر بحث کی گئی ہے اور اس سلسلہ میں ان تعلقات کی قدامت مشرق و مغرب کے درمیان، عرب تاجروں کی اہمیت ان ملکوں کے درمیان تجارتی راستوں اُن کی درمیانی منزلوں اور بندرگاہوں کی تفصیل، ہندوستان میں

Marfat.com

دوسری بیرونی قوموں کی تجارت، ہندوستان کی پیداوار، مصنوعات اور دوسرے سامانِ تجارت، تجارتی درآمد و برآمد، عرب کے ہندو بیوپاریوں، بحرِ ہند میں چلنے والے جہازوں کی وسعت، ہندوستان کی بحری تجارت اور دولت وثروت وغیرہ پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور آخر میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ بحر روم کو چھوڑ کر افریقہ کی پشت سے بحرِ ہند میں آنے کے راستہ کے اکتشاف کا سہرا پرتگالیوں کے سر باندھا جاتا ہے، لیکن درحقیقت اس کے پہلے رہنما عرب تھے اور پرتگالیوں کو ہندوستان پہنچانے والا ایک عرب بحری ابن ماجہ تھا۔

تیسرا باب علمی تعلقات پر ہے۔ اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان علمی تعلقات کا کچھ نہ کچھ سلسلہ بنی امیہ کے آخری دور ہی سے شروع ہوگیا تھا، مگر خود مسلمانوں کی اصل علمی تاریخ جب انہوں نے دوسری قوموں کے علوم کی جانب توجہ کی۔ عباسیوں کے زمانہ سے شروع ہوتی ہے، اسی زمانہ سے مسلمانوں نے دوسری علمی قوموں کے علوم سے فائدہ اٹھانا شروع کیا اور یونانی، سریانی اور ایرانی علوم وغیرہ کی طرف توجہ کی تو اس سلسلہ میں انہوں نے ہندوستان سے بھی علمی روابط پیدا کئے۔ عباسی خلفاء خود بھی صاحبِ علم اور علم وفن کے بڑے قدردان اور سرپرست تھے، لیکن عباسی دور کی علمی ترقیوں کا سہرا بڑی حد تک برمکی خاندان کے سر ہے۔ اس لئے اس کتاب میں ہندوستان سے عربوں کے علمی تعلقات کے باب کا آغاز برامکہ کی تاریخ سے کیا گیا ہے۔ اُن کے متعلق عام شہرت تو یہی ہے کہ وہ مجوسی تھے، مگر اس کتاب میں عقلی دلائل اور تاریخی شواہد سے ثابت کیا گیا ہے کہ برامکہ نسلاً ایرانی، مگر مذہباً بدھسٹ تھے۔ یہ محققانہ بحث دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس رشتہ سے ہندوستان سے اُن کا مذہبی تعلق تھا، اور ہندوستان اس زمانہ میں بہت سے علوم کا مرکز تھا۔ اس لئے برامکہ نے یہاں کے مختلف علوم کے فضلاء کو بڑے اعزاز واکرام سے بغداد بلایا۔ اُن کی بڑی قدردانی کی اور اُن کے علوم سے پورا

Marfat.com

فائدہ اٹھایا، جس کا سلسلہ برامکہ کے زوال کے بعد مامون کے عہد میں بھی قائم رہا، بلکہ مامون کی علم نوازی کی وجہ سے اور زیادہ بڑھ گیا۔ اس بحث میں طب، نجوم، جوتش، ہیئت، ریاضی، بیطاری، موسیقی، جنگ و سیاست، منطق و کیمیا، جفر ورمل، قصص و حکایات اور اخلاق و حکمت وغیرہ کی سنسکرت کی جو کتابیں عربی میں ترجمہ ہوئیں اور ان ہندو علماء کا جنہوں نے بغداد میں علمی خدمات انجام دیں، مفصل تذکرہ ہے۔ اس باب کا خاتمہ البیرونی کے حالات پر کیا گیا ہے، جس نے قدیم ہندوستانی علوم پر بہت سی کتابیں لکھیں، سنسکرت کی بعض کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا گیا۔ اس کی کتابیں قدیم ہندوستانی علوم اور ہندوستانی کلچر کی تاریخ کا بہت بڑا ماخذ ہیں۔

چوتھا باب مذہبی تعلقات پر ہے۔ ہندو مسلمانوں کے مذہبی تعلقات کے سلسلہ میں ہم کو انگریزوں کا پڑھایا ہوا صرف یہ سبق یاد رہ گیا ہے کہ مسلمان ہندوؤں کو کافر و مشرک سمجھتے تھے، اُن کو تلوار کے زور سے مسلمان بناتے تھے، اُن سے جزیہ وصول کرتے تھے، اُن کی عبادت گاہوں کو ڈھاتے تھے اور اُس کے ثبوت میں ترک و افغان اور مغل سلاطین کے کچھ واقعات بھی مل جاتے ہیں۔ اس لئے اس باب میں پہلے اس شہرت عام پر بحث و تنقید کی گئی ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ وسط ایشیا کے جن مسلمان خاندانوں نے ہندوستان میں حکومت کی، ان کے بعض سلاطین اور عہدہ داروں کو چھوڑ کر وہ قوم کی مجموعی حیثیت سے اسلام کے صحیح نمائندے نہ تھے اور نہ اُن کی حکومت کو اسلامی نظامِ حکومت سے کوئی علاقہ تھا، اور اُن کے افسروں کو جو زیادہ تر غیر مسلم یا بالکل جدید الاسلام تھے، اسلام کے صلح و جنگ اور حاکمیت و محکومیت کے قوانین ہی سے واقفیت نہ تھی اور جس زمانہ میں ان خاندانوں نے حکومت کی، اُن کی قوم مسلمان بھی نہ ہوئی تھی اور اس میں ہزاروں غیر مسلم تھے، جو لوگ مسلمان بھی تھے، وہ بھی اسلامی روح سے محض بیگانہ اور اپنی قومی خصوصیات پر قائم تھے اور انہوں نے جو کچھ بھی کیا، خواہ وہ مذہب کے نام پر کیا ہو، مگر درحقیقت اس کو مذہب سے کوئی

Marfat.com

علاقہ نہ تھا اور محض سیاست کے لئے تھا۔ اس لئے اُن کے ذاتی اعمال کی ذمہ داری اسلام پر رکھنا اور پوری مسلمان قوم کو ان پر قیاس کرنا کسی حیثیت سے بھی صحیح نہیں ہے۔

اسلام کے اصل نمائندے عرب تھے، وہ حکمرانی میں اسلام کے مقرر کیے ہوئے حدود سے آگے نہ بڑھتے تھے، اور ان کی حکومتوں میں محکموں کے ساتھ زیادتی کی مثالیں شاذ ہی ملتی ہیں، جن سے دنیا کا کوئی حکمران خاندان بھی مستثنیٰ نہیں ہے۔ مذہب کے معاملہ میں وہ بڑے روادار تھے، جن جن قوموں پر انہوں نے حکومت کی، اُن کے مذہبی عقائد و مذہبی نظام، بلکہ مذہبی رسم ورواج تک میں کوئی مداخلت نہیں کی اور نہ اُن کی عبادت گاہوں میں ہاتھ لگایا اور جزیہ اور خراج کے ٹیکس لینے کے بعد ان کو تمام حقوق میں مسلمانوں کے برابر قرار دیا خود سندھ میں عربوں کی حکومت اسی روش پر رہی اور ہندوؤں کو شبہ اہل کتاب قرار دے کر اُن کی عورتوں سے شادی اور ان کے ہاتھ کا ذبیحہ کھانے کی ممانعت کے علاوہ ہر چیز میں اُن کو اہل کتاب کے برابر حقوق عطا کئے، مسلمانوں کے اس فیاضانہ سلوک کا یہ نتیجہ تھا کہ سندھ کے ہندو، مسلمان حکمرانوں کے گرویدہ ہو گئے۔ اس سلسلہ میں اہل کتاب، شبہ اہل کتاب، کافر و مسلم اور جزیہ کے مسائل کی بحثیں بھی آ گئی ہیں، جن سے ان اُمور کے متعلق بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں۔

اس کے بعد اصل بحث مذہبی تعلقات کی شروع ہوتی ہے۔ اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ہندوستان کے ساتھ گونا گوں تعلقات کی بنا پر عربوں کو یہاں کے مذاہب کی تحقیقات کا شوق پیدا ہوا اور انہوں نے بڑی محنت سے اس کی تلاش و تحقیق کر کے اپنی کتابوں میں اُن کے حالات لکھے اور ان مسلمان سیاحوں اور جغرافیہ نویسوں کے علاوہ جن کے نام اوپر گذر چکے ہیں، اور جنہوں نے اپنی کتابوں میں ہندوستان کے عام حالات کے ضمن میں یہاں کے مذاہب کا بھی حال لکھا ہے، دوسرے مسلمان علماء میں ابن ندیم، مطہر بن طاہر مقدسی، ابوالعباس ایرانشہری، عبدالکریم شہرستانی اور عبدالقاہر بغدادی نے خاص طور سے اپنی

Marfat.com

کتابوں میں ہندو مذاہب، اُن کے فرقوں، اُن کے عقائد اور مذہبی رسوم کے تفصیلی حالات تحریر کئے ہیں اور ان بیانات کو نقل بھی کیا ہے۔ اس سلسلہ میں فرقہ سمنیہ پر جس کا عربی تاریخوں میں ذکر آتا ہے، بڑی محققانہ بحث کی گئی ہے اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ وہ بدھ تھے، جنہیں عرب سمنیہ کہتے تھے۔ ہندوستان میں ابتدائی اسلامی فتوحات کے زمانہ میں خصوصاً جن علاقوں سے مسلمانوں کا تعلق رہا، زیادہ تر بدھ آباد تھے۔ اس لئے وہی عربوں سے زیادہ متاثر ہوئے، اور اسلام کا اثر رفتہ رفتہ ہندوستان میں پھیلنے لگا، بعض ہندو راجہ بھی مسلمان ہوئے اور آج سے ایک ہزار سال پہلے سندھ کے ایک راجہ نے قرآن مجید کا سندھی زبان میں ترجمہ کرایا، ہندوستان میں توحید خالص کا تصور بھی اسلام کے اثرات کا نتیجہ ہے، گو ہندوؤں کے بعض فرقوں میں ایک حد تک توحید پائی جاتی تھی، مگر تنزیہی اور کامل توحید اسلام کے اثرات کا نتیجہ ہے۔ اسی طریقہ سے مسلمان بھی ہندوؤں سے متاثر ہوئے اور اس بحث میں دونوں پر ایک دوسرے کے اثرات دکھائے گئے ہیں۔

آخری اور پانچواں باب ''ہندوستان میں اسلامی فتوحات سے پہلے یعنی غزنویوں سے قبل مسلمانوں کی آبادی'' پر ہے۔ یہ باب درحقیقت گذشتہ ابواب ومباحث کا نتیجہ اور ان کا حاصل ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ دکن اور جنوبی ہند میں جہاں مسلمانوں کی حکومت سب سے آخر میں قائم ہوئی، وہیں مسلمان سب سے پہلے آباد ہوئے اور اس کا کوئی ساحلی علاقہ اور تجارتی شہر مسلمانوں سے خالی نہ تھا۔ بعض شہروں میں اُن کی تعداد کئی کئی ہزار تھی اور یہاں کے ہندو راجاؤں پر ان کا بڑا اخلاقی اثر تھا، اور وہ ان کا بڑا لحاظ رکھتے تھے، ان کو ہر طرح کی سہولتیں دے رکھی تھیں، ان کی تمام آبادیوں میں مسجدیں تھیں اور جہاں اُن کی آبادی زیادہ تھی، وہاں اُن کا مستقل مذہبی نظام قائم تھا اور اُن کے معاملات کے فیصلے کیلئے ائمہ وقضاۃ مقرر تھے۔ ان مسلمانوں کے اخلاقی اثر سے بعض ہندو راجہ مسلمان بھی ہوئے۔

Marfat.com

اس بحث میں ان علاقوں میں مسلمانوں کی آمد کی تاریخ ٗ اُن کی بڑی اور مرکزی آبادیوں اور اُن کے حالات کی پوری تفصیل آ گئی ہے، اور مالدیپ، سراندیپ، ملیار، کوئم (ٹرانکور) کارومنڈل، میمور (چمپور) تھانہ (بمبئی) کھمبائت گاری، گندھار (بھڑوچ) کے قریب) بیرم، گوگہ (بھاؤنگر کے پاس) چنداپور (گوا کے قریب) ہنور (احاطہ بمبئی) ملیبار میں ابی سرور، پاکنور (موجودہ برکور) منگلور، ہیلی (کنانور کے قریب) جرٹپن (موجودہ سری کنداپورم) دہ پٹن، بدھ پٹن، پنڈارنی، کالی کٹ، چالبات، سیلون، گاڑی، دواسمندر (علاقہ میسور کا قدیم پایۂ تخت) وغیرہ میں مسلمانوں کی آمد اُن کی آبادیوں، اُن کے نظام، ہندوؤں، سے اُن کے تعلقات اور اس زمانہ کے ان علاقوں کے مختلف حالات لکھے گئے ہیں۔

آخر میں سندھ و ملتان میں مسلمانوں کی تاریخ بیان کی گئی ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ محمد بن قاسم کے آنے سے بھی پہلے یہاں کئی سو مسلمان آباد تھے۔ سندھ کی فتح سے لے کر امویوں کے خاتمہ بلکہ عباسیوں کے ابتدائی زمانہ تک سندھ میں مسلمانوں کی تاریخ بہت صاف ہے، مگر اس کے بعد سندھ کی طوائف الملوکی کے زمانہ کی تاریخ بڑی گنجلک اور پیچیدہ ہے۔ غزنویوں اور غوریوں سے پہلے یہاں کئی مسلمان خانوادوں نے حکومت کی، بلکہ ایک وقت میں دو دو حکومتیں رہی ہیں، جن کے حالات تاریخوں میں بہت کم اور اتنے گنجلک ہیں کہ ان خاندانوں اور اُن کے حکمرانوں کی تعیین مشکل ہے اور بعض خاندانوں کے متعلق یہ بھی نہیں معلوم کہ اُن کی اصل و نسل کیا تھی اور اُن کا زمانہ کونسا ہے۔ اس باب میں ان تمام خاندانوں کی تحقیقات کر کے اس کی تعیین کی گئی ہے اور ان کے حالات لکھے گئے ہیں، جس سے سندھ کے حکمرانوں کا سلسلہ بڑی حد تک مکمل ہو جاتا ہے، یہ بحث بڑی محققانہ ہے۔ ان خاندانوں کے حالات کے ساتھ ان کے زمانہ کے سندھ کے بڑے بڑے شہروں کے مختلف قسم کے حالات کی تعیین اور اُن پرانے شہروں کے جائے وقوع کی جن کے

Marfat.com

اب صرف نام ہی تاریخوں میں باقی رہ گئے ہیں، تعیین کی گئی ہے اور اس بحث پر یہ اہم کتاب ختم ہو جاتی ہے۔ ان مباحث سے اس کتاب کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

خیّام

علمی سلسلہ کی دوسری اہم کتاب خیّام ہے۔ اس نامور حکیم اور جلیل القدر فاضل کو اہل یورپ نے ایک عیاش اور بدمست رندِ اباں کی شکل میں پیش کیا ہے، جو ہمہ تن شاہد و شراب میں غرق رہتا تھا اور جس کا مقصد زندگی رندی اور عیش پرستی کے سوا اور کچھ نہ تھا اور اس مشرب کا وہ بہت بڑا مبلغ بھی تھا، مگر اس تصویر کو حکیم عمر خیام کی اصل شکل سے کوئی علاقہ نہیں ہے، وہ اپنے زمانہ کا ایک بڑا فلسفی، ہیئت و نجوم اور ریاضیات کا بہت بڑا عالم اور فلسفی قسم کا صوفی تھا۔ مذہبی حیثیت سے وہ ایک دیندار مسلمان تھا اور مذہبی علوم میں پوری دستگاہ رکھتا تھا، اس کی زندگی زاہدانہ تھی، مگر اہلِ یورپ کا مذاق خود رندانہ ہے۔ اس لئے رباعیاتِ خیّام کے ظاہری آئینہ میں اس کی جو تصویر دیکھی، وہ مشربی کی بنا پر بڑی دلکش نظر آئی۔ چنانچہ اسی کو اصل سمجھ کر اس کی اتنی تشہیر کی کہ عمر خیام اور بدمست شرابی ہم معنی بن گئے۔ حالانکہ کسی شاعر کے کلام سے اس کی عملی زندگی کا قیاس صحیح نہیں ہے، خصوصاً مشرقی شاعری میں تو سراسر غلط ہے۔ بڑے بڑے مسلم صوفی شعراء کا کلام بھی شراب و شاہد کے ذکر سے خالی نہیں۔ مولانا روم، شمس تبریز، ابوسعید، ابوالخیر جیسے بزرگوں کے کلام میں بھی شراب و شاہد کی رنگینیاں نظر آتی ہیں اور خواجہ حافظ کا کلام تو پورا میخانہ ہے، ممکن ہے بعض ظاہر بین حافظ کی شراب کو بھی شراب ناب ہی محمول کریں، لیکن اُن کے علاوہ اور بزرگوں کو کون رند شاہد باز کہہ سکتا ہے۔ اس کو فارسی شاعری کا عیب سمجھا جائے یا شراب و شاہد، چنگ و رباب، گل و بلبل، ہجر و وصال، اُس کے ایسے لوازم بن گئے ہیں کہ اُن کے سہارے کے بغیر ایک قدم بھی شاعری کے میدان میں نہیں چلا جا سکتا اور نہ اُن کے بغیر اس میں حسن و دلکشی پیدا

Marfat.com

ہوتی ہے۔ اس لئے حکیم و فلسفی اور صوفی صافی شعراء بھی ان کنایات و استعارات کے استعمال پر مجبور تھے اور غالب نے تو صاف صاف کہہ دیا ہے کہ ......

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادۂ و ساغر کہے بغیر

اس لئے خیام کے شاہد و شراب کو کیوں حقیقت پر محمول کیا جائے۔ اس کے علاوہ اس کی بہت سی رباعیاں فلسفیانہ اور اخلاقی بھی ہیں۔ ان کو کیوں نظر انداز کیا جائے۔ خصوصاً جب تاریخی حیثیت سے یہ معلوم و مسلّم ہے کہ وہ ایک بڑا عالم حکیم اور صوفی تھا، جس پر اس کی تصانیف شاہد ہیں، مگر ظاہر پرست اہل یورپ نے اس کی رندانہ رباعیوں کے آئینہ میں اُن کی ظاہری تصویر دیکھ کر اسی کو اصل سمجھ لیا، اگر انہوں نے رباعیوں کے بجائے تاریخ کے اوراق اور خود خیام کے فلسفیانہ تصانیف کے ذریعہ خیام کو سمجھنے کی کوشش کی ہوتی، تو اس کی اصلی شکل نظر پڑتی، کتاب خیام میں اس کی صحیح شکل پیش کی گئی ہے، اور یہ دکھایا گیا ہے کہ وہ رند شاہد باز نہیں۔

خیام پر مشرق سے زیادہ مغرب میں لکھا گیا ہے، مگر جس قدر لکھا گیا ہے، اسی قدر اس کے حالات و واقعات زندگی میں مختلف قسم کی تاریخی پیچیدگیاں اور گتھیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ مصنف نے اس کے سوانح کے تمام مشرقی و مغربی ماخذوں سے اُن پر تنقید کر کے ان گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کی ہے اور نہ صرف اردو بلکہ دوسری زبانوں کے مقابلہ میں بھی پہلی مرتبہ اس بسط و شرح اور تحقیق و تنقید کے ساتھ خیام کے حالات لکھے گئے ہیں اور اس کے عملی کمالات اور علمی کارناموں پر مفصل تبصرہ کر کے دکھایا ہے کہ عمر خیام اپنے زمانہ کا بہت بڑا فاضل، حکیم، ہیئت و نجوم اور ریاضیات کا بہت بڑا عالم اور صوفی مشرب فلسفی تھا اور اس کے سوانح کے سلسلہ میں سلجوقیوں کے دور کے علمی اور خیام کے معاصر علماء کے حالات بھی آگئے ہیں۔

Marfat.com

بعض دوسرے شعراء کے کلام کی طرح عمر خیام کی رباعیاں بھی دوسرے شعراء کی رباعیوں سے خلط ملط ہوگئی ہیں۔ اس لئے رباعیات کے مختلف قلمی اور مطبوعہ نسخوں کی مدد سے خیام کی رباعیات کی تعیین کی کوشش کی گئی ہے اور رباعیات کے ایک قدیم اور صحیح قلمی نسخہ کی نقل بھی کتاب میں شامل کر دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ خیام کے سات نادر فلسفیانہ رسالوں کو جن میں سے چھ عربی میں ہیں اور ایک فارسی میں تصحیح وتحشیہ کے ساتھ مرتب کر کے آخر میں شامل کر دیا گیا ہے۔ یہ اس کتاب کا اجمالی خاکہ ہے، مگر اس کے گوناگوں علمی مباحث، مختلف النوع تاریخی معلومات اور مصنف کی وسعت ووقعتِ نظر اور تحقیق کا اندازہ کتاب کے مطالعہ ہی سے ہوسکتا ہے۔

حیاتِ شبلی

ان کے علاوہ علمی سلسلہ کی دو اہم کتابیں اور ہیں، ایک حیاتِ شبلی، اور دوسری عربوں کی جہاز رانی' ان میں حیاتِ شبلی مختلف حیثیتوں سے زیادہ اہم ہے۔ وہ ایک جلیل القدر اور شفیق استاذ کے حضور میں ایک فاضل شاگردِ رشید کا نذرانۂ عقیدت ہے۔ اس لئے مصنف نے اس میں اپنا پورا تصنیفی کمال اور زورِ قلم صرف کر دیا ہے۔ علامہ شبلی کی زندگی میں جب کسی نے ان کی سوانح لکھنے کا خیال ظاہر کیا، تو وہ اس کو ٹال گئے اور اسی قسم کی ایک فرمائش کے سلسلہ میں انہوں نے ہونہار شاگرد کو لکھا تھا کہ "دوسرے لوگ میری سوانح عمری کیا لکھیں گے، تم ہی جب کبھی دنیا کے اور کاموں سے فرصت پانا تو اس کام کو انجام دینا"۔ اس لئے حیاتِ شبلی کی تالیف ہمیشہ مصنف کے پیشِ نظر رہی، مگر یہ اتفاق ہے کہ ان کو اسی وقت اس کی تالیف کا موقع ملا، جب دنیا کے اور کاموں سے بڑی حد تک فرصت مل چکی تھی۔ چنانچہ حیاتِ شبلی ان کی آخری تصنیف ہے اور اسی پر ان کی تصنیفی زندگی کا خاتمہ ہوگیا۔

مولانا شبلی کی ذات جامعِ کمالات تھی۔ وہ قدیم مذہبی علوم کے عالم بھی تھے اور جدید افکار وخیالات کے واقف کار بھی۔ قدیم علماء کی صحبت بھی اٹھائی تھی اور جدید طبقہ کے

Marfat.com

شریکِ بزم بھی رہے تھے۔ وہ مفکر و محقق بھی تھے اور ادیب و شاعر بھی، انشاء پرداز بھی تھے اور خطیب بھی، مؤرخ بھی تھے اور متکلم بھی، مصلح بھی تھے اور ماہر تعلیم بھی اور سیاست کا ذوق بھی رکھتے تھے اور ان سب میں اُن کے بڑے بڑے کارنامے ہیں۔ وہ محض پرانے طرز کے عالم نہ تھے، بلکہ زمانہ کے نئے حالات وضروریات کی بنا پر بہت سے خیالات میں انقلابی تھے اور قدیم بنیادوں پر جدید قصر ملت کی تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے اُن کے خیالات پُرانے اور نئے طبقوں سے مختلف تھے اور دونوں ان سے کھٹکتے تھے، خصوصاً عربی تعلیم اور علماء کی مذہبی وتعلیمی اصلاح کے لئے انہوں نے جو انقلابی قدم اٹھایا، وہ بالکل نیا تھا۔ وہ ان دونوں کی اصلاح کر کے ان کو جدید دینی وملی ضروریات کے مطابق بنانا چاہتے تھے، جس کا نمونہ دارالعلوم ندوۃ العلماء ہے اور اسلامی علوم ومعارف پر غور وفکر اس کی تعبیر، ترجمانی اور علمی تلاش وتحقیق کا ایک نیا طریقہ اختیار کیا تھا، جس کا نمونہ دارالمصنفین ہے۔ ان کی ان باتوں سے پُرانے علماء بالکل نامانوس تھے۔ اس لئے علامہ شبلی کو طرح طرح کی بدگمانیوں کا شکار ہونا پڑا، لیکن بالآخر زمانہ کے حالات نے سب کو اس راستہ پر چلنے کے لئے مجبور کر دیا اور جو اس سے الگ رہے، اُن کے علمی خدمات کا دائرہ محدود ہو کر رہ گیا۔ علامہ شبلی کا بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انہوں نے اپنی عاقبت اندیشی اور فراست سے دینی علوم اور علماء کا بھرم قائم کر دیا، ورنہ قدیم اور جدید کی ٹکر میں ان کا وقار قائم رہنا مشکل ہو جاتا، مگر اسی کے ساتھ وہ جدید تعلیم وتہذیب سے مرعوب نہ تھے اور اس کے بعض محاسن کے اعتراف کے ساتھ اس کی خامیوں کے ناقد بھی تھے اور سیاسیات میں آزادانہ خیالات رکھتے تھے۔ اس لئے جدید تعلیم یافتہ طبقہ بھی ان سے مطمئن نہ تھا۔

اس کے علاوہ مسلمانوں کی تمام قومی وملی تحریکیں خواہ وہ تعلیمی ہوں یا اصلاحی، علمی ہوں یا سیاسی، جو ان کے زمانہ میں تھیں، ان سب میں ان کا نمایاں حصہ رہا اور بعض تحریکوں کے خود بانی اور رہنما تھے، اور ان میں سے کسی تحریک میں وہ کسی کے مقلد نہ تھے، بلکہ خود

Marfat.com

مجتہد اور رہنما کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس لئے اس زمانہ کے بعض اشخاص اور جماعتوں سے ان کو اختلافات بھی پیش آئے۔ اس لئے ان کی سوانح کا اس طرح لکھنا کہ مولانا شبلی کے کمالات و کارنامے اُن کی جدت و ندرت اور قائدانہ و مجتہدانہ حیثیت بھی نمایاں ہو جائے اور کسی آبگینہ کو ٹھیس بھی نہ لگنے پائے، بڑا نازک کام تھا، مگر مصنف نے بڑی خوبی سے ان نازک مراحل کو طے کیا ہے اور مولانا شبلی کے کمالات اور ان کے کارناموں کا ایسا دلکش مرقع تیار کیا، جس میں اُن کے سارے خط و خال نمایاں اور وہ اپنے تمام معاصرین میں ممتاز نظر آتے ہیں۔

اس کتاب میں اُن کے ذاتی سوانح کے ساتھ ان کے علمی و تعلیمی، اصلاحی اور سیاسی کارناموں کی پوری تفصیل آگئی ہے اور چونکہ ان کی پوری زندگی قومی و ملی کاموں میں گذری اور انہوں نے مسلمانوں کے گوناگوں کام انجام دیئے، اور ان کی ہر تحریک میں سرگرم حصہ لیا۔ اس لئے اُن کے سوانح کے سلسلہ میں ہندوستان کے مسلمانوں کی پچاس سالہ ملی سرگذشت بھی آگئی ہے۔ اس کتاب کا مقدمہ نہایت فاضلانہ اور اپنی جگہ پر ایک مستقل کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں پرانے صوبے اودھ خصوصاً اس کے مشرقی اضلاع کی کئی صدیوں کی علمی، دینی اور اخلاقی و روحانی تاریخ بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے جمع کی گئی ہے، جو کسی ایک کتاب میں اس طرح مرتب اور یکجا نہیں مل سکتی۔ اس طرح یہ کتاب مولانا شبلی مرحوم کے حالات اور کارناموں کا مرقع بھی ہے اور ہندوستان کے مسلمانوں کی پچاس سالہ تاریخ بھی۔

عربوں کی جہاز رانی

یہ ان خطبات کا مجموعہ ہے، جو مارچ ۱۹۳۰ء میں اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن بمبئی کی فرمائش پر دیئے گئے تھے، جنہیں کتابی شکل میں شائع کر دیا گیا تھا، جیسا کہ اوپر عرب و ہند کے تعلقات پر تبصرہ کے سلسلہ میں لکھا جا چکا ہے کہ عرب قدیم الایام سے ایک

Marfat.com

تاجر قوم اور مشرق و مغرب کے درمیان تجارتی کڑی تھے۔ وہ مصر و افریقہ اور عرب و شام اور عراق کا تجارتی مال ہندوستان، سیلون، برما، انڈونیشیا اور چین لے جاتے تھے اور ان ملکوں کا سامان مذکورہ ممالک میں پہنچاتے تھے اور ظہورِ اسلام سے بہت پہلے اپنے زمانہ کے بڑے بحر پیما اور جہاز ران تھے۔ اس کے بعد جب اسلامی فتوحات کا سیلاب عرب سے نکل کر افریقہ اور یورپ کی طرف بڑھا، تو اُن کے سمندر عربوں کے بحری بیڑوں کی جولا نگاہ بن گئے اور ایک صدی کے اندر وہ بحر عرب، خلیجِ فارس، بحیرۂ اسود، بحر قلزم اور بحر روم کے حکمران بن گئے اور ان کی بحری حیثیت و اہمیت تقریباً وہی ہوگئی جو اس زمانہ میں برطانیہ کی ہے اور اس سلسلہ میں انہوں نے علمی اور عملی دونوں حیثیتوں سے فن جہاز رانی کو بڑی ترقی دی۔

ملک گیری کے بعد جب دوسری صدی سے ان کی علمی ترقی کا دور شروع ہوا تو علم و فن کے دوسرے شعبوں کے ساتھ سمندروں کے متعلق تحقیقات اور جغرافی انکشافات کے سلسلہ میں انہوں نے اس زمانہ کے معلوم سمندروں کا چپہ چپہ چھان مارا۔ بعض نئے سمندروں کا پتہ چلایا، مختلف سمندروں کے راستے دریافت کئے، نامعلوم جزیروں کا انکشاف کیا۔ یورپ، ایشیا اور افریقہ کے نامعلوم خطوں سے واقفیت پیدا کی، فن جہاز رانی کو ترقی دی۔ اس کے بہت سے آلات ایجاد کئے۔ سمندروں کے حالات اور جہاز رانی پر کتابیں لکھیں، عربوں کی جہاز رانی میں ان سب کی پوری تفصیل بیان کی گئی ہے۔

پہلے لغاتِ عرب اور کلام مجید سے عربوں کی بحری واقفیت اور ان کی جہاز رانی کا ثبوت دیا گیا ہے۔ اس کے بعد عہد رسالت میں عربوں کے بحری سفیروں کا حال لکھا ہے۔ پھر خلافتِ راشدہ میں جہاز رانی کی ترقی کا ذکر ہے۔ اس کا آغاز حضرت عثمانؓ کے عہد سے ہوا تھا اور امیر معاویہؓ نے شام کی گورنری کے زمانہ میں بحر روم کے متعدد جزائر فتح کئے تھے اور اسلامی بیڑے کو اتنا طاقتور بنا دیا تھا کہ ۳۱ھ میں جب قیصر روم نے چھ سو جہازوں کے ساتھ شام کے سواحل پر حملہ کیا تو اسلامی بیڑے نے اس کو نہایت فاش شکست دی، لیکن

Marfat.com

عربوں کی بحری ترقی کا اصل زمانہ اموی عہد ہے۔ اس زمانہ میں بحرِ روم اسلامی بیڑے کی ترک وتاز کا جولانگاہ بن گیا اور مسلمانوں نے چند دنوں کے اندر سسلی اور سپین کا پورا جزیرہ اور اٹلی کے بعض حصے فتح کر لئے اور پرتگال، فرانس تک بڑھتے چلے گئے۔

ان فتوحات کے سلسلہ میں مختلف حیثیتوں سے جہاز رانی کو بڑی ترقی ہوئی اور امویوں کا بحری بیڑا اس زمانہ کا سب سے زیادہ طاقتور بیڑا بن گیا۔ اس کے بعد بنی عباس کے زمانہ میں اگرچہ مشرقی خلافت میں بحری سرگرمی کم ہوگئی تھی، مگر مغرب میں بنی امیہ اندلس اور فاطمیہ مصر کے یہاں اس کا سلسلہ برابر جاری رہا اور عباسیوں کے عہد میں علمی و فنی حیثیت سے جہاز رانی کو بڑی ترقی ہوئی۔ اس لئے ان دونوں زمانوں کی ترقی کا حال کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھا گیا ہے اور اس سلسلہ میں عرب اور عراق کی پرانی اور عربوں کی قائم کردہ نئی بندرگاہوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد مشرقی ملکوں میں عربوں کی تجارت کے حالات ہیں اور اس سلسلہ میں مغربی ہند کی بندرگاہوں سے لے کر سیلون، برہما، جاوا، سماٹرا، وغیرہ جزائر شرق الہند اور چین تک کی بندرگاہوں، یہاں عربوں کی تجارت اور اُن کے اثرات کی تفصیل ہے، پھر افریقہ کے سواحل یعنی بحرروم کے جزائر، اس کے ساحلی ملکوں سسلی، اسپین، مصر اور شمالی افریقہ میں عربوں کی جہاز رانی اور اس کی بندرگاہوں کے حالات ہیں۔

پھر بحر پیمائی اور فنِ جہاز رانی کے متعلقات عربوں کے علمی کارناموں اور ان کے ایجادات واکتشافات کا ذکر ہے اور اس سلسلہ میں سمندروں کے بارہ میں عربوں کے علم، ان کی پیمائش، بحر بیرنگ سے ان کی واقفیت، عرب جہاز رانوں کی تحقیقات، بحر محیط (اٹلانٹک) کے جزائر میں انگلینڈ، آئرلینڈ، دوبارانگلستان، جزائر خالدات (فرچونیٹس آئرلینڈ) بحر چین اور بحر الکاہل میں جاوا سماٹرا، جاپان، فلپائن، مڈگاسکر اور کمورہ سے ان کی واقفیت اور اُن کی کتابوں میں اُن کے بارہ میں بیانات کی تفصیل ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ

Marfat.com

بحرِ روم اور بحرِ اٹلانٹک سے افریقہ کے سواحل پر گھوم کر بحرِ ہند میں آنے کا راستہ دریافت کرنے والا پہلا شخص ایک عرب ابن ماجہ تھا اور واسکوڈی گاما اسی کے ذریعہ ہندوستان پہنچا تھا۔

اس کے بعد عربوں کے بنائے ہوئے بحری نقشوں، ان کے تعمیر کردہ لائٹ ہاؤسز اور میل کے نشانات کا ذکر اور جہاز رانوں کے رہنما ستاروں، سمندری ہواؤں اور اُن کے جغرافیہ پر عربوں کی تصانیف کا حال ہے، پھر قطب نما کی ایجاد اور ترقی کی بحث اور عربوں کے ایجاد کردہ اُن فلکی آلات کا ذکر ہے، جن سے جہاز رانی میں مدد ملتی ہے، پھر عربوں کے قائم کردہ جہاز رانی کے کارخانوں، مصنوعی بحری لڑائیوں، ڈوبے ہوئے جہازوں کے نکالنے، جہازی عملہ، جہازی ساز و سامان وغیرہ جہاز کے مختلف متعلقات کی تفصیل اور بحرِ ہند اور بحرِ عرب کے راستوں کا تذکرہ ہے اور مسلمانوں کی بحری ترقی کے خاتمہ پر یہ داستان ختم کی گئی ہے۔ آخر میں عربوں کی بحری تصانیف کا اجمالی تذکرہ ہے۔ یہ اس کتاب کے مباحث کا اجمالی خاکہ ہے اور اس میں اس موضوع پر جو معلومات فراہم کی گئی ہیں، اُن کا صحیح اندازہ اصل کتاب کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی متعدد چھوٹے چھوٹے رسالے ہیں۔

مضامین و مقالات و خطبات

ان تصانیف کے علاوہ انہوں نے مختلف موضوعات پر سیکڑوں مضامین لکھے۔ علم و ادب کا مشکل ہی سے کوئی گوشہ ایسا نکل سکتا ہے، جو تشنہ تحقیق رہا ہو اور ان کی نظر سے چھوٹا ہو، انہوں نے اسلامی علوم و فنون کے بہت سے مستور گوشے بے نقاب کیے، علمی و مذہبی مباحث پر لکھا، ادبی و لسانی مسائل پر بحث و تنقید کی، مختلف اعتراضات کے جوابات دیئے، تاریخی گتھیوں کو سلجھایا، قومی و ملی مسائل پر اظہارِ خیال کیا۔ مسلمانوں کے علمی و تمدنی کارناموں کو اس طرح پیش کیا کہ اسلامی تاریخ، علم و فن اور تہذیب کا تماشا گاہ نظر آنے

Marfat.com

لگی۔غرض اسلامی علوم و ادب کی ہر شاخ، اور ہر پہلو پر معلومات کا ایک دفتر جمع کر دیا اور جس موضوع پر قلم اٹھایا اس کو اس تحقیق کے ساتھ لکھا کہ اس پر اضافہ کی گنجائش نہ چھوڑی۔

صرف ایک موضوع اور زبان و ادب پر ان کے مضامین کی تعداد اتنی ہے کہ ان کا مجموعہ کئی سو صفحات میں نقوشِ سلیمانی کے نام سے شائع ہوا ہے۔اس سے اُن کے دوسرے مضامین کی تعداد کا قیاس کیا جا سکتا ہے، اگر ان سب کو جمع کیا جائے، تو ان کا مجموعہ کئی جلدوں میں آئے گا۔ان میں سے بعض مضامین اتنے طویل ہیں کہ مستقل رسالوں کی شکل میں شائع ہوئے۔مثلاً رسالہ اہل سنت والجماعت، بہادر خواتینِ اسلام، حیاتِ مالک اور خلافتِ اسلامیہ اور دنیائے اسلام، ان سب مضامین پر تبصرہ کے لئے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے، اگر صرف ان کے ناموں کی فہرست لکھی جائے، تو بھی کئی صفحوں میں آئے گی۔اس لئے مختلف موضوع و مسائل سے متعلق نمونۃً کچھ مضامین کا نام لکھا جاتا ہے۔اس سے ان کی نوعیت اور اُن کے تنوع کا اندازہ ہوگا۔مثلاً

محبت الٰہی اور اسلام، اسلام میں حیوانات کے ساتھ سلوک، احکام القرآن، توکل، صبر کا قرآنی مفہوم، مذہب کا قانونی حصہ، ارضِ مقدس کی داستان، ارضِ حرم اور قرآنی احکام، خلیل اللہؑ کی بشریت، ذبحِ عظیم، قربانی کا اقتصادی پہلو، فنِ تصوف، اور محدثین و صوفیہ میں تطبیق کی راہ، لفظ اللہ کے معنی، اور اسمِ اعظم کا تخیل، اسلام اور حرمتِ ریا، جبر و قدر، کیا خلقی معذورین کی پیدائش انصافِ الٰہی کے خلاف ہے۔اسلامی عقیدہ کے مطابق بچوں کی پیدائش کے احوال کا اختلاف، امت مسلمہ کی بعثت، تخلیق عالم کا مقصد، قرآن پاک کا تاریخی اعجاز، سنت، وحی اور ملکۂ نبوت، کیا قرآن پاک انسانی ذہن و دماغ سے ماخوذ ہے۔حکومتِ الٰہیہ اور مسلمانوں کا مطمحِ نظر۔

اسلامی تہذیب و تمدن، مسلمان عورتوں کے حقوق کا مسئلہ، اسلام اور زنانِ ہند، تحفظ حقوق زوجین، احادیث و سیر کی تحریری تدوین، اسماء الرجال کا قدیم ذخیرہ، خلفائے

Marfat.com

اسلام کا اقتدار، خلفائے راشدین کا طریقِ حکومت، موجودہ ہندوستان میں کاشتکاروں کے حقوق، سیاسیاتِ اسلام کے نظریے، مسلمانانِ ہند کی مذہبی تنظیم، دنیائے اسلام میں ذہنی انقلاب، عالم اسلام کی تنظیم کا مسئلہ، نظمِ ملت، اندراج نکاح وطلاق وتقرر قضاۃ، مسلمانانِ ہند کا شرعی نظام ......

ہندوؤں کی علمی وتعلیمی ترقی' مسلمانوں کے عہد حکومت میں مرہٹوں کا فوجی نظام، عہدِ اسلام میں تعلیم عنوان کی درسگاہیں، ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کیونکر ہوئی، ہندوستان میں علمِ حدیث، مسلمان حکماء اور یونانی فلاسفہ، نظام اور اس کا فلسفہ، لاہور کا ایک فلکی آلات ساز خاندان، عربوں کی بحری تصنیفات رومن کیتھلک کی چند من گھڑت کہانیاں، برمک اور پُرمکھ، واقدی پھر واقدی، اصولِ تہذیب، ہندوستانی کی اصلیت اور اس کے کچھ اُصول' حجاز کے کتب خانے، انڈیا آفس لائبریری میں اردو کا ذخیرہ۔

ان مضامین کے علاوہ ان مقالات کی بھی خاصی تعداد ہے، جو مختلف علمی مجالس میں پڑھے گئے اور معارف میں شائع ہوئے۔ اس قسم کے بیشتر مقالات مضامین سے زیادہ اہم ہیں۔ چنانچہ اُن کی متعدد اہم کتابیں مثلاً عرب و ہند کے تعلقات، خطباتِ مدارس، خیام اور عربوں کی جہاز رانی اصل میں مقالات ہی تھے، جو ترمیم و اضافے کے بعد کتابی شکل میں شائع ہوئے۔ ان میں حسبِ ذیل مقالات زیادہ اہم ہیں۔ "مسلمانوں کی آئندہ تعلیم، یہ مقالہ جامعہ ملیہ میں پڑھا گیا۔ تاج محل اور لال قلعہ کے معمار اور قنوج ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور کے دو مختلف اجلاسوں میں پڑھے گئے۔ اردو کیونکر پیدا ہوئی۔ ناگری پرچارنی سبھا کے لئے لکھا گیا تھا۔ ابوالبرکات بغدادی اور اس کی کتاب المعتبر دائرۃ المعارف حیدر آباد میں عربی میں پڑھا گیا تھا اور اس کا اردو ترجمہ معارف میں شائع ہوا۔ عرب اور امریکہ، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک اجلاس میں پڑھا گیا تھا۔ اس کے علاوہ اور بھی مقالات ہیں، مگر ان سب کا استقصاء مقصود نہیں۔

Marfat.com

انہوں نے مجلسِ خلافت، جمعیۃ علمائے ہند، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، ادارہ معارف اسلامیہ لاہور، ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد، دائرۃ المعارف حیدر آباد، آل انڈیا ہسٹری کانگریس وغیرہ مختلف علمی و دینی مجالس کے اجلاسوں اور قومی و ملی کانفرنس کی صدارت کی اور ان میں صدارتی خطبے پڑھے۔ ان میں سے جو خطبات تحریری تھے، وہ معارف میں شائع ہوئے۔ اس لئے وہ محفوظ ہیں۔ وہ جملہ امور و مسائل میں خواہ علمی و مذہبی ہوں یا قومی و ملی ایک سوچی سمجھی ہوئی پختہ اور صائب رائے اور مستقل خیالات و نظریہ رکھتے تھے اور ان کا علمی ذوق اتنا رچا ہوا اور ہمہ گیر تھا کہ ان کا کوئی خطبہ اور تقریر بھی خواہ وہ کسی موضوع پر ہو افکار و نظریات اور علمی و تاریخی معلومات سے خالی نہ ہوتی تھی۔ علمی مجالس اور علمی اجتماعات کے خطبے معلومات کا خزانہ اور قومی و ملی کانفرنسوں اور جلسوں کے خطبات زیر بحث مسئلہ کے متعلق تفکر و تدبر، فہم و بصیرت اور صحیح اور سلجھی ہوئی رائے کا درس ہوتے تھے۔ ان کا کوئی خطبہ بھی ان خصوصیات سے خالی نہیں ہے۔ علمی و تاریخی خطبات میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی پچاس سالہ جوبلی کے شعبۂ علوم و فنون اور اسی کانفرنس کے اجلاس کلکتہ کے شعبۂ اردو اور آل انڈیا ہسٹری کانگریس کے اجلاس مدراس کے شعبۂ تاریخ ہند ازمنۂ وسطی کے فاضلانہ خطبہ ہائے صدارت علمی اور تاریخی معلومات کا گنجینہ اور ایک مستقل کتاب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ طب سے ان کو کوئی تعلق نہ تھا، لیکن طبیہ سکول پٹنہ کے جلسۂ تقسیم اسناد کا خطبۂ صدارت اسلامی طب کی پوری تاریخ ہے۔ ان خطبات کی بڑی تعداد ہے۔ مثالاً صرف چند خطبات کا تذکرہ کر دیا گیا۔

اُن کے علاوہ ان کے شذرات بھی نہایت اہم ہوتے تھے، عموماً مختلف النوع وقتی امور و مسائل اور کبھی کبھی مستقل معاملات پر شذرات میں اظہارِ خیال کرتے تھے۔ اس لئے اُن کے شذرات، مسائل و مباحث کے تنوع کی حیثیت سے دائرۃ المعارف کی حیثیت رکھتے ہیں اور اُن سے گذشتہ تیس پینتیس سال کی قومی و ملی تحریکوں، مختلف خیالات و رجحانات اور

Marfat.com

دوسرے پیش آمدہ حالات وواقعات کی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے اور اُن کے متعلق مصنف کے خیالات معلوم کیے جاسکتے ہیں۔ اُن کے شذرات غور وفکر، خیالات کی صحت و پختگی اور اصابت رائے کا نمونہ اور ایجاز واختصار اور بلاغت کے لحاظ سے ادب وانشاء کا شاہکار ہیں۔

مذکورہ بالا تصانیف اور مضامین وخطبات کی فہرست پر سرسری نظر ڈالنے سے ان کی وسعت ووقعتِ نظر، علمی جامعیت وہمہ گیری کا کسی قدر اندازہ ہوجاتا ہے۔ اس دور میں وہ جامعیتِ علوم کی تنہا مثال تھے۔ اُن میں ابن رشد وابن خلدون، ابن تیمیہ، ابن قیم، غزالی، ورومی، شاہ ولی اللہ مجدد سرہندی کے علمی جلووں کی جھلک یکجا نظر آتی تھی۔ اسی لئے ان کی تحریروں سے مسلمانوں کو جس قدر فیض پہنچا، اس کی مثال اس زمانہ میں کمتر ملے گی۔ صحیح العقیدہ، لیکن بے عمل مسلمانوں کو باعمل' طالبِ دین کو دیندار اور دیندار کو متقی بنادینا بہت آسان ہے، لیکن پڑھے لکھے جنون کو شیشہ میں اُتارنا اور تعلیم یافتہ متشککین اور منکرین کو دین کی راہ پر لگانا، بہت دشوار ہے اور یہ بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ اس دشوار کام کو سب سے زیادہ سید سلیمانؒ کی تحریروں نے انجام دیا اور جو لوگ اپنے مذہب اور اپنی تہذیب کے نام سے شرماتے تھے، وہ ان پر فخر کرنے لگے، اور ان میں اس کا ذوق اور اس کی طلب پیدا ہوگئی۔ اس طرح سید سلیمان ندوی نے ہزاروں گم کردہ راہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کو راہ راست پر لگایا۔

ان کا ایک بڑا علمی کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے اسلامی علوم وفنون پر تحقیقات کا ایک ایسا ادارہ قائم کردیا اور اس کو اس درجہ تک پہنچادیا کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری اسلامی دنیا میں اس کی شہرت ہے اور اس کے کاموں کو عزت ووقعت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور اُن کی تربیت کردہ جماعت کے علاوہ، ان کی تصانیف اور مضامین نے بہت سے تعلیم یافتہ مسلمانوں میں سنجیدہ علمی وتحقیقی کاموں کا مذاق پیدا کردیا۔ چنانچہ آج جن مسلمانوں میں بھی اس قسم کا ذوق نظر آتا ہے اور ہندوستان میں جہاں بھی اس قسم کا کام ہو

Marfat.com

رہا ہے، اس میں سید سلیمان ندوی کی تصانیف کو بڑا دخل ہے۔ اس لئے وہ درحقیقت ایک علمی دور اور ایک خاص مکتبِ فکر کے بانی تھے اور جب تک علمی دنیا قائم ہے، سید سلیمان کا یہ کارنامہ زندہ رہے گا۔

ان کا مزاج و مذاق اگرچہ ابتدا سے دینی تھا، اور اُن کی کسی دور کی تحریریں بھی دینی روح سے خالی نہیں ہیں، لیکن عمر کے ساتھ ساتھ دین کا رنگ اور زیادہ گہرا ہوتا گیا اور آخر میں وہ صبغۃ اللہ میں بالکل رنگ گئے تھے۔ **ومن احسن من اللہ صبغۃ** اور ان میں بڑا روحانی انقلاب پیدا ہوگیا تھا۔ اس دور میں اُن کے خیالات میں بھی بڑا تغیر پیدا ہوگیا اور ان کی تقریروں اور تحریروں کا رنگ بھی بدل گیا۔ یہاں تک کہ اپنے بعض پرانے خیالات اور تحریروں سے رجوع کیا اور اُن کے نزدیک اُن کے قلم سے جو بھول چوک ہوئی تھی، اس کو ''رجوع و اعتراف'' کے نام سے معارف میں شائع کیا۔ یہ کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ اس کو بڑا آدمی ہی انجام دے سکتا تھا اور یہ اُن کی عظمت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

اس روحانی انقلاب اور اس کے نتائج کے بارہ میں دو قسم کے خیالات ہیں۔ ایک جماعت اس کو پسندیدہ نظر سے نہیں دیکھتی اور اس کو اُن کی علمی عظمت کے منافی تصور کرتی ہے۔ اسمیں اس کو اُن کے علمی مرتبہ کا استخفاف نظر آتا ہے۔ دوسری جماعت اس انقلاب اور اس کے بعد ہی زندگی کو ان کا سب سے بڑا کارنامہ اور حاصلِ زندگی سمجھتی ہے اور اس سے پہلے کے علمی کاموں کو ناقابلِ اعتناء تصور کرتی ہے۔ یہ دونوں رائیں غلط اور افراط و تفریط پر مبنی ہیں۔ ان دونوں زندگیوں میں کوئی تضاد نہیں ہے بلکہ وہ ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں اور اس سے ان کا مرتبہ اور مقام اور زیادہ بلند ہوگیا۔ اس سے نہ اُن کی علمی منزلت میں کوئی فرق آتا ہے اور نہ ان کے علمی کاموں کی اہمیت گھٹتی ہے۔ ان کے علمی کاموں کا مقصد بھی دین و ملت اور اسلام و مسلمانوں کی خدمت تھا، اس لئے مذہبی حیثیت سے بھی ان کی اہمیت پوری طرح قائم رہتی ہے اور اُن کے روحانی انقلاب کو اتنی اہمیت نہیں دی جا سکتی

Marfat.com

کہ اس کے مقابلہ میں اُن کے علمی کارناموں پر پانی پھیر دیا جائے۔ یہ دونوں پہلو اپنی اپنی جگہ پر اہم ہیں، اور ایک کو بڑھانے کے لئے دوسری کی اہمیت نہیں گھٹائی جا سکتی، یہ کوئی غیر معمولی واقعہ یا نئی مثال نہیں ہے۔ اس قسم کے واقعات دوسرے اکابر اسلام کی زندگی میں بھی پیش آ چکے ہیں۔ امام غزالی، مولانا روم حتیٰ کہ امام رازی تک کو ان مراحل سے گذرنا پڑا ہے۔ لیکن آج کون صاحبِ علم و نظر اُن کے علمی کارناموں کی اہمیت کا انکار یا اس کی زندگی کے دونوں رُخوں سے کسی کا استخفاف کر سکتا ہے۔ اس لئے اس سے سید صاحب کی بھی کسی حیثیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔

درحقیقت یہ دونوں نقطۂ نظر غلط ہیں، نہ سید صاحبؒ نے راہِ سلوک اختیار کرنے کے بعد علمی کاموں کو چھوڑا اور نہ ان کا یہ راہ اختیار کرنا کسی حیثیت سے بھی قابلِ اعتراض ہو سکتا ہے۔ ان کا مذاق ضرور بدل گیا تھا، لیکن عملی کاموں کا سلسلہ بدستور جاری رہا، انہوں نے بہت سے خالص علمی مضامین، مثلاً ابوالبرکات بغدادی، اور اس کی کتاب البحر، ابن منصور کو سولی نہیں پھانسی دی گئی، عہدِ اسلامی میں تعلیم نسواں کی درسگاہیں، عدلِ جہانگیری کا ایک واقعہ' کیا مرزا بیدلؔ عظیم آبادی نہ تھے، برمل اور برمکھ، ملا خیر اللہ مہندس کے چند رسائل، قنوج، اور قومیت وغیرہ اس کے بعد لکھے۔ حیاتِ شبلی جیسی اہم کتاب بھی اسی زمانہ کی ہے۔ مکتوبِ فرنگ کے نام سے اپنے ان خطوط کا مجموعہ مرتب کیا، جو وفدِ خلافت کے سفر میں لندن سے اپنے احباب و اعزہ کو لکھے تھے۔ یادِ رفتگان کے نام سے اُن کے لکھے ہوئے وفیات کا جو مجموعہ حال میں شائع ہوا ہے، اس کو بھی وہ ترتیب دے چکے تھے۔ معارف میں اُن کے جو مضامین شائع ہوئے تھے، اُن کی ترتیب بھی پیش نظر تھی۔ علمی مجالس کی شرکت بھی برابر جاری رہی۔ چنانچہ آل انڈیا ہسٹری کانگریس، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، انجمن ترقی اردو وغیرہ کے جلسوں کی صدارت اسی زمانہ میں کی اور اس کے خطبہ صدارت پڑھے۔ اس کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ تصوف کی راہ میں آنے کے بعد انہوں نے علم کا

Marfat.com

کوچہ بالکل چھوڑ دیا تھا یا اس کی کوئی اہمیت اُن کی نگاہ میں نہ رہ گئی تھی، اگر کسی خاص حالت میں ان کی زبان و قلم سے کوئی ایسا فقرہ نکل گیا، جس سے تصنیف و تالیف یا علمی کاموں کی بے وقعتی ظاہر ہوتی ہو، تو اس کو حقیقت پر محمول کرنا خود سمجھنے والوں کی خوش فہمی ہے، جو لوگ شطحیات صوفیہ تک کی تاویل کرتے ہیں، کم از کم ان سے تو اس کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

اس سلسلہ میں ایک ذاتی واقعہ کا ذکر کرنا نامناسب نہ ہوگا۔ راہِ سلوک میں آنے کے بعد اکثر اپنے تلامذہ اور متوسلین کو بھی اس کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ میں نے عرض کیا کہ آپ نے تو سارے کام ختم کرنے اور جو حاصل کرنا اور دوسروں کو دینا تھا، اس کو حاصل کرنے اور دوسروں تک پہنچانے کے بعد یہ راہ اختیار فرمائی ہے، اگر ہم خدام ابھی سے اس راہ پر لگ گئے، تو ہمارا انجام کیا ہوگا۔ میرا اشارہ سمجھ کر فرمایا "میں یہ نہیں کہتا کہ علمی کام بے کار ہیں، یا ان کی ضرورت نہیں رہی، یا اُن کو چھوڑ دیا جائے، بلکہ تالیف و تصنیف کا مقصد اور نقطۂ نظر بدل جانا چاہئے اور اس کے لئے خود اپنے میں تبدیلی پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ میں نے عرض کیا اور ان خالص علمی کاموں کے متعلق کیا ارشاد ہے، جس کے لئے کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے جواب میں حسبِ عادت معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ فرمایا۔ شوق سے کیجئے، اس سے کون روکتا ہے، یہ بھی ایک کام ہے اور اُن کی دلآویز مسکراہٹ پر بات ختم ہوگئی۔

لیکن جو لوگ اُن کے سلوک و تصوف پر اعتراض کرتے ہیں، وہ بھی غلطی پر ہیں، ہر انسان پر دوسروں کے حقوق و فرائض کے ساتھ اپنے نفس کے بھی کچھ حقوق ہیں اور دوسروں کی خدمت اور اصلاح و فکر کے ساتھ اپنی فکر بھی ضروری ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سید صاحب نے جو علمی کام انجام دیئے، ان کا مقصد دین و ملت ہی کی خدمت تھا۔ اس لئے وہ بھی ان کے اعمالِ حسنہ میں داخل ہیں، لیکن ان کا تعلق زیادہ تر دوسروں کی اصلاح سے تھا، اس لئے اس فرض کی ادائیگی اور اس کام کی تکمیل کے بعد، اگر انہوں نے اپنی فلاح

Marfat.com

و تکمیل کے لئے کوئی راستہ اختیار کیا تو اس میں اعتراض کی کون سی بات ہے۔

درحقیقت ایک مسلمان کی زندگی کے مراحل کی فطری ترتیب یہی ہے اور اسوۂ نبویؐ بھی یہی تھا۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کی بعثت کے بعد اگرچہ آپؐ کی زندگی کا کوئی لمحہ بھی تعلق مع اللہ اور رضائے الٰہی کی طلب سے خالی نہ تھا اور آپؐ کی پوری زندگی اسلام کی تبلیغ، اس کی تعلیمات کی اشاعت، روئے زمین پر حکومت الٰہیہ کا قیام اور اس کے احکام کے نفاذ کی جدوجہد میں گذری، مگر جب ان کاموں سے فراغت اور دین کی تکمیل ہو چکی تو خصوصیت کے ساتھ تسبیح اور توبہ و استغفار کا حکم ہوا اور سورۂ فتح نازل ہوئی اور جیسا کہ بخاری اور حدیث کی دوسری کتابوں میں ہے، اس کے بعد آپؐ کا زیادہ وقت تسبیح و تہلیل میں بسر ہونے لگا، اس لئے سیرت نگارِ نبویؐ نے بھی اس اسوۂ نبویؐ پر عمل کیا اور ہر مسلمان کا یہی عمل ہونا چاہئے۔

درحقیقت ان دونوں زندگیوں میں کوئی تضاد نہیں ہے، بلکہ وہ ایک ہی تصویر کے دو رُخ، ایک ہی عمارت کے نقش و نگار اور ایک ہی گلدستہ کے مختلف رنگ و بو کے پھول ہیں، جن کے بغیر تصویر حیات کی تکمیل نہیں ہوتی۔ اس لئے جو لوگ ان دونوں پہلوؤں میں سے کسی کو بھی نظر انداز کرتے ہیں، وہ خود ناآشنائے حقیقت ہیں۔

اسیر مالٹا مولانا عزیر گلؒ .... تصنیف : مولانا عبدالقیوم حقانی

تحریک ریشمی رومال اور پس منظر، مولانا عزیر گل کی خاندانی نجابت اور شرافت، شیخ الہند کی مشن کی تکمیل اور جہاد افغانستان، مکہ معظمہ میں گرفتاری، حضور ﷺ کی زیارت، مولانا عزیر گل کی اہلیہ کا تذکرہ، وغیرہ وغیرہ آپ اس کتاب میں پڑھیں گے۔

صفحات : 48 .... قیمت : 15 روپے

القاسم اکیڈمی جامعہ ابوہریرہؓ برانچ پوسٹ آفس خالق آباد، ضلع نوشہرہ، سرحد پاکستان

Marfat.com

ڈاکٹر سید محمد ہاشم
لیکچرر شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

ایک ہمہ جہت عالم ...... ایک گراں مایہ شخصیت

غالب نے اپنے ایک خط میں لکھا ''اگر چہ یک فنہ ہوں، مگر مجھے اپنے ایمان کی قسم، میں نے اپنے کسی شیوہ کی داد نہ پائی''۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ کا معاملہ اس سے قطعاً مختلف ہے۔ وہ جامع الکمالات شخصیت کے مالک اور بہت سے میدانوں کے امام ہیں۔ وہ اگر ایک طرف عالمی سطح کے سیاست داں ہیں تو دوسری طرف ایک زبردست صاحبِ سلوک کے خلیفۂ مجاز ہیں۔ ایک صاحب طرز ادیب کی حیثیت سے ان کی عظمت مسلم ہے، تو میدانِ تحقیق میں وہ مجتہدانہ مقام کے حامل ہیں، اگر مؤرخانہ بصیرت درجۂ استناد کو پہنچی ہوئی ہے تو ان کا شعری ملکہ بھی قابلِ قدر ہے۔ انہوں نے سیرت وسوانح میں رسوخ واعتبار حاصل کیا ہے، تو صحافت و ادارت کا اختصاص لائقِ تقلید ہے۔ تنقید وتبصرہ نگاری کے ساتھ ساتھ لسانیات کے موضوع پر ان کی گہرافشانیاں اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہیں۔

دوسرے زاویہ سے دیکھا جائے تو علومِ قرآن پر وہ ماہرانہ قلم اُٹھاتے ہیں تو علمِ حدیث ان کے خصوصی اقلیم ومملکت ہیں۔ وہ فقہ وتفسیر کے مجدد اور لغت ورجال کے متکلم ہیں، تصوف ان کی جبلت ہے تو کلام ان کا حاشیہ نشیں۔ وہ برسہا برس تک پیچ وتاب رازی کی زلفیں سنوارنے میں مصروف ومنہمک رہے، لیکن جب انہیں یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ سوز وساز رومی کی غواصی کریں تو ان کی جبلت عود کر آئی اور ''رجوع واعتراف'' کے پل سے

Marfat.com

گذر کر وہ دفعتاً غزالی کی صف میں جا کر کھڑے ہو گئے۔ ظاہر ہے گلہائے رنگ کے ایسے حسین اور پر پیچ گلدستہ کی تفہیم و تحسین اس کے ہمہ جہت مطالعہ کے بغیر ممکن نہیں ......

در سخن مخفی منم چو بوئے گل در برگ گل

ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

ہمارا ادب سطحیت کے جبر، فکر کی تخفیف اور تخیل کے مجرد اظہار کے سبب بہت مجروح ہوا ہے۔ جب کہ سماجی، سیاسی، جغرافیائی، تاریخی، مذہبی اور سائنسی افکار کا ادبی اظہار ادب عالیہ کے امتیازی نشانات کا حامل ہوتا ہے اور اس خیال کی تائید دنیا کی تمام مشہور زبانوں سے ہوتی ہے۔ اسی طرح اردو ادب کے نصاب اور نظامِ تعلیم کے علاوہ دنیا کی کوئی اہم زبان ایسی نہیں، جہاں مذہب، سیاسیات، تاریخ، جغرافیہ اور صحافت کے بغیر اس ادب کی گاڑی آگے بڑھ سکتی ہو، جب کہ تقریباً گذشتہ تیس برس سے یہ خصوصیت پیدا ہوگئی ہے۔ ہمارے ادب کی اعلیٰ ترین ڈگریاں حاصل کرنے والا شخص جو کل کا استاد اور مدبر ہے، ان کے مبادیات کو چھوئے بغیر بھی کارزارِ زندگی میں قدم رکھ سکتا ہے۔ اس کو سہل انگاری اور سطحیت کے جبر کے علاوہ کوئی دوسرا نام نہیں دیا جا سکتا۔ دراصل علم و ادب کی برگزیدگی یہ ہے کہ بیک وقت ان دونوں کا ذوق عام اور احساس شدید ہو جائے۔ ادراک کی نبض میں تیزی، قوتِ عمل میں تندی، مطالعہ میں مادہ۔ دل، ور ذہنی تربیت میں وسعت ہی نہیں ہمہ جہتی بھی پیدا ہو جائے۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ کی تحریروں کا مطالعہ ان تمام سمتوں میں ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ ان کی شاعری کو جس کے مجموعہ کا نام ''ارمغانِ سلیمان'' ہے۔ دوسرے درجہ کی چیز کہا جا سکتا ہے۔ ان کے تنقیدی تبصروں پر کلام کیا جا سکتا ہے۔ اردو زبان کی ابتدا سے متعلق انہوں نے جو رائے دی ہیں، ان کا بطلان خلاف توقع نہ ہوگا، لیکن سیرت و سوانح، تاریخ و تنقید، وفیات اور دیگر عالمی موضوعات کے علاوہ قرآن و حدیث، فقہ و تفسیر، تصوف و

Marfat.com

کلام اور لغت و رجال وغیرہ پر ایک طرز خاص میں لکھے ہوئے ساڑھے تین سو فکر انگیز اور بصیرت افروز مقالات ہمارے ادب عالیہ کا بیش بہار سرمایہ ہیں۔ سیرۃ النبیؐ کی ۵+۲=۷ ضخیم جلدیں جن میں سے ہر ایک تقریباً پانچ سو صفحات کو محیط ہے، اور جس میں حشو و زوائد کی گنجائش برائے نام ہی نکل سکتی ہے۔ عربی، انگریزی، فرانسیسی، پشتو، مالاباری، ہندی، گجراتی اور ترکی زبانوں میں اس کے جو ترجمے ہوئے ہیں، ان کے نتائج اس امر پر دال ہیں کہ اسے دنیا کے مذہبی ادب میں صف اول میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ نیز اس میں وقت نظر، تحقیقی کاوش اور تنقیدی حزم و احتیاط کے جو مظاہر جلوہ گر ہیں، مذہبی ادب ان سے عموماً بے نیاز رہتا ہے۔ رحمتِ عالم ﷺ جس کے ہر ایڈیشن میں برسوں محنت کی جاتی رہی ہے بچوں کے ادب کی ایک ممتاز کتاب ہے۔ خطباتِ مدراس کے موضوعات کا انتخاب، طرزِ استدلال، زبان اور اسلوبِ بیان جس قدر موثر و دل نشین ہے، اہل نظر سے مخفی نہیں، چنانچہ پروفیسر رشید احمد صدیقی کا بیان ہے کہ :

> ''سید صاحب کی تصانیف میں سے جس تصنیف نے مجھے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ متاثر کیا، وہ ان کے خطباتِ مدراس ہیں۔ مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسلامی عقائد اور شعائر سے متعلق اتنی اچھی اور مختصر کتاب شاید اسلامی ممالک میں بھی نہیں لکھی گئی''۔

سیرۃِ عائشہؓ اور حیاتِ امام مالکؒ کو اگر بظاہر زیادہ ادبی اعتبار حاصل نہ بھی ہو تو حیاتِ خیام کی ترتیب میں جس محنت، عرق ریزی، نکتہ سنجی اور دقیقہ رسی کا مظاہرہ کیا ہے، اس نے پورے دو سو سال کی تحقیق میں انقلاب برپا کر دیا۔ اس کتاب میں تحقیق کا جو نیا منشور اور نمونہ پیش کیا ہے اور تاریخ کی زبان میں، خیام کو دوسرا جنم دیا ہے، جب یہ کتاب اپنی ابتدائی شکل میں ایک مقالہ کی حیثیت سے معارف میں شائع ہوئی تھی، تو پروفیسر محمود شیرانی اور ڈاکٹر محمد اقبال کو اس کے بعض مباحث سے اختلاف تھا، لیکن توسیع پا کر جب یہ کتاب

Marfat.com

''خیام'' کے نام سے منظر عام پر آئی، تو اس وقت سے عہد حاضر تک کے نامور محققین اور امامانِ تحقیق نے اس کو اپنے فن کا مستند اور گرانمایہ کارنامہ تسلیم کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس موضوع پر بعد میں لکھی جانے والی ایرانی اور انگریزی کتابیں اسی کی مؤید بھی ہیں، اور اس سے مستفاد بھی۔ اس کتاب کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے، عام تحقیقی تصانیف کے برخلاف اس کو بہتر سے بہتر ادبی اعتبار حاصل ہے۔ بعض نہایت خشک اور فلسفیانہ مباحث کو بھی دلچسپ و دل نشین اسلوب میں پیش کیا گیا ہے۔ رباعیات خیام کے تعین کے سلسلے میں اب تک کی یہ سب سے محتاط تصنیف ہے۔

اگرچہ ارض القرآن میں قرآن عظیم کے جغرافیائی مقامات کی تعیین اور نشان دہی کی گئی ہے، جو اپنے موضوع کے اعتبار سے خالص مذہبی تالیف معلوم ہوتی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ علم آثار قدیمہ کے نقطۂ نظر سے فن، مذہب پر غالب نظر آتا ہے، چنانچہ سید صاحب نے مفسرین کی روایتی تحقیق سے انحراف کر کے خالص فنی نقطۂ نظر سے جس لسانیاتی ژرف نگاہی اور جغرافیائی بصیرت، علم طبقات الارض کی واقفیت اور اسلامی و مخضرمی شعرا کے کلام سے استدلال کر کے جن حقائق کا انکشاف کیا ہے، ان کی فنی حیثیت مسلم ہے۔ عمومی بحثوں سے قطع نظر ادق مسائل کو بھی جاذبِ نظر بنا کر پیش کرنا، سید صاحب کا خاص امتیاز ہے، یہی نہیں بلکہ پرشکوہ اسلوب کی پختگی کا یہ عالم ہے کہ اپنے بیان کے دوران قرآن حکیم کی آیت کے ساتھ جب اس کا ترجمہ پیش کرتے ہیں، تو اسلوب میں قطعاً فرق نہیں آتا اور قرآن کریم کا وقار پوری متانت کے ساتھ اس میں جھلکتا ہے۔

عہدِ جدید میں بعض مصالح کے پیشِ نظر ممالک عربیہ سے خصوصی روابط کا اہتمام و التزام ہے، لیکن سید صاحب نے آزادیٔ ہند سے قبل اپنے پانچ تاریخی خطبات میں صدیوں پُرانے عرب و ہند کے تعلقات کا جائزہ لے کر ان کی نوعیت وافادیت پر بڑا جامع کلام کیا ہے۔ تحقیق کے اسی دائرہ کو موصوف نے مزید وسیع کیا اور بحری آلات رسل و رسائل

Marfat.com

میں عربوں کی خدمات پر لکچر دیئے۔ یہ دونوں کتابیں ''عرب و ہند کے تعلقات'' اور ''عربوں کی جہاز رانی'' کے نام سے ۱۹۲۹ء اور ۱۹۳۲ء میں سرکاری سطح پر طبع ہو کر شائع ہوئیں۔ ان کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ سید صاحبؒ کی سماجیاتی بصیرت کس قدر عمیق، سیاسیاتی نظر کس قدر وسیع، معاشیاتی ورک کتنا بھرپور، تقابلی زبان وادب کا لسانیاتی اور ادبی مطالعہ کتنا جامع اور مذہبی افادیت کا رجحان کتنا واضح اور شفاف تھا۔ ان تصانیف کے بنیادی موضوعات پر دقتِ نظر کا ثبوت دینے کے علاوہ سید صاحبؒ نے ان دو کتابوں اور خود ارض القرآن میں لسانی ولسانیاتی مباحث کی جس عالمانہ اور فنکارانہ طریقہ پر گرہ کشائی کی ہے، نیز مختلف زیر مطالعہ علوم پر جو سیر حاصل کلام کیا ہے، وہ سید صاحبؒ کی جامع علوم شخصیت کا آئینہ دار ہے۔ قطب نما کی ایجاد پر سید صاحبؒ کے انکشاف کو آج تک غلط ثابت نہیں کیا جا سکا ہے، اسی طرح سید صاحب ہی کی یہ دلچسپ اور پرمغز بحث وتحقیق ہے کہ ہندوستان پہنچنے والا پہلا سیاح واسکوڈی گاما نہیں، ایک مسلمان محمد ابن ماجد تھا، جو واسکو ڈی گاما کا شاگرد نہیں، بلکہ استاد اور رہبر تھا۔ چنانچہ حال ہی میں اسی موضوع پر ایک محقق کو پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی عطا کی گئی ہے۔

سوانح نگاری کے نقطۂ نظر سے سید صاحبؒ کا پایہ بہت بلند نظر آتا ہے، اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ وہ رسولِ اکرم ﷺ کی سیرت نگاری کے مجدد ہیں۔ اس کے علاوہ سیرتِ عائشہؓ اور حیاتِ امامِ مالکؒ جیسی شخصیات پر بھی وہ اپنا زورِ طبع صرف اور فنی کاوش کا اظہار مکمل کر چکے تھے۔ خیام کی تحقیق کے دوران اس کی سوانح کی تمام جزئیات کو جس احتیاط سے سید صاحبؒ نے پیش کیا ہے۔ اپنے موضوع پر اسے حرفِ آخر کہا جا سکتا ہے۔ البتہ حیاتِ شبلیؒ میں عقیدت مندی کے سبب بعض فنی خامیاں راہ پا گئی ہیں، لیکن یہاں یہ امر بھی محلِ نظر ہے کہ سید صاحبؒ نے نہ صرف یہ کہ فن کی کسوٹی پر پرکھنے کا کوئی دعویٰ نہیں کیا ہے، بلکہ اسے انہوں نے عقیدت مند کا ایک تحفہ کہا ہے۔ بایں ہمہ سوانح نگاری کے آداب و

Marfat.com

شرائط کا لحاظ رکھنے میں وہ بیشتر جگہ کامیاب رہے ہیں اور فنی اعتبار سے یہ تصنیف اردو سوانح کی مقدس کتابوں سے کہیں بہتر ہے، جب کہ ''یادگارِ غالب'' اور ''حیاتِ جاوید'' کی تلاوت ان کا مخالف بھی باوضو اور باادب کرتا ہے۔

ابن خلکان کی شہرہ آفاق کتاب ''وفیات الاعیان'' کا نعم البدل سید صاحبؒ کی ''یادِ رفتگان'' ہے، جس میں تعزیت کے عنوان سے مذکورہ شخصیات کی حیات اور کارناموں پر نہ صرف ایجاز بیانی کا حق ادا کیا ہے، بلکہ ایمان کی بات یہ ہے کہ اعجاز کاری کے جلوے دکھائے ہیں۔ ان میں ملی، ملکی اور عالمی ہر سطح کی شخصیات موجود ہیں۔ سید صاحبؒ کے بزرگ، ہم عمر اور کم سن وفات یافتگان سبھی کو حصہ ملا ہے۔ یہاں خالص سیاسی شخصیات بھی جلوہ افروز ہیں اور خالص مذہبی بھی۔ اس کے علاوہ خادمانِ قوم، علماء وصلحائے اُمت اور شعرا وادبا اور محققین وغیرہ شامل ہیں اور بعض ایسی شخصیات بھی ہیں، جن پر اگر سید صاحبؒ قلم نہ اُٹھاتے تو شاید وہ بہت دن تک گوشۂ گمنامی میں پڑی رہتیں' یہ اضافہ بطورِ خاص ہے۔ معارف کے صفحات سے سید صاحبؒ نے اس فن کی جو شمع روشن کی، عہد حاضر میں چاروں طرف اس کا نور چھلکتا نظر آتا ہے۔ الفاظ کی ترتیب بظاہر جذباتی ہے، لیکن ہر ترکیب معنوی اعتبار سے تہ دار اور اپنے جلو میں ایک جہانِ معنی لے کر چلتی ہے۔ جذباتی وابستگی ہونے کے باوجود حقیقت کا دامن ہاتھ سے نہیں جاتا اور ایجاز نگاری کا فن جہاں ایک طرف کمال دکھاتا نظر آتا ہے، وہیں، قاری سے زبان کی نزاکتوں کے ساتھ ساتھ، تاریخ وتصوف، فلسفہ و سیاست اور دوسرے علوم کی اصطلاحات سے کماحقہٗ واقفیت کا مطالبہ بھی کرتا ہے۔ مولانا محمد علی جوہر کے بارے میں ان کی گہرافشانیوں سے ایک اقتباس درج ذیل ہے:

''وہ پُر درد آواز جو ۱۹۱۱ء سے ۱۹۳۰ء تک ہندوستان اور دنیائے اسلام کے ہر قیامت آفریں سانحے پر صدائے صور بن کر بلند ہوتی رہی، ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئی۔ وہ آتشیں زبان جو رزم میں تیغ براں بن کر چمکتی تھی، اب کسی

Marfat.com

معرکہ میں ہم کو نظر نہ آئے گی۔ وہ پر جوش سینہ جو ہمارے مصائب کے پہاڑ سیلاب بن کر بہالے جاتا تھا۔ اس کا تلاطم ہمیشہ کے لئے تھم گیا۔ وہ پر زور دست و بازو جو شب و روز کی نبرد آزمائی اور خدمت گذاری میں مصروف تھے، وہ اب ایسے تھکے کہ پھر نہ اٹھیں گے۔ افسوس! کہ شکست خوردہ فوج کا آخری سپاہی جو اعدا کے نرغے میں تنہا لڑ رہا تھا، آخر زخموں سے چور ہو کر ایسا گرا کہ پھر کھڑا نہ ہوگا، وہ مشرق کا آفتاب تھا، یہ آفتاب بھی اگر مشرق سے طلوع ہو کر مغرب میں جا ڈوبا تو دنیا کا کوئی نیا واقعہ نہ ہوا اور اس لئے حق تھا کہ مشرق و مغرب کا متحدہ مرکز اس کا مدفن بنے۔ اے مشرق و مغرب کے مالک! تو اپنی رضامندیوں کے پھولوں سے اس کا دامن بھر دے''۔

صرف ایک اقتباس ایک مذہبی شخصیت یعنی حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے بھی ملاحظہ ہو:

''جس کا سینہ چشتی ذوقِ عشق اور مجددی سکون کا مجمع البحرین تھا، جس کی زبان شریعت و طریقت کی وحدت ترجمان تھی، جس کے قلم نے فقہ و تصوف کو ایک مدت کی ہنگامہ آرائی کے بعد باہم ہم آغوش کیا تھا اور جس کے فیض نے تقریباً نصف صدی تک اللہ تعالیٰ کے فضل و توفیق سے اپنی اعلیٰ تعلیم و تربیت اور تزکیہ و ہدایت سے ایک عالم کو منور کر رکھا تھا اور جس نے اپنی تحریر و تقریر سے حقائق ایمانی و دقائق فقہی، اسرار احسانی اور رموز حکمت ربانی کو برملا فاش کیا تھا اور اس لئے دنیا نے اس کو حکیم الامت کہہ کر پکارا''۔

نقوشِ سلیمانی سید صاحبؒ کے لسانی اور ادبی مقالات اور خطبات کا مجموعہ ہے۔ اس کے دو حصے ہیں، پہلا حصہ اردو زبان پر علمی، سماجی، سیاسی اور لسانیاتی قسم کے مباحث پر مبنی مضامین پر مشتمل ہے، لیکن اس کا اہم ترین مضمون وہ ہے، جو ۱۹۳۲ء میں انجمن اردوئے

Marfat.com

معلّٰی کے جلسے میں پڑھا گیا تھا۔ اسی مضمون میں سید صاحبؒ نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اردو سندھی سے نکلی اور وہ اس کا منبع محمد بن قاسم کا حملہ قرار دیتے ہیں۔ نصیر الدین ہاشمی، محمود شیرانی وغیرہ کی طرح سلیمان ندویؒ کا یہ خیال بھی ماہرین لسانیات نے غلط ثابت کر دیا ہے، لیکن اسی مقالے اور دوسرے خطبات و مقالات میں زبان کی ساخت، اس میں کارفرما عناصر اور اس کے ارتقا کی تاریخ کی جزئیات پر جو لسانیاتی بحث کی گئی ہے۔ اس کے پیش نظر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ سید صاحب اس فن کے اہم نکات سے بڑی حد تک واقف تھے۔ انہیں ماہر لسانیات نہیں کہا جا سکتا، لیکن وہ زبان کے رموز و نکات کے اداشناس اور اردو کے مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کرنے والے ایک اہلِ قلم اور عالم ضرور تھے، جس کا شغف ان کو نوعمری سے ہی تھا۔ ابتدا میں اس کا رُخ عربی کی طرف تھا، مگر بعد میں وقت کی ضرورت کے احساس نے اسے اردو کی طرف موڑ دیا۔ چند مضامین کی فہرست پر نظر ڈالنے سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے۔

چنانچہ عربی زبان کی مختصر تاریخ ستمبر ۱۹۰۴ء، عربی زبان کی وسعت جولائی ۱۹۰۷ء، اور عربی زبان کی خصوصیات اگست ۱۹۰۷ء، کے الندوہ میں، عربی زبان اور علمی اصطلاحات اگست ۱۹۱۳ء کے الہلال میں اور علم الالسنہ پر ایک مضمون اکتوبر ۱۹۱۳ء میں ماہنامہ تمدن میں شائع ہوا۔ لغات جدیدہ کے نام سے عربی اردو لغت کا سنہ اشاعت ۱۹۱۲ء ہے۔ ارض القرآن کا سنہ تالیف ۱۹۱۴ء اور سنہ اشاعت ۱۹۱۸ء ہے۔ اس میں لسانیاتی بحثیں بہت وقیع ہیں۔ فروری ۱۹۲۱ء کے معارف میں اسپینی زبان میں عربی کے آثار شائع ہوا۔ ستمبر ۱۹۲۱ء میں وضع اصطلاحات پر ایک مضمون لکھا اور یہیں سے انہوں نے اردو کی طرف رجوع کیا، چنانچہ مئی ۱۹۲۵ء میں ''اردو'' ۱۹۳۲ء میں اردو کیوں کر پیدا ہوئی۔ ۱۹۳۷ء میں ہماری زبان بیسویں صدی میں، مئی اور جون ۳۹ء کے شماروں میں بعض پرانے لفظوں کی نئی تحقیق اور تمہید کے عنوان سے انکے مقالات شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ عرب و ہند کے تعلقات اور

Marfat.com

عربوں کی جہازرانی میں انتقال حروف واصوات اور الفاظ و املا پر بحثوں سے سید صاحبؒ کے علم اللسان پر درک وبصیرت کا بخوبی انکشاف ہوتا ہے۔

رباعی ایک متنازعہ فیہ صنف سخن رہی ہے۔ اس کے اوزان وارکان پر طویل بحثیں ہوتی رہیں، لیکن سید سلیمان ندویؒ نے پہلی بار رباعی کی وجہ تسمیہ اور اس کے وجہ آغاز کو فارسی کے بجائے عربی سے وابستہ کیا۔ بعد میں اس موضوع پر جو مقالات لکھے گئے ہیں، ان میں نت نئے اوزان وزحافات کی دریافت تو ہوئی ہے، لیکن اسکے علاوہ رباعی کے متعلق سید صاحب کے خیالات پر حرف گیری نہ ہوسکی۔ خود پروفیسر محمود شیرانی اور پروفیسر ڈاکٹر محمد اقبال نے اس کی مکمل اشاعت کے بعد رسالہ اردو میں اپنی بحث کو ختم کردیا۔ یہ بحث مقالاتِ شیرانی میں شامل ہے۔

نقوشِ سلیمانی کا دوسرا حصہ ان مقدمات پر مشتمل ہے، جو سید صاحبؒ نے مختلف اہلِ ادب کی کتابوں یا شعری مجموعوں پر لکھے تھے۔ ان میں خاص طور سے مکاتیبِ مہدی، حسرت، اصغر اور جگر کے مجموعہائے کلام پر مقدمے سید صاحبؒ کی تنقیدی بصیرت کی جھلکیاں پیش کرتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسی تحریروں میں تنقید تو مقصد ہی نہیں ہوتا ہے، تاہم اس کا اظہار ہوجانا ناگزیر ہے۔ اسی طرح رموز بے خودی پر تبصرہ اقبال کی فکری توصیف لیکن فنی ولسانی خامیوں کی نشاندہی سے مزین ہے۔ یہ سبھی حضرات سید صاحبؒ کی شعرفہمی، نکتہ رسی اور اعلیٰ ذوق نیز شعر وادب پر سید صاحبؒ کی نگاہ محرمانہ کے معترف ومداح تھے اور ظاہر ہے ان کی آراء کو بے وقعت نہیں کہا جاسکتا۔

مطبوعات جدیدہ اور نئی کتابیں وغیرہ کے عنوانات سے اردو کتابوں پر تبصرہ نگاری کا باقاعدہ آغاز بھی معارف کے صفحات سے ہوتا ہے۔ سہ ماہی رسالہ اردو معارف کے پانچ سال بعد ۱۹۲۱ء میں جاری ہوا۔ معارف کی تقلید میں اس میں بھی یہ پابندی کی گئی۔ اس طرح کے تبصروں کی ایک نہج متعین ہوئی اور بعد میں اس میں اضافے ہوتے رہے۔

Marfat.com

ان تبصروں میں سید صاحبؒ کا اندازِ فکر تنقیدِ حالی وشبلی کی ترقی یافتہ شکل میں جلوہ گر ہوا اور پروفیسر کلیم الدین کو شعر الہند کی طرح اس پر کسی اظہارِ حیرت کی بھی ضرورت پیش نہیں آئی۔

سید صاحب کی سیاسی وسماجی شخصیت ان کے رسائل دنیائے اسلام اور مسئلہ خلافت اور ہندوستان، خلافتِ عثمانیہ اور دنیائے اسلام، خواتینِ اسلام کی بہادری، سیرتِ عائشہؓ اور سب سے زیادہ برید فرنگ اور معارف کے شذرات میں ظاہر ہوئی ہے۔ مؤخر الذکر دونوں حوالے ادبی اعتبار سے بھی وقعت واہمیت کے حامل ہیں۔ جہاں سید صاحبؒ کا اسلوبِ نگارش اپنی چنگاریاں بکھیرتا نظر آتا ہے۔ برید فرنگ ان خطوط کا مجموعہ ہے، جو سید صاحب نے وفدِ خلافت کے ایک رکن کی حیثیت سے لندن سے اپنے ہندوستانی احباب و مخلصین کو لکھے تھے۔ لندن کا یہ سفرنامہ ان کے سفرنامہ افغانستان سے قدرے مختلف ہے۔ اس لئے کہ ایک کا پس منظر سیاسی ہے اور دوسرے کا خالص علمی۔

صحافت ادب سے باہر کی چیز نہیں، البتہ اخباری صحافت اور ماہنامہ جرائد کی ادارت میں بین فرق ہے۔ اخبار کی صحافت میں وقتی اور عارضی عنصر غالب رہتا ہے، کچھ عرصہ بعد اس کی معنویت تقریباً ختم ہو جاتی ہے۔ ہنگامی موضوعات تو ماہناموں یا جرائد کے شذرات میں بھی تنفس کے مریض رہتے ہیں، لیکن اہم فکری مسائل پر سنجیدگی سے قلم اٹھایا جائے تو اس ادبی صحافت کی عمر زیادہ ہوتی ہے۔ سید صاحبؒ کے الندوہ کے بیشتر شذرات ہنگامیؒ اور وقتی ہونے کی وجہ سے زندہ نہ رہ سکے۔ البتہ الہلال کی ادارت سے وابستگی کے بعد اس میں بھی مقالات لکھے اور مستقل علمی موضوعات پر خامہ فرسائی کرتے رہے، لیکن اس عہد وابستگی کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ شبلی کے دو تربیت یافتگان اپنی انفرادیت کے باوجود بیک وقت شبلی کے اسلوب کی پیروی میں مکمل طور پر کامیاب تھے اور یہیں ان کا قران ہوا۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ کی انانیت کے سمندر میں اس وقت پہلا پرشور طوفان آیا، جب ان کی عدم موجودگی کے سبب ایک خصوصی شمارہ سید صاحبؒ نے ترتیب دیا اور مسجد

Marfat.com

کانپور کے انہدام کا واقعہ ۲۰ ر اگست ۱۹۱۳ء کے اداریہ کا موضوع بنا۔ یہ پر جوش اداریہ مولانا آزادؒ کی مابہ الامتیاز خصوصیات سے اس حد تک مماثل تھا کہ آئندہ شمارہ میں موصوف کو وضاحت کرنی پڑی کہ میں اس ہفتہ سفر میں تھا، گویا وہ اداریہ ان کا نہیں ہے۔ اس کے بعد خود اپنے مخصوص لب ولہجہ میں وہی ماتم کیا۔ تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ ''سید سلیمان ندوی حیات اور ادبی کارنامے'' میں ان دونوں اداریوں کا تجزیاتی ولسانیاتی مطالعہ وموازنہ موجود ہے۔ یہ اداریہ جہاں سید صاحبؒ کے اس وصف خاص کا مظہر ہے، وہیں مولانا آزادؒ اور سید صاحبؒ کی معاصرانہ چشمک کا آغاز بھی ہے۔

الہلال کے تین سال بعد سید صاحب نے ماہنامہ معارف جاری کیا۔ اس کا اولین شمارہ ہر اعتبار سے معیاری شکل میں سامنے آیا۔ مستثنیات سے قطع نظر اخبار ورسائل کے اجراء کا کلیہ یہ ہے کہ اس کا معیار اس کی پہلی اشاعت سے متعین ہوتا ہے، چنانچہ بعد کے شمارے اسی معیار، اسی نہج اور مکمل پابندی کے ساتھ منظر عام پر آتے رہے اور شاید یہ واحد مثال ہے کہ آغاز سے تا ایں دم اس رسالہ کے تسلسل اشاعت میں کسی ناغہ کا داغ نہیں ہے۔ سید صاحب ۱۹۵۰ء تک اس کے مدیر اعلیٰ رہے۔ اس دوران وہ عالم اسلام کے مشہور صاحب فکر کی حیثیت میں سیاسی، سماجی اور علمی وتعلیمی میدانوں میں سرگرم رہے۔ مثلاً وفد خلافت کے ساتھ انگلستان گئے۔ اسطرح ایک دوسرے وفد کے قائد بن کر سعودی عرب گئے۔ ندوہ کی معتمدی ان کی مستقل مصروفیت تھی۔ افغانستان میں علامہ اقبال اور سر راس مسعود کے ساتھ نصاب کی اصلاحی کمیٹی کے رکن بن کر گئے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں مختلف نصابات کی ترتیب کی ذمہ داری، یہاں کورٹ کی مسلسل رکنیت، تقررات میں ایکسپرٹ کی حیثیت سے شرکت، دار المصنفین کا پورا انتظام، سیرت کی تکمیل اور متعدد کتابوں کی تصنیف وتالیف اور طباعت کے علاوہ دوسری کتابوں کی اشاعت وغیرہ کی ذمہ داری کو وہ خوش اسلوبی سے نباہتے تھے۔ تقریباً ہر شمارے میں ایک یا زائد مقالہ لکھنا ناگزیر

Marfat.com

ہوتا تھا۔ مطبوعاتِ جدیدہ اور وفیات بھی التزامی طور پر سید صاحبؒ سے متعلق تھے۔ ان سینکڑوں مضامین کے علاوہ ۲۱۹۲ صفحات پر ان کے متین و پر مغز شذرات اپنے نشیب و فراز کے ساتھ صفحہ قرطاس پر نمودار ہوئے۔ معارف کے بعد کتنے ہی رسالے جاری ہوئے اور بند بھی ہوئے، لیکن معارف کے بانی اور مسلسل پینتیس (۳۵) سالہ مدیر کی ضیا پاشی عالم ادب کو آج تک منور کر رہی ہے۔

رسائل اور صحافت کے بغیر اس ادب کا وجود مشکوک اور معیار مبہم ہوتا ہے اور جس زبان کے ادبی رسائل دہائیوں دیگر رسائل کو جنم دینے کا سبب بن جائیں، تو وہ اس ادب میں ہی نہیں، باہر بھی قابلِ قدر ہوتے ہیں۔ معارف نے ادب کی اشاعت کا ایک معیار متعین کیا، تنقید و تبصرہ کا ایک سلیقہ عطا کیا، معارف کے واسطہ سے سید صاحبؒ نے کتنے ہی باصلاحیت افراد کی جوہر شناسی کا ثبوت دیتے ہوئے ان کی ادبی و تصنیفی تربیت کر کے انہیں اہل قلم بنایا اور طرزِ فکر و طرزِ استدلال کی نئی راہوں کی نشاندہی کی۔ معارف کے اشاریہ پر نظر ڈالنے سے ان اشخاص کی حقیقت توقع سے زیادہ عیاں ہو جاتی ہے۔ کتنے ہی بے جان قلم جاندار اور روح پرور ہو گئے۔ ۱۹۱۶ء سے ۱۹۵۰ء تک کتنی ہی نسلیں علمی و ادبی تربیت پا گئیں اور کتنے ہی نئے اہل قلم پیدا ہو گئے۔ نثر نگاروں کے علاوہ اہم شعرا میں حسرت، جگر، اصغر و فانی اور فراق وغیرہ یہیں سے طلوع ہوئے اور اُبھرے۔ علامہ اقبال نے اپنا تصور زمان و مکان مرتب کرنے میں سب سے زیادہ استفادہ سید صاحبؒ سے ہی کیا ہے۔ سید صاحبؒ کے نام ان کے خطوط اس بات کے مظہر ہیں کہ اس علامہ دھر نے سید صاحبؒ سے قدم قدم پر رہنمائی حاصل کی ہے۔ یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ اگر معارف نہ ہوتا تو حالی و شبلی سے آگے بڑھنے والے اردو ادب کو اپنا اعتبار قائم کرنے میں کچھ مزید وقت درکار ہوتا اور بلاشبہ معارف کا دوسرا نام سید سلیمان ندویؒ ہے۔

سید صاحبؒ کی جامع کمالات شخصیت کے تصنیفی پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے

Marfat.com

پروفیسر سعید احمد اکبر آبادی نے ایک جگہ لکھا ہے :

''سید صاحبؒ کی وسعتِ مطالعہ، ذوقِ تحقیق، دقیقہ رسی اور علم و فضل کے علاوہ ان کا قلم گرم مزاج ہونے کے بجائے نرم رو اور سبک خرام تھا، جو تنقید کے نازک سے نازک موقع پر بھی جادۂ احتیاط و اعتدال سے منحرف نہیں ہوتا تھا۔ اس کی طبیعت میں متانت و سنجیدگی اور حلم و بردباری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، جس کی وجہ سے اس کے خامۂ گوہر افشاں کی پیشانی پر کبھی بھی جھنجھلاہٹ اور غیض و غضب کے تیور ظاہر نہیں ہوتے تھے۔ مزاج میں استقلال، طبیعت میں صلح پسندی، مزاج میں مسکنت تھی۔ فکر پر بجائے عقلیت کے اشعریت بلکہ سلفیت غالب تھی۔ ان خداداد اوصاف و کمالات کے باعث وہ جس محفل میں بھی بیٹھا، صدرِ بزم ہو کر رہا، جس انجمن میں شرکت کی، شمعِ انجمن کہلایا ......

یہ وہ ذاتی اوصاف و کمالات تھے جہاں مولانا شبلی کامیاب نہ ہو سکے، وہ کامیاب ہوئے اور جو عام اور ہمہ گیر اعتماد ان کو حاصل ہوا وہ ان کے استاد کو حاصل نہ ہو سکا''۔

سید صاحبؒ کو عربی زبان لکھنے پر ویسا ہی عبور حاصل تھا، جیسی وہ اردو لکھتے تھے، ان کی وسعتِ مطالعہ بے اندازہ تھی۔ ہندوستان کے ہمہ جہت مسائل سے قطع نظر صرف اسلامی موضوعات ہی اتنے متنوع ہوتے تھے کہ عالمِ عرب میں قرۃ عین سمجھے جاتے تھے، وہ عربی کے معیاری رسائل المیزان، المنار اور البیان وغیرہ کے واسطہ سے بہت کم سنی میں ہی عربی حلقوں میں روشناس اور قابل قدر ہو گئے تھے اور بعد کے دور میں ان کی تحریروں کا عربی میں ترجمہ ہوتا تھا۔ اگر ایک طرف لغات جدیدہ ماہنامہ الضیاء عربی مضامین، علومِ قرآن و حدیث پر ان کے مقالات ان کی نگاہ محرمانہ کی دلیل ہیں، تو دوسری طرف مولانا

Marfat.com

مسعود عالم ندوی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور مولانا محمد ناظم ندوی جیسی شخصیات کو اپنے لمس سے کندن بنا کر عالم عرب کے سامنے بڑے فخر کے ساتھ پیش کیا۔ لیکن فیصل ایوارڈ یافتہ یہ اجلّہ روزگار اپنے استاد ہی کے نقشِ قدم پر گامزن ہو کر اردو کے مشاہیر میں بھی محترم وممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ یہ سید صاحبؒ کا احسانِ عظیم ہے کہ ذاتی وانفرادی ہی نہیں اجتماعی طور پر بھی انہوں نے عربی کے بجائے اردو کے دامن کو اپنے قیمتی موتیوں سے مالا مال کیا۔ انہوں نے اردو سے کچھ لیا نہیں، اسے بہت کچھ دیا، بلکہ اس پر اپنا سب کچھ نچھاور کر دیا۔ چنانچہ ۱۹۵۳ء میں ڈھاکہ (مشرقی پاکستان) میں اردو کی تعلیم وترقی پر تقریر کے دوران بنگالی زبان کے حامیوں کے ساتھ موصوف کو جس ناشائستہ صورتِ حال سے گزرنا پڑا، وہ سید صاحبؒ کی بے باک اردو دوستی کا واضح ثبوت ہے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اسی موقع کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

> ''سید صاحبؒ پاکستان گئے تو مدتوں خبر نہ آئی۔ ایک اخبار میں پڑھا کہ اردو کے مسئلہ پر تقریر کے دوران ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلبہ نے سید صاحبؒ کو تکلیف پہنچائی۔ بڑا قلق ہوا، سید صاحبؒ کے لئے یوں کہ کس منزلت کا آدمی، کہاں جا کر کس بنا پر رسوا ہوا، اور طلبہ کے لئے یوں کہ طالب علم بالخصوص یونیورسٹی کے طالب علم سے بڑھ کر قیمتی متاع کسی قوم اور ملک کی کیا ہوگی۔ اس نے یہ سلوک سید صاحبؒ کے ساتھ کیا جن کی علمی، مذہبی، قومی، تہذیبی خدمات اس صدی میں اتنی زیادہ اور گراں مایہ تھیں کہ کسی ایک شخص کی نہ تھیں پھر علماء کی رسوائی سلاطین کے ہاتھوں تو سنی تھی، طلبہ کے ہاتھوں سننے میں نہیں آئی تھی ......
>
> اگر ایک عالم کی موت عالم کی موت ہے تو ایک عالم کی بے حرمتی کیا ہوتی ہوگی!!''۔

Marfat.com

(۲)

سید سلیمان ندویؒ کی شخصیت جن اسباب و محرکات اور عواقب و عوامل کے نتیجہ میں اتنی توانا، عظیم اور ہمہ جہت بن پائی، ان میں سید صاحبؒ کے خاندانی حالات، والد اور بھائی کی تربیت منتخب روزگار اساتذہ سے کسبِ فیض، ندوہ کی مخصوص علمی فضا، اس عہد میں ہندوستان اور مسلم معاشرہ کے تقاضے، انگریزوں کی صورتِ حال عقائد و اعمال کی شکست و ریخت اور ان تمام حالات میں علماء کے فرائض سے آگہی وغیرہ بطورِ خاص شامل ہیں۔ سید صاحبؒ کے بزرگوں کا خصوصی فیضان اس پر مستزاد ہے۔ موصوف کے دادا حکیم میر محمدی اور نانا حکیم سید حیدر حسن اپنے وقت کے مشہور اطباء حاذق اور صاحبِ معرفت بزرگ تھے۔ والد حکیم سید ابوالحسن اپنے خاندانی کمالات میں اور بھی ممتاز تھے۔ وہ ایک سنجیدہ عالم دین، ریاست اسلام پور کے شاہی طبیب اور نقش بندی ابوالعلائی سلسلہ کے شیخ کامل تھے۔ نفاست و نظافت ان کی طبیعت کا خمیر تھا۔ ان کا ظاہر باوقار اور باطن کمال تقویٰ کا آئینہ دار تھا"۔ (غلام محمد تذکرہ سلیمان ص ۲۸)

در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق
ہر ہوسناکی نداند جام و سنداں باختن
باچنیں ذوق جنوں پاس گریباں داشتم
درجنوں از خود نرفتن کار ہر دیوانہ نیست

سید صاحبؒ کی ولادت جمعہ ۲۲ر نومبر ۱۸۸۴ء کو دیسنہ میں ہوئی۔ ان کا ابتدائی بچپن یہیں گزرا والد کے اسلام پور میں قیام پذیر ہونے کی وجہ سے سید صاحب کی تعلیم و تربیت ان کے بڑے بھائی مولوی سید ابوحبیب صاحب کی زیرِ نگرانی شروع ہوئی۔ موصوف نے عربی فارسی کی متداول کتب کے علاوہ سید صاحبؒ کو سلوک کا بھی رمز آشنا کر دیا تھا۔ مولانا اسماعیل شہید کی تقویۃ الایمان کو موصوف کی تربیت اور پختگی عقائد میں

Marfat.com

بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے بارے میں خود سید صاحبؒ نے لکھا ہے کہ :

''یہ پہلی کتاب تھی، جس نے مجھے دینِ حق کی باتیں سکھائیں اور ایسی سکھائیں کہ اثنائے تعلیم و مطالعہ میں بیسیوں آندھیاں آئیں۔ کتنی دفعہ خیالات کے طوفان اٹھے۔ مگر اُس وقت جو باتیں جڑ پکڑ چکی تھیں، ان میں سے ایک بھی اپنی جگہ سے نہ ہلی۔ علم کلام کے مسائل، اشاعرہ و معتزلہ کے نزاعات، غزالی و رازی و ابن رشد کے دلائل یکے بعد دیگرے نگاہوں سے گذرے، مگر اسماعیل شہید کی تلقین بہرحال اپنی جگہ قائم رہی''۔ (مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں۔ مضمون سید سلیمان ندوی، ''جن سے میں متأثر ہوا'')

کچھ عرصے کے بعد وہ اپنے والد ماجد کے پاس چلے گئے، لیکن وہاں ان کا قیام صرف چند ماہ رہا اور پھلواری شریف کے مدرسہ میں مولانا شاہ سلیمان پھلواری کے دامن تربیت سے وابستہ کر دئے گئے۔ وہاں کتب درسیہ کے علاوہ سلوک و تصوف کی مجالس میں شرکت اور سماع کی محفلوں سے محظوظ ہونے کا موقع بھی ملتا رہا۔ ذہن کی ساخت و پرداخت میں طالب علمی کے ماحول اور فضا کو خاص دخل ہوتا ہے، اگرچہ اس مدرسہ کے بعد سید صاحب دربھنگہ کے مدرسہ میں داخل ہو گئے تھے اور وہاں سے ۱۹۰۰ء میں ندوہ پہنچ گئے، جہاں تصوف کو جلا دینے کا موقعہ نہ مل سکا، تاہم طبیعت کے اس خمیر کے ساتھ بعد کی زندگی میں انہیں طرح طرح کی کتابوں سے واسطہ رہا اور انہوں نے مختلف قسم کے علماء و مشائخ کبار کے حالات کا مطالعہ کیا۔ علم و دانش کے اضافے کے ساتھ ساتھ معروضی مطالعہ کے رجحان کو تقویت ملتی رہی اور غیر شعوری طور پر ان کی اصل غذا ان کے قلب و ذہن کو منور و معطر کرتی رہی۔ چنانچہ علم و آگہی کے اوج کمال پر پہنچنے کے بعد بے ساختہ اس کا اظہار ہو گیا اور وہ مولانا اشرف علی تھانویؒ کے دامنِ فیض سے وابستہ ہو گئے۔ استعداد کا یہ عالم تھا کہ بقول مرشد تھانوی ان کی حیثیت سوکھی لکڑی کی سی تھی۔ ذرا سی آگ دکھانے سے وہ بھڑک

Marfat.com

اُٹھی اور دو سال میں ہی سید صاحب کا شمار حضرت تھانویؒ کے اجل خلفاء میں ہونے لگا۔ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۵۳ء یعنی وفات تک کا زمانہ اس فن میں رسوخ و کمال اور منتہائے رفعت کا مظہر ہے۔ اس لئے یہ کہنا درست ہی ہوگا کہ جس نقطہ سے سید صاحبؒ کی زندگی کا آغاز ہوا تھا، اس کی آخری منزل پر پہنچ کر ہی انہیں اطمینان نصیب ہوا۔ یہ الگ بات ہے کہ تیس (۳۰) سال پر مشتمل درمیانی عرصہ جوان کی زندگی کا بہترین دور تھا، اور جس میں انہوں نے علمی و عملی اعتبار سے بہت بے نظیر اور معرکہ آراء کارنامے انجام دیئے، اس میں سید صاحبؒ کی متصوفانہ شخصیت ماند پڑی ہوئی نظر آتی ہے، جب کہ یہ دور خود ایک مسلمہ حیثیت اور دبستانی خصوصیت رکھتا ہے۔

سید صاحبؒ ۱۹۰۰ء میں ندوہ میں داخل ہوئے، وہاں مولانا محمد فاروق چریاکوٹی، مولانا محمد حفیظ اللہ اور مولانا شبلیؒ نے سید صاحب کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں نمایاں ترین کردار ادا کیا۔ یوں تو سید صاحبؒ کا اصل استاد علامہ شبلی کو ہی سمجھا جاتا ہے، لیکن شبلی ۱۹۰۵ء میں ندوہ پہنچے تھے اور سید صاحبؒ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۵ء تک مولانا محمد فاروق صاحب کے سایہ عاطفت میں رہے، یہ حسنِ اتفاق ہی تو ہے کہ اپنے زمانے میں علامہ شبلی بھی مولانا محمد فاروق صاحب کے شاگردِ خاص رہے تھے، اور وہ شخص جو چند سال بعد علامہ شبلی کا چہیتا شاگرد اور جانشین بننے والا تھا۔ مولانا چریاکوٹی کے فیض صحبت سے دریتیم رواں رہا تھا، اس لئے یہ تسلیم کرنے میں تامل نہیں ہوسکتا کہ سید صاحب کی شخصیت کی نشو و نما میں مولانا شبلیؒ کے ساتھ ہی ساتھ مولانا محمد فاروق چریاکوٹی کا بھی بہت بڑا حصہ ہے۔ مؤخر الذکر سے متعلق سید صاحبؒ کے درج ذیل بیان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے:

"یہاں (ندوہ میں) ہندوستان کی مشہور ہستی صدر مدرس یعنی مولانا محمد فاروق صاحب چریاکوٹی کی تھی۔ یہ اپنے زمانے میں ادب و معقولات کے امام تھے۔ ان کی خاص چیز ان کے پڑھانے کا طریقہ تھا، وہ جو کچھ پڑھاتے

Marfat.com

تھے، عملی طور پر پڑھاتے تھے اور اس کی مشق کراتے تھے۔ صرف ونحو، ادب و عروض، منطق وفلسفہ ہر ایک فن میں ان کا یہی طرز تھا۔ دوسری خصوصیت ان کی یہ تھی کہ وہ کتاب کے لفظوں کے پابند نہ تھے، یعنی کتاب نہیں پڑھاتے تھے بلکہ اس فن کے مسائل پڑھاتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ طالب علم فن پر قابو پالیتا تھا۔ ان کے طرزِ تعلیم کی بہتری کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ مولانا شبلیؒ جیسا کامل ان کی درس گاہ سے پیدا ہوا۔ بہر حال ان کے طرزِ تعلیم نے چند ہی دنوں میں یہ کیفیت پیدا کردی کہ آنکھوں کے پردے ہٹ گئے اور وہ مسئلے جو استادوں کے سمجھانے سے سمجھ میں نہ آتے تھے، وہ روزِ روشن کی طرح نظر آنے لگے۔ یہ پہلی شخصیت تھی، جس نے میرے دل ودماغ پر اثر ڈالا"۔ (معارف اعظم گڑھ، جولائی ۱۹۵۰ء)

علامہ شبلیؒ، ندوہ کے معتمد بن کر آئے تو انہوں نے سب سے پہلے اصلاح نصاب کی طرف توجہ کی۔ اس میں بعض اہم تبدیلیوں کے علاوہ انگریزی کو لازمی بھی قرار دیا۔ علومِ جدیدہ میں فلسفہ ونفسیات وغیرہ کو بقدرِ ضرورت داخل کیا۔ عربی ادب کو لوازم کا درجہ دیا، طلبہ میں تحریر وتقریر کا ذوق پیدا کرنے کے لئے مختلف قدم اُٹھائے۔ کتب خانہ کو وسیع کیا۔ رسالہ "الندوہ" کی بطورِ خاص نگرانی کر کے اسے اعلیٰ معیار کا جریدہ بنایا اور بعض اچھے، ذی استعداد اور ہونہار طلبہ کا انتخاب کر کے انکی خصوصی تربیت میں منہمک ہو گئے۔ مولوی ضیاء الحسن علوی، مولوی سید سلیمان اور مولوی عبدالسلام بطورِ خاص اس زمرہ میں داخل تھے۔ لیکن معراجِ کمال ثانی الذکر ہی کو حاصل ہو سکی۔

سید صاحبؒ کے ندوہ کے ایک ساتھی مولانا عبدالباری ندوی کا بیان ہے کہ کسبی کمالات اور صلاحیتوں میں سید صاحب کا کوئی حریف نہیں تھا، چنانچہ وہ تمام تر فارغ اوقات شبلی کی صحبت اور استفادہ میں گذارتے، عربی کے جو اخبارات ورسائل آتے، ان کا

Marfat.com

پابندی سے مطالعہ کرتے۔ اس وابستگی کے بعد سید صاحبؒ مختلف انجمنوں کی نظامت سے بھی سبکدوش ہو گئے اور استاد کا دامن مضبوطی سے تھام لیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنی مضمون نویسی کے اسلوب پر بھی نظر ثانی کی۔ مولانا محمد فاروق صاحب کی شاگردی نے سید صاحبؒ کو عربی ادب کے شعرائے متاخرین کا دلدادہ بنا دیا تھا، لیکن شبلی نے دلائل اعجاز، نقد الشعراء اور حماسہ کو نصاب میں داخل کیا، تو سید صاحبؒ کے اندر متقدمین کا صحیح مذاق پیدا ہوا۔ جدید عربی کی استعداد میں بھی برابر اضافہ ہوتا رہا۔ عربی رسائل "البیان" اور "المنار" میں مضامین شائع ہونے لگے۔ درسی کتب میں مؤطا امام مالک اور اس کی شرحوں اور حواشی کو بہت دل لگا کر پڑھا۔ فتح الباری خاص طور سے ان کے مطالعہ میں رہتی۔ دوسری اہم کتابوں کے علاوہ حافظ ذہبی کی تذکرۃ الحفاظ نے بھی سید صاحبؒ پر گہرا اثر ڈالا اور اسی کی وجہ سے ان کے اندر طبقات و تراجم اور تاریخ کا ذوق پیدا ہوا۔ اس کے بعد موصوف نے ابن ندیم کی کتاب الفہرست، حاجی خلیفہ کی کشف الظنون اور ابن خلکان کی وفیات کا مطالعہ کیا۔ مؤخر الذکر تو اتنی بار پڑھی کہ بقول خود "اس کے حواشی اور حوالوں سے اس کے اول و آخر کے صفحے بھر گئے"۔ اور یہی کتاب سید صاحب کی "یادِ رفتگاں" کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ شبلیؒ کے فیضِ صحبت نے تاریخی و علمی کتب و مضامین کے مطالعہ کی طرف خصوصی رہنمائی کی۔ تحریر و تقریر کو بھی اسی فیضان سے جلا ملی۔ الندوہ کا اسسٹنٹ ایڈیٹر بنایا گیا تو تمام ذمہ داریاں انہی پر ڈال دی گئیں۔ یہاں تک کہ شبلی کی طرف سے بعض اداریے بھی لکھنے پڑے اور اسلوب میں پختگی کا یہ عالم کہ دونوں کے درمیان امتیاز دشوار ہو گیا۔

۱۹۰۷ء میں تعلیم سے فارغ ہوئے اور ۱۹۰۸ء میں ندوہ میں ہی عربی استاد کی حیثیت سے تقرر ہو گیا۔ اسی دوران مبتدیوں کے لئے "دروس الادب" کے نام سے عربی ریڈریں لکھیں۔ ۱۹۱۰ء میں ایک شعبہ قائم ہوا، جس کا مقصد یہ تھا کہ انگریزوں نے تاریخ کے نصاب کی کتابوں میں مسلمانوں سے متعلق جو زہر افشانی کی ہے اور غلط بیانیوں سے کام

Marfat.com

لیا ہے، کتابوں کے ان حصوں کی نشاندہی کر کے اصل تاریخ کی تحقیق کی جائے اور ان اغلاط کو درست کیا جائے۔ سید سلیمان ندویؒ کو اس شعبہ کی ذمہ داری سونپی گئی، جسے انہوں نے بحسن وخوبی انجام تک پہنچایا۔

۱۹۱۲ء میں ایک عربی اردو لغت تیار کی۔ اسی سال باقاعدگی سے وہ سیرت کے اسٹاف میں شامل ہوئے۔ بادی النظر میں تو وہ عربی کی بنیادی کتابوں سے مواد اخذ کرنے پر مامور کیے گئے تھے، لیکن وہ اپنے دائرہ سے بہت آگے بڑھ گئے۔ رہنمائی تو اپنے استاد شبلیؒ سے حاصل کرتے رہے، لیکن سیرت کی اولین دو جلدوں کا کام بڑی حد تک انہوں نے خود ہی مکمل کر دیا۔ علامہ شبلیؒ اس کام میں خود بھی منہمک و مشغول رہے۔ انہیں شاگرد رشید کے کام سے اتنی آسانی ہوگئی کہ مضمون میں ترمیم و اضافے کرنے اور زبان و اسلوب کو نکھارنے کے علاوہ کوئی دیگر خاص کام کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ اس کے باوجود بھی وہ علامہ کی حیات میں پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکی۔ بعد میں سید صاحبؒ نے ضروری اضافوں کے ساتھ استاد ہی کے نام نامی سے ان دونوں جلدوں کو شائع کیا۔ استاد کی وفات کے سبب بقیہ پانچ جلدوں میں سید صاحب اس رہنمائی اور نگرانی سے بھی محروم ہو گئے تھے۔ لہٰذا یہ بارِ عظیم خود ہی اُٹھانا پڑا۔

علامہ شبلیؒ کا انتقال نومبر ۱۹۱۴ء میں ہوگیا تھا۔ چند ماہ بعد علامہ کے ہی نقشہ کے مطابق دارالمصنفین کا قیام عمل میں آیا اور اس کے اہم ترین ذمہ دار اور شبلیؒ کے جانشین کی حیثیت میں تقریباً پینتیس (۳۵) سال تک سید سلیمان ندویؒ ہی کو وہاں رہ کر علم وادب کی خدمات انجام دینی پڑیں۔ جولائی ۱۹۱۶ء میں رسالہ معارف جاری کیا۔ یہ اپنی نوعیت اور معیار کے اعتبار سے اہم ترین رسالہ تھا۔ اس کی یہ حیثیت کسی نہ کسی شکل میں آج بھی برقرار ہے۔ معارف کے توسط سے سید صاحبؒ نے قوم وملت کی جو رہنمائی کی ور علوم وفنون کی جو خدمات انجام دی ہیں، وہ بقول پروفیسر رشید احمد صدیقی ''اتنی زیادہ عظیم اور گرانمایہ تھیں کہ

Marfat.com

اس دور میں کسی ایک شخص کی اتنی نہ تھیں"۔

اس رسالہ کے عالمانہ مضامین، اہم اور وقیع موضوعات پر مباحث، نئی کتابوں پر تبصرے، عصری مسائل سے متعلق بیباک اور فکر انگیز شذرات اور سرکردہ اشخاص کے انتقال پر وفیات کے عنوان سے تفصیلی اظہارِ تعزیت وغیرہ دوسرے رسائل کے لئے بالکل نئی اور ممتاز چیزیں تھیں۔ چنانچہ قابلِ قبول حد تک ان رسائل نے اس سے اخذ واستفادہ کیا اور بعد میں جاری ہونے والے رسائل نے تو اس کی تقلید میں کوئی دقیقہ فروگذاشت ہی نہیں کیا۔ سہ ماہی رسالہ "اردو" کا اجراء ۱۹۲۱ء میں عمل میں آیا تھا۔ وہ معارف کی معاصرانہ چشمک سے مملو ہونے کے باوجود اس سے ممکنہ استفادہ وتقلید سے بے نیاز نہیں رہ سکا۔ اس میں نئی مطبوعات پر تبصرہ میں تو تقلید کا یہ رنگ بالکل عیاں ہے۔ اس کے علاوہ مذہبی، معاشرتی، اقتصادی، سیاسی اور دوسرے علمی وادبی موضوعات پر سید صاحب بڑی پابندی سے لکھتے رہتے تھے۔ مسئلہ خلافت ۱۹۱۹ء اور اس کے بعد کئی سال تک ہندوستان کے اُفق پر بھی چھایا رہا اور اس مسئلہ نے پورے عالمِ اسلام کو اپنے دائرۂ اثر ونفوذ میں لے لیا تھا۔ معارف حتی المقدور مسلم مسائل میں رہنمائی کرتا تھا۔

چنانچہ اس پورے عرصہ میں یہ مسئلہ معارف کا بھی سرگرم موضوع رہا اور سید والا قدر کی فکری نگارشات اس پر مستزاد اسی معاشرتی تاریخ اور سیاسی بصیرت نے موصوف کی قائدانہ اور رہنمایانہ حیثیت کو مسلم کرادیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۲۰ء کے وفد خلافت کے ساتھ سید صاحب بھی لندن گئے اور ۱۹۲۴ء میں شاہ سعود کے پاس جانے والے وفد کی قیادت تو سید صاحبؒ ہی نے فرمائی۔ اپنے قیام یورپ کے زمانے میں سید صاحبؒ اپنی تاریخی، تحقیقی اور علمی سرگرمیوں کی طرف سے غافل نہیں رہے، بلکہ انہیں وہاں اس جوہر کو نکھارنے کا اور زیادہ موقع ملا، چنانچہ وہیں سے مسئلہ خلافت پر ان کے لکھے ہوئے متعدد مضامین اس امر پر شاہد عادل ہیں۔ اس سے قبل اور مابعد لغات جدیدہ، ارض القرآن، حیاتِ امامِ مالکؒ،

Marfat.com

سیرۃ النبیؐ کی متعدد جلدیں، سیرۃِ عائشہؓ، خطباتِ مدراس، رحمتِ عالمؐ، عرب و ہند کے تعلقات، عربوں کی جہاز رانی، خیام اور حیاتِ شبلیؒ وغیرہ سید صاحبؒ کی نگارشات عالیہ علم و دانش کے مختلف میدانوں میں مختلف زمانوں میں ظہور پذیر ہوتی رہیں اور اپنی عظمت و انفرادیت کا لوہا منواتی رہیں۔ سید صاحبؒ ۱۹۲۴ء میں ندوہ کے معتمد ہوئے۔ ناظم تعلیمات کی حیثیت سے انہیں برسہا برس تک اس میدان میں اپنے اشہب فکر و عمل کو ہر سمت دوڑانے کا موقع ملتا رہا اور بلاشبہ اس دور میں ندوہ نے ہر اعتبار سے بے مثال ترقی کی۔ اسی مسلمہ عظمت کے پیش نظر ۱۹۳۳ء میں نادر شاہ افغانستان نے سر راس مسعود اور علامہ اقبال کے ساتھ اپنے ملک کی تعلیمی اصلاحات کے لئے سید صاحبؒ کو بھی مدعو کیا تھا اور وہ آں موصوف کی تجاویز سے بہت متاثر بھی ہوئے تھے۔

سید صاحبؒ اردو کی ترویج و فروغ اور بقا و تحفظ کے لئے زندگی بھر لڑتے رہے۔ اس کے لئے انہوں نے ہر میدان سے جنگ کی۔ اردو ہندی کی نزاع ہو یا اردو کے ساتھ انگریزوں اور غیر مسلموں کے امتیازانہ و متعصبانہ سلوک، اردو پر لگائے جانے والے الزامات یا اسے ملک بدر کرنے کی سازش، اور اردو کا سیاسی درجہ ہو یا معاشرہ میں اس کی کس مپرسی کا شکوہ، سید صاحب اسی سطح سے بولتے جیسی کہ ضرورت ہوتی اور اپنی بات منوا کر رہتے تھے۔ چنانچہ اردو اور سندھی کے رشتہ سے متعلق سید صاحب کے نظریہ کو بھی اسی سیاق و سباق میں دیکھنا چاہئے۔ اور اردو کی خدمت کے سلسلے میں حتمی رائے تو وہی ہے جو پروفیسر رشید احمد صدیقی کے مضمون سے نقل کی جا چکی ہے۔

سید صاحبؒ مولانا ابوالکلام آزادؒ کے ہفتہ وار ''الہلال'' سے بھی تقریباً ایک سال وابستہ رہے۔ وہاں بھی انہوں نے اپنی انفرادیت کا مکمل ثبوت فراہم کر دیا تھا۔ اس کی ادارتی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ عربی، قرآنیات، تاریخ اسلام، معاصر اسلامی ممالک کے حالات، اسلامی حریت و سیاست وغیرہ پر انہوں نے متعدد مضامین لکھے۔ ''مشہدِ اکبر''

Marfat.com

کے عنوان سے مسجد کے انہدام کے واقعہ کانپور پر ۱۳/اگست ۱۹۱۳ء کو سید صاحبؒ کا اداریہ اپنی ندرت کے اعتبار سے مولانا ابوالکلام آزادؒ کے مشہور عام اسلوب پر بھی فوقیت لے گیا تھا۔

اور آخر میں تو یوں ہوا کہ سید صاحبؒ کی جبلت جس کو دوسرے کاموں میں استغراق اور اس طرف سے عدم توجہی کے سبب اس اظہار کا موقع ہی نہ مل سکا تھا، پھر عود کر آئی۔ ۲۵/۳۰ سال تک علوم وعقلیات کی غواصی سے سیر ہو کر بھی طبیعت میں اعلیٰ درجہ کی نفاست و نظافت تھی۔ تمام بزرگوں کی طرف نگاہ دوڑاتے رہے، لیکن معیار، مزاج اور نہج کو اپنے مطابق نہ پانے کی وجہ سے بہت دن تک کوئی فیصلہ نہ کر سکے۔ کافی تلاش وتحقیق کے بعد بالآخر مولانا اشرف علی تھانویؒ تک اتفاقاً رسائی حاصل ہوگئی اور انہیں ہر لحاظ سے مفید پا کر اپنے احوال کا ایک خط لکھ دیا۔ چند ہی روز میں دوسرا تفصیلی خط ارسال کیا۔ سید صاحبؒ کے تبحر علمی، رفعتِ روحانی اور فکر آخرت کا اندازہ لگانے کے لئے ان خطوط کے درج ذیل اقتباسات کا مطالعہ ناگزیر معلوم ہوتا ہے:

''اب میں کشمکش کی اس منزل میں ہوں، جس میں علوم ظاہری تسکین کا باعث نہیں رہتے۔ دعا کا طالب اور ہمت کا خواستگار ہوں''۔

''میں آپ کی دعا و دعوت کا بہترین مستحق ہوں۔ مسائل علمی کی اُلجھن سے نجات کا خواستگار نہیں بلکہ روح کی اُلجھن سے نجات کے لئے دعا و ہمت کا طالب ہوں۔ میں نے اعتزال سے لے کر سلفیت تک بمدارج ترقی کی ہے۔ عقائد میں امامِ مالک کے اس اُصول کا پیرو ہوں، الاستوی معلوم والکیفیت مجھول و الایمان به واجب والسوال عنه بدعة ، سیرۃ النبیؐ علیٰ صاحبها الصلوٰۃ کی تالیف وتدوین میں خواہ مجھ سے غلطیاں ہوئی ہوں، مگر اس مصروفیت نے ذاتِ نبوی ﷺ کے ساتھ ایک جذبۂ محبت پیدا کر دیا ہے۔ وللہ الحمد۔ فقہ میں متاخرین کا متبع نہیں، مگر اہل حدیث بالمعنی المتعارف

Marfat.com

نہیں ہوں۔ ائمہ رحم اللہ تعالیٰ کا دل سے ادب کرتا ہوں اور کسی رائے میں کلیۃً ان سے عدول حق نہیں سمجھتا۔

میرا خاندان صوبہ بہار علم ظاہر و باطن کا جامع رہا ہے۔ والد مرحوم ابوالعلائی المشرب تھے۔ بھائی صاحب مجددی تھے اور دونوں صاحبِ حال و نسبت تھے۔ بچپن ان بزرگوں کے آغوش میں بسر ہوا۔ ذکر مراقبہ اسی سن میں شروع کر دیا تھا، مگر برا ہو علم باطل کا کہ جس نے مدتوں کے لئے اس راہ سے ہٹا دیا اور خدا جانے کہاں کہاں ٹھوکریں کھائیں اور اب جب مرحلہ اربعین سے گذر کر ہوش آیا تو ان بزرگوں کا سایہ سر سے اٹھ چکا ہے۔ میں نے یہ کیفیت اس لئے لکھ دی کہ جناب مستقبل کی اصلاح میں میرے ماضی سے بھی باخبر رہیں۔ میرے لئے کوئی ایسا نسخہ تجویز فرمائیں کہ مجھ میں استقامت و مثبت اور رغبت الی الطاعات پیدا ہو۔ فرائض کا پابند ہوں، بدعات سے نفور ہوں، کبھی کبھی ذوق سجود کی لذت بھی پاتا ہوں۔ امامِ ربانی مجدد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہؒ اور ان کے سلسلے سے عقیدت تامہ رکھتا ہوں۔ خرافات وطامات صوفیہ کا دل سے منکر ہوں۔ صالح نہیں لیکن صلاح حال کا دل سے خواستگار ہوں۔

یورپ کے مذہبی و علمی حملوں کے مقابلے میں اسلام کی خدمت کا ولولہ ہے اور اب تک پچیس برس کا زمانہ انہی مشاغل میں گذرا۔ اب آپ سے دعا کا طالب، ہمت کا خواستگار اور حصول اخلاص اور اصلاح قلب کے لئے کسی نسخہ کا سائل ہوں۔ والسلام“۔

اس کے بعد وہ سلوک کی جن منزلوں تک پہنچے اس کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں البتہ اتنے زبردست عالم اور طالبِ صادق کے ابتدائے عشق کی تمام کیفیات اس سے مترشح ہو جاتی ہیں۔ بعد میں انتہائی تیزی کے ساتھ اس میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔

سید صاحب ۱۹۴۵ء سے پانچ سال تک بھوپال میں قاضی القضاۃ رہے۔ جون ۱۹۵۰ء میں کراچی چلے گئے۔ وہاں حکومت کی طرف سے پاکستان کا دستور بنانے کی ذمہ

Marfat.com

داری تفویض کی گئی۔ ان کی بین الاقوامی شہرت مضاعف ہوتی رہی، یہاں تک کہ انتقال (۲۳ رنومبر ۱۹۵۳ء) سے چند ماہ قبل اپریل میں ڈھاکہ میں ہسٹاریکل کانگریس کے اجلاس کی صدارت بھی فرمائی، جہاں اردو کی حمایت میں تقریر کرتے ہوئے سنگ باری کا سامنا کرنا پڑا، جسم پر تو زخم نہیں آئے، لیکن دل کے یہ کاری زخم مندمل نہ ہو سکے اور کچھ عرصہ میں اردو کا یہ جانباز سپاہی شہید اور علم و دانش کا یہ ستارہ اپنی ضیا پاشیاں باقی چھوڑ کر غروب ہو گیا............

مت سہل ہمیں جانو ' پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

اسلامی انقلاب اور اس کا فکری لائحۂ عمل

رشحاتِ قلم : مولانا عبدالقیوم حقانی

اشتراکیت، سرمایہ داریت، فسطائیت اور لادین مغربی جمہوریت کے چھائے ہوئے گھپ اندھیروں میں اسلامی انقلاب کے خدوخال، نوجوانوں میں فکری الحاد اور ارتداد کی یلغار اور اس کے انسداد کا مناسب طریق کار، پرائیویٹ شریعت بل سے سرکاری شریعت بل تک کے مختلف کردار، پھر کیا ہوا؟ کیا ہوتا رہا؟ اور کس نے کیا رول ادا کیا؟ تاریخ کے سربستہ رازوں کا انکشاف، ملک کی سیاست کے ایک تاریخی دور پر رواں اور دلکش تبصرہ، تحریر میں بے ساختگی اور برجستگی کے علاوہ پُرزور انشاء کی تمام خصوصیات نمایاں ہیں۔ اس کا مطالعہ تحریک انقلابِ اسلامی کے تمام کارکنوں اور قومی سیاست کے ہر طالب علم کا فرض ہے۔

صفحات : 208 ....

القاسم اکیڈمی' جامعہ ابوہریرہ' برانچ پوسٹ آفس خالق آباد، ضلع نوشہرہ، سرحد، پاکستان

Marfat.com

عبدالرشید عراقی

اجمالی تذکرہ وسوانح

۱۸۸۱ء تا ۱۸۹۰ء کے عشرے میں برصغیر (پاک وہند) میں پانچ (۵) سلیمان پیدا ہوئے ،جنہوں نے آگے چل کر دنیائے علم وادب میں اسلام کی شمع روشن کی اور پانچ (۵) سلیمان یہ تھے۔

۱　قاضی محمد سلیمان منصور پوری' مصنف رحمۃ للعالمین (تاریخ وفات جون ۱۹۳۰ء)

۲　شاہ سلیمان پھلواری (تاریخ وفات جون ۱۹۳۵ء)

۳　مولانا سلیمان اشرف سابق صدر شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (تاریخ وفات اپریل ۱۹۳۹ء)

۴　سر شاہ محمد سلیمان (جج ہائی کورٹ الہ آباد (تاریخ وفات مارچ ۱۹۴۱ء)

۵　علامہ سید سلیمان ندوی (تاریخ وفات نومبر ۱۹۵۳ء)

علامہ سید سلیمان ندویؒ علوم اسلامیہ کا بحر ذخار تھے۔ تمام علوم پر ان کو یکساں قدرت حاصل تھی۔ تحقیق وتدقیق میں ان کا کوئی ہمسر نہ تھا۔ ان کی تحقیقات عالیہ کا اعتراف مغربی مستشرقین نے کیا ہے اور ان کے علمی تبحر اور صاحب علم وفضل اور جامع الکمالات ہونے کا اعتراف برصغیر کے نامور اہل علم اور صاحب قلم نے کیا ہے۔ مولانا مسعود عالم ندوی جو خود بھی ایک جلیل القدر عالم تھے، سید صاحب کے انتقال پر اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا :

Marfat.com

''میری نگاہ میں اس دور کے تمام اہلِ علم واہلِ نظر میں صرف ہندوستان کے نہیں، بلکہ دوسرے ملکوں کے بھی، مگر یہ واقعہ ہے کہ کوئی شخصیت علم وفن کے گوناگوں شعبوں کی ایسی جامع نظر نہیں آتی (جیسی سید صاحب کی تھی) سید سلیمان ندویؒ کی شخصیت ہمہ گیر تھی۔ وہ بیک وقت مفسر بھی تھے اور محدث بھی، فقیہ بھی تھے اور مورخ بھی، محقق بھی تھے اور مبصر بھی، دانشور بھی تھے اور نقاد بھی، معلم بھی تھے، اور متکلم بھی، فلسفی بھی تھے، اور ادیب بھی، خطیب بھی تھے اور مقرر بھی، صوفی بھی تھے اور شاعر بھی، مصنف بھی تھے اور صحافی بھی، اور سب سے بڑھ کر بہت بڑے سیرت نگار بھی تھے''۔

شخصیت :

سید صاحب کی شخصیت کے بارے میں مولانا محمد نعیم صدیقی ندوی لکھتے ہیں کہ :

''علامہ سید سلیمان ندوی کی شخصیت اعتدال، توازن، ومروت، متانت ووقار، انکسار وتواضع، سادگی وخاکساری، احتیاط ودیانت، حق گوئی وثابت قدمی، خوش طبعی وشگفتہ مزاجی، کثرتِ مطالعہ وذوقِ جستجو، جذبہ وعفو کے اعلیٰ صفات کی مرقع تھی''۔

سید صاحب کی شخصیت جدت وقدامت کا سنگم اور قدیم وجدید دونوں طبقوں کے درمیان حلقہ اتصال تھی۔ وہ اسلامی علوم کے ساتھ جدید افکار وتصورات، نئے رُجحانات اور عصر حاضر کی تحریکات سے پوری طرح واقف، اور تلاش وتحقیق اور نقد ونظر کے جدید طریقوں کے ماہر تھے۔

علامہ شبلی نعمانیؒ نے سید صاحبؒ کے بارے میں ندوۃ العلماء کے اجلاس ۱۹۱۲ء میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا :

''ندوہ نے کیا کیا کچھ نہیں کیا، ایک سلیمان پیدا کیا، یہی کافی ہے''۔

Marfat.com

سید صاحبؒ کے علمی تبحر اور ان کے جامع الکمالات ہونے کا اعتراف تمام مسالک کے علماء کرتے تھے اور سید صاحبؒ کے تمام مسالک کے علمائے کرام سے روابط تھے۔ اس کا ثبوت آپ کی کتاب ''یادِ رفتگان'' سے ملتا ہے کہ آپ نے علمائے کرام کی رفاقت پر معارف اعظم گڑھ میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ اہلحدیث، دیوبندی، بریلوی اور شیعہ سب مسالک کے علمائے کرام کی وفات پر آپ نے معارف میں اُن کے علم وفضل کا اعتراف کیا۔

اہل حدیث علماء میں مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری، مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی، مولانا قاضی محمد سلیمان منصور پوری، مولانا نواب علی حسن خان، مولانا ابوبکر محمد شیث جون پوری، مولانا محمد بن سورتی، مولانا عبدالقادر قصوری، شمس العلماء مولانا محمد حفیظ اللہ بندوی، اور مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہم اللہ اجمعین۔

دیوبندی مسلک کے علماء میں مولانا مفتی عزیز الرحمان، مولانا حبیب الرحمان عثمانی، مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری، مولانا عبدالعزیز گوجرانوالہ، مولانا محمد اشرف علی تھانوی اور مولانا مفتی کفایت اللہ رحمہم اللہ اجمعین شامل تھے۔

سید صاحب میں سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ بڑی فراخدلی سے علماء کرام کے علمی تبحر اور ان کی دینی و مذہبی خدمات کا اعتراف کرتے تھے۔ مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ :

''مولانا ہندوستان کے مشاہیر علماء میں تھے۔ فن مناظرہ کے امام تھے، خوش بیان مقرر تھے۔ اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف جس نے بھی زبان کھولی اور قلم اٹھایا، اس کے حملے کو روکنے کے لئے اُن کا قلم شمشیرِ بے نیام ہوتا تھا اور اسی مجاہدانہ خدمت میں اُنہوں نے عمر بسر کردی۔ فجزاللہ عن الاسلام خیر الجزاء۔

مولانا سید انور شاہ کشمیری کے بارے میں لکھتے ہیں :

Marfat.com

''مرحوم کم سخن، لیکن وسیع النظر عالم تھے۔ وسعتِ نظر، قوتِ حافظہ اور کثرت حفظ میں اس عہد میں بے مثال تھے۔ معلومات کے دریا، حافظہ کے بادشاہ اور وسعتِ علمی کی نادر مثال تھے''۔

مولانا سلیمان اشرف کے بارے میں لکھتے ہیں :

''مرحوم خوش اندام، خوش لباس، خوش طبع، نظافت پسند، سادہ مزاج اور بے تکلف تھے۔ نہایت فیاض، کشادہ دست اور سیر چشم تھے۔ ان کی مجلس سدا بہار تھی۔ وہ خود سدا بہار تھے، فکر و غم کا ان کے ہاں گزر نہ تھا''۔

سید صاحب کی صحافت :

سید صاحب کی ہمہ گیر شخصیت کا ایک نمایاں پہلو اور ان کی زندگی کا روشن باب ان کی صحافت ہے۔ سید صاحب ماہنامہ الندوہ لکھنؤ کے سب ایڈیٹر، مولانا ابوالکلام آزاد کے ہفت روزہ الہلال کے ادارہ تحریر کے رکن اور ماہنامہ معارف اعظم گڑھ کے ایڈیٹر رہے۔

الندوہ لکھنؤ :

ماہنامہ الندوہ لکھنؤ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کا آرگن تھا، جو مولانا شبلی نعمانیؒ اور مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی نے اگست ۱۹۰۴ء میں جاری کیا۔ سید صاحب مختلف وقتوں میں الندوہ کے تین بار سب ایڈیٹر رہے۔

۱　　از ۱۹۰۶ء تا مارچ ۱۹۰۸ء

۲　　اگست ۱۹۰۸ء تا فروری ۱۹۱۰ء

۳　　اگست ۱۹۱۱ء تا مئی ۱۹۱۲ء

سید صاحب نے الندوہ میں مضمون نگاری زمانہ طالب علمی ہی میں شروع کر دی تھی۔ سید صاحبؒ نے الندوہ میں مختلف موضوعات پر دینی و مذہبی، تحقیقی و تنقیدی اور تاریخی

Marfat.com

مقالات لکھے۔ مثلاً

علم الحدیث، مئی ۱۹۰۵ء...... امام بخاری، مارچ ۱۹۰۶ء...... قضاء وقدر اور قرآن جولائی ۱۹۰۶ء...... القرآن والفلسفہ الجدیدہ، ستمبر ۱۹۰۶ء...... تمدن اسلام، نومبر ۱۹۰۸ء سود اور صحف انبیاء، جولائی ۱۹۰۹ء ...... اشتراکیت اور اسلام، مئی ۱۹۱۱ء۔

الہلال کلکتہ :

۱۳؍جولائی ۱۹۱۲ء کو مولانا ابوالکلام آزاد نے کلکتہ سے ہفت روزہ الہلال جاری کیا۔ الہلال مختلف حیثیتوں سے اردو صحافت میں ایک نیا باب تھا۔ وہ صحیح معنوں میں ہماری سیاسی، صحافتی اور ادبی تاریخ میں سنگِ میل ثابت ہوا۔ یہ صحیح ہے کہ اس کی عہد آفریں، شہرت وعظمت کا سہرا مولانا ابوالکلام آزاد کی نابغہ شخصیت کے سر ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ الہلال کو بدر کامل بنانے میں علامہ سید سلیمان ندویؒ کا بھی نمایاں حصہ رہا ہے۔

الہلال کے ادارہ تحریر میں سید صاحب تقریباً ۶ ماہ رہے۔ اس کے بعد آپ دکن کالج پونہ میں فارسی کے اسسٹنٹ پروفیسر ہو گئے۔ الہلال کے ۶ ماہ کے قیام میں سید صاحب نے کئی ایک علمی وتحقیقی تاریخی اور تنقیدی مقالات لکھے۔ مثلاً

الحریۃ فی الاسلام (۶ قسطوں میں) ۲/۹/۱۶/۲۴/ جولائی ۱۹۱۳ء/ یکم/ ۱۸ اکتوبر ۱۹۱۳ء

مشہدِ اکبر اول	۱۳؍اگست ۱۹۱۳ء
قصص بنی اسرائیل	۲۴؍ستمبر، ۱۵؍اکتوبر، ۱۲/ ۱۹؍نومبر ۱۹۱۳ء
علوم القرآن	۱۱؍فروری ۱۹۱۴ء/ ۲۵؍مارچ ۱۹۱۴ء/ ۸؍جولائی ۱۹۱۴ء
آثارِ اسلامیہ (البلاغ)	۱۲/ ۲۲؍نومبر ۱۹۱۵ء

معارف اعظم گڑھ :

ماہنامہ معارف سید صاحب نے اعظم گڑھ سے جولائی ۱۹۱۶ء میں جاری کیا اور

Marfat.com

۱۹۴۹ء تک تنہا آپ معارف کے ایڈیٹر رہے۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں سید صاحب یورپ گئے تو آٹھ ماہ کے لئے مولانا عبدالماجد دریابادیؒ معارف کے ایڈیٹر رہے۔ جولائی ۱۹۴۶ء میں سید صاحب ریاست بھوپال کے امور مذہبی کے افسر اعلیٰ مقرر ہوئے۔ اس وقت معارف کے فی الجملہ نگران آپ ہی تھے، لیکن ان کی عدم موجودگی میں مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی اور مولانا سید ریاست علی ندوی بطورِ مدیر فرائض انجام دیتے۔ ۱۹۵۱ء میں سید صاحب پاکستان تشریف لے آئے، تو مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی معارف کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ معارف میں سید صاحب شذرات، کتابوں پر تبصرے خود لکھتے تھے۔ ان کے علاوہ کئی ایک علمی و دینی اور مذہبی اور تحقیقی و تاریخی مقالات معارف بھی لکھے۔ مثلاً

اہل سنت والجماعت	مئی جون ۱۹۱۷ء
دنیائے اسلام میں ذہنی انقلاب	نومبر ۱۹۲۲ء
حجاز کے کتب خانے	اکتوبر تا دسمبر ۱۹۲۶ء
ہندوؤں کا ایک عجیب فرقہ	جولائی ۱۹۲۳ء
لاہور کا ایک فلکی آلات ساز	مارچ ۱۹۳۳ء
سندھانی جزیہ عہد عالمگیر	اپریل ۱۹۵۱ء
مسلمانانِ ہند کی مذہبی تعلیم	مارچ ۱۹۵۵ء

سید صاحب ہر ماہ شذرات میں مختلف النوع، وقتی امور و مسائل پر تبصرہ فرماتے تھے۔ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی لکھتے ہیں کہ :

''سید صاحبؒ کے شذرات بھی نہایت اہم ہوتے تھے۔ عموماً مختلف النوع، وقتی رموز و مسائل اور کبھی کبھی مستقل معاملات پر شذرات میں اظہارِ خیال کرتے تھے۔ اس لئے ان کے شذرات، مباحث و مسائل کے تنوع کی حیثیت سے دائرۃ المعارف کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان سے گذشتہ تیس

Marfat.com

پینتیس سال کی قومی و ملی تحریکوں، مختلف خیالات و رجحانات اور دوسرے پیش آمدہ حالات کی تاریخ مقرر کی جا سکتی ہے اور ان کے متعلق مصنف کے خیالات معلوم کئے جا سکتے ہیں۔ ان کے شذرات، غور فکر، خیالات کی صحت و پختگی اور اصابتِ رائے کا نمونہ اور ایجاز و اختصار اور بلاغت کے لحاظ سے ادب و انشاء کے شاہکار ہیں"۔ (معارف سلیمان نمبر ص ۲۰۸)

سید صاحب کی تصانیف :

علامہ سید سلیمان ندوی ایک بلند پایہ ادیب، نقاد اور مبصر ہونے کے علاوہ اعلیٰ پایہ کے مصنف بھی تھے۔ آپ نے الندوہ لکھنؤ، الہلال کلکتہ، اور معارف اعظم گڑھ میں علمی و دینی، مذہبی اور تاریخی، تحقیقی و تنقیدی اور ادبی مقالات لکھ کر برصغیر کے نامور اہل علم اور قلم سے خراج تحسین حاصل کیا۔ سید صاحب نے مختلف موضوعات پر جو کتابیں لکھیں، ان کا مختصر تعارف درج ذیل ہے۔

لغاتِ جدیدہ :

عربی کے جدید الفاظ کی ڈکشنری، ۱۹۱۲ء میں شائع ہوئی۔

ارض القرآن :

یہ کتاب دو جلدوں میں ہے۔ اس میں قدیم عرب کے جغرافیہ، اقوام عرب کی پرانی مذہبی و تمدنی تاریخ پر محققانہ بحث کی گئی ہے۔ پہلی جلد ۱۹۱۷ء میں اور دوسری جلد ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئی۔

سیرۃ النبی ﷺ (جلد سوم تا ہفتم):

علامہ شبلی نعمانیؒ نے سیرۃ النبی ﷺ کی تالیف کا اپنی آخری عمر میں منصوبہ بنایا، جیسا کہ فرماتے ہیں ....

Marfat.com

عجم کی مدح کی، عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیمِ آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرتِ پیغمبر خاتمؐ
کہ یوں ہی اب میرا خاتمہ بالخیر ہونا تھا

مولانا شبلی جلد اول مکمل کر چکے تھے اور دوسری جلد بھی نصف کے قریب مکمل کر لی تھی کہ ۱۸/نومبر ۱۹۱۴ء کو رحلت فرما گئے۔ سید صاحب نے پہلی اور دوسری جلد پر نظر ثانی کی اور جو مباحث ادھورے رہ گئے تھے۔ ان کو مکمل کیا۔ چنانچہ سید صاحب نے پہلی جلد اگست ۱۹۱۸ء میں شائع کی۔ اس جلد میں از ولادت تا ختم سلسلہ غزوات مع مقدمہ مشتمل بر نقد فن سیرۃ و تاریخ عرب قبل ظہور و بعثت کا بیان ہے۔

دوسری جلد جولائی ۱۹۲۰ء میں شائع ہوئی۔ اس میں از ۹ھ تا ۱۱ھ جس میں اقامت دین، تاسیس خلافت، اشاعتِ اسلام کے انتظامات، مذہبی، تکمیل شریعت، حجۃ الوداع، وفات شمائل و اخلاق و عادات کی تفصیل اور ازواج و اولاد کا مختصر تذکرہ ہے۔

تیسری جلد ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی۔ اس میں معجزہ کی حقیقت، اس کے امکان و وقوع پر فلسفہ قدیم، علم کلام، فلسفہ جدیدہ اور قرآن کے نقطۂ ہائے نظر سے مبسوط تبصرہ ہے۔

چوتھی جلد ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی۔ اس کا موضوع منصب نبوت ہے۔ پانچویں جلد ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی۔ اس کا موضوع عبادات ہے۔ چھٹی جلد ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی۔ اس میں اخلاقی تعلیمات کا بیان ہے۔ ساتویں جلد سید صاحب کی زندگی میں شائع نہ ہو سکی۔ یہ ۱۹۸۰ء میں شائع ہوئی۔ اس میں اسلام میں حکومت کی اہمیت، عہد نبوی میں نظامِ حکومت، سلطنت اور دین کا تعلق امت مسلمہ کی بعثت وغیرہ پر بحث کی گئی ہے۔

سیرتِ عائشہؓ:

موضوع نام سے ظاہر ہے۔ ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی۔ علامہ اقبال کے مطالعہ میں

Marfat.com

جب یہ کتاب آئی، تو سید صاحب کو لکھا :

''سیرت عائشہؓ کے لئے سراپا سپاس ہوں ۔ یہ ہدیہ سلیمانی نہیں سرمہ سلیمانی ہے۔اس کتاب کے پڑھنے سے میرے علم میں بہت مفید اضافہ ہوا۔خدائے تعالیٰ جزائے خیر دے''۔

خطباتِ مدراس :

یہ سیرۃ نبویؐ پر ۸ خطبات کا مجموعہ ہے جو اکتوبر ۱۹۲۵ء میں مدراس میں ارشاد فرمائے ۔۱۹۲۲ء میں کتابی صورت میں شائع ہوئے ۔ یہ خطبات سیرۃ نبویؐ کا جوہر اور عطر ہیں۔

عرب و ہند کے تعلقات :

مارچ ۱۹۲۹ء میں الہ آباد میں عرب و ہند کے تعلقات پر خطبات ارشاد فرمائے ۔ ان خطبات میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو ان کا وہ عہد زرّیں یاد دلایا ہے ، جب دونوں گوناگوں اور مختلف النوع تعلقات کے رشتوں سے منسلک تھے ۔ یہ خطبات سید صاحب کے ذوقِ تحقیق ،اور وسعتِ معلومات کا آئینہ دار ہیں ۔۱۹۳۰ء میں کتابی صورت میں شائع ہوئے۔

عربوں کی جہاز رانی :

مارچ ۱۹۳۱ء میں بمبئی میں عربوں کی جہاز رانی پر چار خطبات ارشاد فرمائے ۔ان میں زمانۂ جاہلیت اور اسلام میں عربوں کی جہاز رانی ،عربوں کی دنیا کے سمندروں سے واقفیت، ان کے بعض بحری انکشافات ،عربوں کے سامان وآلات جہاز رانی، اور ان کی بحر محیط کو عبور کرنے کی کوششوں وغیرہ سے بحث کی گئی ہے ۔۱۹۳۵ء میں معارف پریس اعظم گڑھ سے کتابی صورت میں شائع ہوئے۔

Marfat.com

خیام :

خیام کے عنوان سے دسمبر ۱۹۳۰ء میں اورنیٹیل کانفرنس کے اجلاس پٹنہ میں ایک مقالہ پڑھا۔ بعد میں اس میں اضافہ اور نظر ثانی کر کے ۱۹۳۳ء میں کتابی صورت میں شائع کیا۔ علامہ اقبالؒ نے اس کتاب کے مطالعہ کے بعد سید صاحب کو لکھا :

''عمر خیام پر آپ نے جو کچھ لکھ دیا ہے، اس پر اب کوئی مشرقی یا مغربی عالم اضافہ نہ کر سکے گا۔ (اقبال نامہ ص ۱۷۸)

سیر افغانستان :

اکتوبر ۱۹۳۳ء میں حکومتِ افغانستان کی دعوت پر علامہ اقبال، سر راس مسعود اور سید صاحبؒ نے افغانستان کا تعلیمی سفر کیا۔ اس سفر کی روئیداد سید صاحب نے ''سیر افغانستان'' کے نام سے معارف میں شائع کی۔ بعد میں اس کو کتابی صورت میں شائع کیا۔

نقوش سلیمانی :

یہ کتاب سید صاحب کے ادبی مقالات، مقدمات، خطبات پر مشتمل ہے۔ ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی۔

رحمتِ عالم ﷺ :

سیرۃ نبوی پر مختصر کتاب، بچوں کے لئے لکھی گئی۔ ۱۹۴۰ء میں شائع ہوئی۔

برید فرنگ :

سید صاحبؒ کے خطوط کا مجموعہ جو آپ نے اپنے سفر انگلستان ۱۹۲۰ء میں برصغیر کے مختلف علمی و ادبی شخصیات کے نام لکھے۔ یہ کتاب سید صاحب نے ۱۹۵۲ء میں مکتبہ الشرق کراچی سے شائع کی۔

Marfat.com

مسلمان خواتین کی بہادری :

الندوہ لکھنؤ کے جنوری ۱۹۰۹ء کے شمارہ میں خاتونانِ اسلام کی شجاعت کے عنوان سے سید صاحب نے ایک مقالہ شائع کیا۔ بعد میں اس مقالہ میں اضافہ کر کے مسلمان خواتین کی بہادری کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع کیا۔ یہ کتاب کئی بار شائع ہو چکی ہے۔ حال ہی میں نعمانی کتب خانہ لاہور نے سیر الصحابیاتؓ واسوہ صحابیاتؓ کے ساتھ شائع کیا ہے۔ صفحات کی تعداد ۳۴ ہے۔

حیاتِ شبلیؒ :

یہ مولانا شبلیؒ نعمانی کی سوانح حیات ہی نہیں ہے بلکہ مسلمانانِ ہند کے پچاس برس کی علمی، ادبی، سیاسی، تعلیمی، مذہبی اور قومی واقعات کی مستند تاریخ ہے۔ یہ کتاب ۱۹۴۳ء میں شائع ہوئی۔ صفحات ۸۴۶ ہیں۔

مقالاتِ سلیمان :

سید صاحب کی وفات کے بعد مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے دارالمصنفین اعظم گڑھ سے شائع کیے۔ یہ مقالات تین جلدوں میں ہیں۔

جلد اول میں ۱۵ تاریخی مقالات ہیں۔

جلد دوم میں ۲۰ علمی و تحقیقی مقالات ہیں۔

جلد سوم میں ۲۳ مذہبی مقالات ہیں۔

جلد اول ۱۹۶۶ء، جلد دوم ۱۹۶۸ء میں اور جلد سوم ۱۹۷۱ء میں شائع ہوئی۔

مکاتیب سلیمان :

اس کتاب میں ۱۴۵ خطوط ہیں۔ جو سید صاحب نے وقتاً فوقتاً مولانا مسعود عالم

Marfat.com

ندوی کو لکھے۔ یہ کتاب ۱۹۵۴ء میں مکتبہ چراغ راہ کراچی نے شائع کی۔

مکتوباتِ سلیمان :

یہ کتاب دو جلدوں میں ہے۔ اس میں مندرج تمام خطوط مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام ہیں۔ خطوط کی مجموعی تعداد ۴۰۰ ہے۔ پہلی جلد ۱۹۶۲ء میں اور دوسری جلد ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئی، سید صاحب کے تمام مکاتیب علمی، تاریخ اور ادبی معلومات کا خزینہ اور بے حد افادیت کے حامل ہیں۔

مشاہیر کی علمی اور مطالعاتی زندگی

ترتیب وتعلیق : مولانا عبدالقیوم حقانی

جناب مدیر ''الحق'' حضرت مولانا سمیع الحق مدظلہٗ کے سوالنامہ کے جواب میں برصغیر پاک وہند کے اکابر علماء، مشائخ، مصنفین مشاہیر اور دینی وعلمی زعماء کی گرانقدر اور وقیع علمی تحریریں، ایک نادر تاریخی شاہکار، علم ومطالعہ اور عمر بھر کے تجربات کا نچوڑ، اسلام کے وسیع اور عظیم کتب خانہ میں نافع اور مفید کتابوں کی نشاندہی، علمی اور مطالعاتی زندگی میں سہل، مختصر مگر نافع راستہ کی توضیح، علماء، طلباء، وکلاء اور علمی ومطالعاتی ذوق رکھنے والے تمام احباب کے لئے یکساں مفید۔ مضبوط جلد بندی، عمدہ طباعت اور بہترین کاغذ۔

صفحات : 356 ....

القاسم اکیڈمی جامعہ ابوہریرہ

برانچ پوسٹ آفس خالق آباد، ضلع نوشہرہ، سرحد، پاکستان

Marfat.com

مولانا سعید احمد اکبرآبادی

مولانا شبلیؒ کا جانشین

مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت یہ کہنا کہ وہ ایک بہت بڑے محقق، نامور مصنف، بلند پایہ عالم اور صاحبِ طرز انشاپرداز تھے۔ ایک عام اور معمولی پیرایۂ بیان ہے، جس سے مولانا کا اصل مقام اور مرتبہ متعین نہیں ہوتا اور نہ اُن کا صحیح حق ادا ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بیسویں صدی میں ہندوستان کی اسلامی سوسائٹی کے ذہن و فکر اور یہاں کے تعلیم یافتہ طبقہ میں خواہ وہ طرزِ قدیم کا ہو یا طرزِ جدید کا، نصف صدی کے اندر اندر مذاق تصنیف و تالیف، طریقِ فکر و استدلال اور تہذیبی اہمال و عواطف کے اعتبار سے جو عظیم الشان انقلاب ہوا ہے، مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت اور اُن کے علمی و عملی کارناموں کو اس میں بڑا دخل ہے اور یہ انقلاب جس طرح پیدا ہوا ہے اور اُس نے ذہنی و فکری دنیا میں قدیم تعلیم یافتہ طبقہ کو جو سیادت بخشی ہے، اس کی نظیر آج پورے عالمِ اسلام میں کہیں نظر نہیں آئے گی۔ اس کی اصل حقیقت معلوم کرنے کے لئے ضروری یہ ہے کہ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے اوائل کے علمی و تصنیفی حالات پر ایک نگاہ ڈال لی جائے۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے نامور استاد مولانا شبلی کے زیرِ سایۂ عاطفت جب تصنیف و تالیف کا قلم سنبھالا، تو یہ وہ زمانہ تھا، جب کہ تعلیم یافتہ مسلمان دو طبقوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک قدیم تعلیم یافتہ یعنی علماء اور دوسرا جدید انگریزی تعلیم یافتہ گروہ۔ دونوں کا دائرہ عمل ایک دوسرے سے الگ تھا اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ دونوں میں رقابت تھی۔ ایک طبقہ دوسرے طبقہ کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتا تھا۔ علماء کی علمی کوششوں اور

Marfat.com

تحریروں و تصنیفی سرگرمیوں کا دائرہ فروعی اور جزئیاتی مسائل، یا متون درسیہ کے شروح و حواشی تک محدود تھا۔ تصنیف و تالیف کی زبان صاف، دلچسپ اور روان نہیں تھی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ تعلیم یافتہ طبقہ کو اُن کے ساتھ نہ کوئی دلچسپی تھی اور نہ اس کی نگاہ میں ان مسائل و مباحث کی کوئی اہمیت تھی۔ مغربی علوم و فنون اور انگریزی تعلیم نے اسلامی مسائل سے متعلق طریقِ فکر و بحث میں جو تبدیلی پیدا کر دی تھی، علماء کو نہ اس تبدیلی کا احساس تھا، نہ اس تبدیلی کے اسباب سے ان کو واقفیت تھی اور نہ ان کی زبان وقلم وقت کے جدید طرزِ سخن سے آشنا تھی۔

دوسری جانب انگریزی تعلیم یافتہ گروہ کا حال یہ تھا کہ وہ چونکہ سرسید کی آخری عمر کی پالیسی جو مسٹر بیک پرنسپل مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے زیر اثر تھی، اس سے کافی متاثر تھا۔ اس بنا پر اس کے دل و دماغ پر انگریزوں کی نقالی اور ان کی تہذیبی و تمدنی تقلید کی دھن سوار تھی۔ اس جنون میں اس کو نہ مذہب سے لگاؤ تھا، نہ دینی و قومی روایات سے دلچسپی تھی اور نہ قومی تہذیب اور کلچر کی اس کے دل میں عظمت تھی۔ مسلمانوں کی تاریخ سے متعلق اگر اسے تھوڑی بہت کچھ واقفیت تھی بھی، تو اس کی معلومات کا ذریعہ خود مسلمان مصنفین کی کتابوں کے بجائے یورپ کے مشنری مصنفین یا مستشرقین کی تصنیفات تھیں، جو علمی تحقیق اور ریسرچ کے پردہ میں اسلام کی روایاتِ حسنہ کو بھی اسی طرح پیش کرتے تھے کہ ایک مسلمان اسے پڑھ کر شرم سے گردن جھکا لیتا تھا اور خود اس کے دل میں اپنی تاریخ سے نفرت پیدا ہو جاتی تھی۔ اس طرح دونوں گروہوں کی راہ منزلِ مقصود اور سمت ایک دوسرے سے بالکل الگ تھی۔ ایک دوسرے کا مذاق اڑاتا تھا، طنز و تعریض کرتا تھا، اور دونوں میں اختلاف و افتراق کی ایسی وسیع خلیج حائل تھی، جس کا دور کرنا آسان نہیں تھا۔

وقت کی ملی اور قومی ضرورتوں کا تقاضا تھا کہ دونوں طبقوں کو ایک دوسرے کے قریب لایا جائے، اُن میں صلح کرا کے مصافحہ کرا لیا جائے، تا کہ دونوں باہمی اشتراکِ عمل سے وقت کے جدید تقاضوں کو پورا کر سکیں۔ اس کی صورت بجز اس کے کچھ اور نہیں ہو سکتی تھی

Marfat.com

کہ ایک طرف تعلیم قدیم کے نصاب میں تغیر وتبدل کر کے ایسے علماء پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی، جو صرف فروعی مسائل میں ہی وقت صرف کرنے کو دین کی سب سے بڑی خدمت نہ سمجھتے ہوں، بلکہ تعلیم جدید نے اسلام اور اس کی تعلیمات وروایات سے متعلق جو صدہا نئے قسم کے سوالات ومباحث پیدا کر دیئے تھے، اُن پر وقت کی زبان میں گفتگو کر سکتے اور اسلام کے نمائندہ کی حیثیت سے بزمِ نو کے ارکان کو خطاب کر سکتے ہوں اور دوسری طرف ضرورت تھی کہ انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کے دل ودماغ پر مغربی علوم وفنون اور انگریزی تعلیم سے جو مرعوبیت چھائی ہوئی تھی اور جس کے باعث وہ خود اپنی تاریخ، کلچر، تہذیب وتمدن اور روایات سے متعلق احساسِ کمتری میں مبتلا تھا۔ اس کو دور کرنے کی کوشش کی جاتی۔ اس سلسلہ میں کرنے کے اصل کام دو تھے۔ ایک یہ کہ علی گڑھ کے نصابِ تعلیم میں عربی، فارسی، اردو، اسلامی تاریخ، اسلامی فلسفۂ دینیات، یہ مضامین بھی شامل کرائے جاتے اور دوسرا کام یہ تھا کہ صاف ستھرے اور دلچسپ ودلنشین اندازِ بیان وزبان میں مغربی مذاق تحقیق وتصنیف کے مطابق اسلامی مسائل ومباحث اور اسلامی تاریخ وتمدن پر کتابیں لکھ کر شائع کی جاتیں تا کہ یہ انگریزی تعلیم یافتہ گروہ بھی ان کو پڑھ کر فائدہ حاصل کر سکتا۔

مولانا شبلی جو قدرت کی طرف سے ایک بڑا احساس دل اور بیدار دماغ لے کر پیدا ہوئے تھے، انہوں نے ان دوگونہ ضرورتوں کو محسوس کیا اور علی گڑھ کو خیر باد کہہ کر ہمہ تن اس کام میں لگ گئے۔ تقاضائے وقت کے مطابق علماء پیدا کرنے کی غرض سے وہ ندوۃ العلماء سے وابستہ ہو گئے، جو خاص اسی غرض سے قائم ہوا تھا اور تربیت یافتگانِ سر سید کی خصوصاً اور عام مسلمانوں کی عموماً ذہنی اصلاح کے لئے انہوں نے تاریخ وفلسفۂ اسلام کو اپنا خاص موضوع بنا کر کتابیں لکھنی شروع کیں۔ اس سلسلہ میں اور سب چیزوں سے قطع نظر مولانا نے اردو پر جو احسانِ عظیم کیا ہے، وہ کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا، جو زبان اب تک صرف شعروشاعری یا افسانہ خوانی وداستان طرازی کی زبان تھی، اس کو ایک نہایت باوقار، مگر ساتھ

Marfat.com

ہی دلچسپ وشگفتہ زبان بنادیا اور بحث وتحقیق، تنقید اور جمع وترتیبِ معلومات کے اعتبار سے اردو اب تک جس جدید مغربی اندازِ تصنیف سے ناآشنا تھی، مولانا نے اس کو اس سے مالا مال کردیا۔

مولانا شبلی نے جو پودا لگایا اور جس درخت کا بیج بویا تھا، اگرچہ ان کی زندگی میں برگ وبار لانے لگا اور اس کے ثمرات ظاہر ہونے لگے تھے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس پودے کو ایک تناور درخت بنانے میں سب سے بڑا دخل انہیں کے جانشین وتلمیذِ خاص مولانا سید سلیمان ندوی کا ہے، انہوں نے جس طرح اس تحریک کو چلایا، اُس کو کامیاب بنانے کے لئے جو راہ (مصنوعی طور پر نہیں بلکہ فطری اور طبعی طور پر) اختیار کی، سچ یہ ہے کہ مولانا شبلی کے بس کی بات بھی نہیں تھی۔

اس میں شبہ نہیں کہ مولانا شبلی کی شخصیت بڑی جامع اور ہمہ گیر تھی، انہوں نے مجتہدانہ طور پر علمی کام بھی کئے، اور عملی بھی۔ انہوں نے نثر کے میدان میں بھی گوہر لٹائے، اور نظم کے سبزہ زار میں حسن تخیل، لطافتِ بیان اور جذبات واثر کے پھول کھلائے۔ انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی ذہنی معاشرتی، یہاں تک کہ سیاسی اور تعلیمی زندگی کے ہر پہلو اور ہر گوشہ کو متاثر کیا اور سب پر کچھ نہ کچھ اپنا نقش چھوڑا اور آج ہم واضح طور پر ان وسیع اثرات ونقوش کو ہر جگہ محسوس کرسکتے ہیں، لیکن بہرحال یہ ماننا پڑے گا کہ بعض خاص اسباب کی بنا پر جن میں سے بعض کا تعلق ضرور مولانا کی اپنی طبیعت اور افتادِ مزاج سے تھا، مولانا شبلی کو نہ قدیم الخیال علماء کا پورا اعتماد حاصل ہوسکا، اور نہ انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کا۔ مولانا نے الکلام، علم الکلام اور سیرت النبی میں بعض خاص بحثیں اپنے نقطۂ نظر سے لکھی تھیں۔ علماء کا طبقہ ان کو برداشت نہ کرسکا۔ یہاں تک کہ خود ان کے سب سے بڑے قدرداں اور مداح نواب صدر یارِ جنگ، مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی بھی اُن کی تحریک ندوہ کے مخالفوں میں ہوگئے۔ (معارف مولانا شروانی کے متعلق یہ بیان صحیح نہیں ہے، سیرت تو اس

Marfat.com

وقت چھپی بھی نہیں تھی) اور اس پر جو طوفان برپا ہوا اور مولانا پر جس طرح اس طبقہ کی طرف سے حملے ہوئے، وہ باخبر اصحاب سے پوشیدہ نہیں ہیں۔

رہا تعلیمِ جدید کا گروہ، تو چونکہ یہ گروہ سرسید کے زیرِ اثر تھا اور مولانا شبلی سرسید کی سیاسی بلکہ ایک حد تک تعلیمی پالیسی کے مخالف تھے اور اس مخالفت کا برملا اظہار بھی کرتے تھے۔ اس بنا پر ظاہر ہے مولانا کو اس طبقہ کا پورا اعتماد حاصل نہیں ہوسکتا تھا۔ علاوہ بریں بعض کوتاہ نظروں نے خواہ مخواہ مولانا شبلی کو خواجہ حالی سے ٹکرا دیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیم جدید کے لوگوں میں ایک مستقل گروہ ایسا پیدا ہوگیا، جس کا سب سے محبوبِ ادبی مشغلہ خواجہ حالی کی جاو بیجا مدح سرائی اور منقبت کرنا اور ساتھ ہی مولانا شبلی پر مختلف دروازوں سے حملہ کرتے رہنا تھا چنانچہ تنقید شعر العجم عطیہ فیضی کے نام مولانا شبلی کے خطوط وغیرہ کتابوں اور ان جیسے مضامین و مقالات کی اشاعت اسی طبقہ کی اندرونی کوششوں اور سرگرمیوں کی رہینِ منت ہے۔

ان حالات اور اس ماحول میں مولانا شبلی کی سب سے بڑی خوش نصیبی یہ تھی کہ اُن کو مولانا سید سلیمان ندویؒ کی شکل میں ایک ایسا شاگرد مل گیا، جو وسعتِ مطالعہ، ذوقِ تحقیق، دقیقہ رسی، اور علم و فضل میں استاد کا صحیح جانشین تھا اور ساتھ ہی اپنے اندر بہت سی ایسی خوبیاں اور کمالات رکھتا تھا، جو اسی کا اپنا حصہ تھے اس کا قلم بجائے گرم مزاج ہونے کے نرم رو اور سبک خرام تھا، جو تنقید کے نازک سے نازک موقع پر بھی جادۂ احتیاط و اعتدال سے منحرف نہیں ہوتا تھا۔ اس کی طبیعت میں متانت و سنجیدگی اور علم و بردباری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، جس کی وجہ سے اس کے خامۂ گوہر فشاں کی پیشانی پر کبھی بھی جھنجلاہٹ اور غیظ و غضب کے تیور ظاہر نہیں ہوتے تھے۔ تشرّع، تدیّن، بلکہ تقشّف اس کی قبائے علم کا تکمۂ زرّین تھا، جس کے باعث کسی مسئلہ میں اختلاف کے باوجود جماعتِ علماء کی بھی اس پر نکتہ چینی کی جرأت نہیں ہوسکتی تھی، پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے مزاج میں استقلال، طبیعت میں صلح پسندی، مزاج میں مسکنت تھی، فکر پر بجائے عقلیت اور تفلسف کے اشعریت بلکہ

Marfat.com

سلفیت غالب تھی۔ ان خداداد اوصاف و کمالات کے باعث وہ جس محفل میں بھی بیٹھا، صدر بزم ہو کر رہا، جس انجمن میں بھی شرکت کی، شمع انجمن کہلایا۔

مولانا سید سلیمان ندوی کے یہ وہ ذاتی اوصاف و کمالات تھے، جس کے باعث جہاں مولانا شبلی کامیاب نہ ہو سکے، وہ کامیاب ہوئے اور جو عام اور ہمہ گیر اعتماد ان کو حاصل ہوا، وہ اُن کے استاد کو حاصل نہیں ہو سکا تھا۔ علماء نے ان پر اپنے اعتماد کلی کا اظہار اس طرح کیا کہ وہ جمعیۃ علمائے ہند کے سالانہ اجلاس منعقدہ کلکتہ کے صدر منتخب ہوئے۔ ایک عرصہ تک اُس کی مجلسِ عاملہ کے سربرآوردہ ممبر رہے۔ جمعیۃ علمائے ہند کے زیرِ اہتمام دلی میں آل انڈیا فلسطین کانفرنس ہوئی، تو اس کے صدر بھی وہی ہوئے۔ خود ندوۃ العلماء کی وہ سرزمین جو مولانا شبلی پر تنگ ہوگئی تھی، مولانا سید سلیمان ندوی کے لئے اُس نے عزت و احترام کے ساتھ اپنی آغوش کھول دی، پھر علماء خواہ کسی مسلک و خیال کے ہوں، مولانا کا ہر ایک مسلک کے علماء میں بڑا وقار اور درجہ تھا اور سب دل سے مولانا کے علم و فضل کے مدّاح ہونے کے ساتھ اُن کے اخلاق و فضائل کے قدردان تھے۔ دوسری طرف جس علی گڑھ کو مولانا شبلی نے حالات سے تنگ اور مجبور ہو کر خیرباد کہا تھا، اُسی نے مولانا سید سلیمان ندوی کی علمی اور اسلامی خدمات کا اعتراف اس طرح کیا کہ مولانا کو ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری دینے پر فخر کیا۔ علاوہ بریں وہ مسلم یونیورسٹی کی کورٹ کے اور اس کی بعض اور مجلسوں کے رکن رکین ایک مدت تک رہے۔ انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کو مولانا کی ذات کے ساتھ جو عقیدت و ارادت تھی، اس کا اظہار مولانا محمد علی اور ڈاکٹر اقبال رحمۃ اللہ علیہما کے ان خطوط سے بھی ہوتا ہے، جو ان دونوں بزرگوں نے مولانا کو لکھے ہیں۔ مولانا محمد علی جوہر کے خطوط میں تو خیر نری عقیدت اور جوشِ ارادت کا ہی اظہار ہے، لیکن ڈاکٹر اقبال کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی مسائل و مباحث پر غور کرتے وقت انہیں جب کبھی کوئی الجھن اور دقت پیش آتی تھی، تو وہ فوراً مولانا کی طرف رجوع کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کو

Marfat.com

مولانا کے ساتھ جو گہری عقیدت تھی، اس کا عملی اظہار انہوں نے اس طرح بھی کیا کہ ادارۂ معارف اسلامیہ، جس کے بانی خود ڈاکٹر صاحب تھے، اس کے اجلاس منعقدہ لاہور کی صدارت انہوں نے مولانا کو پیش کی اور پھر صدارت کی تحریک کرتے ہوئے انہوں نے جو الفاظ مولانا کی نسبت کہے تھے، وہ اُن کے دلی جذباتِ ارادت کے آئینہ دار تھے۔ انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کے اعتماد کا ایک اور واضح ثبوت یہ ہے کہ خلافت کا وفد انگلستان گیا، تو مولانا اس کے رکن تھے۔ حجاز کی موتمر عالم اسلامی میں شرکت کرنے کے لئے ہندوستان سے خلافت کا جو وفد گیا تھا، جس میں مولانا محمد علی، شوکت علی، شعیب قریشی جیسے لوگ انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کے نمائندے تھے، مولانا اس وفد کے رئیس و امیر تھے۔ اُن کے علاوہ ہندوستان کی اور دوسری یونیورسٹیوں کے مختلف علمی اور ادبی ادارے مولانا کو برابر بلاتے رہتے، اور اُن کے چشمۂ علم وفضل سے سیراب ہوتے رہتے تھے۔

اس اعتماد کے باعث مولانا کی تصنیفات وتالیفات، مضامین، مقالات، تقریریں اور خطبات دونوں تعلیم یافتہ طبقوں میں مقبول و پسندیدہ تھے۔ ہر ایک اُن کی قدر کرتا، اور اُن سے فائدہ اٹھاتا تھا۔ اس طرح مولانا شبلی کی تحریک کا جو اصل مقصد تھا، وہ باحسن وجوہ تکمیل کو پہنچا، یعنی ایک طرف علمائے کرام نے کتب درسیہ کے متون وحواشی اور منہیات وشروح کے دائرہ سے باہر نکل کر علمائے سلف کے علمی کارناموں کا جائزہ لینا شروع کیا۔ ان میں ذوقِ تحقیق وجستجو پیدا ہو، تاریخ جس کو انہوں نے اپنے لئے شجرِ ممنوعہ بنا رکھا تھا اور اگر اس کی طرف توجہ بھی ہوتی، تو اس کا دارومدار علامہ جلال الدین سیوطی کی تاریخ الخلفا پر تھا۔ اس کی طرف متوجہ ہوئے، فلسفۂ تاریخ کا ذوق بڑھا۔ واقعات کی تحقیق وتنقید کا جذبہ اُبھرا، اسلامی علوم وفنون کے بہت سے گوشے تھے، جن کی طرف اب تک توجہ نہیں کی گئی تھی۔ اُن کی طرف بھی رجحان ہوا، اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وقت کی زبان میں گفتگو کرنے کی صلاحیت پیدا ہوئی۔ دوسری جانب انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کو اسلامیات سے دلچسپی

Marfat.com

ہوئی، قومی روایات کا احترام اور اُن کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا۔ مغربی مصنفین کی غلط بیانیوں نے اسلامی تاریخ وثقافت سے متعلق جونقوش بدان کے دل ودماغ میں جما دیے تھے، وہ ٹلنے لگے اور اب خود ان میں مستند ذرائع معلومات کی روشنی میں اسلامیات پر ریسرچ کرنے کا ولولہ بیدار ہوا اور اس طرح انہوں نے استادانِ مغرب کی اندھی پیروی سے نجات پائی۔ آج ہم میں کتنے ملکی اور غیر ملکی یونیورسٹیوں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات ہیں، جن کا موضوع تحقیق وتصنیف، اسلامی علوم وفنون، اسلامی دینیات اور اسلامی ادبیات ہیں، کون کہہ سکتا ہے کہ اس عام فضا کے پیدا کرنے میں مولانا سید سلیمان ندوی کے علمی اور اسلامی کارناموں کو بہت بڑا دخل نہیں ہے۔

اس بنا پر کوئی شبہ نہیں کہ مولانا کے احسانات دونوں طبقوں پر ہیں اور چونکہ ان دونوں کو مولانا نے ایک دوسرے سے قریب کر دیا اور ان میں علمی ودینی ارتباط واتفاق پیدا کر کے انہیں اس قابل بنا دیا کہ دونوں باہمی اشتراک وتعاون سے اسلام کی اور مسلمانوں کی بیش از بیش مفید تر خدمات انجام دے سکیں۔ اس بنا پر مولانا کا احسان تمام مسلمانوں پر بھی ہے۔ اس عام فیضان واحسان کے علاوہ اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ مولانا طرزِ قدیم کے تعلیم یافتہ تھے، انہوں نے یونیورسٹیوں کے ایوانوں کے بجائے مدرسہ کی چٹائیوں پر بیٹھ کر علم حاصل کیا تھا اور وہ اپنی وضع وقطع شکل وصورت، لباس اور عادات واطوار ہر لحاظ سے کٹر قسم کے تعلیم قدیم کے فرد تھے اور اُن کو اس میں اتنا غلو تھا کہ تعلیم جدید کے حضرات کی بڑی بڑی انجمنوں میں میں بیٹھ کر بھی اپنی مولویت کو چھپاتے نہیں، بلکہ اس پر فخر کرتے تھے اور جب بھی موقع ملتا تھا، ایک مخصوص لطیف پیرایہ میں چٹکیاں بھی لے لیا کرتے تھے، چنانچہ راقم الحروف کو یاد ہے، ندوۃ العلماء کا سالانہ جلسہ (غالباً ۲۸ء) امرتسر میں منعقد ہو رہا تھا، میں اس زمانہ میں طالب علم تھا اور لاہور میں مقیم تھا۔ لاہور سے میں اور ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی جو ڈاکٹر اقبال مرحوم سے خاص تقرب رکھتے اور اُن کے ایڈیکانگ کی

Marfat.com

حیثیت سے رہتے تھے، اس اجلاس میں شرکت کرنے کے لئے امرتسر پہنچے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کسی عذر کی بنا پر اس میں شرکت نہیں کر سکتے تھے۔ میں اور چغتائی صاحب مغرب کے بعد مولانا سید سلیمان ندوی کی قیامگاہ پر حاضر ہو کر مولانا سے ملے، تو مولانا نے علیگ سلیک کے بعد چغتائی صاحب سے خطاب کر کے پوچھا، کیوں ماسٹر صاحب! ڈاکٹر صاحب (ڈاکٹر اقبال) تشریف نہیں لائیں گے۔ چغتائی صاحب نے ڈاکٹر صاحب کی طرف سے عذر بیان کیا، تو مولانا نے فوراً اپنے خاص انداز میں مسکراتے ہوئے فرمایا، اگر ڈاکٹر صاحب تشریف لے ہی آتے تو اچھا ہوتا۔ یہاں سب علماء جمع ہوں گے، اُن کو سُنانے کا اس سے بہتر اور کیا موقع ہوگا۔ چغتائی صاحب معلوم نہیں سمجھے یا نہیں، لیکن دہلی اور لکھنؤ کے جو حضرات اس وقت وہاں موجود تھے، انہوں نے مولانا کے اس فقرہ سے بڑا لطف لیا۔

غالباً ۳۹ء یا ۴۰ء کی بات ہے۔ ایک مرتبہ دہلی میں تشریف فرما تھے۔ اسی اثناء میں حسبِ معمول از راہِ شفقت بزرگانہ ندوۃ المصنفین دہلی کے دفتر واقع قرول باغ میں ایک دن شام کے وقت لائے۔ ہم سب بیٹھے چائے پی رہے تھے اور مولانا کی شفقت آمیز باتوں اور مشوروں سے مستفید ہو رہے تھے کہ اتنے میں ملک کے ایک مشہور صاحبِ علم جن کا رجحان تجدد کی طرف تھا اور جن کا ایک مقالہ ''برزخ'' کی بحث پر حال میں ایک علمی مجلہ میں شائع ہو چکا تھا۔ اچانک دفتر برہان میں آ نکلے۔ مولانا نے انہیں دیکھا تو نیم استادہ ہو کر مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا اور مسکراتے ہوئے فرمایا'' السلام علیکم یا اھل البرزخ'' وہ تو یہ سن کر کچھ جھینپ سے گئے، لیکن مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی کے اس فقرہ نے کہ دنیا میں جنت کہاں ہے؟ فضا کو صاف کر دیا۔ اسی مجلس میں مولانا نے اپنی سیرت النبی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ بعض لوگ پوچھتے ہیں کہ سیرت پہلی اور دوسری جلد میں ختم ہو گئی۔ اب سیرت کہاں ہے؟ یہ تو سب اسلامی تعلیمات ہیں، جن پر باقی جلدوں میں بحث ہوئی ہے، تو بھئی اصل بات یہ ہے کہ انگریزی تعلیم یافتہ حضرات کسی ایسی کتاب کو

Marfat.com

پڑھتے ہی نہیں جس میں خالص دینی اور مذہبی بحثیں ہوں، وہ صرف تاریخ اور سیرت سے مانوس ہیں۔ اس لئے میں نے دراصل عنوان سیرت کا ہی رکھا ہے، اور اس بہانہ چاہتا ہوں کہ ان حضرات کو اسلام کی تمام دینی اور اخلاقی تعلیمات اور ان کے احکام و مسائل سے واقف کر دوں۔ اس طرح گویا میں نے بچوں کی طرح اپنے اصل مقصد کے چہرہ پر ایک مٹی کا مصنوعی چہرہ لگا لیا ہے تاکہ ان حضرات کو توحش نہ ہو اور وہ سیرت محمدیہ کے ساتھ ساتھ شریعتِ محمدیہ سے بھی واقف ہو جائیں۔

بہرحال اس گذارش کا مقصد یہ ہے کہ مولانا علماً و عملاً صورۃً و شکلاً، ظاہراً و باطناً ایک عالم دین تھے۔ انہوں نے جو کچھ کیا، اسی حیثیت سے کیا اور اپنے عالمانہ وقار کو ہر جگہ اور ہر موقع پر برقرار رکھا۔ اس بنا پر طبقۂ علماء کو ان کا خاص طور پر ممنون و شکر گذار ہونا چاہئے کہ اُن کے ایک فرد فرید نے یونیورسٹیوں کی علمی مجلسوں میں ہسٹاریکل کانگریس کے اجلاسوں اور ادبی و تحقیقاتی اداروں کے جلسوں کی صدارت کر کے اور اسلامی علوم وفنون کے علاوہ دوسرے علمی، ادبی، تاریخی اور سیاسی مسائل و مباحث پر محققانہ تصنیفات و مقالات لکھ کر صرف اپنے آپ کو سرفراز و سربلند نہیں کیا بلکہ تعلیم جدید کے حضرات کے دل و دماغ پر پورے طبقۂ علماء اور مدارس عربیہ کی علمی و تحقیقی سیادت کا نقش بھی ثبت کر دیا، ورنہ ظاہر ہے ان علمی مجلسوں میں علماء کا گذر ہی کہاں تھا؟

مولاناؒ کی عظیم الشان خدمات علم و دین کا ایک بڑا روشن و تابناک پہلو یہ ہے کہ انہوں نے جو کچھ کیا خود ہی نہیں کیا، بلکہ ان ہی مدارس عربیہ کے پڑھے ہوئے اور بوریہ نشین علماء میں سے ایک ایسی جماعت تیار کر دی، جو اربابِ قلم بھی ہیں اور علم و تحقیق کے میدان کے شہسوار بھی، اسلامیات کے مبصر بھی ہیں اور ادبی مسائل و معلومات کے نکتہ دان و نکتہ سنج بھی۔ واقعہ یہ ہے کہ خود مصنف اور محقق ہونا اس قدر مشکل نہیں ہے، جتنا کہ مصنف گر اور محقق ساز ہونا ہے۔ مولانا شبلی کی طرح مولانا سید سلیمان ندوی کو بھی قدرت نے اس

Marfat.com

کا خاص ذوق اور ملکہ عطا فرمایا تھا اور اُن میں دوسروں کی علمی نگرانی و رہنمائی کا بڑا جذبہ تھا۔ دارالمصنفین مولانا جس کے ناظم اعلیٰ اور سرخیل و امام تھے، اس کا تو خیر قیام ہی اسی مقصد کے لئے ہوا تھا کہ اربابِ قلم علماء اور محقق مصنفین پیدا ہوں۔ اس بنا پر اس ادارہ کے ارکان و رفقاء کو تو مولانا کے فیضانِ تعلیم و تربیت سے بلاواسطہ و براہِ راست بہرہ مند ہونے کا شرف حاصل تھا ہی لیکن اس ادارہ سے باہر ملک کے دور دراز گوشوں میں نوجوان علمی ذوق رکھتے تھے اور اس سلسلہ میں مولانا سے استفادہ کرنا چاہتے تھے۔ مولانا نے کبھی اُن کی امداد و اعانت میں دریغ نہیں فرمایا اور بڑی خوشی سے جو علمی رہنمائی بھی وہ کر سکتے تھے، وہ کرتے تھے۔

خود راقم الحروف کو یاد ہے۔ غالباً ۲۷ء میں جب کہ میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہونے والا تھا، میں نے مولانا کو ایک خط لکھا کہ میں کچھ تصنیف و تالیف کا ذوق رکھتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ دو تین سال دارالمصنفین میں آپ کے زیر تربیت رہ کر اپنے اس ذوق کی تکمیل کروں، تو کیا یہ صورت ممکن ہے؟ مولانا نے بڑی شفقت اور محبت کے ساتھ دارالمصنفین کے قواعد وضوابط کی ایک کاپی ارسال کردی اور افسوس کے ساتھ تحریر فرمایا کہ بالفعل کسی معاوضہ پر یہاں قیام کی کوئی صورت نہیں ہے۔ **ولعل اللّٰہ یحدث بعد ذٰلک امراً**"۔ اس کے بعد لکھا کہ بہر حال آپ کو یہاں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ مجھ سے جو فائدہ یہاں رہ کر حاصل کرنا چاہتے ہیں، اپنی جگہ پر رہتے ہوئے بھی کر سکتے ہیں۔ آپ جس عنوان پر لکھنا چاہیں، مجھ کو اس سے مطلع کر دیں، میں بتاؤں گا کہ اس عنوان سے متعلق مواد کہاں کہاں ملے گا، اسے کس طرح جمع اور کس طرح مرتب کرنا چاہئے اور پھر جب آپ مقالہ تیار کر لیں تو میرے پاس بھیج دیجئے، میں اس میں اصلاح کر دیا کروں گا"۔

اس واقعہ کے دو تین سال بعد کا ذکر ہے۔ اس زمانہ میں میرے ارزاں قسم کے

Marfat.com

مضامین و مقالات پنجاب کے بعض ادبی رسالوں میں شائع ہوتے تھے، لیکن مجلہ معارف کی جو عظمت میرے دل میں تھی، اس کی وجہ سے شوق تھا کہ کبھی معارف میں بھی میرے نام سے کوئی چیز شائع ہو۔ اس معیار کا کوئی مقالہ تو لکھا نہیں گیا، ایک نظم لکھی تھی، جو بعد میں پنجاب کے ایک ادبی رسالہ میں شائع ہوگئی تھی۔ اس نظم کی نسبت خیال ہوا کہ معارف کے معیار کے مطابق ہے۔ فوراً مولانا کی خدمت میں ارسال کردی۔ مولانا نے یہ نظم واپس کرتے ہوئے بڑی محبت اور شفقت کے ساتھ تحریر فرمایا ''آپ اس نظم نویسی کے چکر میں کہاں پڑ گئے۔ یہ آپ کے مرتبہ سے گری ہوئی چیز ہے، کچھ محنت کیجئے اور مقالہ نویسی پر توجہ کیجئے۔ قوم کو آپ سے اس کی توقع ہوسکتی ہے اور یہی ہونی چاہئے۔ مولانا کے اس گرامی نامہ کا میرے دل پر خاص اثر ہوا اور مجھے اب تک یاد ہے کہ میں نے مولانا کے اس مکتوبِ گرامی کے جواب میں یہ شعر لکھا تھا ....

کون ہوں کیا ہوں کہاں ہوں سب حقیقت کھل گئی
تو نے وہ ٹھوکر لگائی چشمِ علت کھل گئی

بہر حال حق یہ ہے کہ اربابِ قلم وتحقیق علماء کی ایک جماعت پیدا کر کے مولانا نے ہندوستان کی اسلامی سوسائٹی میں جو انقلاب پیدا کیا ہے۔ وہ آج پورے عالم اسلام میں اپنی نظیر آپ ہے۔ ورنہ عہدِ حاضر کے ترکی، مصر، ایران، شام و بیروت اور افغانستان پر نگاہ ڈالئے، تو معلوم ہوگا کہ مغربی طرز پر تحقیق و تصنیف کا جو کام بھی ہو رہا ہے، اسے جدید تعلیم یافتہ طبقہ ہی انجام دے رہا ہے۔ طرزِ قدیم کی تعلیم کے حامل جو حضرات ہیں، وہ اب تک اپنی اسی پرانی ڈگر پر چلے جارہے ہیں اور درسیات و دینیات کے عزلت کدوں سے باہر نکل کر نئی دنیا کی آب وہوا سے زیادہ آشنا نہیں۔ اُس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان ملکوں کے جدید تعلیم یافتہ حضرات پر اسلامی تہذیب وثقافت اور تمدن و معاشرت کا رنگ اتنا گہرا نہیں ہے، جتنا کہ ہندوستان کے اس طبقہ پر ہے۔ وہاں جدید وقدیم کا فرق و امتیاز اُن کی باہمی رقابت

Marfat.com

اور کشمکش اب تک قائم ہے۔ مصر میں جامعہ ازہر اور جامعہ فواد دونوں ایک دوسرے کے حریف ہیں، لیکن یہاں دیو بند، علی گڑھ، ندوۃ العلماء اور جامعہ ملیہ سب ایک دوسرے کے حلیف شریک اور متعاون ہیں۔ غور کیجئے اس انقلابِ عظیم کا سرچشمہ کہاں ہے؟ اس میں شک نہیں کہ اس میں خلافت کی تحریک اور بعد میں کانگریس کی سیاسی جدوجہد کو بھی دخل ہے، لیکن جہاں تک اس انقلاب کے علمی پہلو کا تعلق ہے، کوئی شبہ نہیں، وہ بڑی حد تک سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کوششوں کا مرہون ہے۔

اب ایک اور پہلو سے دیکھئے۔ خالص علمی اور تحقیقی کام اور پبلک لائف دونوں میں پرانا بیر ہے۔ دونوں کو نباہنا جام وسندان باختن سے کم مشکل نہیں ہے، لیکن مولانا کو قدرت نے جو عجیب ہمہ گیر اور جامع طبیعت عطا فرمائی تھی۔ اس کی وجہ سے انہوں نے اس راہ کو بھی اپنے لئے آسان کر لیا تھا۔ تحریک خلافت اور اس کے بعد تحریک آزادی کے زمانہ میں وہ ان دونوں تحریکوں کے سرگرم زعماء کے دوش بدوش چلتے رہے۔ ملک کے دور دراز گوشوں کے اور ملک سے باہر بھی سفر ہو رہے ہیں۔ جلسوں میں تقریریں ہو رہی ہیں اجلاس کا خطبۂ صدارت پڑھا جا رہا ہے، مشاورتی کونسلوں میں شرکت ہو رہی ہے، قومی کارکنوں کی عملی نگرانی کی جا رہی ہے ...... غرض کہ مسلمانوں کی قومی زندگی کا کوئی گوشہ تعلیمی ہو، یا سیاسی، مذہبی ہو یا معاشرتی، ادبی ہو یا علمی، ایسا نہیں ہے، جس میں مولانا عملاً شریک نہ رہے ہوں اور اس کی سرگرمیوں میں حضورِ قلب و دماغ کے ساتھ حصہ نہ لیتے ہوں۔ اس بنا پر مولانا کی شہرت اور اُن کی شخصیت کی عظمت کا احساس صرف طبقۂ خواص تک محدود نہیں رہا، بلکہ عام مسلمانوں اور ابنائے وطن نے بھی اُن کی بزرگی اور تقدس کے سامنے سرِ نیاز خم کر دیا۔

حضرت تھانویؒ کی خدمت میں :

علم وفضل، کمال و ہنر اور عروج وارتقا کے یہ تمام منازل و مراحل طے کرنے کے بعد آخر وہ وقت بھی آ گیا جب کہ علم کے حجابات ظاہر بھی اٹھ گئے اور شاہد حقیقی کا جمالِ

Marfat.com

معنوی بلا کسی واسطہ و وسیلہ کے پرتو فگن ہونے لگا۔ بعض کوتاہ نظر خواہ کچھ کہیں، لیکن حق یہ ہے کہ آخر عمر میں مولانا کو جو روحانی مقام حاصل ہوا اور جس کی وجہ سے وہ علمی اور تحقیقی کاموں سے کنارہ کش ہو گئے تھے، وہ قرب و اتصال الٰہی کا ایک بلند مقام اور ایک انسان کے کمال کی معراج ہے۔ عشق کی فغان سنجی یا زمزمہ پیرائی ہجر و فراق کی مدت کے دراز ہونے تک باقی رہتی ہے، لیکن جب حسن خود بے نقاب ہو کر سامنے آجائے، اور اپنی جلوہ طرازیوں سے عشق کی کائناتِ زندگی پر مستولی اور غالب ہو جائے تو عشق کی زبان گنگ ہو جاتی ہے۔ وہ مسحور و بے خود ہو کر قوتِ گفتار سے محروم ہو جاتا ہے اور تجلیات میں گم ہو کر حیرت کی تصویر بن کر رہ جاتا ہے۔ علم کی مثال اس نقش پا کی سی ہے، جس کے ذریعہ محبوب تک پہنچنے کی کوشش کی جائے، لیکن جب محبوب خود سامنے آجائے تو اس وقت بھی اس نقشِ پا کی پیروی کرنا اور اسی کے اشاروں پر چلنا خود منزلِ مقصود سے دور ہونا نہیں تو اور کیا ہے؟ یہی وہ حقیقت ہے، جس کو ''العلم حجاب اکبر'' میں بیان کیا گیا ہے۔

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

حضرت سید صاحب کا آخر عمر میں روحانی لطائف و مزایا کی طرف مائل ہو جانا اور اس میں غلو کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اب تک وہ جو کام کرتے رہے تھے۔ اس کو انہوں نے تکمیل کے آخری درجہ تک پہنچا دیا تھا۔ مولانا کی تخصیص نہیں بلکہ ہر صاحبِ کمال کا حال یہی ہوتا ہے کہ جب اس کا کمال عروج و ارتقا کے آخری نقطہ تک پہنچ جاتا ہے، تو اب اُس کو اس میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہتی اور وہ اس سے منہ موڑ کر ایک ایسے سبزہ زار میں جا نکلتا ہے، جو زمان و مکان، این و آں اور زوال و فنا کے خرخشوں اور حد بندیوں سے وراء الوراء ہوتا ہے اور جہاں کسبِ کمال کی تشنگی کبھی نہیں بجھتی، خوب سے خوب تر تلاش کرنے والی نگاہ کو کبھی سیری نہیں ہوتی، جہاں دامانِ طلب کبھی پر نہیں ہوتا، جہاں قرب و اتصال کی ٹھنڈک

Marfat.com

شوق واشتیاق کی آگ کو سرد نہیں کرتی، بلکہ اُسے اور مشتعل کرتی ہے۔ آئزک نیوٹن جس نے عالمِ طبیعیات میں ایک انقلابِ عظیم پیدا کردیا، جب وہ سب کچھ کر چکا تو خود اس سے منحرف ہوکر گرجا سے وابستہ ہوگیا اور اس کے قلب اور روح کو سکون وہیں ملا۔ حضرت الاستاذ مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ کا حال بھی یہی تھا۔ عمر بھر علم و تحقیق کے میدان میں کونہ کونہ کی خاک چھانتے پھرے، اور ہزاروں کو اپنے فیوضِ علمیہ سے باکمال بنا گئے، لیکن خود آخر عمر میں ذکر و شغل اور مراقبہ و مناجات کی طرف حد سے زیادہ مائل ہوگئے تھے اور فرماتے تھے کہ افسوس! ہم علم کے پیچھے لگے رہے، لیکن اصل کام جو کرنے کا تھا وہ نہ کیا!!

جس طرح آئزک نیوٹن اپنی لافانی تحقیقات و اکتشافات سے بیزار ہوکر ایک گوشہ میں جا بیٹھا، لیکن دنیا آج تک اس سے فائدہ اٹھا رہی ہے اور اُٹھاتی رہے گی، اسی طرح اگرچہ سید صاحبؒ خود آخر میں اپنے عمر بھر کے کاموں سے ایک بلند تر، اعلیٰ تر مقصد کی خاطر کنارہ کش ہوگئے تھے، لیکن یہ انہوں نے اس وقت کیا تھا، جب کہ اُن کی کوششوں کا لگایا ہوا پودا پورے طور پر بارآور ہو چکا تھا اور اُن کو یقین تھا کہ اس سلسلہ میں انہیں خود جو کام کرنا تھا، وہ اسے پورا کر چکے تھے اور اب ایک ایسی جماعت پیدا ہوگئی تھی، جو اُن کے نقشِ قدم پر چل کر اس کام کو برابر جاری رکھے گی اور فروغ دے گی۔ اس بنا پر اب یا آئندہ اس راہ میں جو کام بھی ہوگا، وہ مولانا کی منت کشی احسان سے آزاد نہیں ہوسکتا۔

جیسا کہ میں نے اوپر کہا مجھ کو مولانا سے براہِ راست تلمذ و استفادہ کا شرف حاصل نہیں ہوسکا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ میں اپنے تئیں مولانا کا تلمذ معنوی سمجھتا ہوں، کیونکہ میں نے مولانا شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی دونوں کی کتابوں سے کافی استفادہ کیا ہے، مجھ کو ان دونوں بزرگوں کی کتابیں اور بالالتزام مجلہ معارف پڑھنے کا شوق اُس وقت سے تھا، جب کہ میں پورے طور پر ان کے مضامین سمجھنے کی استعداد بھی نہیں رکھتا تھا۔ دارالعلوم دیوبند کی طالب علمی کے زمانہ میں میں اپنی اس خصوصیت کے اعتبار سے مشہور تھا، چنانچہ ایک مرتبہ

Marfat.com

حضرت شاہ صاحب (مولانا سید محمد انور شاہؒ) کو یاجوج و ماجوج سے متعلق ایک بحث کا مطالعہ کرنے کے سلسلے میں ارض القرآن کو دیکھنے کا خیال پیدا ہوا، تو ایک دن عشاء کی نماز کے بعد مسجد سے کمرہ کی طرف واپس جاتے ہوئے سیدھے میرے کمرہ میں تشریف لائے اور کتاب طلب کی۔ میں نے افسوس کے ساتھ عرض کیا کہ کتاب ہے، مگر یہاں نہیں آگرہ میں ہے، تو فرمایا، ''بس جب کتاب یہاں تمہارے پاس بھی نہیں تو اور کس کے پاس ہوگی۔ دارالمصنفین کی کتابیں یہاں اور پڑھتا کون ہے؟''

تلمذ روحانی کی اس نسبت کی وجہ سے مجھ کو سید صاحب کی ذات اور شخصیت کے ساتھ نہ صرف ایک رسمی عقیدت تھے، بلکہ محبت بھی تھی اور مجھ کو یہ کہنے میں مسرت اور فخر دونوں محسوس ہوتے ہیں کہ حضرت سید صاحب بھی مجھ کو اسی بزرگانہ شفقت و کرم سے دیکھتے اور اسی کے مطابق برتاؤ کرتے تھے۔ دلی جب کبھی آتے تو ناممکن تھا کہ شرفِ ملاقات عنایت فرمائے بغیر واپس چلے جاتے۔ ایک مرتبہ میں نے برہان کے نظرات میں اسلامی تعلیم گاہوں کی خصوصیات بتاتے ہوئے ندوۃ العلماء کی نسبت ''دینی مگر دنیوی'' کا فقرہ لکھ دیا۔ پرچہ حضرت سید صاحب کی نظر سے گذرا تو بڑا ملال ہوا، اسی اثنا میں کسی سفر میں کہیں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور سید صاحب کی ملاقات ہوگئی۔ سید صاحب نے مولانا حفظ الرحمٰن سے فرمایا ''ہم لوگ تو مولوی سعید صاحب کو اپنا ہی آدمی سمجھتے تھے، لیکن اب اُن کے قلم سے ندوہ کی نسبت یہ الفاظ پڑھ کر سخت صدمہ اور ملال ہوا ہے''۔ مولانا سیوہارویؒ نے دلی پہنچ کر مجھ کو سید صاحب کی یہ شکایت پہنچادی، تو مجھ کو خود اس کا بہت افسوس اور ملال ہوا، کچھ دنوں بعد لکھنؤ میں ایک جلسہ کے سلسلہ میں سید صاحب سے ملاقات ہوگئی تو میں نے اس واقعہ کا ذکر کر کے عرض کیا کہ دراصل مجھ سے تعبیر میں کوتاہی ہوگئی، مجھ کو ایک ''بھی'' کا لفظ اور لکھنا چاہئے تھا، یعنی دینی مگر دنیوی بھی، تو میرا مطلب زیادہ واضح ہوتا، کیونکہ ظاہر ہے، دین کے ساتھ دنیا جمع کرنا عیب اور نقص نہیں، بلکہ ہنر و کمال ہے ....

Marfat.com

ع دین و دنیا بہم آمیز کہ اکسیر اینست

اور درحقیقت ندوہ کے قیام کی ایک غرض یہ بھی تھی کہ ایسے علماء پیدا کئے جائیں، جو علومِ دینیہ کے ساتھ علومِ دنیویہ میں بھی کوتاہ نہ ہوں۔ حضرت سید صاحب یہ سُن کر غایت شفقت سے مسکرا دیئے اور فرمایا الآن اصبت اور بات رفت و گذشت ہوگئی۔

اب وہ شفقت و محبت اور کرم و توجہ یاد کرتا ہوں تو دل تڑپ کے رہ جاتا ہے، گویا میر تقی میر سے معذرت کے ساتھ! ....

مصائب اور تھے پر اُن کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہوگیا ہے!

میرؔ کے اصل شعر میں بجائے ''اُن'' کے ''دل'' ہے۔

فرحمه الله رحمةً واسعةً و طاب ثراه۔

میرے حضرتؒ میرے شیخؒ

تصنیف : مولانا عبدالقیوم حقانی

شیخ الحدیث مولانا حضرت مولانا عبدالحقؒ کی حیات طیبہ، علم و عمل، سیرت و کردار، صفات و کمالات، علمی، دینی، روحانی، تجدیدی، جہادی اور اصلاحی کارنامے، ذوق علم، وشوق مطالعہ، سفر آخرت کے عبرت انگیز احوال، ایمان آفریں مجالس اور روح پرور ارشادات و افادات کا دلچسپ، جامع اور حسین مرقع۔

صفحات : 260

القاسم اکیڈمی جامعہ ابوہریرہ، برانچ پوسٹ آفس، خالق آباد، نوشہرہ، سرحد، پاکستان

Marfat.com

مولانا محمد اویس صاحب ندوی

بعض اہم علمی کام

جو سید صاحبؒ کے پیش نظر تھے

سید صاحبؒ اس دنیا سے تشریف لے گئے اور اپنے ساتھ علوم و معارف اور کمالات کا ایک خزانہ لے گئے، لیکن جو کچھ چھوڑ گئے ہیں، وہ بھی کم نہیں ہے، اُن کی تصنیفات' مقالات، خطبات اور مکاتب ایک گنج گرانمایہ کی حیثیت رکھتے ہیں، موجودہ اور آئندہ نسلوں کی دینی، اخلاقی، عملی اور ذہنی رہنمائی کے لئے اس میں بڑا قیمتی سامان موجود ہے۔

لیکن ان ''الباقیات الصالحات'' کے سوا سید صاحب کے سامنے کچھ اور بھی کام تھے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ کی جو باتیں میرے علم میں ہیں، اُن کو قلم بند کردوں۔ ممکن ہے کہ دوسرے حضرات کے پاس بھی اس سلسلہ کے کچھ معلومات ہوں، اگر یہ سب چیزیں جمع ہوجائیں تو آئندہ کے کاموں کا ایک خاکہ تیار ہوسکتا ہے اور سید صاحب کے ''حسنات'' کا ایک نیا باب کھل سکتا ہے۔

سید صاحبؒ کو اسلامی علوم میں حقیقی شغف قرآن مجید سے تھا۔ آیاتِ قرآنی سے کلامی، فقہی، اخلاقی اور سیاستِ اسلامی کے مسائل کا استنباط، اس کے ادبی لطائف کی تشریح و توضیح اور تاریخی مباحث کی تحقیق اُن کی زندگی کا دلچسپ موضوع تھا۔ ارض القرآن اور سیرۃ النبی ﷺ کی ضخیم جلدیں، اُن کے اس مذاق کی شاہد عادل ہیں۔

سید صاحب کے ذہن میں عصری مذاق کے مطابق قرآن مجید کے مسائل کی ترتیب و تدوین کا ایک نقشہ تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اصول کی رعایت کرتے ہوئے دیانت اور

Marfat.com

ذہن کی سلامتی کے ساتھ، آیاتِ قرآنی پر غور کیا جائے اور ان آیات سے کلامی، فقہی، اخلاقی، اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی مسائل کا استنباط ہو سکے تو ان کو احادیثِ نبویہ ﷺ نیز صحابہؓ و تابعینؒ اور سلف صالحینؒ کی تشریحات کے ساتھ الگ الگ مرتب کیا جائے۔

یہ تجویز بہ ظاہر بہت مختصر معلوم ہوتی ہے. لیکن اگر اس کو عملی جامہ پہنایا جائے، تو پورا ایک ادارہ اس کام میں لگ سکتا ہے۔ اسلامی علوم میں مفید ترین کتابوں کا اضافہ اور اسلامی نظریات کو سمجھنے کے لئے بہترین مواد جمع ہو سکتا ہے۔

سید صاحب نے عقائد القرآن اور فقہ القرآن کے نام سے اس سلسلہ میں دو عنوان قائم فرما کر کچھ کام بھی شروع کر دیا تھا۔ فقہ القرآن کے لئے راقم سطور سے قرآن مجید کی آیاتِ احکام کو جمع کرایا تھا، جو میرے پاس موجود ہیں۔

دوسرے محققین کی طرح سید صاحب کا خیال تھا کہ آیاتِ قرآنی کی حیثیت کلیات کی ہے اور احادیث نبوی ﷺ انہی کلیات کی تشریح ہیں۔ اس سلسلہ میں سید صاحب کی رائے تھی کہ قرآن مجید نیز ذخیرۂ احادیث کا دقتِ نظر سے مطالعہ کیا جائے اور ارشاداتِ نبوی ﷺ کو انہی کلیات کے ماتحت جمع کیا جائے۔ اس موضوع سے متعلق سید صاحب نے اپنی یادداشت کی کاپی میں دو عنوانات قائم فرمائے تھے۔ پہلا عنوان یہ ہے:

''الایات الّتی استدل بھا النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم علٰی ماقالہ''

اس عنوان کے تحت سید صاحبؒ نے ۵۸ استدلالاتِ نبوی ﷺ کو جمع فرمایا تھا۔ مثال کے طور پر چند ملاحظہ ہوں۔

(۱) فضل العالم علٰے العابد کفضلی علی ادناکم ثم تلا انما یخشی اللّٰہ من عبادہٖ العلماء۔ (ترمذی تفسیر)

(۲) فلمّا قضی الصّلٰوۃ قال من نسی الصّلٰوۃ فلیصلھا اذا ذکرھا فان اللّٰہ تعالٰی قال اقم الصّلٰوۃ لذکری۔ (ابوداؤد)

Marfat.com

(۳) نهانا عن الاستخصاء ثم قرء علينا ، يااَيها الذين آمنو لاتحرموا طيبات ما احل الله لكم ولا تعتدوا ان الله لا يحب المعتدين ـ (بخاری)

(۴) ان اللّٰه يملى الظالم ثم قرء و كذالك اخذ ربك اذ اخذ القرى و هى ظالمة ـ (مسلم)

دوسرا عنوان یہ ہے :

"القسم الثانی من الاحاديث التى تفسِّر القرآن بغير ذكر القرآن"

اس عنوان کے تحت سید صاحب نے ۱۲۸ احادیث کو جمع فرمایا تھا، اس کی مثالیں ملاحظہ ہوں۔

(۱) اياكم والظن (مسلم) انّ بعض الظن اثم ،

(۲) انّما هى اعمالكم ترد عليكم ولا تجزون الا ماكنتم تعملون ،

(۳) انفق ينفق عليك وما انفقتم من شى فهو يخلفه

دوسرے علماء نے بھی اس عنوان سے دلچسپی ظاہر فرمائی ہے۔ مثلاً صاحب روح المعانی کا خیال ہے کہ دعا " اللهم من احييته منّا فاحيه على الاسلام ومن توفيته منا فتوفه على الايمان " کا ماخذ آیت "ولا تموتن الا وانتم مسلمون " ہے (روح المعانی ج ۴ ص ۱۶) اسی طرح حضرت مولانا انور شاہ صاحب فرماتے ہیں، ولتكن منكم امة يدعون الى الخير الآية ، استنبط منه حديث صلى الله عليه وسلم ، لا تزال طائفة من و امتى ظاهرين على الحق حديثه صلى اللّٰه عليه وسلم الجهاد ماضٍ الى يوم القيامة ـ (مشکلات القرآن ص ۹۷)

ان عنوانات کو پورا کرنا کچھ آسان کام نہیں ہے، لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ بڑی اہم اور مفید خدمت ہوگی اور اگر اس موضوع پر کچھ کام کر ڈالا جائے، تو اپنے طرز کی نئی

Marfat.com

چیز ہوگی۔

اِن اہم اور بنیادی کاموں کے سوا قرآن مجید کے سلسلہ میں سید صاحبؒ کے پیشِ نظر حسبِ ذیل کام بھی تھے، ان میں سے بعض سید صاحب کی نگرانی میں انجام پا چکے ہیں، مگر ابھی ان کی طباعت کی نوبت نہیں آئی ہے۔

(۱) دارالمصنفین کے کتب خانہ میں الفوز الکبیر کا ایک قلمی نسخہ ہے، جس میں شاہ صاحبؒ کے حواشی قرآن اور اُصول ترجمۂ قرآن مجید کا رسالہ بھی ہے۔ سید صاحب کی خواہش تھی کہ اس کو شائع کیا جائے۔

(۲) قرآن مجید میں کائنات کی مختلف چیزوں کو بہ طورِ "آیاتِ الٰہی" کے پیش کیا گیا ہے۔ سید صاحب کا خیال تھا کہ ان تمام آیات کو الگ الگ عنوانات کے ماتحت جمع کیا جائے اور جن چیزوں کو بطورِ آیات کے پیش کیا گیا ہے، اُن کے متعلق قدیم و جدید ماخذ سے ایسے معلومات کو جمع کر دیا جائے، جن سے ان آیاتِ الٰہی کے آیت (یعنی نشانی) ہونے کی حیثیت اور حقیقت واضح ہو جائے۔ سید صاحب نے ان آیات کو عنوانات کے ماتحت جمع کرادیا تھا، اُن کی تشریح کا کام باقی ہے۔

(۳) سید صاحب کا خیال تھا کہ معانی و بلاغت، نیز دوسری کتابوں میں مسائل کی تشریح کے ضمن میں قرآن مجید کے لطائفِ ادبیہ کو واضح کیا گیا ہے، اگر آیاتِ متعلقہ کو عنوان بنا کر ان سب کو سورتوں کی ترتیب کے ساتھ جمع کر دیا جائے، تو قرآن مجید پر ادبی حیثیت سے غور کرنے والوں کے لئے ایک مفید خدمت ہوگی، بحمد اللہ دو جلدوں میں یہ کام پورا ہوا۔

(۴) قرآن مجید کے اعجاز کا مسئلہ قرآنی علوم میں جو اہمیت رکھتا ہے۔ وہ ظاہر ہے، ہر عہد میں مختلف نوعیتوں سے اس پر کلام کیا گیا ہے۔ مسلمانوں کے عہدِ تصنیف سے لے کر اس وقت تک اس موضوع پر جو کچھ بھی لکھا گیا ہے، اس کو سنین کی ترتیب کے اعتبار سے سید

Marfat.com

آخر میں سید صاحب کی ایک خواہش کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے، جس کا تعلق خود اُن کی تصانیف سے ہے اور جس سے ان کے تصنیفی احتیاط کا اندازہ ہوتا ہے، وہ خواہش یہ تھی کہ اُن کی تصانیف بالخصوص سیرۃ النبی ﷺ پر نظر ثانی کا کام کیا جائے، اپنے بعض شاگردوں سے زبانی اور خطوط میں اس کا ذکر فرمایا، گو صرف عقیدہ نہیں بلکہ حقیقۃً سید صاحب کا قلم خود اس قدر محتاط تھا کہ اُن کی تصانیف پر خصوصی طور سے نظر ثانی کی ضرورت نہیں ہے، لیکن اُن کی یہ خواہش اُن کی عالی ظرفی، وسعت نظری، تلاشِ حق کی فکر اور مسائل دینیہ میں انتہائی ورع و احتیاط کی کھلی ہوئی دلیل ہے۔ شاید عام طور سے لوگوں کو نہ معلوم ہوگا کہ دارالمصنفین میں جب سیرۃ النبی ﷺ کی کوئی جلد چھپتی تھی، تو پہلا ایڈیشن بڑی تقطیع پر چھپتا تھا اور اس کے دو ڈھائی سال کے بعد چھوٹی تقطیع والا اڈیشن چھپتا تھا۔ یہ تاخیر صرف سید صاحب کی احتیاط کی وجہ سے ہوتی تھی، وہ چاہتے تھے کہ پہلا ایڈیشن اصحابِ علم اور اہل نظر کی نگاہوں سے گذر جائے، اُن کی تنقید کا حال معلوم ہو جائے، تب دوسرا ایڈیشن چھاپا جائے تاکہ اس نئے ایڈیشن میں تصحیح وغیرہ کا موقع مل جائے۔ اللہ تعالیٰ عام مصنفین کو اسی فضل و کمال اور رسوخِ علم کے ساتھ یہی احتیاط نصیب فرمائیں۔ (آمین)

صُحبتے با اہلِ حق .... مرتبہ : مولانا عبدالقیوم حقانی

شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحقؒ کے اُن ارشادات وملفوظات کا مجموعہ، جن میں عصر حاضر کے ذوق اور مزاج کے مطابق زندگی کی اصلاح کا پیغام، ایمان ویقین کی احسانی کیفیت پیدا کرنے کا وافر سامان اور حکایات و تمثیلات کے پیرائے میں تصوفِ اسلامی کا عطر اور علوم و معارف کا لب لباب آ گیا ہے۔ مضبوط ڈائی دار جلد، عمدہ طباعت، اور شاندار کاغذ۔

صفحات : 408 ....

القاسم اکیڈمی، جامعہ ابوہریرہ، برانچ پوسٹ آفس خالق آباد ضلع نوشہرہ، سرحد، پاکستان

Marfat.com

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

تصانیف کے تراجم

مولانا سید سلیمان ندویؒ ہشت پہل شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ادیب و انشاء پرداز، شاعر و خطیب، مورخ و مفکر، محقق و نقاد اور سب سے بڑھ کر سیرت نگار رسول اعظم ﷺ تھے۔ ان کی تربیت علامہ شبلی نعمانی کے دامنِ شفقت میں ہوئی تھی، انہوں نے علامہ شبلی کے بعض نامکمل کاموں کو پایۂ تکمیل تک پہنچا کر بجا طور پر ان کے شاگردِ رشید اور جانشین ہونے کا استحقاق ثابت کر دیا اور تادم آخر وہ علامہ شبلیؒ کے وضع کردہ خطوط پر ہی گامزن رہے۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اردو زبان و ادب میں گراں بہا تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے، اس کا کامل حق ادا کرنے کی کوشش کرتے۔ اسی کاملیت و جامعیت کی وجہ سے ان کی تمام کتابیں، بلکہ تمام تحریریں نہایت مقبول ہوئیں۔ بعض کتابیں تو غالباً سو سے زیادہ بار طبع ہوئیں، بعض کتابوں کے ترجمے دنیا کی دوسری زبانوں میں ہوئے، جس سے حکمت سلیمانی کا سکہ اردو کے علاوہ دوسری زبانوں میں بھی چلا۔ زیرِ نظر مقالہ میں ہم نے کوشش کی ہے کہ علامہ ندویؒ کی کتابوں کے تراجم کا ایک اجمالی مگر بڑی حد تک جامع تعارف پیش کیا جائے۔

۱۔ سیرۃ النبی ﷺ (جلد سوم):

علامہ شبلیؒ نے اس دنیا سے رخصت ہوتے وقت سیرت النبیؐ کے باقی ماندہ منصوبہ و خاکہ کی تکمیل کی اہم ذمہ داری سید صاحبؒ کے سپرد کی۔ چنانچہ سید صاحب نے اولاً علامہ شبلیؒ کے مسودہ سیرت کو دو جلدوں میں علی الترتیب ۱۹۱۸ء ...... ۱۹۲۰ء میں شائع

Marfat.com

کیا اور خود سیرۃ النبیؐ کی تیسری جلد لکھی، جو ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی۔ اس جلد کا موضوع معجزات ہے، جس میں معجزہ کی حقیقت ونوعیت بیان کرنے کے ساتھ اس کے ہر پہلو اور ہر گوشہ پر نہایت عالمانہ اور محققانہ بحث کی گئی ہے۔ اس موضوع پر اتنی جامع اور بلند پایہ کتاب اب تک اردو میں نہیں لکھی گئی۔ سیرت کی یہ جلد بھی دوسری جلدوں کی طرح بہت مقبول ہوئی۔ اب اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ پشتو زبان میں اس کا ترجمہ جناب عزیز الرحمٰن سیفی نے کیا، جو پشتو ٹولنہ کابل سے ۱۳۴۰ھ میں شائع ہوا۔ ترکی زبان میں بھی اس کا ترجمہ ہوا، مگر وہ دستیاب نہ ہوسکا۔

۲۔ سیرۃ النبی ﷺ (جلد چہارم):

سیرت نبوی ﷺ کی اس جلد کا موضوع منصب نبوت ہے، جس میں منصب نبوت کی تشریح، قبل اسلام عرب کے اخلاقی حالات، تبلیغ نبوی کے اُصول، رسول اکرم ﷺ کا پیغمبرانہ عمل اور اسلام اور اس کے عقائد پر مفصل اور حکیمانہ مباحث ہیں۔ جلد ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی اور اس وقت سے اب تک مسلسل شائع ہو رہی ہے۔ پشتو زبان میں اس کا ترجمہ بھی جناب عزیز الرحمٰن سیفی ہی نے کیا، جو ۱۳۲۳ھ میں پشتو ٹولنہ کابل ہی سے شائع ہوا۔

سیرۃ النبی کی اس جلد کو ترکی لباس بھی عطا کیا گیا۔ یہ کارنامہ شبلیؒ وسلیمانؒ کی کتابوں کے شیدائی جناب محمد عمر رضا نے انجام دیا، جسے آمدی مطبع سی، استنبول ترکی، نے ۱۹۲۸ء میں شائع کیا۔ یہ مطبوعہ نسخہ کتب خانہ دارالمصنفین میں موجود ہے۔

۳۔ سیرۃ النبی ﷺ (جلد پنجم):

سیرۃ النبی ﷺ کی اس جلد کا موضوع عبادات ہے، جس میں عبادات کی حقیقت اور ان کے اقسام کے ذکر کے بعد فرائض خمسہ اور جہاد پر علیحدہ علیحدہ سیر حاصل بحث وتحقیق کی گئی ہے۔ اس جلد کو بھی جناب عزیز الرحمٰن سیفی نے پشتو زبان میں منتقل کیا اور

Marfat.com

وہ ۱۳۴۶ھ میں پشتو ٹولنہ کابل ہی سے شائع ہوا۔

۴۔ سیرۃ النبی ﷺ (جلد ششم) :

یہ جلد اخلاقی تعلیمات پر مشتمل ہے۔ اس میں اسلام میں اخلاق کی اہمیت اور پھر اسلامی و اخلاقی تعلیمات اور فضائل و رذائل اور اسلامی آداب کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور معلم اخلاق کی حیثیت سے آنحضرت ﷺ کے علوئے مرتبت کا بڑا دلنشیں بیان ہے۔ جناب عزیز الرحمٰن سیفی نے اسے بھی پشتو جامہ پہنایا جو پشتو ٹولنہ کابل ہی سے ۱۳۴۹ھ میں شائع ہوا۔ سیرۃ النبی ﷺ کے پشتو ترجمہ کے تمام مطبوعہ نسخے کتب خانہ دارالمصنفین میں موجود ہیں۔

۵۔ ارض القرآن :

یہ سید صاحب کی پہلی معرکہ آراء تصنیف ہے، جو قیام دارالمصنفین کے فوراً بعد شائع ہوئی۔ اس موضوع پر اردو بلکہ دیگر علمی زبانوں میں بھی کوئی کتاب نہیں تھی۔ خود سید صاحب نے لکھا ہے کہ تیرہ سو برس میں مخصوص اس فن پر ایک کتاب بھی نہیں لکھی گئی۔

(مولانا سید سلیمان ندویؒ، ارض القرآن جلد اول ص ۴، دارالمصنفین ایڈیشن ۱۹۵۵ء)

سید صاحبؒ جب دفتر سیرۃ النبی ﷺ میں علامہ شبلیؒ کے معاون تھے، اسی زمانہ میں انہوں نے جغرافیہ و مقامات قرآنی کے مطالعہ میں یہ سارا مواد جمع کیا تھا، جو بقول ان ہی کے سیرۃ النبی ﷺ کا مقدمہ ہے۔ (ایضاً ص ۲)

قرآن مجید میں عبرت و نصیحت کے لئے عرب کے قدیم اقوام و قبائل اور مقامات کا ذکر کیا گیا ہے۔ ارض القرآن میں ان کی تاریخی، جغرافیائی اور اثری تحقیق کی گئی ہے، ایک مقصد یہ بھی تھا کہ قرآن مجید کے بیانات اور جدید تاریخی و جغرافیائی تحقیقات و اکتشافات میں مطابقت پیدا ہو جائے اور مؤرخینِ یورپ نے جو غلطیاں کی ہیں، ان کو بھی واضح کر دیا جائے۔

Marfat.com

دو جلدوں پر مشتمل یہ تصنیف ۱۹۱۶ء ...... ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئی اور اہل علم میں بہت مقبول ہوئی۔ مشہور روسی عالم علامہ جار اللہ ہندوستان آئے، تو فرمایا کہ مجھ کو دارالمصنفین کی اہم علمی خدمت کا اندازہ اسی کتاب کی اشاعت سے ہوا تھا۔ اب تک اس کے کئی ایڈیشن ملک و بیرونِ ملک سے طبع ہو چکے ہیں۔ ۱۹۳۶ء میں پروفیسر سید مظفر الدین ندوی نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا، جو شائع ہو چکا ہے۔

(سید صباح الدین عبدالرحمٰن معارف سلیمان نمبر ص ۱۳، دارالمصنفین ۱۹۵۵ء)
لیکن مزید تفصیلات دستیاب نہ ہو سکیں۔

۶۔ حیاتِ امام مالکؒ :

امامِ مالکؒ کی ذات سے سید صاحبؒ کو بڑی عقیدت تھی، جس کے نتیجے میں انہوں نے ۱۹۰۷ء میں ماہنامہ الندوہ میں ان کے حالات اور علمی کمالات پر ایک سلسلۂ مضامین شروع کیا۔ دس سال بعد ۱۹۱۷ء میں اس کو مزید اضافوں کے ساتھ کتابی صورت میں شائع کیا۔ اس کتاب میں امامِ مالکؒ کی ولادت سے وفات تک کے تمام حالات اور کارناموں کو جامعیت کے ساتھ قلمبند کیا گیا ہے۔ یہ کتاب بھی بہت مقبول ہوئی۔ اس کا ترجمہ جنوبی ہندوستان کی علاقائی زبان تیلگو میں ہوا۔ (تعارف دارالمصنفین ص ۳ (س،ن) لیکن اس کے متعلق مزید کوئی تفصیل دستیاب نہیں۔

۷۔ سیرتِ عائشہؓ :

سید صاحبؒ کی یہ بلند پایہ تصنیف ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی۔ اس کی ابتداء انہوں نے زمانہ طالب علمی میں کی تھی۔ علامہ شبلیؒ نے اس کی تکمیل پر بہت زور دیا تھا، مگر یہ ان کی وفات کے بعد مکمل ہو کر شائع ہوئی۔ اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کی اردو زبان میں یہ سب سے زیادہ جامع سوانح عمری ہے۔ حضرت عائشہؓ کی زندگی ہر خاتون کے لئے آئینہ خانہ ہے، جس میں وہ ایک حقیقی مسلمان عورت کی تصویر دیکھ سکتی ہے۔ یہ معرکہ آراء کتاب

Marfat.com

بھی عوام وخواص اور خاص طور سے خواتین میں بہت مقبول ہوئی۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے ایک خط میں سید صاحبؒ کو لکھا کہ :

''سیرتِ عائشہؓ کے لئے سراپا سپاس ہوں، یہ ہدیہ سلیمانی نہیں، سرمہ سلیمانی ہے، اس کتاب کو پڑھنے سے میرے علم میں بہت مفید اضافہ ہوا''۔

(مشاہیر کے خطوط ص ۱۱۲، مطبوعہ دارالمصنفین)

سیرتِ عائشہؓ کا کئی علمی زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ یہاں ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ سیرت عائشہؓ کا ترجمہ سب سے پہلے ترکی زبان میں ''عصر سعادت'' کے نام سے محمد عمر رضا نے کیا، جو کون طوغندی مطبعہ سی، استنبول ترکی سے ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا۔

۲۔ ملیالم زبان میں بھی ترجمہ ہوا، جو ایم پی عبدالرحمٰن کرکل کے قلم سے ہے۔ اسے ہادی پبلکیشن منجیری کیرالا نے پربودھانم پریس کالی میں طبع کرا کر ۱۹۷۶ء میں شائع کیا۔ ترکی اور ملیالم زبانوں کے ترجمے دارالمصنفین کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔

۳۔ انگریزی میں سیرتِ عائشہؓ کے تین ترجمے ہوئے۔ پہلا ترجمہ جناب محی الدین نے کیا، جسے اکیڈمی آف ریسرچ اینڈ پبلکیشن نے ۱۹۷۷ء میں شائع کیا۔

۴۔ دوسرا انگریزی ترجمہ جناب سید اطہر علی نے کیا، جو اسلامک بک پبلکیشن کویت سے ۱۹۸۲ء میں طبع ہوا۔

۵۔ جناب سعید الحق دسنوی نیوز ایڈیٹر ریڈیو پاکستان نے بھی سیرتِ عائشہؓ کو انگریزی قالب عطا کیا، جو ۱۹۶۰ء میں ریڈیو پاکستان ڈھاکہ سے شائع ہوا۔

۸۔ بہادر خواتینِ اسلام :

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے ۱۹۰۸ء میں ماہنامہ الندوہ میں مسلمان عورتوں کی بہادری کے عنوان سے ایک سلسلہ مضامین شروع کیا تھا۔ یہ کتاب اسی کا مجموعہ ہے۔ اسمیں خواتینِ اسلام کی دلیری، بہادری، ہمت و جرأت اور شجاعت کے واقعات کو نہایت مؤثر

Marfat.com

انداز میں قلمبند کیا گیا ہے۔

یہ کتابچہ دارالمصنفین کے ابتدائی دور میں شائع ہوا۔ اب تک اس کے کئی ایڈیشن طبع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ دارالمصنفین کے سابق ناظم جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم نے انگریزی میں اس کا ترجمہ HEROIL DEEDS OF MUSLIM WOMEN کے نام سے کیا، جو پہلے اسلامک ریویو لندن میں شائع ہوا، پھر ۱۹۶۱ء میں شیخ محمد اشرف تاجر کتب اسلامیہ لاہور نے کتابی صورت میں شائع کیا۔ اس انگریزی ترجمہ کے اب تک دسیوں ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ اس کا مطبوعہ نسخہ کتب خانہ دارالمصنفین میں موجود ہے۔

۹۔ رسالہ اہل سنت والجماعت :

۱۹۱۷ء میں سید صاحب نے اہل سنت والجماعت کے عنوان سے ماہنامہ معارف میں ایک سلسلہ مضامین شروع کیا، پھر یہ رسالہ کی صورت میں چھپا۔ اس میں اسلام کے مذہبی فرقوں پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے ان کے عقائد و آراء پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے اور دکھایا گیا ہے کہ ہر دور میں راسخ العقیدہ مسلمانوں کا فرقہ اہل سنت والجماعت رہا ہے۔

خالص کلامی مباحث پر مشتمل یہ کتاب بھی بہت مقبول ہوئی۔ اب تک اس کے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم نے لکھا ہے کہ اس کا ترجمہ ملیالم، تیلگو اور بنگلہ میں بھی ہوا۔ (معارف سلیمان نمبر ص ۱۳)

مالاباری (ملیالم) ترجمہ کتب خانہ دارالمصنفین میں موجود ہے، جو محمد عبدالقادر کے قلم سے ہے اور جسے اسلامیہ پبلشنگ ہاؤس وکم ٹراونکور نے مطبع انوار الاسلام سے طبع کرا کر ۱۹۳۲ء میں شائع کیا۔

۱۰۔ خطباتِ مدراس :

یہ سید صاحب کے ان آٹھ بے مثل خطبات کا مجموعہ ہے، جو انہوں نے اکتوبر،

Marfat.com

نومبر ۱۹۲۵ء میں مسلم ایجوکیشنل ایسوسی ایشن آف سودرن انڈیا کی فرمائش پر اسلام اور پیغمبر اسلام کے متعلق انگریزی اسکول کے طالب علموں اور عام مسلمانوں کے سامنے لالی ہال مدراس میں دیئے تھے۔ دارالمصنفین نے ۱۹۲۶ء میں ان کو کتابی صورت میں شائع کیا۔ یہ خطبات دراصل سیرت مبارکہ کا انتہائی جامع خلاصہ اور مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کے الفاظ میں سیرت نبوی کا جوہر اور عطر ہیں۔

(حیات سلیمان ص ۲۸۹، دارالمصنفین ایڈیشن ۱۹۸۰ء)

یہ کتاب بھی سید صاحب کی مقبول ترین کتابوں میں ہے، جس کے پچاس ایڈیشن طبع ہو چکے ہیں، جس زمانہ میں یہ خطبات پیش کئے گئے تھے، اسی وقت مدراس کے انگریزی اخباروں نے اس کے خلاصے اور اقتباسات شائع کئے تھے۔ خاص طور سے ''ہندو'' اور ڈیلی ایکسپریس مدراس نے ہفتہ واران کو شائع کیا، بعد میں اس کا مستقل عربی و انگریزی ترجمہ ہوا۔

۱۔ جناب مولانا محمد ناظم ندوی مدیر جامعہ عباسیہ بہاول پور نے اسے عربی کا جامہ پہنایا، جو الرسالۃ المحمدیہ کے نام سے اولاً ۱۳۷۳ھ (۵۴۔۱۹۵۳ء) میں قاہرہ سے شائع ہوا، تقریباً تیس سال بعد ۱۴۰۲ھ، ۱۹۸۲ء میں اسی ترجمہ کو دارالمصنفین اعظم گڑھ نے نہایت اہتمام سے شائع کیا۔

خطباتِ مدراس کا یہ عربی ترجمہ جناب عبدالحمید خطیب سابق سفیر حجاز بہ پاکستان اور عمر بہا الامیری سابق سفیر شام بہ پاکستان کی کوششوں سے غالباً پاکستان میں بھی شائع ہوا۔ (غلام محمد، تذکرہ سلیمان ص ۸۴/مجلس علمی کراچی ۱۹۶۰ء)

۲۔ جناب سعید الحق دسنوی نے خطبات مدراس کا انگریزی ترجمہ **LIVING PROPHET** کے نام سے کیا۔ (معارف سلیمان نمبر ص ۱۹) اس کے ناشر کا نام معلوم نہ ہو سکا۔

Marfat.com

۱۱۔عرب و ہند کے تعلقات :

یہ کتاب بھی سید صاحب کے خطبات پر مشتمل ہے، جو انہوں نے ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کی فرمائش پر ۲۲۔۲۳؍ مارچ ۱۹۲۹ء میں دیئے تھے، اکیڈمی نے ۱۹۳۰ء میں اس مجموعہ خطبات کو شائع کیا اور انعام سے بھی نواز۔ اس میں سید صاحب نے عرب و ہند کے قدیم تجارتی، علمی اور مذہبی تعلقات کی تاریخ بڑی تفصیل سے بیان کی ہے۔ اس کتاب نے بھی قبول عام حاصل کیا۔ موضوع کی انفرادیت اور افادیت کے پیش نظر اس کے کئی ترجمے ہوئے۔

۱۔ انگریزی ترجمہ جناب سعید الحق دسنوی نے کیا جو ۳۳-۱۹۳۲ء میں اسلامک کلچر حیدر آباد میں قسط وار شائع ہوا، بعد میں حکومت پاکستان نے اسے کتابی صورت میں شائع کیا۔

۲۔ دوسرا انگریزی ترجمہ INDO ARAB RELATION کے نام سے پروفیسر محمد صلاح الدین استاذ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد نے کیا، جسے انسٹی ٹیوٹ آف انڈو میڈلسٹ کلچرل اسٹڈیز حیدر آباد نے ۱۹۶۲ء میں شائع کیا۔

۱۲۔خیام :

اصلاً یہ سید صاحب کا وہ مقالہ ہے، جو انہوں نے دسمبر ۱۹۳۰ء میں آل انڈیا اورینٹیل کانفرنس پٹنہ میں پیش کیا تھا۔ اکتوبر ۱۹۳۳ء میں متعدد اضافوں کے ساتھ دارالمصنفین نے اسے شائع کیا۔ اس میں مشہور حکیم صوفی اور فلسفی شاعر عمر خیام کے حالات اور کارناموں کا نہایت محققانہ جائزہ پیش کیا گیا ہے اور عمر خیام کے متعلق جو غلط فہمیاں عرصہ سے چلی آرہی تھیں، ان کی اصل حقیقت واضح کی گئی۔

سید صاحب کی یہ مایہ ناز تحقیقی کاوش بہت مقبول ہوئی۔ علامہ اقبال نے لکھا عمر

Marfat.com

خیام پر آپ نے جو کچھ لکھدیا، اس پر اب کوئی مشرقی یا مغربی عالم اضافہ نہ کر سکے گا۔

(اقبال نامہ ص ۱۷۸-۱۷۹)

واقعہ بھی یہی ہے کہ سید صاحبؒ کی دیدہ ریزی، دقت نظری، وسعت مطالعہ اور غیر معمولی تلاش و تحقیق نے اس کتاب کو شاہکار بنا دیا، جس کی داد ہندوستان، ایران، افغانستان اور یورپ کے اربابِ علم و کمال نے بھی دی۔ فردوس کی ہزار سالہ برسی کے موقع پر افغانستان نے ایران کو جو تحائف بھیجے تھے، ان میں کتاب خیام بھی شامل تھی۔

(معارف سلیمان نمبر ص ۲۶)

خود سید صاحب لکھتے ہیں :

"خاکسار کی کتاب خیام کی قدر یورپ کے مستشرقین اور ایران کے ادیبوں دونوں نے کی اور فرمائش کی گئی کہ اس کا فارسی ترجمہ شائع کیا جائے ...... تصحیح و اضافہ کے بعد اب یہ نسخہ کابل بھیجا جا رہا ہے۔ اُمید ہے کہ جلد اس کا ترجمہ بلخ اور شاپور تک پہنچ جائیگا، جن کو صاحبِ سوانح اپنے قافلہ عمر کا گذرگاہ سمجھتا تھا"۔ (شذرات معارف جنوری ۱۹۳۷ء)

مولانا شاہ معین الدین احمد ندویؒ نے لکھا ہے کہ یہ ترجمہ عرصہ ہوا شائع ہو چکا ہے۔ (حیاتِ سلیمان حاشیہ ص ۴۴۲) مگر راقم الحروف یہ معلوم کرنے میں ناکام رہا کہ یہ ترجمہ کس نے کیا اور وہ کب اور کہاں سے شائع ہوا۔

۱۳۔ عربوں کی جہاز رانی :

یہ کتاب سید صاحب کے ان تاریخی خطبات کا مجموعہ ہے، جو انہوں نے حکومت بمبئی کے محکمہ تعلیمات کی فرمائش پر انجمن اسلام بمبئی میں ۱۸ تا ۲۱، مارچ ۱۹۳۰ء میں دیئے تھے۔ ان خطبات کو اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی نے ۱۹۳۵ء میں کتابی صورت میں شائع کیا۔

اس میں عربوں کی جہاز رانی کی ابتداء و ارتقاء ان کی بحری ایجادات، اختراعات،

Marfat.com

تصنیفات اور بحری خدمات کی مکمل تاریخ نہایت تدقیق اور دیدہ ریزی سے قلمبند کی گئی ہے۔ اپنے موضوع پر منفرد کاوش ہونے کی وجہ سے یہ کتاب بھی بہت مقبول ہوئی۔ جب یہ خطبات دیئے گئے تھے، اسی زمانہ میں بعض اخبارات نے پوری کتاب بالاقساط شائع کی۔ مشہور محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب نے لکھا ہے کہ "یہ ان خوش نصیب کتابوں میں ایک ہے، جسے متخصصین اور عوام دونوں نے پسند کیا۔ (عربوں کی جہاز رانی ص ۲۰۳، مطبوعہ بمبئی)

اسے انگریزی میں جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم نے منتقل کیا، جو ARAB NAVIGATION کے نام سے پہلے اکتوبر ۱۹۴۱ء میں اور اپریل واکتوبر ۱۹۴۲ء میں اسلامک کلچر حیدر آباد میں شائع ہوا، پھر شیخ محمد اشرف لاہور نے ۱۹۶۱ء میں کتابی صورت میں شائع کیا۔ دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا۔ اب تک اس ترجمہ کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

۱۴۔ رحمتِ عالم :

سیرت نبویؐ پر یہ مختصر کتاب طالب علموں اور عام پڑھے لکھے مسلمانوں کے لئے سید صاحبؒ نے ۱۹۴۰ء میں اپنے بعض احباب کی فرمائش پر لکھی تھی۔ اس میں آنحضرت ﷺ کی ولادت باسعادت سے وفات تک حالات نہایت دلنشین اور آسان زبان میں لکھے گئے ہیں۔ اب تک اس کے سیکڑوں ایڈیشن دارالمصنفین اور دوسرے اداروں سے شائع ہو چکے ہیں۔ ہندوستان و پاکستان کے اکثر مدارس کے نصابِ تعلیم میں بھی داخل ہے۔

رحمتِ عالم کا ترجمہ ہندی اور گجراتی زبانوں میں ہوا۔ ہندی ترجمہ خود سید صاحبؒ نے کرایا تھا، مگر وہ راقم کو دستیاب نہ ہو سکا اور یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اس کا ترجمہ کس نے کیا تھا۔ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے لکھا ہے کہ ہندی اور ہندوستان کی مختلف زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا۔ (حیات سلیمان ص ۴۸۵)

ہندی کے علاوہ راقم کو گجراتی ترجمہ کا علم ہو سکا، جس کا مطبوعہ نسخہ کتب خانہ

Marfat.com

دارالمصنفین میں موجود ہے۔ گجراتی ترجمہ ایک ہندو خاتون ون مالا بہن بنت زہری کی محنت ولگن اور شوق کا نتیجہ ہے۔ اسے گجراتی ورنیکلر سوسائٹی احمد آباد نے ۱۹۴۵ء میں شائع کیا۔ اس ترجمہ پر سید صاحب اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے ایک خط میں مولانا سید ابوظفر ندوی کو لکھتے ہیں :

"مجھے یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی کہ میری کتاب رحمتِ عالم کا ترجمہ گجراتی زبان میں ہو رہا ہے۔ یہ خوشی اس لئے بھی اور زیادہ ہے کہ یہ کام ایک ہندو دوست نے خود اپنی خوشی سے انجام دیا۔ اس خوشی میں مزید اضافہ یہ جان کر ہوا کہ ہندو دوست ایک نیک بخت خاتون ون مالا بہن بنت زہری صاحب ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ گجراتی پڑھنے والے ہندو اور مسلمان دونوں میں اس ترجمہ کو مقبولیت حاصل ہوگی۔ (گجراتی ترجمہ کے ساتھ یہ خط بھی شائع ہوا ہے)

۱۵۔ ہندوؤں کی تعلیم مسلمانوں کے عہد میں :

مذکورہ عنوان سے سید صاحبؒ نے آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس منعقدہ کلکتہ میں ایک مقالہ پیش کیا تھا۔ بعض اہم اضافوں کے ساتھ یہ ۱۹۱۸ء میں مسلسل ایک سال تک معارف میں شائع ہوتا رہا۔ سید صاحبؒ کو اپنی زندگی کے آخری ایام میں اس کو کتابی صورت میں شائع کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ انہوں نے اسے ایجوکیشنل کانفرنس کو اس کی امانت سمجھ کر اس کا مسودہ انہیں طباعت کے لئے دیا، جسے کانفرنس نے اگست ۱۹۵۴ء میں کتابی صورت میں شائع کیا۔

اس کتاب میں سید صاحبؒ نے بدلائل ثابت کیا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے عہد میں ہندوؤں نے کس طرح علمی و تعلیمی ترقی کی اور اس ترقی میں مسلمانوں کا کس قدر حصہ ہے۔

اپنے موضوع پر یہ پہلی اور منفرد تحریر تھی، جو سید صاحبؒ کے قلم سے نکلی اور ہاتھوں

Marfat.com

ہاتھ لے لی گئی۔اس کے بھی اب تک کئی ایڈیشن طبع ہو چکے ہیں۔اسے بھی جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم نے انگریزی قالب دیا، جو اکتوبر ۱۹۳۸ء اور اکتوبر ۱۹۳۹ء میں اسلامک کلچر حیدر آباد میں شائع ہوا۔ بنگالی زبان میں اس کا ترجمہ جناب غلام محی الدین صاحب نے کیا، جو اخبار ''آج'' میں بالاقساط شائع ہوا۔

مقالات :

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے مختلف موضوعات پر سیکڑوں علمی، ادبی، تاریخی، مذہبی، تعلیمی اور سوانحی مقالات لکھے، جو بے حد مقبول ہوئے۔بعض تاریخی مقالات تو آج بھی اپنے موضوع پر حرفِ آخر کی حیثیت رکھتے ہیں۔مثلاً تاج محل اور لال قلعہ کے معمار اور لاہور کا ایک فلکی آلات ساز خاندان وغیرہ۔

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی اور جناب سید صباح الدینؒ عبدالرحمٰن مرحوم نے ان کے متعدد علمی و تاریخی مقالات کو تین جلدوں میں مرتب کر کے دارالمصنفین سے شائع کر دیا ہے۔سید صاحب کے بعض مقالات کا بھی انگریزی و عربی میں ترجمہ ہوا، خاص طور سے صباح الدین صاحب نے ان کی تصانیف ہی کی طرح ان کے مقالات کو بھی انگریزی میں منتقل کیا، جن مقالات کے ترجموں کا علم ہو سکا، ان کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

ا۔ واقدی :

۱۹۲۵ء میں ایک عیسائی اہل قلم نے مانچسٹر گارجین (لندن) میں ایک مضمون لکھا، جس میں حسبِ عادت آنحضرت ﷺ سے متعلق بعض گستاخیاں کیں۔خواجہ کمال الدین مرحوم اس وقت ووکنگ میں تھے، انہوں نے مضمون نگار سے اس کی معلومات کا مآخذ دریافت کیا، تو اس نے مارگولیتھ کی کتاب کا حوالہ دیا۔تب مارگولیتھ سے رجوع کیا گیا تو انہوں نے کتاب المغازی کے جرمن ترجمہ کا حوالہ دیا۔تب واقدی کے معتبر و غیر معتبر کی بحث کا آغاز ہوا، خواجہ صاحب نے اس سلسلہ میں سید صاحبؒ سے رجوع کیا، چنانچہ سید

Marfat.com

صاحبؒ نے جنوری ۱۹۲۶ء میں معارف میں ایک مضمون لکھا، جس میں انہوں نے ثابت کیا کہ اگر چہ بعض علماء ومحدثین واقدی کو معتبر گردانتے ہیں، تاہم وہ ائمہ اور اصحابِ فن کے نزدیک نا قابل اعتبار ہے۔

اس مضمون سے متاثر ہوکر پروفیسر گولیم نے ان اُصولوں سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی، جن کی بنیاد پر کسی مصنف یا راوی کے متعلق فیصلہ رد وقبول کیا جاتا ہے، چنانچہ اس سلسلہ میں سید صاحب نے جنوری ۱۹۲۷ء میں پھر ''واقدی'' کے عنوان سے ایک مضمون سپرد قلم کیا، جس میں پروفیسر گولیم کے سوالات کے مفصل جوابات دیئے۔ سید صاحبؒ کے ان مضامین کا انگریزی ترجمہ اسلامک ریویو ووکنگ لندن میں شائع ہوا، مگر مترجم کا نام معلوم نہ ہوسکا۔ ان مضامین کا ایک صاحب نے جن کا نام معلوم نہ ہوسکا، حجاز میں عربی ترجمہ کیا۔ (سید صباح الدین عبدالرحمٰن، معارف سلیمان نمبر ص ۲۰)

۲۔ کیا مسلمان ارسطو کی گاڑی کے قلی تھے :

۱۹۲۷ء میں ایک انگریز مضمون نگار نے لکھا کہ مسلمان ارسطو کی گاڑی کے قلی تھے۔ چنانچہ اس کے جواب میں سید صاحبؒ نے ایک فاضلانہ مضمون سپردِ قلم کیا، جس میں انگریز مضمون نگار کے خیال کی مکمل تردید کی۔ اس مضمون کا انگریزی ترجمہ اسلامک کلچر حیدر آباد میں شائع ہوا۔ (ایضاً)

۳۔ لاہور کا ایک فلکی آلات ساز خاندان :

اس میں اصطرلاب اور اس کے ہندوستانی صناعوں کی تفصیلات ہیں۔ یہ دراصل جرمن فاضل ڈاکٹر فان کلیوبر کے ایک استفسار کے جواب میں سید صاحب نے لکھا تھا۔ برلن کے عجائب خانہ میں ہندوستانی اصطرلابی ضیاء الدین محمد کا بنایا ہوا ایک کمرہ تھا، جس پر اس کا نام، تاریخ اور مقام کندہ تھا، مگر اس کے علاوہ اس کا کچھ حال معلوم نہ تھا، چنانچہ ڈاکٹر فان کلیوبر نے اس سلسلہ میں سید صاحبؒ سے رجوع کیا اور ضیاء الدین محمد کے وطن، عہد اور اس کے فن وشہرت کے متعلق سوالات پوچھے۔ سید صاحبؒ نے اس کے جواب میں یہ گرانمایہ تحقیقی مقالہ سپرد قلم کیا، جو اگست ۱۹۳۲ء کے معارف میں شائع ہوا۔

Marfat.com

اس شاندار مقالہ کا جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم نے انگریزی میں ترجمہ کیا، جو اکتوبر ۱۹۳۵ء میں اسلامک کلچر حیدرآباد میں شائع ہوا۔

۴۔ تاج محل اور لال قلعہ کے معمار:

بعض مغربی مورخین نے یہ افسانہ مشہور کر رکھا تھا کہ تاج محل کا معمار ایک اطالوی ماہر فن تعمیر تھا۔ اس مقالہ میں سید صاحب نے نہایت تلاش و تفحص و تدقیق کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ تاج محل اور لال قلعہ کا معمار حقیقی استاذ احمد لاہوری تھا۔ اس میں استاذ احمد لاہوری کے خاندان اور اس کے ڈیڑھ سو برس کے کارناموں کی سرگذشت بھی سید صاحبؒ نے پیش کر دی ہے۔ اس سے ان تمام بے بنیاد نظریات کا جو تاج محل کے معماروں کے متعلق مشہور کئے گئے تھے، ازالہ ہو گیا۔

جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم نے اس کو بھی انگریزی میں منتقل کیا، جو جرنل آف دی بہار ریسرچ سوسائٹی جلد ۳۴ حصہ اول و دوم میں ۱۹۴۵ء میں شائع ہوا۔

اس مختصر سے جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ نگارشات سلیمانی کا افادہ صرف اردو داں طبقہ تک محدود نہیں رہا، دوسری زبانوں نے بھی اس سرچشمہ علم و فضل سے اپنی تشنگی بجھائی، آج پہلے سے زیادہ ضرورت ہے کہ سید صاحبؒ کی گراں قدر تحریروں کی روشنی دنیائے علم میں پھیلے اور ہر زندہ زبان ان کی تحقیق، نظریات، اور خیالات سے اکتساب نور کرے۔

تحفۂ فکر و عمل

ترتیب: مولانا عبدالقیوم حقانی

الحاج محمد منصور الزمان صدیقی کے وقیع فکر انگیز مکاتیب کا مجموعہ، جن میں فکر و عمل، تعلیم و تربیت، نظم و ضبط، حزم و احتیاط، خدمت خلق، قومی، ملکی اور ملی امور میں منہج نبوی ﷺ اور صحیح خطوط پر کام کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔

القاسم اکیڈمی جامعہ ابوہریرہؓ برانچ پوسٹ آفس خالق آباد ضلع نوشہرہ سرحد پاکستان

Marfat.com

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

ایک عظیم انشا پرداز

سیرۃ النبیؐ علامہ سید سلیمان ندویؒ کا شاہکار ہے اور ان کا اصل کارنامہ اس کی تیسری جلد سے ظاہر ہوتا ہے۔

سیرۃ النبی جلد سوم :

سیرۃ النبیؐ کی تیسری جلد، سید صاحبؒ کی اپنی تصنیف ہے گو اس کے ۸۶۸ صفحوں میں ۸۳ صفحے مولانا عبدالباری ندوی کے لکھے ہوئے ہیں۔ اس کا موضوع معجزات ہے۔ اس میں معجزات کے امکانات، تاثیرات فلکیہ، علل خفیہ، قوت کمالیہ، قوت نفسیہ، تاثیرات نفسانیہ، مکالمۂ الٰہی، وحی، نزول ملائکہ، عالم رویا، مشاہدات و مسموعات، اسراء یا معراج، معراج کے اسرار، اعلانات و انعامات، شق القمر اور شق صدر وغیرہ جیسے غوامض پر مباحث ہیں۔ ان میں کبھی اشاعرہ اور کبھی معتزلہ کے نقطۂ ہائے نظر پیش کیے گئے ہیں، کہیں ابن رشد، ابن تیمیہ، یعقوب کندی اور فارابی کی تصانیف کی ورق گردانی کی گئی ہے۔ ان تمام مباحث کی بنیاد، قرآن مجید اور احادیث پر رکھی گئی ہے۔

یہ موضوع آسان نہ تھا، خشک، مشکل اور سنگلاخ تھا، اس کے غامض مباحث میں اغلاق، اشکال اور ابہام کے پیدا ہونے کا خیال تھا، لیکن ان کو پیش کرنے میں سید صاحبؒ نے کچھ ایسا طاقت ور انداز بیان اختیار کیا کہ جو چیزیں معلوم تھیں، وہ از سر نو معلوم ہوتی نظر آئیں اور جو چیزیں معلوم نہیں تھیں، ان کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ خیال کے خارستان میں لالہ زار دکھائی دے رہا ہے اور ظنیات کے ریگستان میں ایک نئے قسم کا گلزار آباد ہو رہا ہے۔

Marfat.com

شکوک وشبہات کی تاریکی میں ایمان کی مہتابی پھیل رہی ہے۔ پوری کتاب ایک عاشق اسلام کے بے قرار دل، ایک دیدہ ور متکلم کے مستحکم دلائل اور ایک رمز شناس عالم کی گہری نگاہ کے ساتھ لکھی گئی ہے، جس میں قرآن مجید کی آیتوں کے ہیروں کی کانٹی بھی کی گئی ہے اور حدیث کے خزانہ سے زمرد اور یاقوت بھی بکھیرے گئے ہیں۔ اس کو پڑھتے وقت یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت تک سید صاحب کی علمی معرفت اور تحقیقی نظر اپنے اوج پر پہنچ رہی تھی، جس کو قلم بند کرنے میں ان کے قلم کی شگفتگی اور تحریر کی روانی ان کا پورا ساتھ دے رہی تھے، اور انہوں نے یہ ثابت کر دکھایا کہ لیلیٰ کے خطوط اور مجنوں کی ڈائری لکھنے یا پھول کو زیب چمن بنا کر اس کی شمیم انگیزی کرنے یا بوئے گل کو نسیم سحری سے پھیلانے یا حسینوں کی مشکیں زلفوں کو شامہ نوازی اور عنبریں بانہوں کی مرقع آرائی کرنے میں تو انشاپردازی کا جوہر دکھانا، بہت آسان ہے، لیکن موضوع کی سنگلاخی کے ساتھ، افکار ومباحث کا قصر شیریں تعمیر کر کے اس کے اندر سے زبان کی جوئے شیر بہانا بہت مشکل ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ کرتے وقت یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ اردو زبان کو ایسا پیرایہ بیان مل رہا تھا، جس سے اور دوسری ترقی یافتہ زبانوں کی طرح، اس میں بھی غوامض اور دقائق کو شگفتہ اور شستہ طرزِ ادا میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

اس کتاب کی تمہید ہی خاص انشاپردازانہ رنگ میں لکھی گئی، جس کے کچھ ٹکڑے یہ ہیں :

"جب روئے زمین پر گناہوں کی تاریکی اور بدیوں کی ظلمت محیط ہو جاتی ہے، تو صبح کا تڑکا ہوتا ہے اور آفتاب ہدایت نمودار ہوتا ہے۔ باغ عالم میں جب برائیوں کی خزاں چھا جاتی ہے تو موسم بدلتا ہے اور بہارِ نبوت رونق افروز ہوتی ہے"۔

کس طرح؟ اس کو متکلمانہ انداز میں اس طرح قلم بند کرتے ہیں :

"اور جس طرح زمین، آسمان، سورج، چاند، پھل اور پھول کے خاص خاص قوانینِ فطرت ہیں، جن میں عموماً تغیر نہیں ہوتا۔ اسی طرح دنیا کے رشد و

Marfat.com

ہدایت، عذاب ورحمت اور نبوت ورسالت کے خاص خاص اُصول وقواعد ہیں' جن میں تغیر، راہ نہیں پاتا، انبیاء ورسل اپنے اپنے وقت پر مبعوث ہوکر قوموں کو دعوت دیتے ہیں، قومیں ان کی تصدیق یا تکذیب کرتی ہیں، منکرین ہلاک اور مومنین کامیاب ہوجاتے ہیں، اس روحانی جہاد میں انبیاء ورسل سے ہمارے علم و دانش سے بالاتر، اعمال صادر ہوتے ہیں، اور ان کے عجیب خوارق، ظہور پذیر ہوتے ہیں''۔

پھر اللہ تعالیٰ کے سامنے بندوں کی بے چارگی، مجبوری، محکومی اور لاعلمی کی مرقع آرائی اس طرح کرتے ہیں کہ اس میں منطقیانہ دلائل بھی آجاتے ہیں اور تاریخی کوائف بھی۔

''لیکن جس طرح ہم کبھی یہ نہیں بتاسکتے کہ خاص خاص پھول، خاص خاص درخت، خاص خاص ستارے، فلاں فلاں معین اوقات ہی پر کیوں جلوہ نما ہوتے ہیں۔ پھول سرخ کیوں آتے ہیں؟ ستارے چمکتے کیوں ہیں؟ شہد میٹھا کیوں ہوتا ہے؟ چاند اور سورج چلتے کیوں ہیں؟ تخم، درخت، غذا، خون اور گوشت کیوں کر بن جاتا ہے، اسی طرح اس کا جواب بھی نہیں دے سکتے کہ پیغمبروں کا ظہور اپنے اپنے وقت پر کیوں کر ہوتا ہے؟ اور ان سے یہ مافوق العادۃ، افعال واعمال، بحکم الٰہی کیوں کر صادر ہوتے ہیں؟ ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ وہ، ہوتے ہیں، چنانچہ دنیا کا ہر پیغمبر بلکہ روحانیت کا ہر حامل اپنی پراسرار زندگی کے اندر اس قسم کے حالات وکیفیات کی ایک دنیا رکھتا ہے۔ عالم کی تاریخ آپ کے سامنے ہے، جس میں اگر قوموں کے روحانی محلوں کے حالات وسوانح غور سے پڑھیں، تو آپ کو ہر جگہ نظر آئے گا کہ وہ، وہ کچھ دیکھتے تھے، جو ہم نہیں دیکھ سکتے، وہ، وہ کچھ سنتے تھے، جو ہم نہیں سن سکتے، وہ، وہ کچھ جانتے تھے، جو ہم نہیں جان سکتے اور ان سے وہ اعمال بھی صادر ہوتے تھے جو کسی اور سے نہیں ہوسکتے، یہ وہ تاریخی واقعات ہیں، جن سے انکار کرنا

Marfat.com

اسی طرح ناممکن ہے، جس طرح سکندر اور نپولین کے فتوحات یا بدھ، موسیٰ اور عیسیٰ کے وجود سے"۔ (ص ۴-۱)

سید صاحبؒ نے معجزات کی بحث میں مادہ، یعنی ہیولی، حوادث بلا سبب مؤثر، تاثیرات فلکیہ، علل خفیہ، قوت کمالیہ، قوت نفسیہ اور تاثیرات نفسیہ وغیرہ جیسے فلسفیانہ مباحث کو جس طرح سلیس اور فصیح زبان میں سمجھایا ہے، وہ ان حکمائے اسلام ہی کی ادراک کی طرح ہے جو ان مباحث کے بڑے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ معراج کے ذکر کی جو دل نشیں تمہید ہے، اس کے پڑھنے سے معراج کی ساری کیفیات ذہن پر چھا جاتی ہیں اور ان کو قبول کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں، فرماتے ہیں :

"الوالعزم پیغمبروں کو آغاز نبوت کے کسی خاص وقت اور مخصوص ساعت میں یہ منصب رفیع حاصل ہوتا ہے اور اس وقت شرائط رویت کے تمام مادی پردے ان کے لئے منسوخ کر دیے جاتے ہیں، قیود زمانی و مکانی کی تمام فرضی بیڑیاں ان کے پاؤں سے کاٹ ڈالی جاتی ہیں، آسمان و زمین کے مخفی مناظر بے محابانہ ان کے سامنے آتے ہیں اور وہ اس کے بعد نور کا حلۂ بہشتی پہن کر فرشتوں کے روحانی جلوس کے ساتھ بارگاہِ الٰہی میں پیش ہوتے ہیں اور اپنے اپنے رتبہ اور درجہ کے مناسب مقام پر کھڑے ہو کر فیض ربانی سے معمور اور غرق دریائے نور ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ بعض مقربان خاص کو درجہ عطا ہوتا ہے کہ وہ حریم خلوت گاہ قدس میں بار پا کر قاب قوسین یعنی دو کمانوں کے فاصلہ سے نزدیک تر ہو جاتے ہیں، اور پھر وہاں اپنے منصب کا فرمانِ خاص لے کر اسی کاشانہ آب و خاک میں واپس آ جاتے ہیں"۔

(ص: ۳۹۴)

پھر رسول اللہ ﷺ کی معراجِ خصوصی کا ذکر ایسے ایجاز کے ساتھ کرتے ہیں، جس میں سب کچھ احاطہ ہو گیا ہے :

"حضور ﷺ چونکہ سرورِ انبیاء اور سید اولادِ آدم تھے، اس لئے اس خطیرۂ

Marfat.com

قدس اور بارگاہِ لامکان میں آپ کو وہاں تک رسائی حاصل ہوئی، جہاں تک کسی فرزند آدم کا قدم اس سے پہلے نہیں پہنچا تھا اور وہ کچھ مشاہدہ کیا، جواب تک دوسرے مقربانِ بارگاہ کی حدِ نظر سے باہر تھا''۔ (ص: ۳۹۵)

یہ تو سیرۃ النبیؐ جلد سوم کی تھوڑی سی جھلکیاں تھیں۔ اب ذرا آگے بڑھ کر اور جلدوں کی طرف مائل ہوں۔ سیرۃ النبی جلد سوم ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئی۔ اس کے آٹھ سال کے بعد اس کی چوتھی جلد طبع ہوئی جو ۸۸۸ صفحے پر مشتمل ہے، یعنی تیسری جلد سے بیس صفحے زیادہ ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ سید صاحبؒ کے قلم کا مسافر پہلے سے زیادہ تیز اور سبک ہو گیا تھا۔ اس وقت ان کی عمر ۵۳ سال کی ہو چکی تھی، لیکن قلم پہلے سے زیادہ جوان اور رعنا ہو گیا تھا، اس لئے کہ ...... ع　عشق ہم راہ است و ہم خود منزل است

یہ عشق رسولؐ تھا، جس کی رہ نوردی کر کے منزل تک پہنچنے میں ساری عمر گذاری اور اس عشق کی سرشاری بلکہ اس کی پسی ہوئی بجلیاں اور بکھری ہوئی تجلیاں ان کی سیرۃ النبی کی پانچوں جلدوں کی تحریروں میں دکھائی دیتی ہیں۔ اس چوتھی جلد کا موضوع 'منصب نبوت ہے۔ اس میں پیغمبر اسلام کی بعثت کے وقت دنیا اور خصوصاً عرب کی مذہبی اور اخلاقی حالت' خیر الامم بننے کی صلاحیت، تبلیغ نبوی کے اُصول، اس کی کامیابی کے اسباب، سلام کے عقائد میں ایمان کی مختلف قسمیں، جزاء، سزا، دوزخ، جنت، قضا، قدر، نبوت کی حقیقت، نبی کی ضرورت، وحی، وحی متلو، وحی غیر متلو، اجتہاد، حکمت وغیرہ جیسے موضوعات پر مباحث ہیں۔ ان کو سمجھنے اور سمجھ کر سمجھانے کے لئے بیسویں صدی کا ذہن، جس زبان' اسلوب اور طرزِ ادا کا طلب گار ہے، سید صاحبؒ نے اسی کو اختیار کر کے ان کو مطمئن کیا ہے۔ ان کو پڑھنے کے بعد قارئین غیر شعوری طور پر محسوس کریں گے، کہ وہ افکار کی انجمن در انجمن سے گزر رہے ہیں اور ان کے خیالات میں ارتعاش اور جذبات میں ہلچل پیدا ہو رہی ہے۔

ان تمام باتوں کو قلم بند کرنے میں سید صاحبؒ کو اس بات سے بڑی مدد ملی کہ ان کے ذہن کے دریچے اور روشندان ہر طرف کھلے رہے۔ ان کے خیالات کے قصر میں قرآن مجید کی شعاعیں اور احادیث کی کرنیں تو برابر داخل ہوتی رہیں، اسی کے ساتھ انہوں نے

Marfat.com

قوموں کی تاریخوں سے جو عبرت و بصیرت حاصل کی، اس سے ان کے ذہن میں جلا پیدا ہوتی رہی، پھر علم کلام، فلسفہ اور نفسیات کی چاندنی بھی ان کے ذہن پر چھائی رہی۔ ان ہی ملے جلے اجزاء سے ان کی تحریریں خود بخود ان کے قلم سے نکلتی رہیں، جن کو پڑھتے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے قلم کے دل سے جو باتیں نکل رہی ہیں، وہ ان کے قارئین کے دلوں میں اتر رہی ہیں۔ یہ باتیں وہی محسوس کریں گے، جو اسلام کے مے خانہ کے ساغر و مینا سے شغل رکھنے کا ذوق رکھتے ہیں۔

اس قسم کے موضوع پر علماء بھی اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے ہیں جن کا یہ بڑا وصف تو ضرور رہا کہ وہ ایسے تمام مسائل کو اچھی طرح سمجھتے لیکن ان کو سمجھانے میں ان کا قلم ان کا ساتھ نہیں دیتا۔ اس لئے ان کی تحریریں حواشی، تعلیقات اور توضیحات کی محتاج ہو جاتیں۔

علامہ شبلیؒ کی تحریروں کا یہ اعجاز ہے کہ مسائل کتنے ہی دقیق اور پیچیدہ ہوں، ان کو سمجھ کر اپنے انداز بیان سے بہت ہی بہتر اور واضح طریقہ پر اپنے قارئین کو سمجھا دیتے۔ دبستانِ شبلیؒ کے چمنستان کے گل سرسبد' سید صاحبؒ ہی تھے۔ اس لئے اس انداز بیان کی گل فشانی ان کی ہر تصنیف کی تحریروں میں ہے۔ سیرۃ النبی کی اس جلد چہارم میں تو اس کے ہر صفحہ پر ہے۔ اس میں مجوسیوں کی مجوسیت، مزدکوں کی مزدکیت، یہودیوں کی یہودیت، عیسائیوں کی عیسائیت، ہندوؤں کی ہندویت، بودھوں کی بودھ مت، زردشتیوں کے نور و ظلمت، خیر، شر، نیکی اور بدی اہرمن اور یزداں، کلیسا کی سفاکی، کیقیاد، خسرو، نوشیرواں، قسطنطین، جسٹینین اور یزدگرد وغیرہ کی حکمرانی کی تفصیلات آ گئی ہیں، پھر ملائکہ، جنات کی حقیقت، بتوں کی پرستش، شیاطین، دوسری قوموں میں بھوت اور کہانت وغیرہ کے تخیلات شراب خواری، قمار بازی، سود خواری، سفاکی اور بے رحمی وغیرہ جیسے مسائل بھی زیر بحث آئے ہیں۔ اس کے بعد یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ اس ظلمت میں رسول اللہ ﷺ کا خورشید نبوت کس طرح طلوع ہوا اور کیسے یہ ظلمت شب کافور ہوگئی اور کیسے اس نبوت کا نور سرزمینِ عرب کو منور کر کے دنیا کو روشن کرتا چلا گیا۔ یہ موضوعات نئے تو نہیں تھے کہ جن پر گزشتہ

Marfat.com

چودہ سو برس سے کچھ نہیں لکھا گیا ہو، بہت کچھ لکھا جا چکا تھا، مگر سید صاحبؒ نے ان ہی باتوں کو جس خاص انداز اور ذہن کو مطمئن کرنے والے پیرایہ میں لکھا ہے، وہ اس کی نمایاں خوبیاں ہیں۔ قرآن مجید میں رسول اللہ ﷺ کو یہ ہدایت دی گئی تھی کہ لوگوں سے ایسی باتیں کہو کہ جو ان کے دلوں میں اثر کریں، اس ہدایت سے سید صاحبؒ نے بہت کچھ سیکھا اور سیکھ کر اپنی تحریروں کو اس انداز میں ڈھالا کہ وہ لوگوں کے دلوں میں گھر کرے۔ اس جلد میں زیادہ تر عقائد پر بحثیں ہیں۔ علماء، حکماء، معتزلین اور صوفیائے کرام وغیرہ نے اپنے اپنے مسلک کے مطابق ان کی وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے، مگر ان میں کچھ تو اپنی کج مج بیانی، کچھ اپنے عقیدوں کی غلو پسندی اور کچھ دوسروں کے عقائد پر جارحانہ روش کی وجہ سے ان موضوعات کو مؤثر اور دل نشیں نہیں بنا سکے۔ سید صاحبؒ نے ان مباحث میں صرف قرآن مجید اور احادیث کو اپنے لئے شمع ہدایت ضرور بنایا ہے اور ان ہی کی روشنی میں اپنے خیالات کی تصریح کی ہے، مگر ان کا طرزِ استدلال کچھ ایسا ہے کہ اس سے متقشف علماء، ذہین متکلمین، بیدار معتزلین اور خمار توحید سے مخمور صوفیائے کرام کو بھی اختلاف نہ ہوگا۔ عام قارئین کے شکوک وشبہات کی ظلمت شب تو سب کافور دکھائی دے گی۔

سید صاحبؒ کے قلم کا ایک بڑا وصف یہ بھی ہے کہ وہ جب چاہتے ہیں، اپنی باوقار تحریر میں پراز تاثیر تقریر کی لذت پیدا کر دیتے ہیں۔ اس کے نمونے اس چوتھی جلد میں جا بجا ملیں گے۔ ایک نمونہ سے آپ بھی لذت آشنا ہوں:

> ”عرب میں سرتاپا روحانی واخلاقی انقلاب پیدا کر دینا، اقوامِ عالم کے سامنے کامل ترین اور آخری شریعت پیش کرنا، ظلمت کدۂ عالم کو سراج منیر بنا کر بقعہ نور بنا دینا، گمراہوں کو راستہ بتانا، بھولوں کو یاد دلانا، بندوں کا رشتہ خدا سے جوڑنا، غلط اوہام کو مٹانا، اخلاق فاضلہ کا سکھانا، گناہوں کے دفتر کو دھونا، انسانوں کو شیطانوں کے دامِ فریب سے نکال کر فرشتوں کی صف میں کھڑا کرنا، دنیا کو رفق ومحبت، لطف وشفقت اور برادرانہ مساوات کی تعلیم دینا، حکمت ودانائی، پند وموعظت اور تہذیب وتمدن کے رموز سکھانا، روحانیت کی

Marfat.com

برباد شدہ دنیا کی دوبارہ تعمیر اور قلوب و ارواح کے ویران گھروں کی از سر نو آبادی، خاتم النبیین کا اصلی کام، ایک شریعت کی تاسیس، مذاہب عالم کی اصلاح، فن اخلاق کی علمی و عملی تکمیل، قانونِ الٰہی کا ظہور اور تہذیبِ نفوس کی معراج اخیر تھی اور یہ سب اس پُر آشوب زمانہ میں ہوتا رہا، جس کے لیل و نہار بظاہر صرف حملوں کے تیر باراں کے روکنے میں صرف ہوئے"۔

(ج ۲ ص ۳-۲)

یہ صرف لفظوں اور جملوں کے انبار نہیں، بلکہ ہر لفظ اور ہر فقرہ کی ترتیب و تنظیم میں خیالات کی ایک دنیا آباد کر دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے وجود پر بڑے بڑے فلسفیانہ، متکلمانہ اور معتزلانہ مباحث کیے گئے ہیں۔ حضرت سید صاحبؒ نے اس کے وجود کو جس رنگ میں پیش کیا ہے، اس کی تاثیر اور تاثر سے ذرا لطف لیں:

"یہ گوناگوں عالم، یہ رنگارنگ کائنات، یہ تاروں بھرا آسمان، یہ بوقلموں زمین، یہ سورج، یہ چاند، یہ درخت، یہ سمندر، یہ پہاڑ، یہ لاکھوں جاندار اور بے جان اشیاء، علل و اسباب کا تسلسل، یہ تغیر و انقلاب کا نظام، یہ کائنات کا نظم اور اس کے ذرہ ذرہ کا قاعدہ و قانون، انسانوں کے اندرونی قوی، ان کی باہمی ترتیب، موت و حیات کے اسرار، خواص و قوی کے رموز، انسان کی خیالی بلند پروازی اور عملی عجز و درماندگی، یہ تمام باتیں خالق و صانع کے اعتراف پر مجبور کرتی ہیں۔ نیلگوں آسمان کی چھت، یہ زمین کا سبزہ زار فرش اور ایک ہی حرکت سے شب و روز کا انقلاب ایک خالق کامل کا پتہ دیتا ہے"۔

(ج ۴ ص ۶۵،۶۴)

اور ذرا اس سلسلہ میں ایک چھوٹے سے طاہر اقتباس سے اپنے ذہن کو مطہر کر لیں:

"یہ شب و روز کا نور و ظلمت، یہ سورج اور چاند کی روشنی، ان کی مقررہ رفتار اور با قاعدہ طلوع و غروب اس کی دلیل ہے کہ اس ابلق ایام پر کوئی سوار جس

Marfat.com

کے ہاتھ میں اس کا سیاہ سفید ہے"۔ (ایضاً ص ۴۶۵)

ان باتوں کی تائید میں جب وہ قرآن مجید کی آیتیں پیش کرتے ہیں، تو ان کے پڑھتے وقت یہ خیال نہیں ہوتا کہ ہم عربی زبان کی کوئی عبارت پڑھ رہے ہیں، بلکہ ان کے ترجمے اپنی تحریروں کے ساتھ ایسا منسلک کر دیتے ہیں کہ ان کو پڑھتے وقت وہی لطف آتا ہے، جو عربی زبان کے ماہروں کو کلام پاک کی آیتوں کے پڑھنے میں آتا ہوگا۔

شاعروں کی زبانی دل کی نیرنگیاں تو بہت کچھ سننے میں آتی رہتی ہیں، اب ذرا سیرۃ النبیؐ کے مصنف سے اس کی بوقلمونی کا مشاہدہ کریں۔ رقم طراز ہیں :

"ہمارے ارادہ کا محرک، ہمارے خیالات اور جذبات ہیں۔ ہمارے خیالات اور جذبات پر ہمارے اندرونی عقائد حکومت کرتے ہیں، عام بول چال میں انہی چیزوں کو "دل" کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسلام کے معلم نے بتایا کہ انسان کے تمام اعضاء میں اس کا دل ہی نیکی اور بدی کا گھر ہے۔ فرمایا، انسان کے بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے، جو اگر درست ہے تو تمام بدن درست ہے اور اگر وہ بگڑ گیا تو بدن بگڑ گیا۔ ہاں وہ ٹکڑا دل ہے"۔

(ص ۴۰۵)

آخری سطریں حدیث کے ترجمے ہیں، لیکن عبارت کے سلسلہ میں ایسے جڑ دیئے گئے ہیں کہ تسلسل میں کوئی فرق نہیں ہونے پاتا ہے، یہ تو حدیث کے ذریعہ دل کو سمجھایا گیا۔ قرآن مجید کے ذریعہ اس کو اس طرح سمجھایا ہے کہ :

"قرآن پاک نے دل (قلب) کی تین کیفیتیں بیان کی ہیں۔ سب سے پہلے قلب سلیم (سلامت رو دل) جو ہر گناہ سے پاک رہ کر بالطبع نجات اور سلامت روی کے راستہ پر چلتا ہے۔ دوسرا اس کے مقابل قلب اثیم یعنی گناہ گار دل ہے، یہ گناہوں کی راہ اختیار کرتا ہے۔ تیسرا قلب منیب ہے یعنی رجوع کرنے والا دل ہے، جو اگر کبھی بھٹکتا ہے اور بے راہ ہوتا ہے تو فوراً نیکی اور حق کی طرف رجوع ہو جاتا ہے"۔ (ص ۴۰۶)

Marfat.com

یہ قسمیں بتا کر سید صاحب اپنے انشاپردازانہ رنگ میں لکھتے ہیں :

''غرض یہ سب نیرنگیاں اسی ایک بے رنگ ہستی کی ہیں، جس کا نام دل ہے، ہمارے اعمال کا ہر محرک، ہمارے اسی دل کا ارادہ اور نیت ہے، اسی بھاپ کی طاقت سے اس مشین کا ہر پرزہ چلتا اور حرکت کرتا ہے''۔(ص ۴۲۰۶)

سیرۃ النبی جلد پنجم :

سیرۃ کی چوتھی جلد کا موضوع عقائد تھا۔ پانچویں جلد کا موضوع، عبادات کی حقیقت کیا ہے۔ اس کے اقسام کتنے ہیں، ان میں کیا مصلحت و حکمت رکھی گئی ہے۔ اس میں نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج کے ابواب بھی ہیں۔ یہ موضوعات نئے نہیں، لیکن اس کتاب کے مصنف نے جس انداز میں ان کو پیش کیا ہے۔ اس کا مطالعہ کرتے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم کو کچھ ایسی باتیں معلوم ہو رہی ہیں، جو پہلے معلوم نہ تھیں، حالانکہ وہ جانی بوجھی چیزیں ہیں، لیکن اندازِ بیان کی خوبی سے وہ چیزیں نئی معلوم ہو رہی ہیں۔ وہ کلام پاک کی چھوٹی، بڑی اور لمبی آیتوں کو اپنی تحریروں میں اس طرح جڑ دیتے ہیں کہ وہ نگینوں کی طرح چمکتی نظر آتی ہیں اور جب ان کے مطالب کو سمجھاتے ہیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے سامنے دلنواز باتوں اور دل نشین تحریروں کا خوانِ یغما بچھا ہوا ہے۔ احادیث کی تشریح کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ محدثوں نے جن باتوں کی طرف توجہ نہیں دلائی تھی، ان کی طرف توجہ دلا رہے ہیں۔ اس کتاب کے جو موضوعات ہیں، ان میں فقہاء کا بڑا اختلاف رہا ہے، لیکن اس سلسلہ میں سید صاحبؒ نے جو کچھ لکھا ہے، بڑے بڑے دیدہ ور فقہا کو اس سے اب تک اختلاف نہیں ہوا ہے، اس میں ان کے اندازِ بیان سے ان کو بڑی مدد ملی، جس میں کچھ کلامی رنگ کے ساتھ طرزِ تحریر کی پریاں، کچھ اس طرح الفاظ کے آفاق سے اترتی دکھائی دیتی ہیں کہ نہ صرف صفحات بلکہ شیشۂ دل میں بھی اترتی چلی جاتی ہیں۔ مثلاً نماز کے متعلق رقم طراز ہیں :

''نماز کیا ہے؟ مخلوق کا اپنے دل، زبان اور ہاتھ، پاؤں سے اپنے خالق

Marfat.com

کے سامنے بندگی اور عبودیت کا اظہار، اس رحمان ورحیم کی یاد اور اس کے بے انتہاء احسانات کا شکریہ، حسن ازل کی حمد وثنا اور اس کی یکتائی اور بڑائی کا اقرار، اپنے محبوب سے مہجور روح کا خطاب ہے۔ یہ اپنے آقا کے حضور میں جسم وجان کی بندگی ہے۔ یہ ہمارے اندرونی احساسات کا عرض نیاز ہے۔ یہ ہمارے دل کے ساز کا فطری ترانہ ہے۔ یہ خالق ومخلوق کے درمیان تعلق کی گرہ اور وابستگی کا شیرازہ ہے، یہ بے قرار روح کی تسکین، مضطرب قلب کی تسلی اور مایوس دل کی دوا ہے۔ یہ فطرت کی آواز ہے، حساس واثر پذیر طبیعت کی اندرونی پکار ہے، یہ زندگی کا حاصل ہے اور ہستی کا خلاصہ ہے''۔ (ص ۳۸)

یہ ادب لطیف کی عبارت نہیں، بلکہ اسلام کے ایک سچے عاشق کے دل کی پکار ہے اور کون ایسا عالم ومتکلم ہے جو اس کو پڑھ کر سرشار نہ ہو جائے، ایسی عبارت آرائی، غنچوں، پھولوں، گلزاروں اور بلبل کی نغمہ سرائیوں کی مرقع آرائی کرتے وقت خوب نکھرتی ہے، مگر سید صاحبؒ نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کو ریاض رسول کے نکہت بیز اور شامہ نواز پھول ہی سمجھتے رہے، اس لئے اُن کا ذکر کرنے میں بلبل خوشنوا ہی بنے رہے۔

زکوٰۃ کے جتنے افادی، شرعی اور فقہی پہلو ہیں، ان سب پر سید صاحبؒ نے بحثیں کی ہیں، لیکن طرزِ ادا کی دل نشینی کی وجہ سے ان کو پڑھنے میں لطیف نکتے اور شریعت کے اسرار کی محرمی، جدید ذہن پر بھی آشکارا ہوتی نظر آتی ہے۔ اس کی اہمیت کے استدلال کا زور ملاحظہ کیجئے، لکھتے ہیں :

''قرآن مجید میں جہاں کہیں نماز کا ذکر ہے، اس کے متصل ہی ہمیشہ زکوٰۃ کا بھی بیان ہے، چنانچہ قرآنِ پاک میں بیس مقامات پر اقام الصلوٰۃ کے بعد ہی ایتاء الزکوٰۃ آتا ہے''۔ (ص ۱۵۲)

اس کی اہمیت پر زور دینے کا یہ اندازِ بیان بھی ہے :

''محمد رسول اللہ ﷺ کا پیغام صرف دو لفظوں سے مرکب ہے۔ خدا کا حق، بھائیوں کا حق، پہلے لفظ کا مظہر اعظم نماز اور دوسرے کا زکوٰۃ ہے، اس

Marfat.com

لئے محمد رسول اللہ ﷺ کی دعوتِ حق بلند ہوئی، تو اس کی پکار کی ہر آواز ان ہی دو لفظوں کی تفصیل و تشریح تھی"۔

ان تحریروں میں دل کی جو کرشمہ سازیاں ہیں۔ اس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ اب اس جلد میں لکھتے ہیں کہ جسمانی اور مالی عبادات کے علاوہ قلبی عبادات بھی ہیں، جن کا تعلق نفس کی اندرونی کیفیتوں سے ہے۔ سید صاحبؒ کے خیال میں اس قلبی عبادات میں سرفہرست تقویٰ ہے۔ اس کی لغوی اصطلاحی، مذہبی اور روحانی حیثیت کو کس دلآویز انداز میں سمجھاتے ہیں:

"قلبی عبادت میں سرفہرست تقویٰ ہے، جو رسول اللہ ﷺ کی تمام تعلیمات کا خلاصہ بلکہ روح ہے، لیکن عربی زبان میں اس کے لغوی معنی بچنے، پرہیز کرنے اور لحاظ کرنے کے ہیں، لیکن وحی محمدی کی اصطلاح میں یہ دل کی اس کیفیت کا نام ہے، جو اللہ تعالیٰ کے ہمیشہ حاضر و ناظر ہونے کا یقین پیدا کر کے دل میں خیر و شر کی تمیز کی خلش اور خیر کی رغبت اور شر سے نفرت پیدا کر دیتی ہے، دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ضمیر کے اس احساس کا نام ہے، جس کی بنا پر ہر کام میں خدا کے حکم کے مطابق عمل کرنے کی شدید رغبت اور اس کی مخالفت سے شدید نفرت پیدا ہوتی ہے۔ تقوی والا وہ ہے جو اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں سچائی لے کر آئے اور اس ابدی سچائی کو سچ بنائے۔ وہ کسی کام میں ظاہری فائدہ، فوری ثمرہ، مال و دولت اور جاہ و عزت کے نقطہ پر نہیں بلکہ سچائی کے پہلو پر نظر رکھتا ہے اور خواہ کسی قدر اس کا بظاہر نقصان ہو، مگر وہ سچائی اور راست بازی کے جادہ سے بال بھر ہٹنا نہیں چاہتا، جب وہ ہر کام میں خدا کی مرضی اور پسندیدگی پر نظر رکھتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بھی ان کو اپنی طرف سے اپنے انعامات اور محنت کا صلہ عطا فرماتا ہے اور بڑا صلہ یہ ہوتا ہے کہ دنیا ہی میں بندوں کے درمیان، ان کے ساتھ عقیدت، محبت اور ہر دل عزیزی پیدا ہوتی ہے"۔ (۱۶-۳۱۴)

Marfat.com

یہی بات محراب کے نیچے، منبر پر بھی کہی جاتی ہے، لیکن اس میں واعظانہ رنگ ہوتا ہے، اوپر کے اقتباس کے پیرایہ بیان میں انداز تو معلمانہ ہی ہے، لیکن پڑھتے وقت کچھ فلسفیانہ طرزِ فکر کا احساس پیدا ہوجاتا ہے۔ اخلاص کو بھی قلبی عبادت بتایا ہے۔ اس کو کس خوبصورتی سے سمجھایا ہے:

"جو نیک کام بھی کیا جائے، اس کا محرک دنیاوی غرض نہ ہو اور نہ اس سے مقصود ریا و نمائش جلب منفعت، طلب شہرت، طلب معاوضہ وغیرہ ہو، بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کے حکم کی بجا آوری اور خوشنودی ہو، اسی کا نام اخلاص ہے"۔
(ص ۳۳۰)

توکل کو بھی قلبی عبادت قرار دیتے ہیں۔ اس کو سمجھانے کا یہ انداز ہے:

"توکل، قلبی یقین کا نام ہے۔ اس کے قریب قریب آج کل کے اخلاقیات میں خوداعتمادی کا لفظ بولا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ کامیاب افراد وہی ہوتے ہیں، جن میں یہ جوہر پایا جاتا ہے، لیکن اس خوداعتمادی سے بالکل قریب غرور اور فریبِ نفس ہے، گڑھے اور غار بھی ہیں، اس لئے اسلام نے انانیت کی خوداعتمادی کے بجائے خدا اعتمادی کا نظریہ پیش کیا ہے، جو ان خطروں سے محفوظ ہے"۔

صبر کو بھی قلبی عبادت میں شمار کیا ہے اور اس کو اس طرح سمجھاتے ہیں:

"صبر، بے بسی اور بے کسی یا دشمن سے کسی مجبوری کے سبب سے انتقام نہ لینے کا نام صبر نہیں، بلکہ لغوی معنی تو اس کے، روکنے اور سہارے کے ہیں۔ معنوی حقیقت اس کی یہ ہے کہ اپنے نفس کو اضطراب اور گھبراہٹ سے روکا اور اس کو اپنی جگہ پر ثابت قدم رکھا جائے، یعنی مقصود، لاعلمی کی حالت میں، غیر معمولی واقعات کے پیش آنے میں دل میں اضطراب اور بے چینی کو پیدا نہ ہونے دیا جائے"۔

اسی جلد میں جا بجا فقہی مسائل پر بھی مباحث ہیں۔ ان کو کیسے واضح، دل نشین اور

Marfat.com

سلیس انداز میں پیش کیا ہے، وہ لائق توجہ ہے، ان میں مناظرانہ رنگ پیدا ہونے نہیں دیا، بلکہ قرآن مجید اور احادیث کے ذریعہ سے جس نتیجہ پر وہ خود پہنچتے تھے، ان کو اس طرح قلم بند کردیا ہے کہ پڑھنے والوں کے ذہن میں شکوک وشبہات نہ رہیں۔ پانچ وقتوں کی نماز کی تفصیل اس طرح بتاتے ہیں :

''نماز فجر کا بالتصریح ذکر، طٰہٰ، طور، دہر، ہود، ق، روم اور نور میں، ظہر کا ذکر بالا جمال دہر، ق، طہٰ اور اسراء اور بالتصریح اسراء، روم میں، عصر کا بقرہ، دہر، ہود، طہٰ، ق اور روم میں، مغرب کا بالا جمال ہود، طہٰ اور روم میں اور بالتصریح ق میں، عشاء کا تصور صلوٰۃ، مزمل، طور اور دہر میں اور بصورتِ عشاء بالا جمال ہود اور روم میں اور بالتصریح ق اور ہود میں ہے۔ تمام نمازوں کا ذکر بالا جمال، بقرہ، اسراء اور طٰہٰ میں ہے، طور سے فجر اور عشاء دو وقتوں کی نماز، اسراء ہود اور طٰہٰ سے کم از کم بظاہر تین وقتوں کی، روم سے چار وقتوں کی، اگر مساء سے مغرب مراد لیں، اور طٰہٰ اور روم سے پانچ وقتوں کی نماز ثابت ہے''۔ (ص ۹۱)

جمع بین الصلواتین کی تصریح کرتے وقت قرآن مجید کی یہ آیت سامنے رکھی :

فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَ حِيْنَ تُصْبِحُوْنَ ○ وَ لَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ عَشِيًّا وَّ حِيْنَ تُظْهِرُوْنَ ○ (روم : ۱۷-۱۸)

اللہ کی تسبیح کرو، جب شام (یا رات) کرو اور جب صبح کرو اور اس کی حمد آسمان اور زمین میں ہے اور اخیر دن کو اس کی تسبیح کرو اور ظہر کرو۔

اس کی تفسیر بیان کرنے میں پورے مسئلے کا حل پیش کردیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ سورۂ روم کی اس آیت سے ظہر وعصر کا نام تصریح کے ساتھ آیا ہے، مگر شام کی نماز میں اجمال ہے یعنی مغرب وعشاء دونوں کو حین تمسون (جب رات کرو) کے ذریعہ سے ادا کیا گیا ہے۔ اس سے اس جانب ایک لطیف اشارہ نکلتا ہے کہ یہ دونوں مل کر ایک بھی ہیں اور علاحدہ بھی ہیں، اس بناء پر اشد ضرورت اور سفر کی بے اطمینانی کے وقت ظہر وعصر کو ایک ساتھ اور مغرب و عشاء کو ایک ساتھ ملا کر بھی ادا کرسکتے ہیں اور صبح کی نماز چونکہ ہر آیت میں ہمیشہ علاحدہ ذکر

Marfat.com

کی گئی ہے، اس لئے اس کا کسی دوسری نماز سے ملانا جائز نہیں۔ احادیث میں جمع بین الصلوٰتین کے عنوان سے آنحضرت ﷺ کی عملی مثالیں، اس نکتہ قرآنی کی تشریح میں موجود ہیں۔ (۹۲-۹۱)

سیرۃ النبی جلد ششم :

سیرۃ النبی جلد پنجم کی اشاعت کے پانچ سال کے بعد سیرۃ النبی جلد ششم ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی۔ جس کی ضخامت ۸۸۸ صفحے ہے۔ اس وقت سید صاحبؒ کی عمر پچپن سال کی ہو چکی تھی، مگر اس کی ضخامت اور اس کے مسائل کے دل آویز بلکہ دل ربایانہ مباحث سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی تصنیفی زندگی کی جوانی، رعنائی اور دل آویزی برقرار تھی۔ اس میں اندازِ تحریر بتاتا ہے کہ پہلے کی طرح قلم کا زور اور تحریر کی روانی کی وجہ سے انشاپردازی کے جھلملاتے موتی ہر جگہ چمکتے نظر آتے ہیں۔ اس جلد کا موضوع، اسلام میں اخلاقیات کی تعلیمات ہے۔ اس کا تقاضا یہ تھا کہ اس کے طرز فکر میں گہرائی اور گیرائی ہو اور طرز ادا میں عظمت اور وقار ہو، یہی چیز ان کی پوری کتاب میں چھائی نظر آتی ہے، جو ان کی انشاپردازی کے مختلف جلوؤں میں سے ایک علاحدہ جلوہ ہے۔ اس میں فضائل اخلاق، رذائل اخلاق اور آدابِ اخلاق کے علاحدہ علاحدہ عنوانات قائم کر کے ان پر مباحث ہیں۔

ان میں جو بات کہی گئی ہے، اس کی تائید میں فوراً قرآن مجید کی آیتیں اور مقدس حدیثیں پیش کر دی گئی ہیں اور یہ تمام مباحث اس لئے خشک نہیں ہونے پاتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی عملی زندگی کے جلوہ ہائے ہزار رنگ کو اس طرح قلم بند کیا گیا ہے کہ شروع سے آخر تک کتاب پڑھتے وقت یہ محسوس نہیں ہوتا کہ ہم مواعظ کی کوئی کتاب پڑھ رہے ہیں، بلکہ محبت بھری حکایتوں کے ایک مجموعہ سے دل و دماغ کو محظوظ کر رہے ہیں۔ ان واقعات کو جمع کرنا تلاش و تحقیق کی دلیل ہے، لیکن ان کو دل نشین اور دلآویز انداز میں پیش کرنے میں قلم کے اعجاز کی ضرورت تھی، جو اس میں پورے طور پر نظر آتی ہے۔ اس ضخیم کتاب میں جو اخلاقی تعلیمات دی گئی ہیں، وہ اس مقالہ کا موضوع تو نہیں، لیکن جس طرح وہ قلم بند کی گئی

Marfat.com

ہیں، ان کا پورا تو نہیں، تھوڑا سا احاطہ یہاں پر ضروری ہے۔ ذرا یہ حسن ادا ملاحظہ کریں:

''اسلام کو، ایمان کے بعد نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے چار ستونوں پر قائم بنایا گیا ہے۔ بظاہر یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ اسلام کی اس عمارت میں اخلاقِ حسنہ کو کوئی جگہ نہیں دی گئی ہے اور بے سمجھ واعظوں کی غلط بیانی سے اس غلط فہمی میں اور اضافہ ہو گیا ہے، حالانکہ عبارات کے شروع میں ہم یہ بتا چکے ہیں کہ دوسرے اہم مقاصد کے علاوہ ان عبادات سے ایک مقصد انسان کے اخلاقِ حسنہ کی ترتیب اور تکمیل ہے۔ قرآن پاک میں ہر جگہ یہ نکتہ واضح کر دیا گیا ہے، چنانچہ نماز کا ایک فائدہ اس نے یہ بتایا ہے کہ وہ بُری باتوں سے باز رکھتی ہے، روزہ کی نسبت بتایا ہے کہ تقویٰ کی تعلیم دیتا ہے، زکوٰۃ، سرتاپا انسانی ہمدردی اور غم خواری کا سبق ہے اور حج بھی مختلف طریقوں سے ہماری اخلاقی اصلاح و ترقی کا ذریعہ اور اپنی اور دوسروں کی امداد کا وسیلہ ہے۔ اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کے ان چاروں ارکان کے نام الگ الگ جو کچھ ہوں، مگر ان کے بنیادی مقاصد میں اخلاقی تعلیم کا راز مضمر ہے۔ اگر ان عبادات سے یہ روحانی اور اخلاقی ثمرہ ظاہر نہ ہو تو سمجھ لینا چاہئے کہ وہ احکامِ الٰہی کی محض لفظی تعمیل اور عبادت کے جوہر و معنی سے یکسر خالی اور معرا ہے۔ وہ درخت ہیں جن میں پھل ہیں اور پھول ہیں، جن میں خوشبو نہیں، وہ قالب ہیں، جن میں روح نہیں''۔ (ص ۱۱)

وہ رسول اللہ ﷺ کے اخلاقِ حسنہ کا اعلیٰ رتبہ متعین کرنا چاہتے ہیں، تو پہلے آپؐ سے پہلے انبیاء کرامؑ کا ذکر کرتے ہیں، مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر جس اسلوب میں کرتے ہیں، اس کا لطف لیتے ہوئے اس کی نکتہ آرائی پر بھی غور کریں:

''کوہِ زیتون کے پرتاثیر واعظ یعنی حضرت عیسیٰؑ کی معصومانہ باتیں، سچائی اور راست بازی کی نصیحتیں، لفظی صنائع و بدائع اور دلکش تمثیلوں سے بھری ہوئی تقریریں، دنیا نے سنیں اور ان کی فصاحت اور شرینی کا مزہ اب تک اس کے

Marfat.com

کام و دہن میں ہے، مگر کیا اس کی آنکھوں نے اس معصوم واعظ کی عملی مثالیں بھی دیکھیں، کیا اس پہلو کے سوا، اس کے اخلاق کا کوئی ایجابی پہلو بھی ہمارے سامنے ہے؟ وہ جس نے یہ کہا کہ سب کچھ تمہارے پاس ہے، جب تک اس کو خدا کی راہ میں لٹا نہ دو، آسمان کی بادشاہت میں داخل نہ ہو گے، کیا اس نے اپنا بھی کچھ خدا کی راہ میں لٹایا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ شریروں کا مقابلہ نہ کرو، کیا اس نے خود بھی شریروں کا مقابلہ نہیں کیا؟ وہ جس نے کہا کہ دشمنوں کو بھی پیار کرو، کیا اس نے کبھی اپنے دشمن کو پیار کیا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ تو اپنے پڑوسی کو اپنے سارے جان و مال سے پیار کر، کیا خود بھی اس کا ایسا ہی عمل تھا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ اگر تمہارے داہنے گال پر کوئی تھپڑ مارے تو بایاں گال بھی اس کے سامنے کر دو، کیا اس نے خود بھی ایسا کیا، وہ جس نے یہ کہا کہ تم سے اگر کوئی تمہارا کرتا مانگے تو اپنی قبا بھی اس کے حوالہ کر دو، کیا ایسی فیاضی خود اس سے بھی ظہور میں آئی"۔ (ص ۳۳-۳۲)

یہاں تک وہ سب کچھ کہہ گئے، جو کہنا چاہتے تھے، مگر وہ حضرت عیسیٰؑ کی نبوت پر ایمان کامل رکھتے تھے۔ ان کا احترام بھی ان کو کرنا تھا، اس لئے ان کا ادب شناس قلم رکتا ہے اور اپنے قارئین کے ذہن کو اس کے بعد دو جملوں میں مسحور کر لیتے ہیں :

"ہم یہ نہیں کہتے کہ حضرت مسیحؑ میں یہ صفتیں موجود نہ تھیں، بلکہ کہنا یہ ہے کہ انجیل نے ان کی اس حیثیت کو محفوظ نہیں رکھا ہے"۔ (ص ۳۴)

اُپنے قلم کے اس سحر سامری کے بعد ناظرین کے ذہن کو یہ لکھ کر مسخر کرتے ہیں :

"مگر اسلام کے اخلاقی معلم کی شان اس حیثیت سے بھی بلند ہے، اس نے جو کچھ کہا، سب سے پہلے خود اس کو کر کے دکھایا۔ اس کا جو قول تھا، وہی اس کا عمل تھا، اس نے یہودیوں کو طعنہ دیا کہ **اتامرون الناس بالبر و تنسون انفسکم** (بقرہ ۵) کیا اوروں کو نیکی کی بات بتاتے ہو اور خود اپنے کو بھول جاتے ہو، اور مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ **لم تقولون مالا تفعلون، کبر مقتا**

Marfat.com

بعند اللّٰہ ان تقولوا مالا تفعلون (صف ۱۰) تم کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں، بڑی بیزاری ہے اللہ کے یہاں کہ کہو وہ جو نہ کرو"۔

اس میں قرآن مجید کی آیتیں اس طرح منسلک ہوگئی ہیں کہ تحریر کی لڑیوں سے جدا نہیں معلوم ہوتیں۔ پھر رسول اللہ ﷺ کے عملی اخلاق کے جلوؤں کو بڑی تفصیل سے پیش کیا گیا ہے اور رسول اکرمؐ کی گوناگوں حیثیتوں کو ایک جگہ اس طرح دکھایا ہے کہ :

"آپ کی حیثیت، ایک انسان، ایک باپ، ایک شوہر، ایک دوست، ایک خانہ دار، ایک کاروباری تاجر، ایک افسر، ایک حاکم، ایک قاضی، ایک سپہ سالار، ایک بادشاہ، ایک استاد، ایک واعظ، ایک مرشد، ایک زاہد، ایک عابد اور ایک پیغمبر کی نظر آتی ہے۔ یہ تمام انسانی طبقے آپ کے سامنے آکر زانوئے ادب تہہ کرتے ہیں"۔

سیرۃ النبی جلد ہفتم :

یہ سید صاحبؒ کی ایک نامکمل اور ادھوری تصنیف ہے۔ وہ اپنی جلد ششم کے بعد اسلام میں معاملات اور سیاسیات کی جو تعلیمات دی گئی ہیں، ان پر ایک مستقل جلد لکھنا چاہتے تھے۔ اس کو شروع کیا تھا، لیکن اس زمانہ میں ان کی نجی اور علمی زندگی میں بعض اسباب کی بنا پر کچھ ایسا انتشار پیدا ہوگیا کہ وہ اس کو مکمل نہ کرسکے، جو چند ابواب لکھے تھے، ان ہی کو جمع کرکے شائع کردیا گیا ہے۔ اس میں پہلے تو معاملات کے عنوان سے ایک مقدمہ ہے، پھر یہ عنوانات ہیں۔

۱۔ اسلام میں حکومت کی حیثیت واہمیت۔ ۲۔ عہد نبوی میں نظام حکومت۔ ۳۔ سلطنت اور دین کا تعلق۔ ۴۔ امت مسلمہ کی بعثت۔ ۵۔ قوت عاملہ یا قوت آمرہ۔ ۶۔ حاکم حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے۔

وہ اپنی آخری زندگی میں علالت اور صحت کی کمزوری کی وجہ سے بھی پریشان رہے، پھر جلد ششم لکھنے کے بعد ان کا وقت، حیاتِ شبلی کی ضخیم جلد کی تدوین میں بھی صرف

Marfat.com

ہوا۔ ان اسباب کی بنا پر ان کی ساتویں جلد مکمل نہ ہوسکی۔ اس میں جو کچھ لکھا، اس میں فکر کی گہرائی تو ضرور ہے، مگر تحریر کا وہ جوئبار اور رود بار بہتا نظر نہیں آتا، جو سیرۃ النبی کی گذشتہ جلدوں میں آتا ہے۔ اس میں ان کے قلم کی پختگی، نظر کی جامعیت، اسلام کی روح سے آشنائی اور اظہارِ رائے میں اعتدال و توازن تو اس کی ہر سطر میں نمایا ہے، جیسا کہ ان کے حسب ذیل اقتباسات سے ظاہر ہوگا۔ اس سے ان کے سیاسی افکار و تخیلات بھی معلوم ہو جائیں گے اور ان کا اندازِ بیان بھی، خلافتِ راشدہ، اسلام کی تاریخ میں ایک آئیڈیل حکومت سمجھی جاتی ہے۔ اس پر وہ تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''اسلام کی سلطنت تمام تر مذہبی احکام پر قائم ہے، مگر اس کا امیر یا خلیفہ نہ خدا ہے، نہ خدا کا اوتار ہے، نہ خدا کا مظہر ہے، نہ خدا سے ہم کلام ہوتا ہے، نہ خدا سے براہِ راست احکام پاتا ہے، بلکہ وہ انسان ہوتا ہے، جس کو مسلمانوں نے اپنی رائے سے یا سابق امیر نے امت کی سرداری اور خدا کی شریعت کی تنفیذ کے لئے اس کو منتخب کیا ہے، تاہم اسلامی حکومت کو اس لحاظ سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ان احکام پر مبنی ہے جو رسولؐ کے ذریعہ سے اس کو ملے ہیں، اس کو الٰہی ہی کہا جا سکتا ہے، اور اس بنا پر کہ اسلام کی حکومت میں ارباب شوریٰ اور اہل حل و عقد کا گروہ مانا گیا ہے اور شوریٰ و باہمی مشورہ کی تاکید ہے، اس کو تسامحاً دستوری کہہ دینا ممکن ہے اور اس سبب سے کہ اس کے خلیفہ کا انتخاب، افراد امت کی جانب سے بھی ہوتا ہے، اس کو حکومت کے حقوق اور فوائد میں امت کے عام افراد سے ایک ذرہ بھی تفوق حاصل نہیں ہوتا، لوگ جمہوری سمجھ سکتے ہیں اور اس خیال سے کہ خلیفہ کے احکام شرعی کی اطاعت، امت پر واجب ہے، اور وہ امت کے مشوروں کے ماننے پر قطعاً مجبور نہیں۔ اس کو شخصی کہہ دینا ممکن ہے اور اس نظر سے کہ خلیفہ کے ہر جائز حکم اور صوابدید پر بے چون و چرا عمل کرنا امت کے لئے ضروری ہے، اس کو زعیم یعنی ڈکٹیٹر سمجھا جا سکتا ہے''۔

Marfat.com

خلافتِ راشدہ کے مختلف بلکہ پیچیدہ پہلوؤں کو کس صاف، سلیس اور عام فہم انداز میں ایک پیراگراف میں سمجھا دیا ہے جو اور اہلِ قلم کے لئے ایک باب میں سمجھانا مشکل ہو جاتا، یہ صرف نفس مسئلہ کے ساتھ قلم پر قدرت کی بھی دلیل ہے اوپر کے اقتباس کے بعد فوراً ہی قارئین کو یہ لکھ کر مسحور کرتے ہیں کہ :

"لیکن ان مختلف جہتوں کی بنا پر ظاہر ہے کہ مغربی اہل سیاست کے بنائے ہوئے نظریات میں سے کوئی نظریہ بھی اسلامی طریق حکومت پر پوری طرح صادق نہیں آ سکتا"۔

اور اس کے بعد اسلامی سیاست کی اسلامی روح کو جس پرزور، مؤثر اور خوبصورت انداز میں قلم بند کیا ہے، وہ موجودہ دور کے اسلامی ممالک کے حکمرانوں کے لئے مشعل ہدایت ہے، لکھتے ہیں :

"اصل یہ ہے کہ سیاسی مفکرین کی نظر حکومت کی ظاہری اشکال کے گورکھ دھندوں میں پھنس کر رہ گئی اور اسلام کی نظر اس کے اندر کی حقیقت پر ہے، اس کے نزدیک حکومت کی ظاہری شکل یعنی انتخاب کا طریقہ، ارباب شوریٰ کی ترتیب اور تعین، ان کے فرائض و حقوق، ان کے انتخاب اظہارِ رائے کے طریقے اور دیگر متعلقہ مسائل اہمیت کے قابل نہیں، اصل چیز حکومت کے امیر و رئیس اور اس کے ارکان وعمال کا تقویٰ ہے"۔

اور پھر اس سیاسی تقویٰ کو جس طرح سمجھایا ہے، اس کو سمجھنے میں کسی دقت نظر کی ضرورت نہیں، لکھتے ہیں :

"یہ تقویٰ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی ذمہ داری کا قلبی و ایمانی احساس اور اس حقیقت کی تلقین ہے کہ حکومت کا کوئی جز کسی کی شخصی یا خاندانی ملکیت نہیں، بلکہ وہ خدا کی ملکیت ہے اور اس کے حکم یا منشا کے حکم کا نفاذ، حکومت کا فرض ہے، اور خدا کے بتائے ہوئے اور تعلیم کئے ہوئے احکام و فرائض میں سب مسلمانوں کی حیثیت یکساں ہے اور سب ہی ایک جیسے، اس کے بندے

Marfat.com

اور تابع فرمان ہیں''۔

تقویٰ کی بحث کو جاری رکھتے ہوئے اسلامی سلطنتوں اور عام سلطنتوں کا موازنہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''عام سلطنتوں کا اصول یہ ہے کہ وہ سلاطین و حکام اور سلطنت کے عمال کے قول و فعل کو قانون کے سلسلوں سے جکڑ دیتی ہیں کہ وہ حق و عدل کے خلاف نہ کرسکیں، لیکن اسلامی حکومت کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے حکمرانوں اور عاملوں کے دلوں پر اپنا قبضہ بٹھاتی ہے، تاکہ تقویٰ اور آخرت کے مواخذہ کے خوف اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کے جذبہ سے حق اور عدل کے خلاف نہ کرسکیں، عام حکومتیں ہر روز اپنے ہر قانون کی لاچاری اور بے اثری کو دیکھ کر دوسرا قانون بناتی ہیں، پھر تیسرا اور چوتھا قانون، پھر اسی طرح ہر قسم کی برائیوں کی روک تھام کے لئے مسلسل قانون بناتی رہتی ہیں اور مجرم اس کو اپنی چالاکی اور ہوشیاری سے برابر توڑتے رہتے ہیں اور سلطنت کا مقصود حاصل نہیں ہوتا، اس کے برخلاف اسلام کی سلطنت اگر اصول اسلام کے مطابق ہو تو صرف خدا کا تقویٰ اور آخرۃ کے مواخذہ کا ڈر ان کے دل کی یہ کجی اور عمل کی ہر برائی کو قطعاً ختم کردیتا ہے، جس کی بے شمار مثالیں عہدِ نبوت، زمانہ خلافت اور بعض نیک و عادل سلاطین کی سلطنتوں میں ملتی ہیں''۔

ایک بہت ہی پیچیدہ، عمیق اور متنازعہ مسئلہ کو کیسے ٹھنڈے لہجہ اور ٹھنڈی تحریر کے ذریعہ سے سمجھانے کی کوشش کی ہے، جو اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ ضرورت کے وقت وہ اپنی تحریر کے ذریعہ جذبات میں تلاطم اور تموج پیدا کرسکتے ہیں، لیکن جب غور و فکر کرنے اور کسی نتیجہ پر پہنچنے کی ضرورت ہوتی ہے، تو اس کے بے دعوتی انداز کی تحریر لکھ کر ذہن کو منور اور متجلی کرتے ہیں۔

۳۲۶۶ صفحے کی سیرۃ النبی کی پانچ جلدیں لکھ کر سید صاحبؒ نے جوئے شیر

Marfat.com

اسلامیہ کے فرہاد کا لقب حاصل کیا، لیکن اسی فرہاد نے ان جلدوں کے ذریعہ سے اپنی انشا پردازی کا جو قصر شیریں تیار کیا، وہ اسی کے ساتھ دوسرا اہم کارنامہ ہے، ان میں جو اندازِ بیان ہے، وہ دنیا کی کسی زبان کے عظیم ترین مصنفوں کے اسلوب کے مقابلہ میں رکھا جاسکتا ہے۔ ان کو عربی زبان پر بڑی قدرت تھی، وہ اس کے بڑے اچھے اہل قلم تھے۔ ان کو فارسی زبان پر بھی دسترس حاصل تھی۔ وہ انگریزی زبان سے بھی اچھی طرح واقفیت رکھتے تھے۔ اس کی اہم کتابیں اور اخبارات برابر ان کے مطالعہ میں رہتے۔ اردو تو ان کی مادری زبان تھی ہی لکھنؤ میں تعلیم پائی اور اپنی عمر کا زیادہ عرصہ یہیں گزارا، پھر علامہ شبلی کی صحبت برابر حاصل رہی۔ ان تمام اثرات کی وجہ سے ان کی تحریروں میں عربی زبان کی جزالت، شوکت اور حشمت آئی۔ فارسی زبان کی فصاحت، بلاغت، حلاوت اور تمکنت غیر شعوری طور پر ان کی تحریروں میں منتقل ہوتی رہی، پھر شاید ان کو بھی خبر نہیں رہی کہ انگریزی زبان کے طرز ادا کی برجستگی اور روانی ان کی تحریروں کا پیچھا کرتی رہی۔ علامہ شبلی کی انشا پردازی کا وصف اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ سرسید نے ایک کان سے اردو کی نثر نگاری کا ایک ہیرا نکالا۔ حالی نے اس کو جلا دی، نذیر احمد نے اس میں چمک پیدا کی اور محمد حسین آزاد نے اس میں دمک عطا کی، مگر جس نے اس ہیرے کو کوہِ نور بنا دیا، وہ علامہ شبلی نعمانیؒ ہیں۔ اس کوہِ نور کا پرتو ان کی بزم کے صدالصدور کی تحریر میں دکھائی دیتا ہے۔

سیرۃ النبی کی ان پانچوں جلدوں میں کہیں تو اس کا اسلوب ایسا ہے جو کسی باوقار مفسر کا ہونا چاہئے، کہیں اس کا اندازِ بیان وہ ہے، جو باوزن محدث کا ہوتا ہے، کہیں اظہارِ رائے وہی ہے جو ایک دیدہ ور فقیہ کے یہاں تلاش کی جاتی ہے، کہیں فکر کی گہرائی ایسی دکھائی دیتی ہے جو ایک فلسفی کے طرزِ ادا میں پائی جاتی ہے، کہیں تحریر کا وہ مؤرخانہ رنگ ہے جو ایک فاضل مؤرخ کے یہاں پایا جاتا ہے، کہیں طرزِ استدلال وہ ہے جو ایک متکلم سے متوقع ہوتا ہے، کہیں رجز خوانی کا وہ انداز ہے، جو سالارِ کارواں کے منہ سے سنائی دیتا ہے،

Marfat.com

کہیں وہ حدی خوانی ہے، جو منزل کے طے کرنے میں مدد دیتی ہے۔ ان ہی اجزائے ترکیبی سے سیرۃ النبی میں ان کی تحریروں میں وہ انشاپردازانہ رنگ پیدا ہو گیا ہے، جس کے سہارے اس کے مطالعہ سے نشاط و انبساط کی کیفیت طاری رہتی ہے۔ یہی ساری خوبیاں ہیں، جن کی وجہ سے خوش مذاق مسلمان، قرآن مجید کے بعد ان جلدوں کو رکھ کر اپنے گھروں کی زینت اور برکت میں اضافہ کرنا پسند کرتے ہیں۔

جمالِ یوسفؒ

تصنیف : مولانا عبدالقیوم حقانی

محدث العصر حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ کا تذکرہ و سوانح، تحصیل اور تکمیل علم، فقر و درویشی، عبدیت و انابت، عشقِ رسول ﷺ و اتباعِ سنت، درس و تدریسِ حدیث، محدثانہ جلالتِ قدر، عظیم فقہی مقام، فضل و کمال، دینی و علمی کارنامے، سیرت و اخلاق، مجاہدانہ کردار، دعوت و تبلیغ، تصنیف و تالیف، قادیانیت کا فاتحانہ تعاقب، اعلاء کلمۃ الحق کے لئے مساعی و جہاد ...... الغرض دلچسپ، جامع اور بعض رُلا دینے اور عمل صالح کی انگیخت کرنے والے حیرت انگیز واقعات۔

ناشر

القاسم اکیڈمی ' جامعہ ابوہریرہ

برانچ پوسٹ آفس خالق آباد نوشہرہ، سرحد، پاکستان

Marfat.com

القاسم اکیڈمی کی تازہ ترین عظیم علمی اور فقہی پیش کش

اسلامی آدابِ زندگی

تحریر ! محمد منصور الزمان صدیقی

پیشِ لفظ ! مولانا عبدالقیوم حقانی

قرآنی تعلیمات، احادیثِ نبوی، عبادات، معاملات، اعمال کے فضائل، بلندیٔ اخلاق و خصائل، محبت و اطاعتِ رسول، محرمات سے اجتناب، منہیات کی نشان دہی، فرقِ باطلہ کا تعاقب، ردِّ بدعات، دعوتِ سنت و اتحادِ امت، خدمتِ انسانیت ...... الغرض زندگی کے ہر موڑ پر رہنمائی کے ہدایات سے معمور، مہد سے لحد تک اہم ضروری مسائل و احکام، سلیس اور بامحاورہ زبان میں ایک مطالعاتی معلّم اور محسن کتاب، اپنے موضوعات کے تنوع، تفہیم و تسہیل، افادیت اور تعلیم و تربیت کے حوالے سے ایک لاجواب کتاب۔

صفحات : 938 .... ریگزین .... قیمت : 350

القاسم اکیڈمی، جامعہ ابوہریرہ

برانچ پوسٹ آفس خالق آباد نوشہرہ

Marfat.com

مولانا محمد اللہ بخش ایاز ملکانوی مدظلہ

انتخابِ لاجواب

ماہنامہ القاسم کی خصوصی اشاعت مولانا سید سلیمان ندویؒ نمبر میں بندہ ناتواں کو علامہ عبدالقیوم حقانی کی طرف سے کچھ تحریر کرنے کا حکم ملا ...... ع

"پس حکم حاکم مرگ مفاجات"

اس لئے کہ میرے اپنے خیال تئیں مخدوم عالی قدر فاضل حقانی کا شمار ان چند نفوس قدسیہ میں سے ہے کہ جن کا حکم نہ ٹالا جا سکے اور نہ بجالایا جا سکے، گویا نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن والا معاملہ ہے، ورنہ کہاں سید الملت والدین علامہ ندویؒ کی ذات والا صفات جہاں ہر کمال کو اوج کمال حاصل ہوا ہے اور کہاں یہ ذرہ بے مقدار جہاں بے کمالی بھی کمال نہ پا سکی ...... ع چہ نسبت خاک را با عالم پاک

گرامی قدر مولانا حقانی کاروانِ سلیمانی میں ہدہد کی غیر حاضری اور پھر عتاب سلیمانی کے قصہ ماضیہ کا پھر سے اعادہ نہ چاہتے تھے۔ اس لئے دعوت شرکت دے کر احسان فرمایا۔ جزاہ اللہ تعالیٰ احسن الجزاء۔

بہرحال تعمیل حکم پر چند بے ربط و جوڑ، بے ترتیب باتیں ریشمی قبا میں پیوند ٹاٹ کے طور پر تحریر خدمت ہیں ...... ع گر قبول افتد زہے قسمت ورنہ تو شکایت کیا

سفیر شام کی ایک علمی الجھن کا حل :

ایک ملاقات کے دوران سفیر شام نے فرمایا کہ مجھ کو ایک علمی اُلجھن ہے، جو کئی

Marfat.com

علماء سے حل نہ ہو سکی، وہ یہ ہے کہ یہودیوں کے متعلق قرآن پاک میں تو یہ تصریح ہے کہ "ضُرِبَت عَلَیھِمُ الذِّلَّةُ وَالمَسْکَنَةُ" اور احادیث نبویؐ سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم کبھی دنیا میں باآبرو حاکم قوم نہیں رہے گی، پھر آج فلسطین میں ان کی حکومت کیسے قائم ہے ...... ؟

حضرت والاؒ نے ایک لحہ تامل کے بغیر فرمایا کہ اس کا جواب تو قرآن پاک ہی میں خود موجود ہے۔ راقم حقیر نے اشارہ پا کر حمائل شریف پیش کر دی۔ حضرت والاؒ نے فوراً سورہ آل عمران کی یہ آیت پاک نکال کر سُنا دی: "ضُرِبَتْ عَلَیھِمُ الذِّلَّةُ اَیْنَ مَا ثُقِفُوْا اِلَّا بِحَبْلٍ مِنَ اللّٰہِ وَ حَبْلٍ مِنَ النَّاسِ" (ماری گئی ان پر ذلت جہاں کہیں بھی پائے جائینگے، بجز اس کے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رسی تھام لیں یا الناس کی رسی) اور اس کی تشریح میں فرمایا کہ حبل اللہ تو دینِ اسلام ہے اور "حبل الناس" سے مراد ورلڈ پاور (عالمی طاقت) ہے یعنی وہ دین میں داخل ہو جائیں یا کسی عالمی طاقت کا سہارا لے لیں تو البتہ ان کی ذلت دور ہو سکتی ہے۔ چنانچہ دنیا جانتی ہے کہ اسرائیل کی حکومت محض انگریز و امریکہ کے بل بوتہ پر قائم ہے۔ اس جواب سے سفیر شام اچھل پڑے اور فرمایا واللہ آج تک کسی نے اس آیتِ پاک کی طرف رہبری نہیں کی تھی، آج پوری تشفی ہوگئی۔

اس کے بعد سفیر شام مذکور نے جماعت اسلامی اور تبلیغی جماعت سے متعلق حضرت والاؒ کی شخصی رائے دریافت فرمائی۔ ارشاد ہوا کہ جماعت اسلامی دین کی سیاسی تعبیر پیش کرتی ہے اور تبلیغی جماعت دینِ خالص کی داعی ہے۔ سفیر صاحب کی ذہانت اس جواب کی گہرائی کو پا گئی اور انہوں نے اظہارِ مسرت و تحسین فرمایا، پھر عقیدت و محبت کے لہجہ میں ایک اور سوال کیا کہ مولانا مودودی اور مولانا ابوالحسن علی ندوی میں آپ کے نزدیک کون بڑا عالم ہے؟ جواب بغیر تقابلی طرز اختیار کیے ہوئے صرف یہ عطا ہوا کہ مولانا ابوالحسن علی ندوی تو ایک بڑے عالم ہیں۔ اس پر سفیر صاحب نے کہا خوب خوب۔

Marfat.com

محاسنِ گفتار :

علامہ سید سلیمان ندویؒ گو کم سخن تھے، مگر ان کی زبان جواہر رولتی تھی، حضرت کے چھوٹے چھوٹے صاف وسادہ جملے اہلِ فکر کے لئے کلیدِ علم وحکمت ہوتے تھے۔ چند نمونے بطورِ ملاحظہ پیش خدمت ہے۔

(۱) فرمایا کہ ''لا الٰہ الّا اللّٰہ'' میں الٰہ کا لفظ ساری صفاتِ الٰہیہ کا جامع ہے، جب کبھی اس کے مفہوم کو کسی ایک صفت کے ساتھ خاص کر کے اس کلمہ کی توجیح کی گئی، تو گمراہی کا دروازہ کھل گیا، جیسے صوفیاء نے ''لا الٰہ'' کے تعبیر ''لاموجود'' سے کی ہے۔ اس کا نتیجہ وحدۃ الوجود اور اس کی موشگافیوں کی صورت میں ظاہر ہوا اور آج مودودی صاحب لا الٰہ کی تعبیر ''لا حاکم'' سے کر رہے ہیں۔ لہٰذا ان کو سارا دین سیاست وحکومت ہی نظر آتا ہے۔

(۲) ایک سالک طریق جو معاشیات کے گریجویٹ تھے اور ذکر میں فائدہ محسوس نہ کرتے تھے، انہوں نے جب اپنی اس ناتشفی کا اظہار کیا تو حضرتِ والاؒ نے ارشاد فرمایا کہ جب انسان کو بھوک لگتی ہے، تو وہ گھونٹ گھونٹ کر کے پیتا ہے۔ پہلے دوسرے یا تیسرے گھونٹ میں اس کی کوئی تسکین نہیں ہوتی، لیکن بالآخر ایک نوبت پر وہ سیر ہو جاتا ہے، مگر اس کے معنیٰ یہ تو نہیں ہوتے کہ بس آخری ہی گھونٹ نے اس کو سیراب کر دیا اور پہلے سارے گھونٹ بے فائدہ رہے۔ نہیں بلکہ فائدہ آخری گھونٹ پر ''محسوس'' ہوا۔ پہلا گھونٹ نہ پیا ہوتا تو آخری کی نوبت کہاں آتی۔ یہی حال کا ذکر ہے۔ مداولت ہو تو بالآخر یہ اثر دکھا کر رہتا ہے، گو اس کا نفع اول ہی روز سے شروع ہو جاتا ہے۔

(۳) غیر اللہ سے استمداد :

غیر اللہ سے استمداد کی جو صورتیں مسلمانوں نے پیدا کر رکھی ہیں، اس کا رد فرما رہے تھے اور حاضرین میں زیادہ تعداد تعلیم یافتہ حضرات کی تھی، مسکراتے ہوئے ارشاد فرمایا: بدعتیوں نے اللہ میاں کی حکومت کو بھی بس شاہِ انگلستان کی حکومت سمجھ رکھا ہے کہ نام بادشاہ

Marfat.com

کا اور اختیارات پارلیمان کے۔ زبان پر لا الٰہ الا اللہ باقی جو مانگنا ہے وہ بڑے پیر صاحب سے خواجہ اجمیری اور دوسرے اولیا اللہ سے۔

شرک کی قباحت کے اظہار کا اس سے بہتر، واضح اور مؤثر ترین پیرایہ خصوصاً نو تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے اور کیا ہو سکتا ہے۔

درپیش خطرہ اور اس کا ازالہ :

سالک طریقِ معرفت کو یہ خطرہ لاحق ہوا کہ اعمالِ صالحہ پر تو گو دوام نصیب ہے، مگر ان کی قبولیت کا کیا بھروسہ؟ یہ خطرہ انہوں نے اور جگہ بھی پیش کیا، مگر کہیں تشفی نہیں ہوئی تھی ...... بالآخر انہوں نے حضرت والاؒ سے اپنی پریشانی کا اظہار فرمایا۔ حضرت نے ان سے پوچھا کہ کبھی بنک کے نام چیک لکھ کر بھی شبہ ہوتا ہے کہ نہ معلوم قبول ہو یا نہ، دستخط ملیں یا نہ ملیں؟ انہوں نے جواب دیا نہیں، حضرت والاؒ نے فرمایا کہ معاملہ تو یہ بھی محتمل تھا، مگر یہاں احتمال پر یقین غالب رہا، اور حق تعالیٰ کے معاملہ میں کھٹک باقی رہ جاتی ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے اور ان سے سچا کس کا وعدہ ہو سکتا ہے کہ جو طاعت ان کے حکم کے مطابق ہو، اس کو وہ قبول کرتا ہے۔

مقصودِ تصوف :

ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا، سلطان الاذکار وغیرہ اور کشف قبور اور اس قبیل کی دوسری چیزیں تصوف نہیں، بلکہ تصوف کا آرٹ ہے، آرٹ میں حقیقت کہاں، تصوف کا مقصود تو رضائے الٰہی اور اتباعِ سنت ہے، ہاں اس سلسلہ میں از خود کوئی بات حاصل ہو جائے، تو وہ اور بات ہے۔

اتباعِ سنت کا مفہوم :

اتباعِ سنت بس اسی کا نام نہیں کہ وضع و قطع مطابق سنت کر لی جائے، بلکہ کامل

Marfat.com

اتباع یہ ہے کہ فکر ونظر اور جذبات واحساسات بھی ذوقِ نبوی کے تابع ہو جائیں''۔

راہِ قناعت :

فرمایا آمدنی کثرت مدخل کا نام نہیں بلکہ قلت مصارف کا نام ہے۔ پس نظر کسب سے زیادہ صرف کی مدات پر رہنی چاہئے، یہی قناعت کی راہ ہے۔

خلاصۂ ذکر :

ذکر ہر حال میں کرنا چاہئے، اگر لذت ہے تو نعمت، ورنہ ادائے فرض کی نعمت تو بہرحال حاصل ہے .... ؎

بہرحال بندہ پہ ہے بندگی
کرم ہے جو ذوقِ عبادت ملے

ذکر کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق اذکرونی اذکرکم تم مجھے یاد کرو، میں تمہیں یاد کروں گا۔ اس سے بڑھ کر نعمت کیا ہو سکتی ہے کہ ذاکر کو بوقت ذکر خود اللہ تعالیٰ یاد کرتے ہیں، ذرا اس کا تصور تو کیجئے کہ جب اللہ کہے تو تصور کے کان سے سُنے کہ عبدی کی آواز آئی ہے، خوب سمجھ لیجئے کہ تصور ایک منصوص حقیقت کو متحضر کرنے کے لئے باندھا جا رہا ہے یہ کوئی نرا تصور نہیں .... ؎

اس سے بڑھ کر اور کیا میرے لئے انعام ہے
آپ خود سنتے ہیں آکر جو میرا پیغام ہے

کیا دوا کے استعمال سے غرض طلب صحت ہے یا لذت کام و دہن، اگر یہ میسر آجائے تو فبھا، ورنہ دوا سے انکار تو نہیں کیا جائے گا۔

ذکر میں انتشارِ خیال سے پریشان نہ ہونا چاہئے، اللہ تعالیٰ نے قلب و دماغ کو ایسا ہی بنا دیا ہے کہ اس میں حرکت فطری ہوتی ہے۔ یہ شاہی شاہراہ ہے، آپ کون اس پر پہرہ

Marfat.com

بٹھانے والے کہ اس شاہی شاہراہ پر چوپڑے چارنہ چلنے پائیں۔ آپ اپنی راہ چلئے، وہ اپنی راہ چلیں۔ حسب تجویز اعلیٰ حضرت حاجی امداداللہؒ آپ یہ خیال کیا کیجئے کہ اللہ اکبر اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے کہ دل کے ایک قطرہ میں خیالات کا سمندر بھر دیا ہے، اللہ رے اس کی عظمت و کبریائی، اس تصور سے یہ خیالات پریشان معرفت کے آیات بن جائیں گے۔ ایسے وقت میں یہ شعر پڑھ لیا جائے ....

دور باش افکار باطل دور باش اغیار دل
سج رہا ہے شاہ خوباں کے لئے دربار دل

اسلامی سیاست اور اس کے انقلابی خدوخال

رشحاتِ قلم : مولانا عبدالقیوم حقانی

سیاست کا مفہوم اور اس کے بنیادی خدوخال، مروجہ سیاست کی اصلاح اور دینی سیاست اپنانے کی ضرورت، دینی و سیاسی جماعتوں کا کردار، قیادت کا انتخاب اور فرائض، نظامِ تعلیم، سیاست کی خشتِ اوّل، مغربی جمہوریت بمقابلہ نظامِ شریعت، اسلام ایک پاکیزہ نظریہ سیاست اور انقلابی ضابطۂ اخلاق، فسطائی سیاست اور اس کا بدترین انجام، اسلام کا معاشی نظام، سودی نظام اور اس کی معزتیں، فحاشی و عریانی کی یلغار، خوف و ہراس کا تسلط' جدید مگر اچھوتے انداز میں نمایاں کیا گیا ہے۔ کئی تحریکوں اور کئی شخصیتوں سے متعلق ایک تاریخی دستاویز، ایک انقلابی تحریر جو سیاست ادب، صحافت، تاریخ اور نئی نسل کو ولولہ تازہ بخشتی ہے۔ ہر لکھے پڑھے مسلمان اور غلبہ دین کی جدوجہد کرنے والے بہی خواہان ملت کے لئے اس کا مطالعہ روشن مستقبل کی ضمانت ہے۔ عمدہ کتابت، شاندار طباعت، مضبوط جلد بندی۔

صفحات : 304 .... قیمت : 120 روپے

القاسم اکیڈمی جامعہ ابوہریرہ' برانچ پوسٹ آفس خالق آباد، ضلع نوشہرہ، سرحد، پاکستان

Marfat.com

محمد فرمان نیپالی ندوی

علامہ سید سلیمان ندویؒ

کی تفسیری نکتہ سنجیاں ...... چند مثالیں

علامہ اقبال علیہ الرحمۃ نے سید الطائفہ علامہ سید سلیمان ندویؒ کے بارے میں کہا ہے کہ ''سید صاحبؒ علوم اسلامیہ کے جوئے شیر کے فرہاد ہیں''۔ ڈاکٹر اقبالؒ کا یہ معنی خیز جملہ اپنے اندر فکر و نظر کے مختلف زاویوں کو سموئے ہوئے ہے۔ اقبال علم کی تقسیم کے قائل نہیں، وہ اس کو جزو لا یتجزی سمجھتے ہیں، جو لوگ اس کو قدیم و جدید کے خانوں میں رکھتے ہیں، وہ ان کو کم عقل مانتے ہیں، ان کا یہ مصرعہ اس کی قوی دلیل فراہم کر رہا ہے کہ ......

ع　　دلیل کم نظری قصۂ قدیم و جدید

اور مفکر اسلام حضرت مولانا کے بقول ''علم ایک اکائی ہے، جو بٹ نہیں سکتی، اس کو قدیم و جدید، مشرقی و مغربی، نظری و علمی میں تقسیم کرنا صحیح نہیں (دیکھئے، علم کا مقام اہل علم کی ذمہ داریاں، مؤلفہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی ص ۷، مطبوعہ مجلس تحقیقات و نشریاتِ اسلام، لکھنؤ) اس زاویۂ نگاہ کے تناظر میں اگر سید صاحبؒ کے تمام علمی ذخائر پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے تو ان کی علمی عبقریت ہر میدان میں کھل کر عیاں ہو جائے گی۔ صرف علامہ شبلی نعمانی اور سید صاحبؒ کی تصنیف کردہ سیرۃ النبیؐ ہی علوم اسلامیہ کا ایک ایسا گنجینہ ہے، جسے اسلامی انسائیکلو پیڈیا کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ اس مختصر مضمون میں جملہ اسلامی علوم میں سید صاحبؒ کی خدمات کا استقصاء مقصود نہیں، کیونکہ یہ دریا کو کوزے میں بند کرنے

Marfat.com

کے مرادف ہے۔

اسلامی علوم میں قرآن کریم منبع صافی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی سے سارے چشمے پھوٹتے ہیں۔ حدیثی سوتے بھی اسی سے نکلتے ہیں، قرآن کریم وہ بحر بیکراں ہے کہ اس میں ہزاروں سفینے ڈالے جائیں تو اس وقت بھی اس کی وسعت ضیق و تنگی کا شکوہ نہیں کرے گی، بلکہ ھل من مزید کی صدائے مسلسل آتی رہے گی۔ وحید العصر علامہ سید سلیمان ندویؒ نے اسی اصل سے اپنے رشتہ کو جوڑا، اور اسی ساحل سے اپنی کشتی حیات کو ایسا وابستہ کیا کہ اس نے انہیں کبھی ڈانواں ڈول ہونے نہیں دیا۔ اس کی شہادت ان کے ایک ہونہار اور بین الاقوامی شہرت کے حامل شاگرد حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے دی ہے۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے الفاظ ہیں :

"عام طور پر لوگ سید صاحبؒ کو مؤرخ، ادیب کی حیثیت سے جانتے ہیں، خصوصاً قدیم حلقہ میں ان کا تعارف اسی سلسلہ سے ہے، لیکن مجھے سید صاحبؒ کی علمی صحبتوں اور ذاتی استفادہ سے معلوم ہوا ہے کہ ان کا امتیازی مضمون قرآن مجید اور علم کلام ہے"۔ (ملاحظہ ہو، پرانے چراغ ج ۱، ص ۵۸، مؤلفہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور دعوت فکر و عمل ص ۱۸۸، مطبوعہ مجلس تحقیقات و نشریاتِ اسلام)

علامہ سید سلیمان ندویؒ کا اصل موضوع قرآن تھا، جس جگہ لکھتے، جہاں بھی کچھ لکھنے کی نوبت آتی، ان کے شگفتہ قلم سے تابدار موتی نکلتے، جو رشحات و شذرات کی حیثیت رکھتے اور بالفاظ دیگر وہ یہ کہنے کے لائق تھے کہ ......

ع آنچہ کردم ہمہ از دولت قرآں کردم

مفسرین اور اُصول تفسیر کے ماہرین کے یہاں تفسیری مباحث کو متعین کرنے کے سلسلہ میں ایک اُصول رہا ہے کہ خود قرآن کریم کی ایک آیت کو اسی کے مثل دوسری آیت کی روشنی میں دیکھا جائے، قرآن کریم نے ایک واقعہ کو مجمل اور کہیں مفصل بیان کیا

Marfat.com

ہے، جو اس کی حکمت کی زندہ مثال ہے۔ اسی کو اصطلاحِ تفسیر میں "تفسیر القرآن بالقرآن" کہا جاتا ہے۔

سید صاحب نے بھی اسی کلیہ کو اپنے سامنے رکھا اور اس کو انہوں نے ایک لمحہ کے لئے بھی فراموش نہیں کیا۔ وہ زمان و مکان کے اعتبار سے قرآنی آیات کی تفسیر پر ایسی قدرت رکھتے تھے، جس کی مثال نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ سید صاحبؒ کو اللہ تعالیٰ نے بلا کا ذہن عطا فرمایا تھا۔ قرآنی نکات کے استخراج میں ان کو خاصی مہارت تھی۔ قرآن کا یہ خاص طریقہ ہے کہ آیت کے اختتام پر اللہ کے توصیفی اسماء و صفات کا ذکر کرتا ہے۔ بعض دیگر مفسرین ان کے تئیں گویا ہوتے ہیں، تو کہتے ہیں کہ یہ اسماء الٰہی صرف اور صرف جذب اعتقاد اور ایمان و ایقان کو بالیدگی بخشنے کے لئے آئے ہیں، لیکن سید صاحب نے یہاں نکتہ آفرینی کی ہے اور سلف کے طریقہ کار سے ذرہ برابر بھی نہیں ہٹے، خط مستقیم پر سفر کرنا ان کی فطرتِ ثانیہ ہے۔ انہیں راہِ حق میں ہر گام حادثات سے تعارف ہوتا ہے، لیکن وہ مسکرا کر حسب روایت گذر جاتے ہیں، سید صاحب فرماتے ہیں کہ اللہ کے جو اسماء و صفات کتاب اللہ میں مذکور ہیں، ان کا ماسبق سے غایت درجہ ربط ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ نساء کی آیت نمبر ۱۵۸ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر اٹھائے جانے کا ذکر ہے اور اخیر میں "و کان اللّٰہ عزیزا حکیما" آیا ہے۔ ایسے مواقع پر سید صاحبؒ کی قرآنی بصیرت خوب خوب آشکارا ہوتی ہے، وہ آیت کے اس ٹکڑے پر حاشیہ دے کر تحریر فرماتے ہیں کہ :

"کونہ عزیزا حکیما ، یقتضی أی یکون الرفع أمراً عظیما إلا کان العزۃ والحکمۃ فی غیر موضعہ (یعنی اللہ تعالیٰ کی صفت غلبہ و حکمت کا ذکر اس کا مقتضی ہے کہ رفع الی السماء ایک عظیم کام تھا۔ اگر طبعی موت کا واقعہ ہوتا تو یہ بات سنت عادیہ تکوینیہ کے نوع میں آتی۔ اس میں غلبہ و قدرت کا اظہار نہ کیا جاتا، یہ کام ایک مافوق

Marfat.com

الطبعیات کرشمہ کی طرح پیش آیا۔ سید صاحب اپنی اس نکتہ آفرینی میں راہِ سلف سے ذرہ برابر بھی نہیں ہٹے، بلکہ انہوں نے اپنی دقیقہ سنجی کی وجہ سے متاخرین میں اپنی عبقریت وامتیاز کا ثبوت دیا ہے۔ یہیں سے یہ بات سید صاحبؒ کی قرآن ڈکشنری میں مرقوم ہوجاتی ہے کہ آیاتِ احکام صفت حکمت کا جوظہور قرآن میں ہوا ہے، وہ اسی مقام کے لائق ہے اور عقائد وایمانیات کا عزت وسطوت سے غایت درجہ تعلق ہے۔ لہٰذا وہ اس سے ہم آہنگ ہیں''۔ (دیکھئے، افکارِ سلیمانی، مرتبہ مولانا مجیب اللہ ندوی ص ۳۵)

اللہ کی صفات جمالی اور جلالی کا قرآن مجید میں جابجا تذکرہ ہے، جن سے اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور وسعتِ تامہ کا اندازہ ہوتا ہے، کیونکہ صفات ہی سے انسان اللہ تعالیٰ کو جانتا اور اس کا اعتقاد رکھتا ہے، صفات جمالی یعنی وہ اسماء وصفات جن سے خدا کی بڑائی، کبریائی اور شہنشائی کا اظہار ہوتا ہے، ان کے متعلق سید صاحبؒ فرماتے ہیں کہ:

''خدا کی صفاتِ جلالی کا ذکر زیادہ تر تورات میں ہے، لیکن صحیفۂ محمدی میں جہاں کہیں خدا کی ان صلاحیتوں کا ذکر آتا ہے، ہمیشہ ان کے ساتھ ساتھ خدا کے عادل، حکیم اور علیم ہونے کا بھی ذکر ہوتا ہے، جس سے انسان کی اس غلط فہمی کو مٹانا مقصود ہے کہ خدا کی ان صفتوں کا منشا یہ نہیں ہے کہ وہ نعوذ باللہ ایک لا اُبالی کی طرح دم کے دم میں جو کر گزرتا ہے بلکہ اس کا قہر، اس کا غلبہ، اس کا انتقام اور اس کی گرفت، عدل وانصاف اور حکمت ومصلحت پر مبنی ہوتی ہے اور اسی طرح ان جلالی ناموں سے بے رحمی اور ظالمانہ سخت گیری کا جو شبہ پیدا ہوسکتا ہے، وہ دور ہوجاتا ہے''۔ (سیرت النبیؐ جلد ۴ ص ۲۶۴) اس مسئلہ پر مزید وضاحت کے لئے سید صاحبؒ کی ایک اور نقطہ آفرینی پر نظر کیجئے۔ سورہ شوریٰ کی آیت ہے کہ:

وما كان لبشر إن يكلمه الله إلا وحيا أو من وراء حجاب أو يرسل رسولا فيوحي باذنه مايشاء إنه علي حكيم۔

''اور کسی نبی کی یہ تاب نہیں کہ اللہ اس سے بات کرے، لیکن وحی (اشارہ) سے یا

Marfat.com

پردہ پیچھے سے یا کسی قاصد کو بھیجے تو وہ خدا کے حکم سے، خدا جس کو چاہے، اس کو وحی کر دیتا ہے بے شک اللہ بلند اور حکمت والا ہے''۔

سید صاحبؒ فرماتے ہیں کہ :

''اس کی بلندی و برتری کا اقتضا تو یہ ہے کہ وہ کسی کو اپنے مکالمہ کے شرف کا مستحق نہ سمجھے، مگر اس کی حکمت کا اقتضا یہ ہے کہ وہ اپنے بندگانِ خاص سے عام بندوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے ان تین غیر معمولی طریقوں میں سے کسی طریقہ سے گفتگو فرمائے''۔

(سیرۃ النبیؐ جلد ۴، مصنفہ علامہ سید سلیمان ندویؒ ص ۴۵، مطبوعہ مکتبہ مدینہ لاہور)

قرآنِ کریم ایک زندۂ جاوید کتاب ہے۔ اس میں ہر درد کا درماں اور ہر زہر کا تریاق ہے۔ مخالفین کی طرف سے جب بھی کوئی اشکال ہوا، تو علمائے حق نے مسئلہ کی نوعیت کو سمجھ کر قرآنی آیات سے استنباطات کر کے اس کا جواب دیا۔ نبوت کی زبان فیض ترجمان اس سلسلہ میں کچھ اس طرح گویا ہوئی ہے کہ **لا تنقضی عجائبہ و لا تبلی جدتہ** یعنی قرآن کے عجائبات کبھی ختم نہیں ہوتے اور نہ اس میں کہنگی طاری ہوگی اور بقول مولانا عبداللہ عباس ندوی کہ قرآن کا موضوع اب بھی ایسا نظر آتا ہے کہ گویا یہ آیت آج ہی اتری ہے، اس کی تازگی و شادابی میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا۔ (ملاحظہ ہو، دعوت و تبلیغ کا معجزانہ اسلوب، مؤلفہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی ص ۱۴)

یہی وجہ ہے کہ سید صاحبؒ نے ہر مسئلہ کے حل کے لئے براہِ راست قرآن کی طرف رجوع کرنے کی دعوت دی ہے۔ بعض طبقوں میں یہ مزاج بن گیا ہے کہ علماء مسائل کی تفتیش فقہ و فتاویٰ اور سیدھے سادے انداز میں لکھی گئی کتابوں میں تلاش کرتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ سامنے آیا کہ لوگ قرآن فہمی سے دور ہو گئے اور فقہی کتابوں پر قناعت کر لی گئی۔ کتبِ فقہ پر اکتفا کر کے قناعت کر لیا جاتا ہے، جب کہ یہ قرآن کو کماحقہٗ درخورِ اعتنا نہ سمجھنا ہے۔ ضرورت ہے کہ اہلِ دانش و بینش اس پہلو پر خصوصی توجہ مبذول کریں۔ سید صاحبؒ

Marfat.com

کے زمانہ میں بعض معاندینِ اسلام کی طرف سے یہ اشکال ہوا کہ اوقاتِ نماز کی کیا ضرورت؟ سید صاحبؒ نے کسی فقیہ کی لکھی ہوئی کتاب پر اعتماد کرنے کے بجائے براہِ راست قرآن کا مطالعہ کیا۔ (ندوہ نے اس سلسلہ میں تجدیدی کارنامہ انجام دیا کہ متنِ قرآن کو درس وتدریس میں داخل کیا۔ اس کی تقلید تقریباً تمام مدارس میں بھی کی گئی۔ مزید تفاسیر قدماء بھی شاملِ نصاب کی گئیں، جب کہ دیگر حلقوں میں اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہ تھی۔ دیکھئے دعوتِ فکر وعمل مؤلفہ، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ ص ۱۸۸) اس بحر میں غواصی کر کے اوقاتِ نماز کی حکمت کچھ اس طرح بیان کی :

''اسلامی نمازوں کے اوقات پر ایک غائر نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے روزانہ کے ان مختلف انسانی مشاغل کے ہر آغاز پر ایک وقت کی نماز رکھی ہے تاکہ پورے اوقات خدا کی یاد میں محسوب ہوں۔ نورِ ظہور کے وقت جب صبحؒ کی نسیم سحری حی علی الصلوٰۃ کا نغمہ جانفزا سناتی ہے اور ہر شے کی زبان سے عالم کے صانع کی تسبیح و تحمید کا ترانہ بلند ہوتا ہے، تو یہ وقت انسانوں کے سر جھکانے کے لئے نہایت موزوں ہے کہ کتاب زندگی میں حیات امروز کا ایک نیا ورق اس وقت کھلتا ہے، اس لئے مناسب ہے کہ اس دن کے کارناموں کی لوح پر سب سے پہلے سجدہ نیاز کا طغرا نقش ہو۔

(سیرت النبیؐ مؤلفہ سید سلیمان ندویؒ مطبوعہ مکتبہ مدینہ لاہور، جلد ۵ ص ۶۴)

قرآن کریم میں اوقاتِ نماز سے متعلق جو آیتیں آئی ہیں، ان میں ظہر اور عصر کی نمازوں کے اوقات کہیں مجمل اور کہیں مفصل ہیں، کہیں تو دونوں کو ایک لفظ 'قبل الغروب' یا ''اصیل'' یا 'طرف النہار'' کہہ کر بیان کیا گیا ہے۔ مثال کے لئے سورہ ق کی یہ آیت پڑھئے :

فاصبر علی مایقولون و سبح بحمد ربک قبل طلوع الشمس و قبل الغروب و من اللیل فسبحہ و أدبار السجود۔

Marfat.com

''پس ان مخالفوں کے کہنے پر اے رسول صبر کرو اور آفتاب کے نکلنے سے پہلے (صبح) اور اس کے ڈوبنے سے پہلے (عصر) اپنے پروردگار کی حمد و تسبیح کر، اور کچھ رات گئے (عشاء) پر اس کی تسبیح کر اور آفتاب کے سجدہ کرنے کے بعد یعنی غروب کے بعد (مغرب کے وقت) اس کی تسبیح کر''۔

لیکن سورۂ روم آیت نمبر ۲ میں ارشادِ باری ہے :

فسبحان اللہ حین تمسون وحین تصبحون ولہ الحمد فی السموات والأرض و عشیا و حین تظھرون۔

''اور اللہ کی تسبیح کرو جب شام (یا رات) کرو اور جب صبح کرو اور اس کی حمد آسمان اور زمین میں ہے اور اخیر دن کو اس کی تسبیح کرو اور جب ظہر کرو''۔

اس آیتِ پاک میں نزول کے بعد (ظہر) اور غروب سے قبل عصر کی نمازوں کی توضیح کی گئی ہے، مگر شام کی نماز (مغرب و عشاء) کے بارے میں اجمال ہے، دونوں کو ''حین تمسون'' سے ادا کر دیا گیا ہے۔ سید صاحب فرماتے ہیں کہ :

''اس سے اس جانب ایک لطیف اشارہ نکلتا ہے کہ یہ دونوں مل کر ایک بھی اور علیحدہ بھی ہیں، اسی بنا پر کسی اشد ضرورت اور سفر کی بے اطمینانی کے وقت ظہر و عصر کو ایک ساتھ اور مغرب و عشاء کو ایک ساتھ ملا کر بھی ادا کر سکتے ہیں اور صبح کی نماز چونکہ ہر آیت میں علیحدہ ذکر کی گئی ہے، اس لئے اس کا کسی دوسری نماز سے ملانا جائز نہیں ہے۔

غنیمت کے مال پر جو زکوۃ عائد ہوتی ہے، وہ خمس ہے، قرآن کریم میں ہے :

واعلموا أنما غنمتم من شئی فأن للہ خمسہ و للرسول و لذی القربیٰ و الیتامیٰ و المساکین و ابن السبیل۔ (انفال:۵)

''اور جان لو کہ جو کچھ تم کو غنیمت ملے، اس کا پانچواں حصہ خدا کے لئے اور رسول کے لئے اور قرابت مندوں کے لئے اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہے''۔

Marfat.com

سید صاحبؒ اس موقع پر ایک خاص بات سمجھانا چاہتے ہیں، وہ فرماتے ہیں :

''جہاد یا دشمنوں سے لڑائی کا اصلی مقصود دین کی حمایت اور اعلائے کلمۃ اللہ ہے۔ غنیمت کا مال حاصل کرنا نہیں اور کوئی صرف حصول غنیمت کی نیت سے دشمن سے لڑے، تو اس کی یہ لڑائی اسلام کی نگاہ میں جہاد نہ ہوگی اور نہ اس کا کوئی ثواب ملے گا۔ اس بنا پر درحقیقت وہ مال غنیمت جو لڑائی میں دشمنوں کے ہاتھ آتا ہے، ایک ایسا سرمایہ ہے، جو بلا قصد اور بلا محنت اتفاقاً مسلمانوں کو مل جاتا ہے۔ اس سے یہ نکتہ حل ہو جاتا ہے کہ جو سرمایہ کسی محنت کے بغیر اتفاقاً ہاتھ آئے، اس میں پانچواں حصہ نظام جماعت کا ہے یا حکومت کے مقررہ بالا مصارف کے لئے ہے''۔ (سیرۃ النبیؐ جلد ۵ ص ۱۱۸)

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اسلام کے تمام ارکان ذکر کئے ہیں، جن میں روزہ بھی ہے، قرآن نے روزہ کا حکم ان لفظ میں دیا ہے کہ :

فمن شهد منكم الشهر فليصمه (البقرۃ:۲۳)

''تو جو اس مہینہ کو پاوے تو اس مہینہ بھر روزہ رکھے''

سید صاحبؒ فرماتے ہیں کہ :

لفظ شہد کے لغوی معنی کسی مقام یا زمانہ میں موجود اور حاضر رہنے کے ہیں۔ اسی سے شہادت اور شاہد کے الفاظ نکلے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ یہ روزے اسی پر واجب ہیں، جو اس ماہِ صیام میں موجود اور حاضر ہو۔ اس ماہِ صیام میں غیر موجود اور غیر حاضر رہنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ماہِ صیام آئے اور شخص غیر حاضر ہو، یعنی اس دنیا میں موجود نہ ہو، جس میں وہ ماہِ صیام آیا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ شخص اپنی جگہ پر موجود ہو، مگر ماہِ صیام کا وہاں گزر نہ ہو، یہ صورت ان قطعات ارضی میں پیش آئے گی، جہاں روز و شب کا نظام موجود ہو، جو باقی متمدن دنیا میں ہے''۔ (حوالہ سابق ج ۵، ص ۲۴۶)

اسی طرح سید صاحبؒ نے سیرۃ النبیؐ جلد ۵ میں ''شکر'' کے بیان میں حمد کا ذکر کیا

Marfat.com

ہے۔ سید صاحبؒ فرماتے ہیں :

''جس طرح سارے قرآن کا نچوڑ سورۂ فاتحہ ہے، سورۂ فاتحہ کا نچوڑ خدا کی حمد ہے' اسی بنا پر قرآنِ پاک کا آغاز سورۂ فاتحہ پر ہے اور سورۂ فاتحہ کا آغاز الحمد سے ہے''۔

(سیرۃ النبیؐ جلد ۵، مؤلفہ مولانا سید سلیمان ندوی، ص ۴۷)

جو لوگ آخرت کے لئے کوشاں رہتے ہیں، تو ان کے لئے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ میوے سے لدے پھدے باغات میں رہیں گے، اسی کو قرآن میں کہیں ''جنات'' اور ''روضات'' سے ادا کیا گیا ہے، اس کی حکمت یہ بیان کی جاتی ہے کہ عرب کے بدو اور صحرائی افراد کے لئے آرام کی جگہ باغ ہی ہو سکتا تھا۔ اسی لئے ان مراعات میں باغ کا ذکر کیا گیا، اس طرح کی فکر سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن صرف عرب کے لئے نازل کیا گیا ہے۔ جب کہ حقیقت اس کے برخلاف ہے۔ سید صاحبؒ ان الفاظ یعنی ''جنات'' اور ''روضات'' کے استعمال سے نکتہ آفرینی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

''انسان کا گھر وہ عیش خانہ ہوتا ہے، جس میں حزن و غم کی آمیزش بھی ہوتی ہے، اہل و عیال اور دولت و مال کے متعلق ہر قسم کی فکریں، اس کے دل و دامن سے لپٹی ہوتی ہیں مگر جب انسان سیر و تفریح کے لئے باغ و چمن کا رخ کرتا ہے، تو تھوڑی دیر کے لئے وہ ہر غم کو بھول جاتا ہے اور ہر تعلق کو دل سے نکال دیتا ہے اور ایسا شاداں و فرحاں بن جاتا ہے کہ غم والم اس کے ہر گوشۂ خاطر سے دور ہو جاتے ہیں۔ وحیِ محمدی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام نے اس لفظ کو اسی لئے استعمال کیا ہے تاکہ اس سے اخروی عیش و مسرت، شادی و خوشی اور فراغِ خاطر کی بھی پوری تصویر کھنچ جائے''۔ (سیرۃ النبیؐ جلد ۴ ص ۴۲۱)

جیسا کہ پیچھے گزر چکا ہے کہ سید صاحب اولاً تفسیر القرآن بالقرآن کے قائل ہیں اس سلسلہ میں ان کی نہایت احتیاط اور سلامتِ فکر خوب جھلکتی ہے۔ بقولِ پروفیسر نثار احمد فاروقی :

Marfat.com

''تفسیر میں ان کی سلامتِ فکر کا اسلوب یہ ہے کہ وہ لفظِ قرآن کو سب سے پہلے قرآن ہی پر پرکھتے ہیں''۔ (افکارِ سلیمانی ص ۹۱)

پروفیسر فاروقی کے اس جملہ کی وضاحت کے لئے سطورِ ذیل ملاحظہ فرمائیں:

حضورِ اکرم ﷺ خاتم النبیین ہیں، لیکن ہر دور میں لوگوں کے مابین ایک ایسا گروہ ضرور پایا گیا ہے، جو ختمِ نبوت کا انکار کرتا ہے اور نبی موعود کا دعویدار رہا ہے۔ فی زمانہ مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کے متبعین اس کے تئیں کافی سرگرم ہیں۔ ختمِ نبوت کے انکار کے تعلق سے ان کی ایک دلیل یہ ہے کہ خاتم کے معنی ہیں، مایختم بہ یعنی مہر اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ کے رسول مہر کے مانند ہیں، جو سابقین ولاحقین انبیاء کی تصدیق کرتے ہیں۔ یہ تاویل وتشریح بعید از قیاس ہے۔

علمائے اہلِ سنت نے اس کے مختلف جوابات دیئے ہیں، جو ان کی دماغی اپج کے غماز ہیں، لیکن چونکہ سید صاحب ''پیش آمدہ مسائل کو حل کرنے کے لئے براہِ راست قرآن کو دیکھنے کے عادی ہیں، اس کے تئیں انہوں نے پورے قرآن کا جائزہ لیا، تو اس میں صرف دو جگہ اسی طرح کے الفاظ نظر آئے، جن سے یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ ختم کے معنی صرف مہر کے نہیں ہیں، بلکہ سیل کر دینے اور سلسلہ کو بند کر دینے کے ہیں۔ سورۂ بقرہ میں ہے، خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ یعنی اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی، یعنی نصیحت وارشاد ان کے قلوب میں راہ نہیں پا سکتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر مقصود یہ ہو کہ باہر سے کوئی اندر داخل نہ ہو سکے تو وہاں ختم استعمال ہوگا۔ دوسری جگہ ارشادِ ربانی ہے ...... خِتَامُهٗ مِسْكٌ (مطففین: ۲۶) یعنی شراب طہور جن ظروف میں ہوگی، انہیں مشک سے مہر بند کیا ہوا ہوگا، مہر بند کرنے کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ نہ باہر سے کوئی اندر داخل ہو سکے، نہ اندرون طرف جو کچھ ہے، وہ باہر نکل سکے، اس سے واضح ہوا کہ ختم نبوت سے مراد یہ ہے کہ انبیاء سلف کا جو

Marfat.com

طویل سلسلہ ہے، ان میں کسی نبی کو خارج نہیں کیا جا سکتا اور خاتم النبین کا مقصد صرف تصدیق انبیاء نہیں بلکہ سلسلہ نبوت کا ختم ہو جانا بھی قرآن کی مراد ہے۔

(افکارِ سلیمانی مرتب مولانا مجیب اللہ ندوی ص ۲۹)

یہ تو مختصر نمونے تھے سید صاحبؒ کی قرآن فہمی کے، ورنہ ابھی سید صاحبؒ کی قرآنی خدمات کے تحت تحقیق الفاظ، تفسیر قرآن، استنباط مسائل و دیگر متعلقات ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس مختصر مضمون میں [illegible] نہیں لیے جا سکتے۔

توضیح السنن

شرح

جامع السنن للامام النیمویؒ

(دو جلد مکمل)

تصنیف : مولانا عبدالقیوم حقانی

آثار السنن سے متعلق مولانا عبدالقیوم حقانی صاحب کی تدریسی، تحقیقی، درسی افادات اور نادر تحقیقات کا عظیم الشان علمی سرمایہ، علم حدیث اور فقہ سے متعلق مباحث کا شاہکار، مسلک احناف کے قطعی دلائل اور دلنشین تشریح، معرکۃ الآراء مباحث پر مدلل اور مفصل مقدمہ اور تحقیقی تعلیقات اس پر مستزاد۔

صفحات : 1376

القاسم اکیڈمی، جامعہ ابوہریرہ، برانچ پوسٹ آفس، خالق آباد، نوشہرہ، سرحد، پاکستان

Marfat.com

سلطان فریدی،

علمِ سیرت کا ایک روشن چراغ

<☆☆☆>

کہاں ہے ؟ کون ہے ؟ اُس کے مقابل علمِ سیرت میں
پسند آئی اُسے اس راہ میں تلقینِ شبلی جب
ادا کر حق ' ہُوا عہدہ برآ ، اُستادِ ذی شاں کا
نصیحت کی تھی جو کرنے کو ، پُورا کردیا وہ سب

کہیں ملّت کا غم لے کر کہیں سیرت پہ کچھ کہنے
سفر کرنا پڑا اُس کو سفر بھی خندہ رُوئی سے
کبھی کابل پسند آتا کبھی مدراس میں ہوتا
بچھائی قوم کو وحدت ' بچایا سب کو دُوئی سے

ادب ، تحقیق یا تاریخ ہو یا ہو سفر نامہ
کہیں نچلا نہیں بیٹھا قلم کو ہاتھ میں لے کر
کیا لبریز جب ہر چیز سے اُردو کے دامن کو
وطن اقبال کا پایا وطن مالُوف ہی دے کر

جہاں مکتب کوئی دیکھا جہاں مجلس کوئی پائی
وہاں سیّد کی سب شہکار تحریریں نظر آئیں
جہاں بھی نامِ ندوی سے چراغِ علم ہے روشن
وہاں بٹتی بہت ذی رُوح تنویریں نظر آئیں

چراغ اُس کا رہا جلتا اُجالے کا علم لے کر
وہاں پر روشنی ہوتی جہاں رہتا ، جہاں جاتا
نہیں بے فکر ہم سے اب بھی وہ جنت نشاں ہو کر
وہاں سے بھیجتا ہے روشنی وہ نور کا داتا

Marfat.com

مولانا سید عبدالرؤف صاحب اورنگ آبادی

حضرتؒ کا سلوک و تصوف اور طریقۂ تربیت

آہ ! علم و ادب، تاریخ و سیر میں یگانۂ روزگار، سلوک و تصوف میں ممتاز اور جملہ اسلامی علوم میں جامع و باکمال ہستی دنیا سے رخصت ہوگئی .... ے

خدایا بران تربتِ نامدار
بفضلت کہ بارانِ رحمت ببار

اور اپنی تحقیقاتِ علمیہ، حقائقِ دینیہ، نکاتِ احسانیہ اور رموز روحانیہ کے ایسے نقش و نگار چھوڑ گئی، جو مدتوں باقی رہیں گے۔ ایسی جامع کمالات ہستی صدیوں میں کہیں پیدا ہوتی ہے ...... ے

عمر ہا در کعبہ و بتخانہ می نالد حیات
تاز بزمِ عشق یک دانائے راز آید برون

علمی بزم کے تو وہ صدر نشین تھے ہی سلوک و تصوف میں بھی اُن کا بڑا درجہ تھا اور اس کے وہ اسرار و رموز اور معارف و حقائق بیان فرماتے کہ دل کیف یقین سے لبریز ہو جاتا ، اس مختصر مضمون میں اس کے بعض جلوے دکھائے جائینگے۔ اس راہ میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ علمی صدارت کی بھری مجلس میں اپنی علمی لغزشوں اور کوتاہیوں کا اعتراف اور ہر اس تحقیق و رائے سے جو کتاب و سنت کے موافق نہ ہو، رجوع کر کے ''از کردۂ ناصواب توبہ یارب'' کی صدا برملا بلند کی۔ عملی سلوک و تصوف کی یہ وہ تجلی تھی کہ مدعیانِ علم و عمل کی آنکھیں خیرہ ہو کر رہ گئیں۔ نفس پرستی کے اس دور میں محض رضائے الٰہی اور اتباع حق کے

Marfat.com

لئے اتنی بڑی ہستی کا اپنی قلمی لغزشوں کا اعتراف اور اس سے برأت کرنا عرفان حقیقت کے کمال اور فنائیت وفنائے نفس کی روشن دلیل ہے۔

فنائے ذات اور اتباعِ حق کی یہ وہ مثال تھی، جس پر خود شیخ طریقت نے مرید کی شان میں مدحیہ اشعار ارشاد فرمائے اور اس ناچیز کی عقیدتمندانہ نظر پہلی مرتبہ حضور والا رحمۃ اللہ پر پڑی۔ ناچیز اس زمانہ میں حضرت مجدد تھانویؒ کی بیعت سے مشرف ہو کر مولانا محمد عیسیٰ صاحب کے زیر تربیت تھا۔ حضرت والا رحمہ اللہ نے تحریر فرمایا کہ اگر وہ مصلح پسند نہیں ہیں، تو مناسبِ حال کوئی دوسرا مصلح منتخب فرمالیں۔ اس کے کچھ دنوں کے بعد حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ سے لکھنؤ اسٹیشن پر ملاقات ہوگئی اور شاہ گنج تک رفاقت کا شرف رہا۔ اس مختصر صحبت کا دل پر ایسا اثر پڑا کہ خط کے ذریعہ نذرِ عقیدت پیش کی۔ اس کے بعد حضور کے حسبِ طلب کئی مرتبہ آپ کے وطن دیسنہ میں حاضری کا موقع ملا اور دوسرے سفر میں لفظ بیعت و ارادت اور فیوض و برکات حاصل کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ اس کے بعد بارہا شرفِ زیارت حاصل ہوا، مگر پاکستان کی ہجرت کے بعد اس سے محرومی رہی۔ البتہ مراسلت کا سلسلہ برابر جاری رہا۔

اس دس سالہ مدت میں حضور کی زبان وقلم سے جو ارشادات نکلے ہیں، افادۂ عام کے خیال سے ان کے مختصر اقتباسات درج کئے جاتے ہیں کہ شاید ان سے کسی قلب سلیم کو فیض و برکت حاصل کرنے کی توفیق ہو، اس سے حضور کے سلوک و تصوف کی حقیقت اور آپ کے طریقۂ تربیت کا بھی اندازہ ہوگا۔

تواضع :

آپ میری نسبت یہ سمجھ لیں کہ یہ خاکسار حضرتِ والا رحمۃ اللہ علیہ کے خدام میں سب سے کمتر اور رُتبہ میں بھی فروتر ہے۔ اس پر بھی اگر اس ذرہ بیمقدار کی طرف اپنے دل کی کشش بے تکلف محسوس کریں تو ظاہر فرمائیں، ایسا نہ ہو کہ بعد کو پچھتاوا آئے، میرے

Marfat.com

حالات کو بھی تحقیق فرمالیں کہ میں اس قابل بھی ہوں، اگر ان سب باتوں کے بعد بھی دل کا میلان ہو تو خدمت سے انحراف نہیں۔

مقصدِ بیعت اور تفویض امانت :

بیعت کا مقصد تو یہ ہے کہ مرشد و مسترشد میں اس امر کا معاہدہ ہوتا ہے کہ مرشد تعلیم وارشاد میں تا امکان غفلت و دریغ نہ کرے اور مسترشد تا امکان اطاعت و انقیاد میں کوتاہی سے کام نہ لے۔ مرشد کے ذمہ جو فرائض عائد ہوتے ہیں، اس کی ادائیگی پر بلا اخذ بیعت بھی تیار ہوں اور چونکہ میں اپنے میں کوتاہی پاتا ہوں، اس لئے تاخیر کر رہا ہوں یا ابھی وقت اس امانت کی سپردگی کا نہیں آیا ہے، وقت کا انتظار کیجئے، جب وقت آئے گا، تو خود بخود یہ دولت نصیب ہو جائے گی۔

پیر اور مرید کے فرائض :

غالباً یہ ذہن نشین ہوگا کہ یہ عمر بھر کا سودا ہے۔ اس لئے اس راہ میں جو قدم رکھا جائے، وہ خوب سوچ سمجھ کر رکھا جائے۔ پیر کی نسبت صرف اتنا اعتقاد رکھنا شرط ہے کہ میری تلاش میں میری نافعیت کے لئے اس سے بہتر کوئی شخص اس وقت نہیں ہے۔ بہرحال یہ طرفین سے الحب فی اللہ کا معاہدہ ہے کہ طالب تعمیل میں اور مطلوب یعنی شیخ تعلیم میں کوئی کمی اخلاص میں نہ کرے گا۔ اس سلسلہ میں چار باتیں بمنزلۂ اصول کے ہیں۔

اعتقاد، انقیاد، اطلاع، اتباع اس راہ میں ضروری ہے کہ اپنے کو مربی کے ہاتھ میں اس طرح دیدیں، جس طرح مریض طبیب کے ہاتھ میں اپنے کو دیدیتا ہے۔ اُصول اربعہ کی پیروی رہے، میں نے پہلے ہی لکھ دیا ہے کہ اپنے شیخ کی نسبت یہ اعتقاد رکھنا چاہئے کہ میری نافعیت کے لئے میری تلاش میں یہ سب سے بہتر ہے۔ پس دوسروں سے انکار کی ضرورت نہیں ہے، مگر اتباع ایک کی چاہئے، ایک ساتھ دو طبیبوں کا مریض مصیبت میں رہتا

Marfat.com

ہے، اعتقاد اور انقیاد تو معلوم کر لیا، اطلاع سے مقصود شیخ سے مکاتبت اور اتباع سے احکامِ شیخ کی پیروی ہے۔

نماز کی حقیقت :

نماز کو اپنی طرف سے پورے ظاہری و باطنی آداب اور خضوع و خشوع کے ادا کرنے کی کوشش کیجئے، جس قدر ہو اللہ کا شکر کیجئے، اور آئندہ کے لئے ہمت کیجئے اور دعا کیجئے، ہمارے حضرت کی تحقیق ہے کہ مبتدی نماز میں یکسوئی کے لئے لفظ کی طرف اور متوسط معنیٰ کی طرف منتہیٰ ذات کی طرف یہ تصور کرے کہ بندہ اپنے آقائے حقیقی کے سامنے کھڑا ہے اور وہ اس کو دیکھ رہا ہے، اس کا اثر یہ ہو کہ قلب میں سکون اور جسم میں پستی اور تواضع کی شان پیدا ہو، نماز میں اصل شے خضوع اور خشوع ظاہری و باطنی ہے اور نیز ہر قسم کے رذائل سے امکان دوری اور فضائل کے حصول کی کوشش اور اطاعتِ الٰہی پر مداومت اور حصول رضائے الٰہی کا شوق باقی غیر مقصود ہیں۔ تو امورِ مقصودہ میں ان اُمور کی طرف بیشتر متوجہ رہیں۔

التزام سنن و نوافل اور تہجد :

نمازِ پنجگانہ کے بعد حسبِ ذیل نمازوں پر حتی الامکان مداومت کی جائے۔ نمازِ تہجد، بعد مغرب ۶ رکعات نفل اوابین، طلوع آفتاب کے بعد ۲ یا ۴ رکعت نفل چاشت، نوافلِ مسنونہ نماز پنجگانہ کے بعد، نماز میں اعتدال ارکان اور حضورِ قلب کی کوشش رہے۔
تہجد کا التزام از بس ضروری ہے، یہی مفتاحِ اسرار ہے، اگر رات کو احیاناً ناغہ ہو جائے، تو بوقت چاشت بارہ رکعات پڑھیں۔ تہجد عجیب عبادت ہے، جس پر خود حضور انور ﷺ نے عملاً دوام فرمایا ہے۔ اس لئے سنتِ مؤکدہ ہے (سنتِ مؤکدہ کی تعریف اس پر صادق ہے، البتہ قولاً تاکید نہیں فرمائی، شفقۃً علی الامۃ، مگر اپنے عمل سے اس کو مؤکد ثابت کر دیا)

Marfat.com

اب اہل محبت کے لئے کیا گنجائش رہی، فضائلِ اعمال کے اکتساب کا سبق محدثین سے نہ لیں، محبین سے لیں، **علیکم بقیام اللیل فانہٗ داب الصالحین** تو لزوم پر دال ہے، تہجد باجماعت اگر اتفاقاً ہو تو جائز ہے، ورنہ اہتمام اور تداعی کے ساتھ نہیں، غور کرنا چاہئے کہ اس میں ریا اور نمود کی خواہش تو پوشیدہ نہیں، اگر تہجد قضا ہو جائے تو طلوعِ آفتاب کے بعد سے دوپہر سے پہلے تک بارہ رکعتیں پڑھ لی جائیں، تہجد کی نماز ذرا جہر سے پڑھنا مستحب ہے۔

دعا کا اہتمام :

تہجد کے بعد بارگاہِ الٰہی میں پورے درد والحاح کے ساتھ اپنے لئے دعا کیجئے۔ دعا میں تضرع وخضوع ہونا چاہئے، عصر اور صبح کی نماز کے بعد دعا خوب کیا کیجئے، اور مانگئے جو آپ کے لئے مناسب ہو، ان شاء اللہ ملے گا، اس در سے کوئی محروم نہیں پھرا ہے۔ **ادعونی استجب لکم** ...... **الخ** ، اس کا اعلان ہے اور ''**الدعاء مخ العبادہ**'' ارشاد ہے۔

احتسابِ نفس :

اپنے عیوب کی تلاش میں رہیئے اور جو عیب سب سے زیادہ اُبھرا ہو، علی العیان معلوم ہو، اس کے دفعیہ کی کوشش کیجئے۔ مثلاً کبر، عجب، ریا، حسد، وغیرہ، ان عیبوں کی حقیقت دریافت کیجئے، اور پھر اس کا علاج معلوم کیجئے۔ اپنے میں شکستگی، افتقار، تواضع ہونی چاہئے اور ہر وقت اپنے عیوب پر نظر جمی رہے اور اُس کے اصلاح کی فکر دامنگیر ہو۔ استکبار و افتخار وغرور کہ ہمچوں من دیگرے نیست کے شیطانی پھندے میں گرفتار نہ ہو جائیں۔ اپنے کو مجموعۂ ذمائم اخلاق سمجھنا خیر وبرکت ہے۔ بر سبیل تذکرہ اسرار قلبی اور راز روحانی کو ظاہر کرنا بھی استکبار وریا میں داخل ہے۔ غیبت بہت بُری چیز ہے، اس سے نیکیاں دوسروں کو مل جاتی

Marfat.com

ہیں، اَپنے قلم سے خود کو مولوی لکھنا کبر کے آثار میں ہے۔ گویا اس کا اظہار ہے کہ لوگ اس کو بڑا سمجھیں، مکائد النفس بہت دقیق ہیں، اللہ تعالیٰ پناہ میں رکھیں، تواضع اور فنائے ذات کی راہ پیش نظر رہے۔ فنائے نفس کے لئے **اللھم اجعلنی فی عینی صغیراً** کی دعا مفید ہے۔ اپنے کو سب سے بدتر سمجھنا بہتر ہے، اس کا ہمیشہ اور ہر کام میں خیال رہے، بس اپنے عیوب پیش نظر رہیں اور اُن کی اصلاح کا خیال غالب اور اس باب میں اپنے نفس کے مکائد پر نظر رہے۔

اصل سلوک :

حصولِ تقویٰ تحلی بالفضائل اور تخلی عن الرذائل برائے رضائے الٰہی اصل سلوک ہے۔ ہر قسم کے رذائل سے بقدر امکان دوری اور فضائل کے حصول کی کوشش اور اطاعتِ الٰہی پر مداومت اور حصول رضائے الٰہی کا شوق اور باقی غیر مقصود ہیں۔ اپنی اصلاح و تربیت کی دھن میں لگے رہئے، تا آنکہ اللہ کے سوا دل سے ہر چیز کی محبت فنا ہو جائے، ریا، عجب، کبر رنگ برنگ صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں اور یہ سالک کے لئے سخت خطرناک ہیں، اس لئے ان سے احتراز کا اہتمام نہایت ضروری ہے۔ بڑی چیز یہ ہے کہ اپنے پر نظر بڑائی کی نہ پڑے، یہ راستہ مردودیت کا ہے۔ **ابیٰ واستکبر و کان من الکافرین**، ہر حال میں تواضع اور فنا پر نظر رہے اور ذمائم اخلاق پر۔

حصولِ تقویٰ :

منہیات و اوامر کی تصریح پیشِ نظر رہے۔ مقصودِ حصولِ تقویٰ ہے کہ قرآن پاک ''**ھدیً للمتقین**'' ہے، عبادت کا منشا بجا آوری کے بعد حصولِ تقویٰ ہی ہے'' **لعلکم تتقون**'' بعد فرائض و سنن و نوافل کی پابندی علی مراتب الوجوب والاستحباب کے منہیاتِ شرعیہ سے احتراز کا لزوم کیا جائے۔

Marfat.com

اہتمام والتزام عمل :

اعمال تو سب کو معلوم ہیں، ضرورت عمل کی ہے اور حصولِ تقویٰ اور رضائے الٰہی کے لئے ساری کوشش اسی کی چاہئے، باقی سب فلسفہ ہے، کام میں لگے رہیں ...... ع

تادمِ آخر دمے فارغ مباش

عمل خیر لوجہ اللہ تعالیٰ ہو، اصل یہ ہے کہ امتحان کی تیاری کے لئے جو وقت صرف ہوتا ہے، وہ بیکار نہیں جاتا ہے، نمبر اسی سے ملتے ہیں، کسی اضطراری عذر کے سبب سے اگر کسی معمول میں کمی ہو جائے تو ان شاء اللہ تعالیٰ ہم کو ہماری نیت کے مطابق حق تعالیٰ اُس کی جزاء عنایت فرمائیں گے، یہ اُن کی شانِ رحیمی وکریمی ہے۔ عمل کے لئے صرف ہمت و عزیمت، دوامِ عمل اور صحتِ فکر ونظر کی ضرورت ہے، عمل، عملیات اور تعویذ کی نہیں، مقبولیت کی خواہش اس راہ کا کانٹا ہے، اللہ تعالیٰ کی رضا کے سوا عمل کا دوسرا محرک نہ ہو اور ہر حال میں ذکر لساناً وقلباً وعملاً جاری رہے۔

احکامِ الٰہی کی اطاعت اور رضائے الٰہی کی طلب :

اصل شے احکامِ الٰہی کی کلی اطاعت، حلال حرام کا خیال، معاملات میں صفائی، اخلاق کی نزاہت، اتباعِ نبوی کا دھیان، التزام سنت کا اہتمام ہے، بدعات ورسوم سے تمام اُمور میں احتراز، اور تمام اُمور میں رضائے الٰہی کی طلب، ان اُمور کی طرف توجہ فرمایئے، کہ یہ اُصول ہیں اور باقی سب فروع اور تدابیر، دوام ذکر کا ظہور یہی ہے، طاعات و مرضیاتِ الٰہی کی اتباع کا ذوق بڑھے، اور اللہ تعالیٰ کی یاد حالاً ہو، باقی کیفیات تو آتی جاتی رہتی ہیں۔

استقامت بڑی دولت ہے :

اب تو زندگی کے آخر لمحہ تک یہ استقامت قائم رکھنا ہے، توفنی مسلماً

Marfat.com

والحقنی بالصالحین کی دعا چاہئے۔ اپنے کام میں تادمِ آخر استقامت کے ساتھ لگے رہئے۔ یہی بڑی دولت ہے۔ ''تادم آخر دمے فارغ مباش'' معمولات پر استقامت مبارک ''الاستقامة فوق الکرامه'' قال اللّٰہ تعالیٰ '' قل اللّٰہ ثم استقم ''سلوک کی اصل کلید ہے۔ عوارض کی وجہ سے کمی باعثِ افسوس نہیں، وہ کمی افسوس کے قابل ہے جو غفلت یا کوتاہی کے باعث ہو، اپنی تکمیل اور اصلاح سے کبھی غفلت نہ برتیں، ہر حالت میں ناقص ہیں یادِ الٰہی سے غفلت نہ ہو، ذکر کا مقصود یہی ہے۔

ذکرِ دوام :

''ادعوا ربکم تضرعاً و خیفةً الی ولا تکن من الغافلین ''تلاوت فرما کر دوامِ ذکر کے فضائل، ثمرات اور وعدے اور غفلت کے نتائج بد اور وعید بیان فرمائے، اور پھر و من یعرض عن ذکر الرحمن ...... الخ'' کے تفسیری نکات بیان کئے اور ہر حرکت و سکون پر عمل و قول میں ذکر کی تاکید فرمائی۔ یادِ الٰہی کو مرکوزِ خاطر کرنے کی ہدایت فرمائی اور بیان کیا کہ احکامِ شرعیہ کی روح ذکر ہی ذکر ہے، اجمال، نوال، کمال کے اعتبار سے ذاتِ باری تعالیٰ ہی کو محبوبیت حاصل ہے، تو اسی محبوبِ حقیقی کی یاد واجب ہے۔'' الذین اشد حبا للّٰہ ''منصوص ہے، دنیا اور تعلقاتِ دنیا کے ساتھ یادِ الٰہی بڑی چیز ہے اور یہی سنتِ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ رضوان اللہ علیہم ہے۔ چنانچہ حضرت عروہؓ کا پاؤں جب کاٹا جانے لگا، تو ہوش و حواس ہی میں پاؤں کاٹنے کا انہوں نے حکم دیا (اسم ذات یعنی اثبات و نفی کے ذکر کے جمالی اور جلالی ہر دو طریقوں کو عملاً ظاہر فرما کر تکرار کی ہدایت کی اور فرمایا کہ وقت ذکر قربت حق، سماعتِ حق، رحمتِ حق اور نزولِ رحمت پر اذعان و نظر رکھنا چاہئے، تاکہ ثمراتِ ذکر جلد سے جلد تر ظاہر ہوں، اپنی بابت فرمایا کہ مجھے تو ذکرِ جلالی میں خشکی پیدا ہو جاتی ہے، اس لئے ذکرِ جمالی پر بیشتر عمل کرتا ہوں اور اسی میں سہولت و لذت

Marfat.com

محسوس کرتا ہوں، آپ کو اختیار ہے کہ جس طریقہ کو چاہیں، اختیار کریں۔

نپولین اعظم جب کسی سپاہی کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا تھا، تو اس کا نام لے کر پکارتا تھا، جس کا اثر یہ ہوتا تھا کہ وہ اس پر جان دینے کو تیار ہو جاتا تھا، اسی طرح اسمائے الٰہی کی یاد اور تکرار اُن کی توجہ خاص کو اپنی طرف مبذول کراتا ہے، اس ارحم الراحمین کا نام پاک ورد کیا جائے گا، تو اس کی رحمتیں ذاکر کی طرف متوجہ کیوں نہ ہوں گی۔ (اسم میں خود محبوبیت نہیں، اس میں محبوبیت محبوب کی ذات پر دال ہونے کے سبب سے ہوتی ہے، کسی اسم کی محبوبیت ذاتِ پاک کی محبوبیت کا نتیجہ اور ظل ہے) ماسویٰ سے بے نیازی کے لئے اثبات و نفی کا ذکر اس کے معنی کے استحضاء کے ساتھ کافی ووافی ہے۔

پاسِ انفاس :

پاسِ انفاس کا مقصد بھی یہ ہے کہ کوئی سانس ذکر الٰہی سے خالی نہ جائے۔ اس کی صورت یہ ہے جو آسانی سے ہو سکتی ہے کہ ہر سانس کے ساتھ اللہ اللہ جاری رہے، بغیر تلفظ، لسانی محض ذکر جلی کے ساتھ اُس کا فائدہ ذکر دوام ہے، جو حسبِ استطاعت مامور ہے۔

مراقبۂ اللہ معی :

اللہ معی کا مراقبہ شروع کر دینا چاہئے۔ اللہ معی کا تصور کہ ہر وقت وہ ہمارے ساتھ اور ہمارے قریب اور ہمارے ہر فعل وخیال کا ناظر و حاضر ہے۔ اس کے مضمون پر غور کیا جائے، اور اس کے مناسب آیات کا استحضار رہے، ''واذا سئالک عبادی عنی فانی قریب ، هو معکم اینما کنتم و نحن اقرب الیه من حبل الورید ، نحن اقرب الیه منکم و لکن لاتبصرون ، و هو علیم بذات الصدور و لا تخفی علیه خائنة الا عین و ماتخفی الصدور ، اولا یعلم من خلق ، الم یعلم بان اللہ یری '' اسی کیفیت کو رسوخ اصل روح ہے، جس کا طریقہ ذکر و شغل ہے۔

Marfat.com

قلب کا ذاکر ہونا :

قلب کا ذاکر ہونا یہ فن کی کوئی اصطلاح نہیں ہے۔ کثرتِ ذکر سے قلب میں ذکر کا لفظ اللہ اللہ ہو یا لا الہ الا اللہ یا کوئی اور مرکوز ہو کر حدیث نفس کے طور پر جاری ہو جاتا ہے، جو ارادہ کے بغیر بھی قائم رہتا ہے، بلکہ اس کا استحضار بھی نہیں رہتا ہے کہ ذکر جاری ہے ...... بہر حال اس کا طریقہ صرف کثرت ذکر یہ توجہ تام ہے اور یہ کوئی مشکل نہیں ہے۔

مجاہدہ وریاضت اور اس کے ثمرات :

مجاہدہ وریاضت سے فضل ورحمت اور توفیقاتِ الٰہیہ کی صلاحیت واستعداد پیدا ہوتی ہے۔ ہر نبی وولی کو مجاہدہ وریاضت کے عقبات سے گذرنا ضرور ہے۔ رسالت مآب ﷺ کا غارِ حرا میں معتکف ہونا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کوہِ طور پر قیام کرنا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جنگلوں میں مقیم ہونا اور اولیاء وفقراء کی نفس کشی اسی سلسلہ کی کڑی ہے، لیکن باہمہ کسب وریاضت ضرور نہیں کہ رحمت کا ورود اور برکات روحانی کا نزول فی البدیہہ ہو یہ سب فضلِ رحمانی ہے، وہ ذاتِ پاک بے نیاز ہے، مگر سالک کو پُر اُمید ہی رہنا چاہئے۔ جزاءً من ربک عطاءً، گویا مزہ نہیں بخشش ہے اور یہ بخشش بے حساب وکتاب ہوتی ہے۔ اوامر ونواہی کی بجا آوری جس گرم جوشی اور خلوص سے ہوگی، اسی قدر انوارِ رحمت و برکات کا نزول ہوگا۔ بعض لوگ احکام واعمال بجالاتے ہیں، ذکر وشغل بھی کرتے ہیں، مگر ثمرات واثرات مرتب نہیں ہوتے ہیں، وجہ اس کی یہی ہے کہ خلوص ومحبت جو بمنزلہٗ روح کے ہے، وہ ان میں مفقود ہے، کوئی شخص کونین کھائے اور کونین کے اثرات مرتب نہ ہوں، تو ظاہر ہے کہ اس کے ناقص ہونے کا حکم لگایا جائے گا۔ اسی طرح نماز روزہ اور دیگر احکام و اعمال بجالاتے ہیں، اور ان کے اثرات وثمرات ظاہر نہیں ہوتے ہیں، تو سمجھ لو کہ ان اعمال کی بجا آوری میں نقص ہے اور پیشگاہِ الٰہی میں تو قدر کمال کی ہے۔

Marfat.com

کیفیات :

سالک کو بڑا دھوکہ ذوق وشوق اور لذت کا ہوتا ہے۔ سو اس کو پوری طرح سمجھ لیجئے کہ یہ چیزیں آثار محمودہ ضرور ہیں، مگر مقصود نہیں، ان کا منشاء اسی قدر ہے کہ کام میں جی لگتا ہے، اور آسانی ہوتی ہے، مگر اس کو قرب ورضا اور حصول ثواب میں کوئی دخل نہیں، کیونکہ یہ امور غیر اختیاریہ میں ہیں، اور غیر اختیاریہ نہ مطلوب ہیں، اور نہ مقصود، دوا کا اصل مقصود صحت بخشی ہے، خوش ذائقگی اور لذت نہیں، جب انسان کے بدن میں صحت آتی ہے، تو طاقت اور کھانے کی لذت تو خود بخود آجائے گی، اس کے لئے کوئی الگ دوا کی ضرورت نہیں، ابتدائی جوش وشوق میں کمی فطری ہے، یہ مرحلہ زندگی میں بھی پیش آتا ہے، یہ کوئی افسوس کی چیز نہیں، جوش وشوق ہو یا نہ ہو، عمل میں کوتاہی نہ ہونے پائے، جس طرح آغاز شباب میں عروس نو کے ساتھ جوشورش وجوش طبع کا مظاہرہ ہوتا ہے، وہ رفتہ رفتہ تمکین سے بدل جاتا ہے اور بجائے بوالہوسی کے دیرینہ محبت ...... اس کی جگہ لے لیتی ہے، میرا ایک شعر ہے ....

دیکھئے ملتی ہے کب دولت سکون عشق کی
ہوئے ہوئے جوش تو ہنگامۂ آغاز ہے

صبر وشکر :

حضرتِ والا رحمۃ اللہ علیہ کا ملفوظ ہے کہ دو حال سے خالی نہیں یا تو بندہ کو نعمت ملتی ہے، تو اس پر شکر واجب ہے، یا ابتلا پیش آتا ہے، تو اس پر صبر مامور ہے، اور یہ دونوں حالتیں موجب ازدیاد ترقی ہیں اور یہی صبر وشکر کی دوہری منزل پوری زندگی کے سفر میں ملتی رہتی ہے، شکر ورضا بڑی چیز ہے، توفیقاتِ الٰہی پر بھی شکر کیجئے، آپ کو گونہ طمانیت جو حاصل ہوئی ہے، آپ اس طمانیت کو ذکر ولجاجت میں صرف کیجئے کہ اس کا شکر یہی ہے، شادی وغم

Marfat.com

دونوں تو ام ہیں ......

ع موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

خواب اور اس کی حیثیت :

رویا اور خواب بشارات ہیں، اس کے سوا ان کی اور کوئی حیثیت نہیں، نہ یہ ذریعۂ قرب ہیں اور نہ اتکال مفید طریق، البتہ خوش ہونا چاہئے کہ خواب سے مطلع کیا جا سکتا ہے، مگر اس سے اپنی بزرگی کا زعم نہ ہو کہ ایسے خواب فاسق بھی دیکھ سکتے ہیں، ہاں اس بات کا شکر کیجئے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی تربیت اس طرح فرماتے ہیں، بہرحال اس کے پیچھے نہ پڑیئے، یہ گو بشارات ہیں، مگر مقصود نہیں ......

ع نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم

بیداری کے معاملات کے طرف توجہ فرمایئے، اسی کا سوال اور اسی کا مواخذہ ہے، باقی رویا اور خواب بشارات سے زیادہ نہیں، دھن کے سـ ھ اپنے کام میں لگے رہیئے، خواب کی حیثیت شرع میں صرف بشارات کی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس اظہار بشارات سے کبھی ان شکلوں کو منتخب فرماتے ہیں، جن سے خواب دیکھنے والوں کو موافقت ہوتی ہے۔ اس میں خواب میں نظر آنے والے بزرگوں کو کوئی دخل نہیں ہوتا، بجز اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے اس اظہارِ بشارت میں اپنا آلہ اپنے فضل سے بنالیا۔

مکرر مکتوب ہے کہ خواب کی حیثیت صرف بشارات کی ہے اور اس ہیچمدان کو دیکھنا اس بات کی علامت ہے کہ آپ مجھ سے محبت رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ساری توفیقات ہیں، وہ جب چاہتے ہیں تو کسی بندہ کو خواب میں یا بیداری میں تنبیہ یا توفیق ارزانی فرماتے ہیں، اور اس کے لئے کبھی کبھی واقع فی النفس ہونے کے لئے اس کی شکل و صورت کو بمنزلہ ...... وجہ و آلہ بناتے ہیں، جس سے صاحبِ معاملہ کو مناسبت اور محبت اور عقیدت ہوتی ہے۔ **ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء** ۔

Marfat.com

احترام نبوی اور حُبِّ رسول ﷺ :

رسول اکرم ﷺ کے نام نامی اور ذکر گرامی کے ساتھ صلی اللہ علیہ وسلم لکھا کیجئے۔ عزت واحترام ظاہری وباطنی دونوں چاہئے۔ عملاً اتباع سنت ہر کام میں اور قولاً درود کی کثرت حب رسول ﷺ کا ذریعہ ہیں، درود خصوصاً جمعہ کے دن کہ وہ اس دن پیشگاہِ نبوی ﷺ میں پیش ہوتے ہیں۔ ہمارے حضرت رحمہ اللہ کو یہ درود پسند تھا۔ **اللھم صل علی سیدنا و مولانا محمد و علیٰ الہٖ سیدنا و مولانا محمد و بارک وسلم**، جمعہ کی رات بالخصوص تکثیر درود چاہئے۔ ایک خواب کے سلسلہ میں سوال ہے کہ کیا واقعاتِ عالم اور حوادثِ روزگار کا وقوع وحدوث پیشگاہِ نبوی سے ہوا کرتا ہے ؟

جواب :- استغفر اللہ! واقعاتِ عالم اور معاملاتِ تکوین صرف اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہیں۔ حضور انور ﷺ باعثِ رحمت ہیں۔ آپ پر اللہ تعالیٰ کی جو بظاہر رحمت ہوئی، وہ مثالی بشارت رحمۃ للعالمین کے توسط سے دیکھائی گئی، مکرر حکم ہے، صلوٰۃ وسلام بطور ذکر کے نہیں، بلکہ بطورِ درود کے پڑھ سکتے ہیں۔ خصوصاً جمعہ کے روز اگر بجائے ذکر درود پڑھا جائے تو اچھا ہے، وحشت دور کرنے کے لئے کسی مختصر درود کی کثرت کیجئے۔

اے نام تو دافعِ بلاہا بیماری قلب راشفاہا

بحمد للہ آپ کے لئے حرمین میں دعا کی گئی۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں۔ آپ کا خواب مبارک ہے، اور اس سلسلہ میں آپ کی مقبولیت کی دلیل ہے۔ اللھم زد فزد۔ مناجات مقبول میں جو کچھ ہے، وہی ہمارے ہاں معمول ہے۔ اس کی اجازت ہے۔ **بارک اللہ تعالیٰ۔**

تصور شیخ اور صالحین :

تصور شیخ بلا قصد وارادہ ہو تو حرج نہیں اور ہمارے حضرت کے خلفاء میں سے

Marfat.com

جناب خواجہ عزیز الحسن رحمہ اللہ تعالیٰ کا ۱۷ ر شعبان کو انتقال ہو گیا۔ افسوس دعائے مغفرت کیجئے، اور ایصالِ ثواب بتلاوۃ القرآن کیا کیجئے۔

صالحین کی محبت کلید کامیابی ہے۔

وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود :

وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کا مفہوم صحیح مختصر یہ جان لیجئے کہ صرف اسی کی ذاتِ پاک موجود ہے۔ ماسویٰ ذاتِ باری تعالیٰ سب کالعدم ہیں، مگر اس کا ہرگز یہ مفہوم نہیں کہ ہر چیز خدا ہی خدا ہے، یہ تو وحدت نہیں، کثرت کا مفہوم ہے، نعوذ باللہ من ذلک، وہ وحدہٗ لا شریک ہے۔

اور وحدۃ الشہود کا مفہوم یہ ہے کہ ہر چیز میں اس کے وجود اور اس کی قدرت کا ظہور ہے اور بس۔

تصوف علمی اور تصوف عملی :

تصوف کی دو قسمیں ہیں۔ ایک علمی، دوسری عملی، تصوف کی کتابوں سے جو علم حاصل ہوتا ہے، وہ تو تصوف علمی ہے اور مجاہدہ اور عمل سے جو صوفیانہ شان پیدا ہوتی ہے، وہ تصوف عملی ہے۔ آپ تصوفِ عملی میں اپنا وقت صرف کیا کیجئے اور اس پر وقت صرف کرنا زیادہ مفید اور موجب خیر و برکت ہے۔

ملفوظاتِ قرآن وہ گنجینہ ہے کہ ہر نظریہ والا اپنے نظریہ کے مطابق اس میں نکات و رموز پاتا ہے، ایک متصوف کو تصوف ہی تصوف نظر آتا ہے، ایک سیاسی کو سیاست ہی سیاست اس میں نظر آتی ہے، مگر مجھے تو قرآن پاک میں تصوف ہی تصوف نظر آتا ہے۔

ہمارے شیخ رحمہ اللہ تعالیٰ کا نظریہ تصوف وہی ہے، جو مجدد طریقت شیخ الکل حضرت مولانا تھانویؒ کا ہے۔ کمال دین و اسلام کا نام تصوف ہے، احکام شرعیہ کی بجا آوری احسان و

Marfat.com

اخلاص کے ساتھ عین طریقت و حقیقت ہے۔ تصوف اسلام کا خلاصہ اہتمام طاعت اور اجتنابِ معصیت اور دوام ذکر ہے اور بس۔

افکار دنیا لاحاصل ہیں :

قلب کو طمانیت اور دماغ کو سکون کیوں نہیں ہے؟ اس کے عدم حصول کا باعث کوئی دینی یا دنیاوی فکر ہوگی، اگر دینی فکر ہے تو مبارک اور دنیاوی فکر ہے، تو اس فکر کا حاصل ہی کیا ہے۔ اللّٰہ ولی المؤمنین و نعم الوکیل پیش نظر رہے ....

کارسازِ مابفکر کار ما　　فکر ما در کارِ ما آزارِ ما

مجدد طریقت شیخ الکل کی تصانیف کا مطالعہ :

بمرات و کرات مکتوب ہے، کہ ہمارے حضرت کی تصانیف یعنی جس قدر ملفوظات اور مواعظ ہیں، انہیں مطالعہ کیا کیجئے، مواعظ و رسائل کا مطالعہ اکسیر ہدایت ہے۔ اس سے استقامت اور بصیرت میں مدد ملے گی۔

آپ التکشف فی التصوف اور بادۂ عرفان شرح دیوان حافظ پڑھا کیجئے۔ حضرتِ والا کے مواعظ و ملفوظات کے مطالعہ سے ان شاء اللہ تعالیٰ کشف حجابات ہوں گے اور سلوک کی سیدھی راہ معلوم ہوگئی۔

امام اور امامت کے فرائض :

ناچیز کے ذمہ خطابت و امامت کی خدمت بھی سپرد ہے۔ اس لئے اس باب خاص میں بھی زبانی اور تحریری ہدایات فرمائیں اور حاضری کے مواقع پر خطابت و امامت کے لئے آگے بڑھا کر عملاً ہدایات حاصل کرنے کا موقع دیا۔

امامِ نماز کا انتخاب تو جماعت کے ہاتھ میں ہے، تو پھر انتخاب و اجازت کے بعد

Marfat.com

امامت کے لئے آپ کو بڑھنا چاہئے تھا، اور تقاضائے ادب تو یہی تھا کہ بعد اذن بلا پس و پیش آگے بڑھ جایئے۔ ہاں بلا اذن جماعت امامت کرنا غلط تھا۔ بصورتِ امامت امام میں جوریائی کیفیات پیدا ہوئی تھیں، ان کو ظاہر فرما کر ان سے اجتناب واحتراز کی تاکید فرمائی۔

تحسین صورت اور بتکلف حسن وخوبی کے ساتھ قرأت ادا کرنے کی کوشش جو امام کرتا ہے، اس کا مقصد مقتدیوں سے دادِ تحسین کے حصول کے سوا اور کیا ہے؟ اور یہ چیز خلوص کے بالکل منافی ہے۔ نماز میں تمام تر توجہ خلوص نیت کے ساتھ احکم الحاکمین، خالقِ کائنات اور رب العالمین کی طرف ہونی چاہئے، نماز اور دیگر عبادات محض انہی کی رضا پر نظر رکھنا چاہئے اور ان ہی کے مرضی کی سعی چاہئے۔ روایات وآثار اور امثال سے امام وامامت وخطابت سے متعلق آداب ورعایات امام وماموم بیان فرمائے۔

کیفیات واحوال اور توحش کے بعد بھی ضبط وسکون کے ساتھ مخلصانہ طور پر اس خدمت کو انجام دینا چاہئے، کسی وقت نماز میں بندۂ ہیچمدان سے سہو ہوگیا، جب سجدۂ سہو ادا کر کے نماز سے فارغ ہوا، تو اعادۂ نماز کے لئے بنظرِ تحسین صلوٰۃ حکم فرمایا۔

حضرت مولانا کا تفقہ :

حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے تعلقات سے پیشتر گاہے گاہے اور تعلقات کے بعد تو اکثر عاجز استفتاء اور استفسارات کیا کرتا تھا، گاہے فرماتے کہ کسی مفتی سے فتویٰ طلب کیجئے، گاہے جواب عنایت فرماتے، چنانچہ چند فتاوی راقم کے پاس محفوظ ہیں۔ ان میں سے صرف ایک فتویٰ بابت رویتِ ہلال صوم وافطار جو علماء کے درمیان میں ''معرکۃ الآرا'' ہے، درج کیا جاتا ہے، جس سے مولانا کے تفقہ فی الدین کی حیثیت ناظرین پر واضح ہوجائے گی۔

استفتاء : علمائے دین متین مسائل مندرجۂ ذیل میں کیا فرماتے ہیں :

Marfat.com

مسئلہ (۱)

کسی مسلم ریاست کی مسلم جماعت یا کسی غیر مسلم ریاست کی مسلم جماعت نے رویتِ ہلال صوم، یا رویتِ ہلال فطر کی تحقیق و تفتیش اور شرعی شہادت لینے کے بعد کسی مسلم عادل مجاز شخص یا کسی غیر مسلم صادق و مجاز شخص کی زبانی، ریڈیو یا ٹیلیفون یا تار کے ذریعہ رویتِ ہلال صوم، رویتِ ہلال فطر کی خبروں کو دیگر بلاد و شہور میں نشر کرایا، اور بیک وقت مختلف مقامات سے نشر کرایا، تو اسی محقق و مصدق اور متواتر خبروں پر مسلمانوں کو صوم یا افطار شرعاً جائز ہے یا ناجائز؟ اگر ناجائز ہے تو اس کی دلیلیں از روئے شرع عقلی و نقلی کیا ہیں؟

مسئلہ (۲)

کسی مسلم یا غیر مسلم ریاست کے کسی شہر کے عالمِ دین یا امام مسجد جامع جن کی عدالت وصداقت مسلم ہو، خود بعد اخذ شہادت شرعی کسی ریڈیو اسٹیشن سے رویتِ ہلال صوم یا رویتِ ہلال فطر کی خبروں کو نشر کرتے ہیں یا بجوابِ تار ٹیلیفون کے ذریعہ خبر ارسال کرتے ہیں، تو ایسی صورت میں صوم یا افطار شرعاً جائز ہے یا ناجائز؟ اگر ناجائز ہے تو کیوں؟ اس کی عقلی و نقلی دلیلیں از روئے شرع شریف کیا ہو سکتی ہیں۔ بینوا توجروا۔

الجواب

(۱) کوئی قاضی ریاست اسلامیہ یا غیر اسلامی ریاست میں کوئی مسلمانوں کا مقرر کردہ قاضی یا امام شرعی شہادت لینے کے بعد رویتِ ہلال صوم یا فطر کا اعلان بذریعہ ریڈیو یا تار ٹیلیفون کرے تو اس کے قضا کے مطابق عمل کرنا درست ہے، کیونکہ یہ شہادت نہیں بلکہ نتیجۂ شہادت ہے۔ قضائے قاضی کا اعلان ہے، مگر ضرورت ہے کہ ان آلاتِ نشر کی پوری نگرانی کی جائے اور اس کا سارا کام مسلمانوں کے ہاتھوں انجام پائے۔

(۲) تنہا عالمِ دین یا امامِ جامع مسجد ہونا کافی نہیں، اس کا مسلمانوں کی جماعت کا مقرر کردہ یا عملاً مسلم ہونا ضروری ہے، اگر ایسا شخص ہلالِ فطر اور ہلالِ صوم کی شہادت شرعی

Marfat.com

لے کر کسی آلۂ نشر سے شائع کرے، یا تار ٹیلیفون سے ارسال کرے، تو اس کے مطابق عمل کرنا درست ہے، جب کہ آج بھی توپ یا گولہ یا نقارہ یا گھنٹہ سے ہلال یا چاند کے طلوع و غروب کا اعلان حکومت یا کسی مسلمہ جماعت کی طرف سے کیا جاتا ہے اور اس پر عمل کیا جاتا ہے۔

سید سلیمان تاریخ ۲۱ر اگست ۴۸ء

از ریاست بھوپال

اس فتویٰ میں یہ فقہی نکتہ کہ یہ شہادت نہیں بلکہ نتیجۂ شہادت ہے، قضائے قاضی کا فیصلہ اور اعلان ہے۔ علامہ رحمۃ اللہ علیہ کی فقیہانہ نکتہ سنجی کی دلیل روشن ہے۔ دوسرے علماء نے اس شہادت کے غیر معتبر ہونے کی وجہ یہ بیان کی کہ یہ آلاتِ جدیدہ شہادت کے قائم مقام نہیں ہیں، یا یہ آلات ذرائع شہادت کے قائم مقام نہیں ہو سکتے ہیں اور اسی پر بار بار زور دیتے ہیں، شہادت اور نتیجۂ شہادت کے فرق کی جانب کسی کی نظر نہیں گئی۔

بزمِ منور (چھ جلد)

افادات : حضرت مولانا منور حسین سورتی مدظلہ ...... ترتیب : حافظ محمد قاسم

حضرت مولانا منور حسین سورتی کے عالمانہ، فاضلانہ، حکیمانہ اور داعیانہ خطبات کا حسین مرقع، مولانا نے اپنی تقاریر میں اپنے دل سوز، اپنی فکر کا ساز بلکہ اپنا جگر نکال کر رکھ دیا ہے، جو ہر لحاظ سے بصیرت افروز اور ایمان پرور ہیں، جو موصوف کی علمی و دینی اور روحانی بصیرت، رائے کی اصابت، ان کی دعوت میں سچائی اور موعظت میں حکمت کا عمدہ مظہر ہے۔

صفحات : 1834 .... قیمت : 750 روپے

القاسم اکیڈمی جامعہ ابوہریرہ، برانچ پوسٹ آفس خالق آباد، ضلع نوشہرہ، سرحد، پاکستان

Marfat.com

جناب ڈاکٹر غلام محمد صاحب

حکیم الامتؒ سے رجوع اور بیعت

شیخ کی تلاش برابر جاری تھی اور اب تو اس جستجو میں دس سال گذر چکے تھے، چونکہ قلبِ سلیمانی کو اصل کشش حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی ذاتِ اقدس سے تھی۔ اس لئے اس ساری مدت میں ہر طرف پھر کر نظر خانقاہ امدادیہ (تھانہ بھون) ہی پر پڑتی تھی اور غیبی اشارے بھی اسی سمت کو متعین کر رہے تھے، چنانچہ جو مراسلت (حضرت والا اور حضرت تھانویؒ کے درمیان) ہو چکی تھی، اس میں بھی دو خواب صاف طور پر اسی کے موید تھے۔ یہ ۱۹۲۹ء کا ذکر ہے۔

حضرت حاجی صاحب کی زیارت :

اب یہ ہوا کہ ایک رات عالم رویا میں شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کی زیارت نصیب ہوئی۔ حضرت سیدی نے اپنی انگشتِ شہادت سے اپنے سینہ کی طرف اور پھر حضرت حاجی صاحب کے سینہ فیض گنجینہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عرض کی :

''اس کو ایسا کر دیجئے''

شیخ الشیوخ قدس سرہٗ مسکرائے اور ارشاد فرمایا :

''اب تو میں ایسا نہیں کرتا''

حضرت والاؒ فرماتے تھے کہ جب آنکھ کھلی تو اس خواب کی تعبیر یہ ذہن میں آئی کہ

Marfat.com

حضرت حاجی صاحب چونکہ عالمِ ناسوت سے تعلق منقطع فرما چکے ہیں۔اس لئے ان کو عذر ہے اور اب ان کے کسی جانشین سے تعلق جوڑنا چاہئے۔

انتخابِ شیخ :

ہندوستان میں اس وقت حضرت حاجی صاحبؒ کے خلیفۂ ارشد تنہا حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ ہی تھے اور انہی کی ذات بابرکات سے خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون کو وہ مرجعیت حاصل ہوگئی تھی جو گیارہویں صدی کے آغاز پر حضرت مجدد الف ثانیؒ کی ذات اقدس سے سرہند کو حاصل تھی۔لازمی طور پر حضرت کے قلب ونظر نے پھر ذاتِ اشرف ہی کی طرف جاذبیت محسوس کی اور ایسی جاذبیت جس نے رجوع پر مجبور کر دیا۔

باطنی اسباب تو یہ ہوتے رہے۔اس کے کچھ ظاہری اسباب بھی پہلے ہی سے موجود تھے،یعنی حضرت والا کے دو مخلص احباب مولانا دریابادی اور مولانا عبدالباری ندوی پہلے ہی سے تھانوی چشمۂ فیض پر پہنچے ہوئے تھے اور ازراہ محبت واخلاص حضرت والا کو بھی اپنا ہم مشرب بنانا چاہتے تھے۔خصوصاً مولانا عبدالباری تو اس معاملہ میں مضطر تھے۔چنانچہ لکھتے ہیں :

"آخر اپنے اِس مرض "خیر خواہی" (اس لفظ پر مولانا عبدالباری ندوی مدظلہ کا فٹ نوٹ یہ درج ہے۔ظاہر و باطن کے اس سراپا مریض میں اس مرض کی تشخیص بھی حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی ہی تھی) سے مضطر ہو کر دھیرے دھیرے ادھر متوجہ کرنا شروع ہی کر دیا۔ابتداء غالباً تھانہ بھون ہی کی کسی حاضری کے دوران میں ہوئی۔وہیں یہ تقاضا قلب میں تیز ہوتا جاتا تھا کہ میرے جیسے بےعلموں سے زیادہ اور بہت زیادہ یہ آستانہ سید صاحب جیسے اکابر علم وقلم کے استفادہ کا ہے کہ ان کے استفادات کا سونا یہاں کی ایک آنچ میں ان شاء اللہ کندن ہو جائے گا۔ الحمدللہ ایسا ہی ہوا"۔(سیرۃ السید کے کچھ انمول سبق سلیمان نمبر معارف ص ۹)

Marfat.com

غرض ظاہری موثرات اور باطنی تقاضوں سے مجبور ہو کر حضرت والاؒ کی نظر انتخاب مرشد تھانویؒ کو قبول ہی کرنے والی تھی کہ اسی دوران میں ایک صاف وصریح اور سچا خواب یہ دیکھا کہ ایک پلنگ پر حضرت مولانا تھانویؒ تشریف فرما ہیں اور اسی کے پاس ایک دوسرے پلنگ پر حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے ساتھ خود حضرت والا بیٹھے ہوئے ہیں، یکا یک مولانا مدنی اپنی جگہ سے اُٹھے اور حضرت والا کا ہاتھ پکڑ کر مرشد تھانوی کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے فرمایا:

''ان کو میری طرف سے قبول فرمالیں''۔ (سلیمان نمبر معارف ص ۲۸، ۲۹)

یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس رویائے صادقہ کے بعد حضرت والا کو یکسوئی حاصل ہوئی اور مرشد تھانوی قدس سرہٗ کی حلقہ بگوشی کا عزم فرمالیا۔

عزم تھانہ بھون:

جولائی و اگست ۱۹۳۸ء میں مولانا عبدالباری ندوی مدظلہٗ تھانہ بھون میں مقیم تھے۔ اس مرتبہ کھل کر اور اصرار سے حضرت والا کو لکھا کہ ''بس اب میری اس حاضری کے زمانہ میں ہمت فرما کر آ ہی جائیں'' اس اصرار کی وجہ بھی خود مولانا ہی کی زبانی سنئے:

''اصرا کی وجہ خصوصیت کے ساتھ یہ تھی کہ حضرت علیہ الرحمۃ کا سلسلۂ علالت طول پکڑتا جا رہا تھا کہ کہیں یہ آفتاب ارشاد و تربیت لب بام نہ ہو''۔ (سلیمان نمبر معارف ص ۶۵، ۶۶)

ادھر حضرت والا خود آمادہ ہی تھے، مولانا کو جواب تحریر فرمایا کہ:

''لفافہ ملا، میں آپ کے حرف حرف سے متفق ہوں۔ کل صبح ان شاءاللہ علی گڑھ کے لئے روانہ ہوتا ہوں، خوشی ہوئی کہ آپ ۲۵ر اگست تک وہاں (تھانہ بھون میں) رہیں گے، ان شاءاللہ شاہدرہ لائن ریلوے سے ۱۱ر اگست

Marfat.com

کی شام کو پہنچتا ہوں، دو روز ٹھہروں گا اور بقدر ظرف فائدہ اٹھاؤں گا"۔

(ایضاً)

چنانچہ پروگرام کے مطابق حضرت والا عازم سفر ہو گئے اور چپ چاپ (تھانہ بھون اور پھر یہاں سے لکھنؤ تک کا سفر حضرت والاؒ نے رفقائے دارالمصنفین بلکہ اہل خانہ تک سے مخفی رکھا تھا اور اس کی کچھ وجوہ تھیں) تھانہ بھون پہنچ گئے، مگر حکیم الامت سے یہاں ملاقات مقدر نہ تھی۔ حضرت حکیم الامت اپنے علاج کی غرض سے لکھنؤ پہنچ چکے تھے۔

لکھنؤ میں مرشد تھانویؒ سے رجوع :

تھانہ بھون میں مرشد تھانوی کو نہ پا کر حضرت والا لکھنؤ پہنچے۔ حکیم الامتؒ کا قیام یہاں مولوی محمد حسن صاحب کاکوروی کے مکان پر تھا۔ بیماری کے سبب سے عام ملاقات کا سلسلہ تو بند تھا، البتہ مخصوص حضرات جیسے خواجہ عزیز الحسن صاحبؒ وغیرہ کے لئے حاضری پر امتناع نہ تھا۔ حضرت والا سید سلیمان ندوی کے بغرض رجوع کرنے کی اطلاع جب حکیم الامت کی خدمت میں پہنچی تو فوراً بلا لیا گیا اور ان کی درخواست پر تربیت کی خدمت بلا تأمل قبول فرمالی گئی۔ اس طرح دس سالہ تلاشِ شیخ وسطِ اگست ۱۹۳۸ء میں بارآور ہوئی۔

جستجو آج وہاں پر مجھے لے آئی ہے
خود جہاں حُسن محبت کا تماشائی ہے

ایک مجذوب کا افشائے راز :

حضرت والا کے اس رجوع کے سلسلہ میں ایک واقعہ کا اظہار دلچسپی اور بصیرت سے خالی نہ ہوگا۔ حضرت تھانویؒ جب لکھنؤ تشریف لے گئے، تو تھانہ بھون میں ایک مجذوب نے آپ کے کسی مرید سے پوچھا کہ تمہارے پیر کہاں گئے ہیں؟ ...... انہوں نے فرمایا کہ اپنے علاج کے لئے لکھنؤ تشریف لے گئے ہیں۔ اس پر مجذوب نے ایک قہقہہ

Marfat.com

لگایا اور کہا :

''علاج وِلاج تو ایک بہانہ ہے، وہ تو ایک شہباز کے شکار کو گئے ہیں، اور شکار کر لائیں گے!''۔

چنانچہ شہباز علم و دانش کے رجوع کی اطلاع عام ہوئی تو سب کو اس قلندر کی تصدیق کرنی پڑی کہ ع　قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید　(یہ روایت مجھ کو ثقہ اور معتبر راویوں یعنی حضرت حاجی عثمان خاں صاحب مرحوم اور مخدومی ڈاکٹر صاحب مدظلہ سے ملی اور شبہ کے احتمال سے پاک ہے)

اور اس میں تعجب کی بات ہی کیا ہے تمام عارفین اس بات پر متفق ہیں کہ ہمیشہ پیاسا ہی پانی کی طرف نہیں جاتا، بلکہ کبھی خود پانی کو بھی پیاسے کی تلاش ہوتی ہے ...... ؎

تشنگان گر آب جویند از جہاں
آب ہم جوید بعالم تشنگاں

(رومی)

خود حضرت والا کی تصدیق :

مولانا عبدالباری صاحب ندوی کے قلم سے اسی حقیقت کی تائید میں خود حضرت والا کا ایک مکتوب نقل ہوا ہے اور اس تمہیدی عبارت کے ساتھ کہ :

''کچھ غیبی کشش پہلے سے بھی تھی، جس کا ایک والا نامہ میں اس طرح اظہار فرمایا کہ : ...... ''مولانا گیلانی نے مجھے لکھا کہ سنا ہے آپ نے بھی ایک دیوبندی کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا ہے۔ میں لکھنے والا تھا کہ ہاتھ گو اب بھی دیا ہو، مگر دل تو اس کو دس بارہ برس پہلے دے چکا تھا، پھر مجھے فخر یہ ہے کہ لوگوں نے مولانا تھانویؒ کو اپنی طرف کھینچا اور مجھے خود مولانا تھانوی نے بار بار اپنی طرف کھینچا۔ (بعالمِ رویا)''۔ (سلیمان نمبر معارف ص ۹۴)

Marfat.com

مُناسبت کا فوری اثر :

بہر حال اِس ملاقات اور تعلق ارادت کے ساتھ ہی پیر و مرید کی مناسبت نے جذب واثر کا حیرت انگیز کرشمہ دکھایا۔ روحانی یگانگت نے پچاس پچپن سالہ بیگانگی کو یکسر جھٹلا دیا۔ غیرت کا کوئی حجاب اب باقی نہ تھا، چار دن کے مختصر قیام کے بعد حضرت والاؒ نے اپنے جس تاثر کا اظہار فرمایا ہے، وہ قابل دید ہے۔ تحریر فرماتے ہیں :

"لکھنؤ میں چار ہی روز صحبت رہی، مگر مولانا (تھانویؒ) کی شفقت میری عقیدت کو بڑھاتی رہی اور آخر اُن کی ہدایت کے بموجب اور آپ (مولانا عبدالباری) کا مشورہ تو پہلے ہی تھا، باب مکاتبت وا ہے اور اب تو وہی وہ ہیں

ع آتے ہیں نگاہوں میں خیالوں میں دلوں میں

معائنہ سے بڑھ کر تصور میں مکالمے تک نوبت آتی ہے۔ (اللہ اللہ پہلا ہی قدم فنا فی الشیخ کے زینہ پر! جس کے اوج کی یہ ابتداء ہو اسکے طےّ منازل کی رفتار کو برق نظر بھی کیا پا سکے؟ اور اس کے مقام منتہا کو کیا دیکھ سکے؟ سلوک سلیمانی کو سمجھنے سمجھانے کا خیال ایک خیالِ خام اور جسارتِ بیجا نہیں تو اور کیا ہے

ع اس حوصلہ کو دیکھئے اور خود کو دیکھئے ....

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

بہر حال اپنی طرف سے سفر شروع کر دیا ہے۔ منزل پر پہنچانا جس کا کام ہے، وہ پہنچائے گا (نگاہ حقیقت پر کیسی جمی ہوئی ہے اور دل رحمت باری سے کس قدر لبریز ہے) دعا کیجئے!

مولانا کے مواعظ و رسائل پڑھتا ہوں، اکثر علمی مسائل بھی اپنے ہی مذاق کے

Marfat.com

مطابق پائے (علمی فراق کے اس اکثری توافق پر حضرت والا ہمیشہ مسرور نظر آئے) اور احوال و کیفیات میں اُن سے نئی نئی گرہیں کھلتی ہیں۔ (یہ مواعظِ اشرفیہ کی زندہ کرامت ہے کہ ان کے مطالعہ سے سالکین کی ہر الجھن دور ہو جاتی ہے) افسوس کہ اتنے دنوں کیوں غافل و محروم رہا''۔

''اتنے دنوں کیوں غافل رہا'' کے خیال نے سالک کی طلب بے انتہا تیز کر دی تھی۔ ایک جگہ شیخ سے فرماتے ہیں .... ؎

دیر سے آیا ہوں ساقی دور سے آیا ہوں میں
ہو عطائے خاص مجھ کو جو عطائے عام ہے

تبدیلی احوال :

اب حضرت والا کی طبیعت دفعۃً بدل گئی، وہ عارف رومی کے اس شعر کا مصداق بن گئے کہ ؎

صد کتاب و صد ورق درنار کن
سینہ را از نور حق گلزار کن

(اس مصرعہ کو بہت غلط سمجھا گیا اور صوفیاء پر ناحق اور ناروا تنقید کی گئی۔ یہاں ''صد کتاب و صد ورق'' کنایہ ہے، دو قباحتوں کی طرف، اولاً ''ادعائے علم'' اور جہاں یہ نہ ہو تو پھر ''لذتِ علم'' جس کے چھوڑے بغیر عرفان نہیں ملتی، کیونکہ ہر لذت غیر، طالبِ حق کے لئے ایک حجاب ہے۔ عارف کامل حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کا قول مشہور ہے کہ ''طالب لذت طالب حق نہیں'' اسی لئے صوفیائے کرام کا مطالبہ ہوتا ہے کہ ''ادعائے علمی کہ جس کو ہر سلیم فطرت انسان برا جانتا ہے اور لذت علمی کو بھی جس کی برائی فوراً سمجھ میں نہیں آتی)

چنانچہ مولانا عبدالباری ندوی مدظلہ کے موسومہ مکتوبات کے دو اقتباسات سے اس کی کھلی تصدیق ملتی ہے۔

Marfat.com

"(۱) دس بارہ برس سے جو چیز نظری طور پر سمجھ میں نہ آتی تھی، وہ عملاً سمجھ میں آ گئی اور اب تلافی مافات میں مصروف ہوں۔" **لعل اللہ یرزقنی صلاحاً** "(یہ علامہ عصر کا اعتراف ہے، **فاعتبروا یا اولی الابصار**)

(۲) اب نہ دارالمصنفین سے زیادہ دلچسپی ہے، نہ ندوہ سے، نہ علمی مقالات و تصنیفات سے، چونکہ میری روزی قلم سے وابستہ ہے اور گھر میں اثاثہ بھی نہیں، اس لئے ناچار پڑا پھرتا ہوں۔ خدا تعالیٰ ہمت دے کہ ترکِ تعلق کرسکوں"۔ (سلیمان نمبر معارفؔ ص ۹۵)

دوسرے اقتباس کا لفظ لفظ اس حال کا آئینہ ہے، جو ایک سالک کو معلوم کو مشہود پانے کی سعی میں طاری ہوتا ہے، لیکن کسی حال کو بھی قیام نہیں۔ چنانچہ شاید برس ڈیڑھ برس بعد پھر حضرت والا کے اس حال میں تغیر آ گیا۔ وہی تغیر جس نے امامِ غزالیؒ کو ترکِ تصنیف و تالیف کے بعد "احیاء العلوم" کی ترتیب و تدوین پر مجبور کر دیا تھا (اس کی تفصیل آگے آئے گی) ...... مگر آج تک بعض لوگ نادانستہ طور پر اور بعض "دروغ مصلحت آمیز" کے اُصول کے ماتحت اسی کیفیت اور اسی حال کو حضرت والا کی دارالمصنفین سے مفارقت کا سبب بتاتے ہیں، جو واقعہ کے یکسر خلاف ہے۔ (اس کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مولانا عبدالباری ندوی کا مضمون شائع شدہ ماہنامہ فاران کراچی بابت ماہ دسمبر ۱۹۵۵ء)

بہرحال اب دل کی دنیا زیروزبر ہو گئی، فکر و نظر کی قدریں بدلیں، اپنی اس حالت کا نقشہ مولانا مسعود عالم مرحوم کے ایک خط میں بھی حضرت والا نے ہی ایجاز کے ساتھ کھینچا ہے۔ معنویت کے ساتھ اعجاز بیان بھی ملاحظہ ہو۔

"واہ واہ کا مزہ بہت اُٹھا چکا اور اب یہ رنگ دل سے اتر چکا۔ اب تو آہ آہ کا دور ہے اور اپنی پچھلی تباہی کا ماتم اور آئندہ کی فکر درپیش ہے"۔

(مکاتیب سلیمان مرتبہ مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم مکتوب نمبر ۱۱۹)

Marfat.com

یہ آہ آہ (یعنی کثرت استغفار و ذکر) اس درجہ بڑھی کہ دارالمصنفین کے ایک رفیق نے مجھ سے فرمایا کہ ''دارالمصنفین کے درودیوار پر اس کا اثر چھا گیا تھا''...... اسی کی شہادت اور رفقائے دارالمصنفین کے بیان سے بھی ملتی ہے۔ چنانچہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب بیان ہے :

''اس تعلق کے ساتھ سید صاحب کے لیل ونہار ہی بدل گئے، اگرچہ اُن کی پوری زندگی دینداری اور پرہیزگاری میں گذری تھی، لیکن بادہ طریقت سے سرشار ہونے کے بعد ان کی دینداری میں تقویٰ اور تورع کا اور بھی زیادہ گہرا رنگ پیدا ہوگیا۔ عبادت و ریاضت بڑھ گئی، ذکر خفی کے ساتھ ذکر جلی بھی کرنے لگے، تقریر و خطابت نے وعظ و پند کی شکل اختیار کرلی، زیادہ وقت علمی مذاکروں کے بجائے رشد و ہدایت میں صرف ہونے لگا''۔

(سلیمان نمبر معارف ص ۳۴ و ۱۱۱)

اور مدیر معارف مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے لکھا ہے کہ :

''وہ صبغۃ اللہ میں بالکل رنگ گئے تھے۔ ''ومن احسن من اللہ صبغۃ'' اور ان میں بڑا روحانی انقلاب ہوگیا تھا۔ ان کے خیالات میں بھی بڑا تغیر پیدا ہوگیا تھا اور ان کی تقریروں اور تحریریں کا رنگ بھی بدل گیا''۔ (ایضاً)

حضرت والا کے داماد محترمی جناب سید حسین صاحب نے جو خود بھی حضرت تھانویؒ ہی کے دست گرفتہ ہیں۔ حضرت والا کے تبدیلی احوال کا بڑا جامع نقشہ کھینچا ہے۔ لکھتے ہیں :

''پہلے دارالمصنفین کے کاموں سے خالی اوقات کا کافی حصہ اہل و عیال کے ساتھ دینی مذاکرہ میں صرف فرماتے یا چھوٹے بچوں سے بذلہ سنجی میں، اب اوقات کا بڑا حصہ خلوت میں گذرتا، خواہ مسجد میں ہو یا اپنے مسکونہ کمرے میں۔ پہلے عصر کے بعد چائے

Marfat.com

رفقائے دار المصنفین کے ساتھ نوش فرماتے اور مغرب تک ان سے مختلف مسائل پر گفتگو فرماتے، یہ مجلس بھی ختم ہوگئی۔ کبھی اعزہ اہلیہ محترمہ سے اشتیاق ظاہر کرتے کہ قبلہ سے کچھ باتیں سنوادیجئے۔ عرصہ ہوا ان کی صحبت میسر نہیں آئی، تو وہ جاکر خلوت سے آتیں اور کچھ دیر کے لئے آپ تشریف لے آتے۔ اہل وعیال اور احباء کی درخواست آپ کم مسترد فرماتے تھے۔ اس لئے ان کی دلجوئی واستمالت کے لئے برآمدہ یا آنگن میں تشریف رکھتے، مگر دل کہیں اور ہی ہوتا۔ سب کی خیر وعافیت دریافت فرماتے اور جلد ہی کہیں اُٹھ کر جانا چاہتے، اگر کوئی اصرار کرتا تو تھوڑی دیر کے لئے رُک بھی جاتے، لیکن سب کو یہ محسوس ہوتا کہ ....

چسکا لگا ہے جام کا شغل ہے صبح و شام کا
اب میں تمہارے کام کا ہم نفسو نہیں رہا

(مجذوب)

یہ صورت دیکھ کر لوگوں نے اصرار کرنا ترک کردیا اور حضرت قبلہ کا اہل وعیال سے ملنا جلنا بھی دس پانچ منٹ کا رہ گیا۔ باہر کے سفر بھی ترک فرمادیئے۔ ایم اے وغیرہ کے امتحانات کی ممتحنی وغیرہ سب چھوڑ دی۔ دار المصنفین کے کام کے علاوہ خلوت کو زیادہ عزیز رکھنے لگے۔

خورد ونوش اور لباس وغیرہ میں بڑی تبدیلی ہوگئی۔ پہلے کے لباسِ فاخرہ سب بکسوں ہی میں بند رہ گئے۔ نادر شاہ کی عطا کردہ خلعت کو کیڑوں ہی نے چاٹ لیا اکثر اہلیہ محترمہ یاد کر کے ہر دوسرے دن کپڑے نکال دیتیں اور اگر کاموں کی مشغولیت سے انہیں خیال نہ رہتا تو خلافِ معمول تین تین دن تک ایک ہی کپڑا پہنے رہتے۔ بعض لوگ جنہیں مزاج عالی میں درخور تھا، کبھی یہ عرض کرتے کہ حضرت تصوف کے یہ معنیٰ تو نہیں کہ انسان کو کپڑا بدلنے کی بھی خبر نہ رہے، تو مسکرا کر فرماتے کہ اب بوڑھا ہوگیا ہوں، یاد نہیں رہتا،

Marfat.com

آپ یاد دلا دیا کریں۔

انہی ایام میں دیکھا کہ حضرت قبلہ فرش زمین پر بیٹھے ہیں کہ لوگ آ گئے۔ آپ بیٹھے بیٹھے گفتگو فرمانے لگے، کبھی بعد نمازِ مغرب دارالمصنفین کی مسجد کی شمالی چاردیواری پر ایک کونہ میں ذکرِ حق میں مشغول ہوتے، کبھی مکان مسکونہ کے باہر برآمدہ میں تخت پر بغیر کسی فرش کے، کبھی مکان کے کسی اور گوشہ میں متوجہ الی الحق پائے جاتے۔ کھانے کا وقت آتا یا کسی اور ضرورت سے لوگ تلاش کرتے ہوئے پہنچتے تو اس حالت میں دیکھ کر عرض کرتے کہ اس طرح کیوں تشریف رکھتے ہیں، فرمادیئے ہوتے تو فرش بچھادیا جاتا یا قالین کی جانماز بچھادی جاتی، سردی کا موسم ہے، ٹھنڈک نہ لگ جائے، فرماتے کہ ان ظاہری باتوں میں کیا رکھا ہے۔

یہ اُس شخص کا حال ہے جو اس دور میں نفاستِ مزاج میں مرزا مظہر جان جاناں شہیدؒ کی مثال اور ظاہری و باطنی حسن اخلاق کا مجسمہ تھا، جس کا رہن سہن اور لباس شاہانہ رہ چکا تھا۔ (سلیمان نمبر معارف ص۲۲۹ تا ص۳۳۲)

ایک اور خاص کیفیت جو ارادت کے تعلق کے بعد ظاہر ہوئی، وہ جذباتِ شوق کا وفور تھا، جو جب سینے سے اُٹھ کر زبان پر آتے شعر بن کر نکلتے تھے۔ چنانچہ خود صاحبِ کلام کو حیرت ہے، فرماتے ہیں ؎

نغمۂ اللہ سے طبع حزیں موزوں ہوئی
جو کبھی گاتی نہ تھی وہ وجد میں گانے لگی

اور پھر فرماتے ہیں .... ؎

فیض ہے یہ کس ولیِ وقت کا
اب مرا جو شعر ہے الہام ہے

Marfat.com

یہ بھی حضرت والاؒ کی زبان سے سنا ہے کہ :

''میری اس دور کی شاعری کا آغاز حضرت والا (تھانوی قدس سرہٗ) کے تعلق سے ہوا اور انجام بھی حضرت کی رحلت ہی پر ہو گیا۔ بعد میں مشکل سے دو چار غزلیں ہوئی ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت کی موجودگی میں جذبات کا وفور رہتا تھا، جو پھر باقی نہ رہا۔ اسی حقیقت کی ترجمانی ان اشعار میں بھی فرمائی ہے''۔ ....

جو شعر بھی سپردِ قلم کر رہا ہوں میں
سب وارداتِ عشق رقم کر رہا ہوں میں
دیوانہ گانِ عشق کو دے کر صدائے عام
آراستہ یہ مجلسِ جم کر رہا ہوں میں

اسی لئے انتباہ بھی فرمادیا ہے کہ ....

سمجھیں میرے کلام کو جو ہوشمند ہیں
مستی مری یہ بادۂ انگور کی نہیں

درخواستِ نصیحت :

غرض لکھنؤ کی مذکورہ حاضری کے بعد حضرت والا کی طبیعت اب پوری قوت کے ساتھ اپنے شیخ عالی مرتبت سے اخذِ فیض کی طرف متوجہ ہوگئی۔ ذوق وشوق نے بار بار تھانہ بھون کی حاضری پر مجبور کر دیا اور شیخ کے خصوصی الطاف سے برسوں کے مراحل منٹوں میں طے ہونے لگے ...... ڈاکٹر صاحب مدظلہٗ نے فرمایا کہ ''ایک مرتبہ حضرت سید صاحب خانقاہ تھانہ بھون تشریف لائے، محفلِ خاص آراستہ تھی۔ سید صاحب حضرت مولانا تھانوی سے متصل بیٹھے ہوئے تھے، چپکے سے سید صاحب نے کوئی بات حضرت شیخ کے گوش گذار فرمائی اور کچھ دیر کی خاموشی کے بعد حضرت شیخ قدس سرہٗ نے سید صاحب کے کان میں کچھ

Marfat.com

ارشاد فرمایا۔ ہم لوگ اس غرض وارشاد کو سُن نہ سکے، مگر دیکھا یہ کہ دفعۃً سید صاحب پہ گریہ طاری ہوگیا، یہاں تک کہ سسکیاں بندھ گئیں، پھر سید صاحب رخصت ہوگئے۔ ساری محفل محو حیرت تھی کہ یہ کیا ماجرا تھا، لیکن بارگاہِ اشرفیہ میں استفسار کی کس کو مجال ہوسکتی تھی۔ ایک عرصہ بعد حضرت خواجہ صاحب (خواجہ عزیز الحسن صاحب غوری مجذوب) نے جرأت کرکے وہ بات پوچھی، تو حضرت حکیم الامت نے اس کا اظہار فرمایا اور خواجہ صاحب نے اس واقعہ کو بلا اظہار نام کے اشرف السوانح میں بھی درج فرمادیا"۔ وہ یہ ہے:

"ایک مشہور فاضل ندوی اتفاقاً چند گھنٹوں کے لئے حضرت والا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور چلتے وقت عرض کیا کہ مجھ کو کوئی نصیحت فرمائیے۔ حضرت والا فرماتے ہیں کہ میں متردد ہوا کہ ایسے فاضل کو میں کیا نصیحت کردوں، پھر اللہ تعالیٰ نے فوراً میرے دل میں ایک مضمون ڈالا جو بعد کو معلوم ہوا کہ ان کے بالکل مناسب حال تھا (یہ ہیں شیخ الشیوخ کے الفاظ لفظ عبدیت کی تاثیر میں ڈوبا ہوا اور درسِ عبدیت کا مظہر بنا ہوا) میں نے کہا کہ حضرت آپ جیسے فاضل کو میں نصیحت تو کیا کرسکتا ہوں، لیکن ہاں میں نے جو اپنی اس تمام عمر میں سارے طریق کا حاصل سمجھا ہے، وہ عرض کئے دیتا ہوں (اس پیرایۂ بیان میں طالب کی حیثیت وعظمت کا کس درجہ پاس ولحاظ ہے) وہ حاصل جو میں سمجھا ہوں، وہ فنا وعبدیت ہے۔ بس جہاں تک ممکن ہو اپنے آپ کو مٹایا جائے، بس اسی کے لئے سارے ریاضت ومجاہدات کئے جاتے ہیں اور بس اپنی ساری عمر فنا وعبدیت کی تحصیل میں گذار دینی چاہئے۔ اس تقریر کا ان پر اس درجہ اثر ہوا کہ وہ آبدیدہ ہوگئے"۔

(اشرف السوانح جلد دوم ص ۲۱۸ مطبوعہ بریق پریس لکھنؤ)

شیخ عالی مقام کی اس نصیحت کا بااخلاص مرید کے قلب نے ایسا اثر قبول کیا کہ پھر

Marfat.com

صاحب نظر حضرات اس بات پر متفق ہو گئے کہ ''حضرت سید صاحب نے فنائیت میں جو کمال حاصل کیا اس کو کوئی نہ پا سکا۔ (یہ تصدیق میں نے حضرت مفتی صاحب حاجی محمد عثمان خان مرحوم، ڈاکٹر صاحب مولانا مسیح اللہ جلال آبادی مدظلہ اور متعدد خلفائے حکیم الامت کی زبانی سنی ہے)

درخواستِ بیعت :

اس مناسبت تامہ کے بعد جو بہت جلد شیخ و مرید میں پیدا ہو گئی تھی۔ حضرت والاؒ نے فرمایا کہ ''میں نے بیعت کی درخواست پیش کر دی''۔ مگر حکیم الامت قدس سرہٗ نے ارشاد فرمایا کہ :

''پچاس خط لکھ چکیں تو پھر ان شاء اللہ!''

پھر فرمایا : ''خواہ روزانہ یا صبح و شام خط لکھ کر یہ عدد پورا کر دیجئے''۔

حضرت مولانا تھانویؒ پر انتظامی شان غالب تھی۔ اس لئے بیعت سے قبل ایک معتد بہ مراسلت کی شرط ضرور عائد فرماتے تھے۔ یہاں بھی عام ضابطہ کے مطابق ایک قید تو عائد فرما دی، مگر دیکھئے کہ کس حکیمانہ و کریمانہ انداز سے ضابطہ و محبت کے تقاضوں کو ہم آہنگ کر دیا کہ نہ یہ ٹوٹے نہ وہ چھوٹے!

حضرت والاؒ نے یہ شرط قبول فرمالی کہ ......

ع ہر چہ از دوست میر سد نیکوست

لیکن اس انقیاد نے ان کو یہ شرف بخشا کہ ابھی چند ہی خطوط آئے گئے تھے کہ تھانہ بھون کی ایک حاضری میں مرشد تھانویؒ نے از خود بیعت سے سرفراز فرما دیا، گویا ایک عطا کو بے طلب اور بے گمان بنا کر اور بھی لذیذ بنا دیا!!۔

حضرت والا فرماتے تھے کہ میرے کل خطوط جو حضرت تھانوی کی رحلت تک لکھے گئے ۲۵، ۳۰ سے زائد نہیں ہیں۔

Marfat.com

بیعت پر شیخ کا اظہارِ تشکر :

یہ بھی حضرت والا ہی سے سنی ہوئی بات ہے کہ حضرت مولانا تھانوی جب حضرت سیدی کو دست بدست بیعت فرما چکے تو اظہارِ تشکر کے طور پر زبانِ اشرف سے یہ جملہ نکلا کہ:

''الحمدللہ میرے حصہ میں سارے عقلاء ہی آئے ہیں''۔

بیعت کا اثر مرید پر :

حضرت والاؒ سے بارہا سنا ہے کہ بیعت سے قبل حضرت مولانا تھانوی کی عقیدت اور عظمت ان پر غالب رہی، لیکن بیعت کے ساتھ ہی محبت عقیدت پر غالب آ گئی اور بے تکلفی نے عظمت کی جگہ لے لی۔ اس تغیر احوال کی اطلاع جب شیخ کی خدمت میں کی گئی تو حضرت شیخ نے اس حال کی تصدیق فرمائی اور یقین دلایا کہ :

''یہی مطلوب ہے، عقیدت کا شیشہ تو ادنیٰ ٹھیس سے چور چور ہو جاتا ہے،
مگر محبت ایک پائیدار چیز ہے!''۔

خصوصی تربیت :

حکیم الامت کے مرتبہ شناس جانتے ہیں کہ وہ اپنے وقت کے مجدد اور ایک محققِ کامل مرشد تھے۔ ان کے دامنِ تربیت میں ہر رنگ اور ہر مزاج کے انسان کو پناہ اسی لئے ملتی اور اطمینانِ کامل اسی لئے میسر آ جاتا کہ ان کے طریقہ اصلاح میں مزاج کا لحاظ بطورِ خاص رکھا جاتا تھا۔ اس کُلیہ کو جاننے پہچاننے کے باوجود بارگاہِ اشرفیہ کے اربابِ خاص کا کہنا ہے کہ حضرت مولانا تھانویؒ نے ہمارے حضرت کی تربیتِ روحانی ایک خاص نہج پر کی تھی۔

حکیم اشفاق الحسین صاحب مرحوم (حکیم اشفاق الحسین صاحب بریلوی تقسیم ہند کے بعد کراچی تشریف لائے۔ ناظم آباد میں ان کا مطب خاصا مشہور تھا اور خود ان کی زاہدانہ سیرت لوگوں پر کافی اثر انداز تھی۔ غالباً ۱۹۵۵ء میں رحلت فرما گئے۔ مرحوم حضرت

Marfat.com

والا کے کمالات علمی و ایمانی کے بڑے معترف تھے اور ۴۰ برس سے معارف کے خریدار تھے) جو حضرت تھانوی کے مجازِ صحبت تھے۔ راقم سے از راہ مہر و کرم فرماتے تھے کہ :

''حضرت مولانا (تھانوی) کے سب خلفاء جانتے ہیں کہ حضرت سید صاحب کی تربیت بالکل خاص نہج سے کی تھی''۔

اس کی تائید ڈاکٹر صاحب مدظلہ کی زبانی بارہا سننے میں آئی کہ :

''حضرت سید صاحب کا معاملہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا، دیکھنے والوں کو تو صرف یہ نظر آتا کہ سید صاحب تھانہ بھون تشریف لائے ہیں۔ محفل میں شرکت فرماتے ہیں، چپ چاپ بیٹھے رہتے ہیں اور چلے جاتے ہیں، نہ کوئی گفتگو ہوتی ہے نہ کچھ عرض و معروض ...... مگر دیکھتے ہی دیکھتے درجۂ کمال کو پہنچ گئے''۔

مولانا دریابادیؒ نے بھی مولانا گیلانیؒ کے اس تأسف پر کہ :

''ہمارے مولانا سید سلیمان ندوی ایسے وقت جاگے جب جگانے والا (یعنی حضرت تھانوی جو اپنی حیات کے آخری منازل میں تھے) خود نیند میں تھا''۔

یہی تحریر فرمایا کہ :

''مولانا ندوی کا شمار دیکھتے ہی دیکھتے ''اصحاب الیمین'' ہی میں نہیں ''مقربین'' میں ہونے لگا''۔ (حکیم الامت ص ۵۳۶، ۵۳۷)

سب سے بڑھ کر حضرت مفتی صاحب مدظلہ کی زبانی بھی جن کا خلفائے اشرفیہ میں ایک اہم مقام ہے، یہ تصدیقی ارشاد سننے میں آیا کہ :

''ہم لوگوں کو تعجب ہوتا تھا کہ حضرت سید صاحب کو اتنی جلد اس قدر رسوخ کیسے حاصل ہو گیا؟ مگر بعد کو پتہ چلا کہ جوہر ہی کچھ اور تھا''۔

Marfat.com

ان سب ارشادات سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ قلبِ سلیمانی کو قلب اشرفی سے ایک خاص ربط تھا اور اسی مخفی رابطہ سے سب کچھ ہوتا رہا۔ قیل و قال کی ضرورت ہی کیا تھا......۔

میان عاشق و معشوق رمزیست
کراماً کاتبین راہم خبر نیست

اپنے اس قیاس کو تقویت ایک اور خلیفہ اشرفیہ مولانا محمود الغنی صاحب سہارنپوری کے اس قول سے ہوتی ہے کہ :

''حضرت سید صاحب کی بات اور تھی، وہ مرتبۂ نفس کو طے کر کے حضرت تھانویؒ کی خدمت میں آئے تھے!''۔

اور ایک دوسرے خلیفۂ مجاز حاجی محمد عثمان خان صاحبؒ کا قول تو اس سے بھی زیادہ واضح ہے۔ فرماتے ہیں کہ :

''ایک مرتبہ حضرت سید صاحب ہی کے کمالات کا ذکر آ گیا، تو حضرت مولانا تھانویؒ نے فرمایا کہ جو لکڑی سوکھی ہوتی ہے، دیا سلائی دکھاتے ہی بھڑک اُٹھتی ہے اور جو گیلی ہوتی ہے، اُس کو عمر بھر بھی پھونکتے رہیے تو سوائے دھوئیں کے کچھ نہیں اُٹھتا ...... ان میں (یعنی مولانا سید سلیمان ندوی) کس بات کی کمی تھی!''۔

اس سب کے علاوہ یہ تو آپ پڑھ ہی چکے ہیں کہ لڑکپن ہی میں حضرت ابو حبیب مجددیؒ کے زیرِ تربیت قلبِ سلیمانی نے ایک خاص استعداد پیدا کر لی تھی، کیا عجب کہ اسی نہج پر حضرت تھانویؒ سے بھی فیض رسانی ہوتی رہی ہو کیونکہ حکیم الامتؒ کی ذاتِ اقدس چشتیت و نقشبندیت کی جامع تھی۔

Marfat.com

دفاع امام ابوحنیفہؒ

رشحاتِ قلم : مولانا عبدالقیوم حقانی

امام اعظم ابوحنیفہؒ کی سیرت وسوانح، علمی وتحقیقی کارنامے، تدوینِ فقہ، قانونی کونسل کی سرگرمیاں، دلچسپ مناظرے، حجیت اجماع وقیاس پر اعتراضات کے جوابات، نظریہ انقلاب و سیاست، فقہ حنفی کی قانونی حیثیت وجامعیت اور تقلید واجتہاد کے علاوہ قدیم وجدید اہم موضوعات پر سیر حاصل تبصرے۔ کمپیوٹرائزڈ ٹائٹل، مضبوط جلد بندی اور شاندار طباعت۔

صفحات : 352 ....

القاسم اکیڈمی، جامعہ ابوہریرہ برانچ پوسٹ آفس، خالق آباد، ضلع نوشہرہ

امامِ اعظم کے حیرت انگیز واقعات

رشحاتِ قلم : مولانا عبدالقیوم حقانی

اردو کی سب سے پہلی اور کامیاب کاوش، فکر ونظر، علم وعمل، تاریخ وتذکرہ، اخلاص و للّٰہیت، طہارت وتقویٰ، سیاست واجتماعیت، تبلیغ واشاعتِ دین، تعلیم وتدریس ...... غرض ہمہ جہت جامع، نفع بخش، کمپیوٹرائزڈ ٹائٹل، مضبوط جلد بندی اور شاندار طباعت۔

صفحات : 272 ....

القاسم اکیڈمی، جامعہ ابوہریرہ برانچ پوسٹ آفس، خالق آباد، ضلع نوشہرہ

Marfat.com

جناب ڈاکٹر غلام محمد صاحب

سیرتِ سلیمانی کا عرفانی پہلو

اہل اللہ کی بزمِ قدس میں تین طرح کی ہستیاں نظر آ ئیں ۔ ایک تو وہ جن کی سیرتیں سرتا سر جذب وعشق اور معرفت کا آئینہ ہیں ۔ مثلاً بایزید بسطامیؒ، شیخ عبد القادر جیلانیؒ، مجدد الف ثانیؒ وغیرہ، دوسری وہ جن کی زندگیاں گو بے داغ ہیں، لیکن ان کا جوہر عرفانی ایک عرصہ بعد کھلا ہے، جیسے امام غزالیؒ، عارف رومیؒ، شیخ فرید الدین عطارؒ وغیرہ، تیسری وہ ہستیاں جن کی حیات کبھی تو عام معیارِ اخلاق سے بھی پست تھی، مگر جب انقلاب آیا، تو رشکِ تقویٰ اور معیارِ معرفت قرار پا گئی، مثلاً سید الطائفہ جنید بغدادیؒ، حضرت بشر حافیؒ وغیرہ...... ہمارے ممدوح کا مقام اس اعتبار سے وسطانی زمرہ میں نظر آیا۔

ورثہ :

انسانی سیرت دو ہی اجزاء سے عبارت ہے، ایک تو موروثی صفات اور دوسرے اکتسابی کمالات ہمارے حضرت والاؒ کو دونوں جہتوں سے حظ وافر ملا تھا۔ وہ سید زادے تھے، شرافت ومروّت، عفو و درگذر، ایثار وسخاوت، حلم و بردباری، عالی حوصلگی اور پامردی حضرت کو ورثہ میں ملی تھی، پھر یہ بھی خوش بختی کی بات تھی کہ یہ صفات آپ کے گرد وپیش کے بزرگوں میں پوری طرح نمایاں تھیں اور آپ کا ماحول علم وعرفان اور طبابتِ جسمانی و روحانی کا سنگم بنا ہوا تھا، آپ کے والد ماجد ایک عالم وطبیب حاذق اور نقشبندی ابوالعلائی سلسلہ کے شیخ اور صاحبِ نسبت بزرگ تھے۔ راقم نے خود حضرت کو یہ فرماتے سنا کہ میں نے اپنے والد اور حضرت مولانا تھانویؒ سے زیادہ بے ہمہ اور باہمہ ہستیاں اپنی عمر میں نہیں

Marfat.com

دیکھیں۔ آپ کے بڑے بھائی مولانا حکیم ابوحبیب جو عمر میں آپ سے ۱۲ سال بڑے تھے، ویسنہ کے ایک مشہور طبیب' جید عالم، اور حضرت شاہ ابواحمد بھوپالی مجددیؒ کے خلیفہ مجاز تھے۔ آپ کے چچا حافظ تجمل حسین صاحب ایک صاحب حال بزرگ، اور شاہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی کے خلیفہ تھے۔

اکتساب :

اس پاکیزہ ماحول اور ان اعلیٰ موروثی صفات کے ساتھ حضرت والاؒ کو کسب کمالات کے بھی پورے مواقع ملے۔ ابتداء ہی سے آپ کے والد ماجد نے آپ کی اخلاق تربیت کو ہمیشہ پیش نظر رکھا، پھر آپ کے بڑے بھائی مولانا ابوحبیب صاحب نے بھی پوری توجہ صرف فرمائی، خود حضرتؒ فرماتے تھے کہ لڑکپن میں میں نے اپنے بڑے بھائی صاحب کے حسبِ ہدایت کچھ ذکر اور مراقبات بھی کئے اور ان کے حلقۂ توجہ میں بھی بیٹھا کرتا تھا، اور اُن کے فیض صحبت سے اپنے اندر پاکی محسوس کرتا تھا، لیکن یہ باطنی پہلو اس دور میں کچھ اُجاگر نہ ہوسکا، کیونکہ اس وقت حصولِ علم مقدم تھا، چنانچہ ابتدائی تعلیم مدرسہ امدادیہ دربھنگہ اور پھلواری شریف میں پائی اور پھر غالباً ۱۹۰۱ء میں ذہن وفکر کی آخری تربیت گاہ ندوۃ العلماء لکھنؤ میں پہنچے۔ خداداد فہم وذکا، اور پھر مولانا شبلی کی تعلیم وتربیت نے مل کر حضرتؒ کو صفِ علماء میں اس قدر ممتاز کیا کہ متنوع علوم وفنون کی جامعیت اور ان میں تحقیق ونظر کے اعتبار سے شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے بعد اگر نظر کہیں آکر ٹھہرتی ہے، تو وہ حضرت سید صاحب ہی کی ذاتِ گرامی ہے۔ **ذلک فضل اللّٰہ یوتیہ من یشاء۔**

حکیم الامت سے مراسلت کا غیبی سبب :

علوم وفنون کی فضاؤں میں تختِ سلیمانی تو خوب پرواز کرتا رہا، مگر مولانا شاہ ابوحبیب صاحبؒ کی برکت سے روحانی عالم کے جو اثرات قلبِ سلیمانی پر پڑتے تھے، وہ

Marfat.com

ساری علمی مصروفیات کے باوجود قائم رہے اور برابر فکر لاحق رہی کہ کوئی شیخ کامل ایسا مل جائے جو روحانی پرواز میں مدد دے سکے، عجیب بات ہے کہ آواخر ۱۹۲۹ء میں حضرت حکیم الامتؒ کے ایما سے مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی نے رسالہ کشف الدجی لکھا، اور اس کا ایک نسخہ تقریظاً کے لئے حضرت علامہ کی خدمت میں ارسال فرمایا۔ ہمارے حضرت نے اس کے جواب میں حکیم الامت کو ایک خط لکھا، اس مکتوب کی نقل یہاں طوالت کا موجب ہوگی۔ البتہ اس کا جواب جو حکیم الامت کی طرف سے عطا ہوا وہ اقتباساً درج ذیل ہے۔ اس سے طرفین کی خط وکتابت کا حال معلوم ہو جائے گا۔

"مولانا المحترم دامت فیوضہم (حضرت حکیم الامتؒ کے ہاں ہر ایک کے حفظ مراتب کا جو پاس ولحاظ تھا، اس کی دلیل میں تنہا یہ مکتوب کافی ہے)

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

عجیب بات ہے کہ انبساط کا قصد نہ میرا تھا، نہ جناب کا، دونوں طرف اتفاقاً ہی اس کے اسباب پیش آ گئے۔ اُس طرف کا واقعہ تو جناب نے تحریر ہی فرما دیا۔ اس طرف یہ واقعہ ہوا کہ میں نے بالتعیین کسی بزرگ کے پاس رسالہ بھیجنے کو نہ کہا تھا۔ دو وجہ سے ایک یہ کہ مجھ کو بزرگوں کی فہرست ہی بہت غیر مکمل معلوم ہے، دوسرے کسی کو ایسی تکلیف دیتے ہوئے ہمت نہیں ہوتی۔ خصوصاً اگر میرا کلام ہو، تو بے حد حجاب ہوتا ہے، یہ رسالہ میرے ہمشیرزادہ نے لکھا، اگرچہ میرے ہی کہنے سے لکھا، چونکہ آج کل عام طبائع کی حالت پر نظر کر کے اس استفتاء کی مضرتِ عامہ کا قوی اندیشہ تھا۔ اس کے انسداد کی سب سے انفع تدبیر علماء کی موافقت حاصل کرنا ذہن میں آیا کہ عوام پر اس کا خاص اثر ہوتا ہے۔ اس لئے میں نے عزیز موصوف کو مصارف دے کر مشورہ دیا کہ جہاں جہاں مناسب ہو بھیج دیا جائے، میں ان کا ممنون ہوں کہ انہوں نے جناب کو بھی تکلیف دے کر یہ موقع دیا کہ میں جناب کا مخاطب بن سکا۔

Marfat.com

غرض یہ واقعہ ادھر سے ہوا، بہر حال حجابِ مرتفع ہونے کے بعد اب مضامین محبت کا جواب عرض کرتا ہوں، جناب کی تواضع نے ضرور مجھ کو ایک معتد بہ درجہ میں معتقد بنا دیا اور غالب یہ ہے کہ آئندہ اس میں اضافہ اور قوت ہو ...... مسئلہ کے متعلق جس عنوان سے رائے سامی ظاہر فرمائی ہے، اس سے سہل اور دل میں اتر جانے والا عنوان کم ذہن میں آتا ہے۔ (حضرت علامہ کی رائے یہ تھی ''آپ (یعنی مستفتی) جس کو مکروہ سمجھتے ہیں، میں اس کو عین ربوا کہتا ہوں اور میرے نزدیک تو قیل وقال و روایت سے زیادہ مستحکم دلیل عمل سلفِ کرام ہے کہ ایسا کھلا اور شدید الاحتیاج مسئلہ ہونے کے باوجود کسی نے اس کو جائز نہیں بتایا اور نہ کبھی اس پر عمل کیا) **بارک اللہ تعالیٰ فی معارفکم** ....

آخر میں جو خانقاہ کے متعلق اپنا انجذاب اور اس کے ساتھ کچھ مواقع محتملہ کا ذکر فرمایا ہے۔ (حضرت علامہ نے یہ تحریر فرمایا تھا: بار بار میرا دل جب زمانہ کے فتن و حوادث سے گھبرا اُٹھتا ہے اور بے اختیار کسی سکینت وطمانیت کے مامن کی تلاش ہوتی ہے، تو خانقاہ امدادیہ کی یاد آتی ہے، لیکن ڈر تھا کہ معلوم نہیں کہ اجنبیت و بے گانگی سے میرے متعلق کیا کیا آپ تک پہنچا ہو اور آپ مجھے تخاطب کا اہل بھی سمجھیں یا نہیں ...... اب میں اس کشمکش کی منزل میں ہوں، جس میں علوم ظاہری تسکین کا باعث نہیں بنتے، دعا کا طالب اور ہمت کا خواستگار ہوں'') اگر خانقاہ میں حضرت شیخ قدس اللہ سرہٗ رونق افروز ہوتے تو یہ سب مضامین حقیقت پر منطبق ہوتے، لیکن اب محض حسنِ ظن پر منطبق ہو سکتے ہیں۔ اس سے آگے ہیچ، البتہ میں زیادہ تکلف کرنے کو بھی اعادۂ حجاب سابق اور موہن انبساط لاحق سمجھ کر پسند نہیں کرتا، اس لئے

Marfat.com

بلاتکلف معاملہ کی سچی بات عرض کرتا ہوں کہ جناب کا یہ حسنِ ظن اگر کسی روایت پر مبنی ہے تو ''لا یوثق بہ'' اور اگر ذوقی و وجدانی ہے تو میں دوستی کرنے کے لئے تیار ہوں۔ بشرطیکہ مجھ کو علوم مین مخاطب نہ بنایا جائے کہ اُن سے معّرا ہونے کو اوپر ظاہر کر چکا ہوں۔ والصدق ینجی والسلام۔

ناکارہ آوارہ ننگِ انام اشرف برائے نام

ازتھانہ بھون، ۲۸ر دسمبر ۱۹۲۹ء

اس پہلی مراسلت کے بعد جس کے سامان غیب ہی سے ہوئے تھے، ہمارے حضرت والا نے ایک اور عریضہ حضرت تھانوی قدس سرہٗ کی خدمت میں لکھا، جس کا متعلقہ جزیہ ہے :

''میرے لئے کوئی ایسا نسخہ تجویز فرمائیں کہ مجھ میں استقامت وتثبت و رغبت الی الطاعت پیدا ہو۔ فرائض کا پابند ہوں، بدعات سے نفور ہوں، کبھی کبھی ذوقِ سجود کی لذت بھی پاتا ہوں''۔ امام ربانی مجدد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور اُن کے سلسلہ سے عقیدت تامہ ہے، خرافات وطاماتِ صوفیہ کا منکر ہوں ......''

اس کے جواب میں حکیم الامت نے اپنے رسالہ ''قصد السبیل'' کی تسہیل روانہ فرمائی اور ساتھ ہی گُر کی باتیں یہ تحریر فرمائیں جو عطر تصوف ہیں :

''مامور بہ وجوباً یا استحباباً اس طریق میں صرف افعال ہیں، انفعالات نہیں، مثلاً استقامت وتثبت ورغبت الی الطاعات والتزام فرائض و تنفر عن البدعات و لذت و ذوق و اخلاص و اصلاحِ قلب و امثالھا، ان میں جو چیزیں یا بعض چیزوں کے جوارحی افعال ہیں، وہ مامور بہ ہیں کیونکہ وہی اختیاری ہیں اور جو انفعالات ہیں وہ مامور بہ نہیں، کیونکہ وہ غیر اختیار ہیں۔ البتہ وہ انفعالات بعضے مطلقاً بعضے خاص احوال میں محمودہ

Marfat.com

ضرور ہیں اور اسی درجہ میں مطلوب بھی ہیں، مگر وہ سب آثار و ثمرات اُنہی افعال کے ہیں، اور وہ افعال ہی اُن کے اسباب ہیں، کہ ان کی طرف فی الجملہ یا فی الاکثر مقتضی ہیں، ان کے علل نہیں کہ ان سے مختلف ہی نہ ہوں، اگر تخلف بھی ہو تو مضر نہیں، کیونکہ اصل مقصود قرب و رضا کی وہ شرطیں نہیں۔ والسلام۔

رُکاوٹ :

مذکورہ بالا مکاتبت کے بعد ایک اور خط ان بزرگوں کے درمیان آیا اور گیا اور اس پر آخری تاریخ ۲۹ رشوال ۴۸ھ کی ملتی ہے۔ انگریزی لحاظ سے ۳۰ء کا کوئی مہینہ ہوگا۔ اس کے بعد پھر تقریباً دس برس تک کے لئے استفادہ و افادہ کا سلسلہ منقطع رہا اور اس کی وجہ راقم نے خود حضرت والا کی زبانی یہ سنی ہے کہ اس زمانہ میں تھانہ بھون سے رسالہ ''النور'' مولانا ظفر احمد عثمانی کے زیر ادارت نکلتا تھا اور اعظم گڑھ سے ''معارف'' جب جب حکیم الامتؒ کی خدمت میں عریضہ لکھنے کا ارادہ ہوتا تو کوئی نہ کوئی اختلافی مسئلہ النور میں شائع ہوتا اور اس کی وجہ سے طبیعت میں رُکاوٹ پیدا ہو جاتی۔

پہلی حاضری :

۱۹۳۴ء کے ختم اور ۳۵ء کے آغاز کا زمانہ تھا۔ حضرت والاؒ، ڈاکٹر اقبال مرحوم کی دعوت پر کسی کمیٹی میں شرکت کے لئے لاہور تشریف لے گئے۔ اب تک مولانا تھانویؒ سے کبھی ملاقات نہ ہوئی تھی۔ لاہور سے واپسی میں خیال آیا کہ تھانہ بھون کچھ دیر کے لئے اُتر جائیں، چنانچہ یہ اندرونی تقاضا پورا ہوا اور اس حاضری سے مرشد تھانوی نے جو اثر لیا، اس کو خود انہی کے جچے تُلے مؤثر الفاظ میں سنئے۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے نام ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں :

''مولانا سید سلیمان ندوی صاحب دفعۃً تشریف لے آئے۔ میں مکان

Marfat.com

پر تھا، سنتے ہی حاضر ہوا، میرے ذہن میں ان کا جثہ طویل وعریض تھا، ملا تو معتدل الخلقت پاکر قلب کو بہت انس ہوا، پھر ملاقات ومکالمت سے اُن کی تواضع وسادگی، ورعایتِ جلیس دیکھ کر تو مسخر ہو گیا (کیسے مفتری ہیں وہ لوگ جنہوں نے بہ زعم محبت یہ مشہور کر رکھا ہے کہ سید صاحب گئے تو تھے ملنے کے لئے، لیکن مولانا تھانویؒ نے اُن کو مسخر کر لیا۔ از خود مرید بنالیا، اس بیان میں اگر مولانا تھانوی کی شکایت ہے تو سید والا مرتبت کے رتبۂ عالی کا کونسا پاس و لحاظ ہے) گیارہ بجے تشریف لائے۔ تین بجے واپس تشریف لے گئے۔ مجلس میں بہت دیر تک ثنا خوانی کرتا رہا''۔ (حکیم الامت ص ۴۳۸)

رجوع اور بیعت:

اس ملاقات سے ظاہر ہے کہ فریقین کے دل محبت وعظمت سے معمور ہو چکے تھے، لیکن پھر بھی ایک عرصہ تک خط وکتابت کی صورت نہ نکل سکی۔ حالانکہ اس عرصہ میں سلیمانی نگاہ، مرشد کامل کے لئے برابر متلاشی تھی اور ہر پھر اگر کہیں ٹھہرتی تھی تو وہ تھانہ بھون ہی کے شیخ الشیوخ کا آستانہ تھا۔ اس عرصہ میں ایک مرتبہ حضرت والاؒ کو عالمِ رویا میں شیخ العرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی زیارت نصیب ہوئی، حضرت سیدیؒ نے اپنے سینہ کی طرف اور حضرت حاجی صاحبؒ کے سینۂ مبارک کی جانب اپنے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے عرض کیا ''اس کو ایسا کر دیجئے''۔ حضرت حاجی صاحب مسکرائے اور فرمایا، ''اب تو میں یہ کام نہیں کرتا''۔ حضرت سیدیؒ کا بیان ہے کہ اس کی تعبیر ذہن میں آئی کہ حضرت حاجی صاحب چونکہ عالم ناسوت سے تعلق منقطع فرما چکے ہیں، اس لئے اُن کو عذر ہے، اور اُن کے کسی جانشین سے تعلق جوڑنا چاہئے۔ چنانچہ پھر نظر حکیم الامت ہی پر پڑی، ساتھ ہی اس کا بھی اعتراف فرماتے تھے کہ حکیم الامت سے تعلق قائم ہونے میں مولانا عبدالباری صاحب ندوی کے اصرار کو بھی دخل ہے۔ غرض پھر مستقل تعلق کے اسباب یوں پیدا ہوئے۔ حکیم

Marfat.com

الامت قدس سرہٗ اگست ۱۹۳۸ء میں اپنے علاج کے سلسلہ میں لکھنؤ تشریف لائے تھے، اس موقع کو حضرت والا نے غنیمت سمجھا، اور حاضر خدمت ہو کر مستقلاً رجوع ہو کر بیعت سے مشرف ہوئے۔

حضرت والاؒ کی بیعت کے سلسلہ میں ایک واقعہ کا اظہار خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ دو معتبر راویوں (مراد حاجی عثمان خان صاحب مرحوم مالک کتب خانہ اشرفیہ اور محترمی ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب مدظلہٗ ہیں) سے یہ بات سنی ہے کہ قطب ارشاد مولانا تھانوی جب لکھنؤ تشریف لے گئے، تو تھانہ بھون میں ایک مجذوب نے آپ کے ایک مرید سے پوچھا ”تمہارے پیر کہاں گئے ہیں“؟ انہوں نے عرض کیا کہ علاج کے سلسلہ میں لکھنؤ تشریف لے گئے ہیں، اس مجذوب نے قہقہہ لگایا اور کہا علاج ولاج تو ایک بہانہ ہے، ایک شہباز کے شکار کو گئے ہیں اور شکار کر لائیں گے“ ...... چنانچہ جب حضرت والاؒ کے رجوع و بیعت کی اطلاع عام ہوئی تو سب کو اس قلندر کی بات کا یقین آ گیا .... ع

قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید

خصوصی ربط :

غرض اب کیا تھا، اُدھر قوتِ فیضان جوش زن اور ادھر طلبِ صادق بے اندازہ، چنانچہ اسی اضطراب میں فرماتے ہیں ....

لفظ بے گانہ بھلا کیا ترجمانی کر سکے
شوق بے اندازہ پیچیدہ وہ میرے دل میں ہے

....

جام پر جام مجھے دے کے بنادے بدمست
صبر سرجوشی اذکار کہاں سے لاؤں

....

Marfat.com

دیر سے آیا ہوں ساقی دور سے آیا ہوں میں
ہو عطائے خاص مجھ کو جو عطائے عام ہے

(یہ سب اشعار حضرت سیدی کے ہیں۔ ان کے بطور استدلال پیش کرنے میں اس لئے تأمل نہیں کہ حضرت والاؒ نے خود اپنے اس دور کے کلام کے متعلق فرمایا کہ "یہ تو میرا سفر نامہ ہے"۔ اس کلام کا آغاز اور انجام حکیم الامت سے رجوع اور اُن کی رحلت پر ہے۔ بعد میں بہ مشکل پانچ چار غزلیں ہوئی ہیں۔ اس مجموعہ کا نام حضرت والاؒ نے "غزل الغزلات" تجویز فرمایا تھا کہ یہ نام حضرت سلیمان علیہ السلام کے مجموعۂ کلام کا تھا۔ (غ)

اور حضرت شیخ نے بھی اس تشنگی کو بجھانے کی پوری سعی فرمائی، بارگاہِ تھانویؒ کے ایک ممتاز خلیفہ مولانا مفتی محمد حسن صاحب نے کئی بار فرمایا کہ حضرت سید صاحب جب خانقاہ میں تشریف لاتے، تو ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی طبیعت میں ایک جوش پیدا ہو جاتا اور معلوم یوں ہوتا کہ گویا جوان ہو گئے ہیں۔ گھنٹہ بھر کی محفل کو دو دو گھنٹہ طول دیتے تھے اور محترم ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب نے فرمایا کہ خود حکیم الامت مجھ سے فرماتے تھے کہ جب رات کو دو بجے آنکھ کھلتی ہے، تو جی چاہتا ہے کہ سید صاحب کو بلالوں اور باتیں کرتا رہوں، مگر اُن کی زحمت کے خیال سے چُپ ہو جاتا ہوں۔

شیخ و مرید کے اس خصوصی ربط سے متعلق کم از کم دو روایات اور سُنائے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا: "ایک مرتبہ حضرت سیدی خانقاہ میں تشریف لے جارہے تھے، محفل آراستہ تھی، حکیم الامت کی نظر جو سید والا مرتبت پر پڑی، تو بے ساختہ کھڑے ہو گئے، مرید صادق نے بڑھ کر عرض کی "حضرت تشریف رکھیں"، تو ارشاد فرمایا "واللہ میں تعظیماً کسی کے لئے نہیں اُٹھتا، میں تو فرطِ محبت سے کھڑا ہو گیا"۔

ایک مرتبہ حکیم الامت نے ایک چھڑی تحفہ میں محبت کے طور پر بھیجی اور اس کے ساتھ ایک رقعہ بھی جس کا آغاز اس پر از محبت اور بلیغ جملہ سے فرمایا تھا:

Marfat.com

''راحتِ جاں! راحتِ جسم کا سامان بھیج رہا ہوں''۔

حضرت سیدیؒ نے اس عطائے شیخ کو دل و جان سے قبول فرما کر جواباً تحریر فرمایا کہ :

''اس عطائے خاص سے میں نے استقامت فی العمل کی تعبیر لی''۔

حضرت شیخ نے جب یہ عارفانہ جواب پڑھا، تو انبساط سے معمور ہو گئے اور اس کا ایک طویل جواب تحریر فرمایا، جو سراسر دعاؤں سے لبریز تھا۔ (یہ دونوں باتیں حضرت سیدیؒ نے احقر سے تنہائی میں ایک مرتبہ فرمائی تھیں اور پھر اس کی اجازت بھی عطا فرمائی تھی کہ احقر اس خط و کتابت کی نقل کر لے، جو حکیم الامت اور اُن کے درمیان رہی، مگر مرض الموت کی وجہ سے خود یہ خزانہ نکال کر عطا نہ فرما سکے اور حضرت کے صاحبزادہ اپنی پریشانیوں میں اس سلسلہ کے ارشادِ پدری کی تعمیل سے قاصر رہے، ورنہ آج اس سے بڑی مدد ملتی، تین چار ابتدائی خطوط کی جو نقلیں مل گئیں، وہ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کا کرم ہے)

مولانا مفتی محمد حسن صاحب نے فرمایا کہ ہم لوگوں کو تعجب ہوتا تھا کہ حضرت صاحب کو اتنی جلد اس قدر رُسوخ کیسے حاصل ہو گیا، مگر بعد کو پتہ چلا کہ یہ جوہر ہی کچھ اور تھا۔

اسی اثناء میں حضرت علامہ نے حکیم الامتؒ کی تحریک اور اشارے کے بغیر اپنے احساس سے مجبور ہو کر بعض اختلافی مسائل میں رجوع و اعتراف کا مضمون ''معارف'' میں شائع فرمایا اور اس کو ملاحظہ کے لئے بھیجا تو حضرت شیخ بے حد مسرور ہوئے اور خلافِ عادت دس بارہ توصیفی اشعار مثنوی کے وزن پر لکھ کر بھیجے (یہ محرم ۱۳۶۱ھ کا واقعہ ہے) چند یہ ہیں ....

از سلیمان گیر اخلاصِ عمل — وان تو ندوی را منزہ از دغل
اے دلت معمور از اسرارِ حق — اے دلت مخمور از آثارِ حق
اے دلت پر نور از انوارِ حق — اے دلت مسرور از اخبارِ حق

Marfat.com

ہم کو نہیں معلوم کہ حسام الدین رحمۃ اللہ علیہ کے بعد یہ سعادت بجز حضرت سیدیؒ کے کسی اور کے بھی حصہ میں آئی ہو کہ شیخ نے مرید کی مدح میں بے ساختہ اشعار کہے ہوں۔

خلافت :

برسوں کی منزلیں دنوں میں طے ہوتی چلی گئیں، ایک مرتبہ حکیم الامت کی طرف سے ایک گرامی نامہ وصول ہوا، جس کا عنوان تھا، ''استشارہ بعد از استخارہ'' اور اس میں لکھا تھا کہ ''میرا جی چاہتا ہے کہ آپ کو خلافت دوں''۔ اس سلسلہ میں' میں نے استخارہ بھی کرلیا، اب آپ کا کیا مشورہ ہے؟ حضرت سیدیؒ نے فرمایا کہ چونکہ قریب ہی میں تھانہ بھون کی حاضری کا قصد تھا، اس لئے میں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا، بلکہ جب حاضرِ خدمت بھی ہوا تو خاموش ہی رہا، آخر ایک دن حضرتِ والا کی طرف سے ایک پرچہ ملا کہ ''آپ نے میری استشارہ کا جواب نہیں دیا'' ...... اس اصرار پر میں نے یہ جواب لکھا کہ

''حضرت والاؒ کا مکتوبِ گرامی پڑھ کر قدموں تلے سے زمین نکل گئی، کہاں میں اور کہاں یہ ذمہ داری''۔ (یہ سب روایت بالمعنیٰ سمجھی جائے، مگر مفہوم کی صحت میں کوئی کلام نہیں)

بس یہ جواب پانا تھا کہ شیخ الشیوخؒ کے قلب سے الحمد للہ کی ایک صدا اٹھی، اور سید والا مرتبت کو خلافتِ باطنی سے سرفراز فرما کر مسند ارشاد پر بٹھادیا ...... اور اس بات کے راوی حضرت حاجی عثمان خان صاحب مرحوم ہیں، جو حکیم الامتؒ کے فدائی اور خلیفہ مجاز تھے کہ حضرت سید صاحب کو خلافت عطا فرما کر حضرت والاؒ اس قدر مطمئن تھے، کہ بار بار فرمایا کہ الحمد للہ اب مجھے کوئی فکر نہیں، میرے بعد ایسے ایسے لوگ موجود ہیں۔ ذالک فضل اللّٰہ یوتیہ من یشاء۔

شوروغوغا :

حیرت ہے کہ عین اس وقت جب کہ بارگاہِ نبوی ﷺ کا سیرت نگار اپنے ممدوح

Marfat.com

کی حیاتِ طیبہ کے آخری نقش و نگار سے اپنی زندگی کو آراستہ کرنے میں مشغول تھا، بے بصروں نے اس کے خلاف ایک شور و غوغا پا کیا کہ علامۂ عصر نے مسندِ علم چھوڑ دی؟ عین اس وقت جب کہ ''وہ آبروئے ندوہ'' اپنے ساتھ ایک جماعتِ کثیر پیدا کر کے اور اس کو برسر کار لگا کر **فسبح بحمد ربک و استغفرہ** کی منزل طے کر رہا تھا، بعض نادانوں نے اس کے اس عمل کو تعطل قرار دیا۔ عین اس وقت جب کہ وہ پیکر عبودیت اُن ساری خدماتِ علمیہ سے فارغ ہو کر جو ایک ادارہ سے بھی ممکن نہ تھیں، **فاذا فرغت فانصب و الی ربک فارغب** کے حکم کے آگے سرنگوں ہو رہا تھا، مدعیان دانش نے اس پر اعتراض کیا کہ یہ شغل کیسا؟ لیکن اس عارف نے اس سارے شور و غل کا جواب اپنے عمل کے استحکام اور معنی خیز تبسم کے ساتھ یہی دیا ......

دستارِ فضیلت ہو یا دلقِ مرقع ہو
ہونا ہے اُسے اک دن نذرِ مئے و میخانہ

کبھی خود ماننے والوں نے زیادہ شور مچایا، تو صرف اتنا فرمایا کہ لوگ مجھ کو کہتے تو محقق اور علامہ ہیں، مگر درحقیقت بے عقل جانتے ہیں ...... اور گر کبھی کسی نے زیادہ احسان جتایا، تو صاف یہ جواب لکھ دیا کہ جن کمالات کی بنا پر آپ نے مجھے اپنا قبلہ بنایا تھا، انہی کمالات نے مجھ کو مولانا تھانویؒ کے آگے جھکا دیا، میں نے اپنے انجام کی فکر کر لی، اب آپ کو اختیار ہے کہ اپنا قبلہ کوئی اور تجویز کر لیں۔

یہ ہنگامہ کوئی نیا یا ہمارے سیدی ذی شان کے ساتھ خاص نہیں۔ عرفاء و اتقیاء کی تاریخ میں ایسی اور بھی مثالیں مل جاتی ہیں ...... عارف رومیؒ نے جب شمس تبریزؒ کا دامن تھاما تھا، تو کیا خود مولانا رومؒ ہی کے شاگردوں نے شمس تابان پر دھول جھونکنے کی کوشش نہیں کی؟ اور کیا بالآخر انہی ناقدروں کے ہاتھوں عارف رومیؒ کو مدتوں بادیہ پیمائی نہیں کرنی پڑی؟ ...... اسی طرح امام غزالیؒ کو بھی اس مرحلہ پر پہنچ کر کیا کچھ نصیحتیں سننی نہ پڑیں،

Marfat.com

خود امام عالی مقام ہی کی زبانی کچھ روداد سنیئے :

''علماء اور ارکانِ سلطنت کو جب خبر ہوئی تو سب نے نہایت الحاح کے ساتھ روکا اور حسرت سے کہا کہ یہ اسلام کی بدنصیبی ہے، ایسی نفعہ رسانی (یعنی درس و تدریس) سے آپ کا دست بردار ہو جانا شرعاً کیونکر جائز ہو سکتا ہے؟ تمام علماء و فضلاء یہی کہتے تھے، لیکن میں اصل حقیقت کو سمجھتا تھا، اس لئے سب کو چھوڑ چھاڑ دفعتہً کھڑا ہوا اور شام کی راہ لی''۔ (الغزالی از علامہ شبلی نعمانی)

کیسی یکسانیت ہے، عارف رومیؒ و امام غزالیؒ اور اسی دور کے سید العلماء والصلحاء مسندِ نشین شبلیؒ و اشرفؒ میں۔

فناء الفناء :

سچ کہا ہے ایک صاحبِ نظر نے کہ حضرت سید صاحب کو عروج کی حالت میں تو لوگوں نے کچھ پہچانا بھی، مگر نزول کے عالم میں کوئی سمجھ ہی نہ سکا کہ ان کا کیا مرتبہ ہے۔ (یہ ڈاکٹر عبدالحئی صاحب مدظلہٗ کا جملہ ہے) راقم بلا خوف تردید عرض کرتا ہے کہ حضرت والا کا پہلا قدم وہاں پڑا، جو بہت سوں کی انتہاء ہے۔ تفصیل کا موقع نہیں، فنی زبان میں مختصراً یہ سمجھ لیجئے کہ ایک شہرۂ آفاق محقق و مفکر اسلام اور ایک مرجع علمائے عصر شخصیت کا کسی شیخ وقت کے آگے اپنے آپ کو پیش کر دینا اسی امر کی بین دلیل ہے کہ وہ مرتبۂ نفس سے گذر کر مرتبۂ روح میں داخل ہو گیا اور مرتبۂ نفس کا طئے کر لینا بلا مبالغہ بہت سوں کی منتہا ہے ..... پھر جب اس منزل پر بھی حضرت والاؒ نے اپنے شیخ عالی مقام سے عرض کیا کہ حضرت کچھ نصیحت فرما دیجئے، تو حکیم الامت کا خود بیان ہے کہ وہ کچھ دیر کے لئے سوچ میں پڑ گئے کہ ایک عالم عصر کو کیا نصیحت کریں، کچھ سمجھ میں نہ آیا تو یہی فرما دیا کہ اس راہ کی ابتداء و انتہاء فنا ہے۔ (یہ واقعہ تفصیلاً ''اشرف السوانح'' میں موجود ہے، مگر بغیر نام کے صرف ان الفاظ کے ساتھ کہ ''ایک فاضل اجل نے مجھ سے نصیحت کے لئے فرمایا'') یہ بات خاطرِ سیمانی میں اس

Marfat.com

درجہ جم گئی اور اس کے بعد اپنے آپ کو اس قدر مٹایا کہ خود مٹنے کا احساس بھی جاتا رہا، فنا سے گذر کر فناء الفناء تک پہنچ گئے، مدح و ذم ایک ہوگئی، مفوض کامل بن گئے، خود حضرت حکیم الامت کے متعدد خلفائے اجل مثلاً حضرت مفتی محمد حسن صاحب، مولانا محمود الغنی صاحب، حاجی محمد عثمان خاں صاحب مرحوم، مولانا عبدالباری صاحب ندوی، ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب، مولانا مسیح اللہ صاحب وغیرہ کو راقم نے اس معاملہ میں ایک زبان پایا کہ حکیم الامت قدس سرہٗ سے فنائیت کا درس جیسے حضرت سید صاحب نے حاصل کیا اور جو کمال اس مرتبہ میں پیدا کیا، وہ کہیں اور نظر نہیں آتا ...... مثالیں اس کی چند ہوتیں تو نقل بھی کرتا، یہ تو ایک مستقل باب ہے ...... ؏ سفینہ چاہئے اس بحرِ بیکراں کے لئے

بس اس وقت تو بزرگوں کی تصدیقات ہی پر یقین کر لیجیے۔

صبر و شکر :

حیاتِ سلیمانی کا بڑا حصہ ''شکر'' ہی کا آئینہ ہے۔ علم و فضل، عزت و عظمت، دولت و ثروت ہر اعتبار سے ہمیشہ سرفراز رہے، مگر آخر عمر کے دس برس میں اپنوں کی ناقدری و ناسپاسی، اپنے محبوب ادارہ دارالمصنفین سے جدائی، تقسیم ہندوستان کے بعد کراچی کا قیام (اس کی کچھ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو احقر کا مضمون ''علامہ سید سلیمان ندوی اور کراچی کے تین سال'' جو ''ریاض'' کے خصوصی نمبر بابتہ مارچ ۱۹۵۴ء میں چھپا ہے) اور یہاں کی مالی و ذہنی پریشانیاں یہ سب ایک مستقل مجاہدہ، اضطرار یہ تھا، پھر شدید شدید بیماریوں کا سلسلہ اس سے الگ ہے ...... یہ وقت صبر کی آزمائش کا تھا اور دیکھنے والوں نے حضرت سلیمانؒ کے ظرفِ عالی کو دیکھا کہ وہ کس وقار اور متانت سے یہ مقام بھی طے کر گئے۔ مجھے ایک معتقد کی حیثیت سے یہ بات کھٹک جاتی تھی کہ ایک پیکرِ مروت و شرافت اور ایک مرنجان مرنج ہستی کے خواہ مخواہ لوگ کیوں درپے آزار ہوگئے تھے؟ حضرت سیدی کی رحلت کے بعد اپنا یہ استعجاب استاذی و مخدومی مولانا مناظر احسن گیلانی مدظلہٗ کی خدمت میں پیش کیا، اس کا جو

Marfat.com

عارفانہ جواب حضرت گیلانی کی طرف سے ملا، اس سے رنج و غم کے بادل چھٹ گئے، آپ بھی اس کو سُن کر بصیرت و سکینت حاصل کیجئے۔

''ہمارے سید الملت قدس سرہٗ العزیز کی صباریت کے جن حالات کی طرف آپ نے اشارہ فرمایا ہے، اُن کا تعلق سچ پوچھئے تو اس جہاں سے زیادہ نہ تھا، اُن کی زندگی کا بڑا حصہ شکوریت کے زیر اثر گذرا تھا، صباریت کی منزلیں رہی جاتی تھیں، زندگی کے آخری دور میں ان منزلوں سے بھی وہ گذر گئے، اور خوب گذرے، صرف علامہ، ڈاکٹر اور اعظم المصنفین ہی ہونا اُن کے لئے مقدر نہ تھا''۔

سید العارفین بن کر رفیق اعلیٰ میں قدرت نے ان کو بلانا چاہا، اسی کا نظم کیا گیا..... اذیت نہ ہو تو صبر کا مطلب ہی بے معنی ہو جاتا ہے۔ صباریت کے اس دور میں اُن کو اذیت ہوئی اور کافی اذیت ہوئی، لیکن جس راہ پر اب پڑ چکے تھے، اُس راہ کی ہر اذیت دوسرے عالم کی مسرتوں کی ضمانت بنتی چلی گئی، انما یوفی الصابرون اجرھم بغیر حساب۔ یہ شعر نہیں لاہوتی حقیقت ہے''۔ (مکتوب مورخہ ۱۵ر فروری ۵۴ء)

جود وسخا :

بخشش وعطا بزرگوں کا ایک خاص وصف ہے، بعض بزرگوں میں یہ وصف عیاں ہے اور بعض میں مخفی، بھوپال کی حاضریوں میں اور کراچی کے دوران قیام میں احقر کو اس کا اندازہ ہو گیا تھا، کہ حضرت والاؒ چپکے چپکے بڑے اعتدال سے مالی ایثار فرمایا کرتے ہیں، لیکن رحلت کے بعد میرے ساتھ ایک عجیب معاملہ پیش آیا، جس سے شیخ کے دستِ کرم کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مرض الموت سے کچھ قبل احقر نے اپنی مالی پریشانیوں کا اظہار کیا تھا اور اس سے مقصود بھی بجز حصولِ دعا کے اور کیا ہو سکتا تھا، پھر مرض الموت میں تو اس کا ذکر بھی بے جا تھا، لیکن وہ سراپا مہر و کرم ہستی، اس ناکارہ کے حال پر اس درجہ متوجہ تھی کہ میری پریشانی کا خیال آخر وقت تک قائم رہا، اور اس درد کی درمانی کئے بغیر چین نہ آیا .....

Marfat.com

رحلت شیخ قدس سرہٗ کے شاید ہفتہ بھر بعد حضرت کی اہلیہ محترمہ مدظلہا نے ایک بند لفافہ اس ہدایت کے ساتھ عنایت فرمایا کہ گھر جا کر اس کو کھولئے ...... میں یہی سمجھتا رہا کہ شاید کوئی راز کے کاغذات ہوں یا حضرتِ والاؒ کے مکتوبات، لیکن گھر پہنچ کر جو لفافہ کھولا، تو اس میں یہ خط دیکھ کر آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں، اور پھر رقت طاری ہوگئی :

عزیز القدر سلمہ ...... السلام علیکم

''مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ ! بجز صبر کے انسان اور کیا کر سکتا ہے، حضرت مولانا جب حیات تھے، تو اکثر و بیشتر آپ کو ایک ہزار روپیہ ہدیہ دینے کو کہا کرتے تھے، مگر میں اپنی غفلت یا اُن کی علالت کا الجھاؤ کہیئے کہ اُن کی حیات میں پورا نہ کر سکی، اب یہ اُن کی خواہش کے مطابق آپ کو ہدیہ کر رہی ہوں۔ آپ اس کو قبول کر کے ممنون فرمائیں۔ آپ کو یہ رقم دے کر میرا قلب بہت مطمئن ہے اور اللہ پاک کی رحمت سے اُمید ہے کہ اُن کی روح کو بھی مسرت اور سکون ہوگا۔ رب رحیم اُن کو اعلیٰ مرتبہ عطا فرمائیں، میرے خاتمہ بالخیر کے لئے ہمیشہ دعا کیجئے''۔

والسلام ''والدۂ سلمان''

خدا جانے فیض روحانی کے ساتھ ساتھ جود و سخا کے دریا بھی کتنے بہائے گئے۔ قدس اللہ اسرارہٗ۔

کشف والہام :

کشف والہام اور کرامت حسی نہ مقصود ہیں نہ مطلوب، نہ اُن کو قرب الٰہی میں کوئی دخل ہے۔ البتہ بقولِ حکیم الامتؒ یہ قرب سے ناشی ضرور ہیں اور جو حضرات ان کی اہمیت کی نفی کرتے ہیں، وہ ان باتوں سے کچھ خالی نہیں ...... حضرت مرشدیؒ کی خدمت میں جو لوگ حاضر ہوتے رہے، وہ سب اس بات کو محسوس کرتے رہے کہ جو اشکال ذہن میں

Marfat.com

لے کر گئے، شیخ نے از خود ایک جملہ میں اس کا جواب عطا فرمایا اور عرض معروض کی نوبت ہی نہ آئی، حتیٰ کہ بعض مرتبہ یہ بھی ہوا کہ کئی افراد کے ذہن میں مختلف نوعیت کے شبہات تھے اور حضرت شیخ نے جب گفتگو فرمائی، تو ہر ایک کے شبہہ کا ازالہ ہو گیا۔ حالانکہ کسی نے اس کا اظہار نہ کیا تھا ... "جگ بیتی" سنانے کے لئے تو ایک مستقل باب کھولنا ہوگا۔ "آپ بیتی" کا ایک جز پیش کرتا ہوں۔

ستمبر ۱۹۴۷ء میں پہلی مرتبہ حضرت شیخ کی خدمت میں بھوپال حاضر ہوا، دو دن بعد ذہن میں یہ وسوسہ آیا کہ یہاں آنے سے حاصل کیا ہوا، یہ نماز روزہ (یہ رمضان کا مہینہ تھا) تو گھر پر بھی ہو ہی رہا تھا، اس وسوسہ سے بچنے کی وہ تمام تدبیریں اختیار کر لیں جو حضرت حکیم الامتؒ نے تجویز فرمائی ہیں، لیکن وسوسہ تھا کہ بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا، حتیٰ کہ ۲۴ گھنٹہ اس خیال پر گذر گئے، اور میں نے حضرتِ والاؒ سے اس سلسلہ میں کچھ عرض نہ کیا، دوسرے دن عصر کی نماز کے لئے حضرتِ والاؒ مسجد جا رہے تھے، احقر بھی ساتھ تھا، چلتے چلتے دفعتہً رُکے، چیں بہ جبیں ہو کر احقر کی طرف دیکھا اور فرمایا: "تو آپ نے مجھ پر کوئی احسان کیا"۔ بس یہ فرما کر پھر آگے چلے، احقر کو یوں محسوس ہوا کہ کسی نے سر پکڑ کر خوب اچھی طرح جھنجوڑ دیا اور وہ وسوسہ کافور تھا۔ بعد از افطار جب احقر نے اپنی اس حالت کا ذکر کیا، تو متبسم ہوئے اور فرمایا:

"ہمارے حضرت والاؒ فرماتے تھے کہ جہاں خزانہ ہوتا ہے، چور وہیں نقب لگاتا ہے، ان شاء اللہ آپ کو فائدہ ہوگا"۔

دوسری مرتبہ مارچ ۴۹ء میں پھر خدمتِ شیخ میں حاضری کی سعادت نصیب ہوئی۔ حضرت والاؒ کچھ بیمار تھے، ایک روز پلنگ پر جو کمرہ کی دیوار سے متصل لگا ہوا تھا، دیوار ہی کی طرف رُخ کر کے لیٹے ہوئے تھے، خادم سرہانے کے قریب بیٹھا ہوا تھا، میرے دل میں اپنے شیخ کی عظمت و محبت کے خیالات موجزن ہوئے، ایکا یک حضرت اقدسؒ نے

Marfat.com

کروٹ بدلی اور مسکرا کر احقر سے فرمایا :

''آپ تو بس یہ سمجھے کہ ''پیر من خس است و لے اعتقاد من بس است''

یہیں قیام کراچی کے دوران میں میں نے حسبِ عادت ایک احوال نامہ (جو ملفوف تھا) پیش کیا، اس میں کچھ عقلی الجھنوں کا ذکر تھا، بس جوں ہی عریضہ ہاتھ میں لیا، فرمانے لگے :

''معلوم ہوتا ہے فلسفیانہ کتابیں آج کل زیرِ مطالعہ ہیں، اُن کو چھوڑیے، اس میں کیا رکھا ہے''۔

احقر کے والد ماجد سلسلہ نقشبندیہ سے منسلک ہیں اور مولانا سید عبداللہ صاحب مجددی حیدرآبادی صاحبِ زجاجۃ المصابیح کے مرید رشید، وہ فرمایا کرتے ہیں کہ حضرت والاؒ کا مکاشفہ بھی بڑا زبردست تھا، گو وہ اس کا اظہار نہیں فرماتے تھے!

اور یہ تو حاضری کا معاملہ ہوا، ورنہ حضرت والاؒ کے سارے منتسبین خواہ وہ ہندو پاک کے کسی گوشہ میں ہوں، اس برکت کو ہمیشہ محسوس کرتے رہے کہ کیسی ہی باطنی الجھن اور پریشانی ہو، جہاں حضرتؒ کی خدمت میں خط لکھا، اور ڈاک کے حوالہ کیا کہ وہ ساری تشویش، سکینت سے بدل جاتی تھے اور احقر کے ساتھ تو حضرتِ والاؒ کے آخر حیات میں یہ معاملہ رہا کہ جب کوئی الجھن پیش آئی، اور عریضہ لکھنے بیٹھا کہ اس کا جواب خود بہ خود ذہن میں آ گیا۔ ایک مرتبہ حضرتِ والا سے یہ کیفیت عرض کی، اور معذرت کی کہ اسی وجہ سے ایک عرصہ کوئی احوال نامہ پیش نہ کر سکا، تو فرمایا، بھئی اس پر تو شکر ادا کیجئے، معذرت کی کیا بات ہے''۔

Marfat.com

بحیثیت شیخ محقق :

اب تک حضرت والاؒ سے متعلق جو کچھ عرض کیا گیا وہ اُن کی نیکی و پاکی، تقویٰ و طہارت اور محبت و معرفت کا ایک بالکل اجمالی تذکرہ تھا، لیکن اہلِ فن جانتے ہیں کہ ہر زاہد و عابد اور ولی اللہ کا ایک مصلح و شیخ محقق ہونا بھی کوئی لازمی امر نہیں، تربیت روحانی کے لئے فن تربیت سے مناسبت اور اس میں درک نہایت ضروری ہے۔ ہمارے حضرت والاؒ جہاں میدانِ علم کے شہسوار تھے، وہاں فنِ تصوف میں بھی "شیخ محقق" کی شان رکھتے تھے اور اُن کے فیوض ہندو پاک کے طول و عرض میں جاری و ساری تھے، بلکہ رنگون تک کے بھی منتسبین کا حال راقم کے علم میں ہے، اس سلسلہ میں حضرت کے صرف چند اقوال نمونۃً پیش ہیں، جن سے اُنکی شانِ تحقیق کا اندازہ ہوگا۔

ایک مرتبہ راقم نے عرض کیا کہ حضرت عمل پر تو بحمد اللہ دوام ہے، لیکن اس کی عدم قبولیت کا گمان ہوتا ہے، معاً فرمایا :

"خوب اپنے احوال کو اللہ میاں کے سر تھوپ دیا، اُن کی عدم قبولیت کا حال تو دوسری دنیا میں معلوم ہوگا، یہاں تو صرف عمل مقصود ہے، عمل میں لگے رہیئے"۔

پھر عرض کیا کہ حضرت قرب کے آثار کچھ تو یہاں بھی ظاہر ہوتے ہوں گے؟

ارشاد ہوا :

"یہ بھی بندے ہی کے ظنوں میں بڑے سے بڑے ولی کا بھی جو اعتقاد ہے، وہ محض ظنِ غالب کی بنا پر ہے، اور اپنے میں آثار قبولیت تلاش کرنا عجب ہے، کیسے آثار اور کیسی بزرگی، اس راہ میں تو اپنے آپ کو مٹانا ہی اصل شے ہے"۔

ایک مرتبہ احقر نے تنہائی میں بعض اپنے احوال عرض کئے، تو ارشاد فرمایا :

"میرے ساتھ تو روزانہ کا یہ معاملہ ہے کہ جب سوتے وقت لائٹ بند کر

Marfat.com

دیتا ہوں تو سارا کمرہ نور سے معمور دکھائی دیتا ہے، مگر میں فوراً آنکھیں بند کر لیتا ہوں کہ ہر آنچہ می شور ہمہ غیر خداست"۔

ایک مرتبہ اذکار واشغال کا تذکرہ تھا، تو ارشاد فرمایا کہ سلطانُ الاذکار، شغل اشد، کشف قبور اور اس قبیل کی چیزیں تصوف نہیں ہیں، بلکہ تصوف کا آرٹ ہیں، آرٹ میں حقیقت کہاں؟ تصوف کا مقصود تو صرف حصولِ رضائے الٰہی اور اتباعِ سنت ہے، ہاں اس سلسلہ میں ازخود کوئی بات حاصل ہو جائے تو وہ اور بات ہے۔

اسی طرح یہ بھی فرمایا کہ مثنوی مولانا روم بھی تصوف نہیں، بلکہ "فلسفۂ تصوف" اور فلسفہ سے بگڑے ہوئے دماغوں کا علاج ہے نہ کہ ہر ایک کا' اس سلسلہ میں احقر نے عرض کیا کہ مثنوی کے پہلے دو اشعار میں جو بات بیان کی گئی ہے، وہ تو ایک حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ عالمِ ارواح میں ایک مقام حق تعالیٰ کے قرب کا حاصل تھا، جہاں وعدۂ الست لیا گیا، تو کیا عجیب جواب مرحمت ہوا فرمایا:

"مقام مستقل ہوتا ہے، جس کا ذکر آپ کر رہے ہیں، وہ تو ایک کانفرنس تھی جو بادشاہ نے طلب کی تھی، وہ مقام کیسے ہو گیا"؟

ایک محفل میں حضرت شیخ اکبر اور حضرت مجدد الف ثانی رحمہما اللہ کا ذکر آیا، تو حضرت سیدیؒ نے کیسی گر کی بات بتائی، ارشاد فرمایا:

"شیخ محی الدین ابن عربی نے توحید کی تعلیم پر زور دیا اور اس کو فلسفیانہ انداز میں پیش فرمایا، اُن کی اصطلاحات کے ذریعہ جو ضلالت پیدا ہوئی، وہ توحید کی راہ سے آئی اور لوگ انا الحق کے مدعی بن گئے، اور حضرت مجدد الفِ ثانی نے اتباعِ سنت پر زور دیا، مگر ساتھ ہی نبوت کی فلسفیانہ توضیح وتشریح پیش فرمائی۔ اس کے ذریعہ جو ضلالت آئی وہ نبوت کی راہ سے تھی، اور انا النبی اور انا مہدی" کہنے والے پیدا ہوئے"۔

ایک دفعہ احقر سے سوال فرمایا کہ "فنا فی الشیخ" کے کیا معنی ہیں؟ احقر نے عرض

Marfat.com

کیا کہ شیخ کی محبت جب ہر محبت پر غالب آجاتی ہے، تو اسی کا نام ''فنافی الشیخ'' ہے، فرمایا کہ یہ تو ابتدائی کیفیت ہے، ''فنافی الشیخ'' ہو جانے کے اصل معنی تو یہ ہیں کہ اپنے احوال و واردات بھی وہی ہو جائیں، جو شیخ کے ہیں، چنانچہ ہمارے مولانا عیسیٰ صاحب فانی فی الشیخ تھے۔

رویا اور تعبیر رویا :

مسلکِ اشرفیہ میں خواب کو کچھ زیادہ اہمیت حاصل نہیں۔ ایک مرتبہ حضرت سیدیؒ نے ارشاد فرمایا کہ ''اخلاق ہی سے قرب حاصل ہوتا ہے، اچھے اچھے خواب یا محض کثرتِ نوافل سے قرب نصیب نہیں ہوتا، حتی کہ حضور انور ﷺ کی خواب میں رویت بھی گو بہت بڑی بات ہے، مگر قربِ حق پر دلالت نہیں کرتی، بلکہ اس کا منشاء صرف یہ ہوتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ آپ کی اتباع کی جائے۔ چنانچہ اگر رویت کے بعد اصلاحِ اخلاق کی زیادہ فکر نہیں کی گئی، اور محض رویت پر بزرگی کا خیال ہو گیا، تو پچھلی حالت بھی سلب ہو جاتی ہے۔ یہ تو امر واقعہ کا ذکر ہو گیا، ویسے ہمارے حضرتِ والاؒ کو تعبیر رویا کا خاص ذوق حاصل تھا، دو ایک نمونے ذیل میں پیش ہیں۔ اہلِ فن کو ابن سیرین کی یاد آجائے تو کوئی عجب نہیں۔

راقم کی اہلیہ نے خواب میں دیکھا کہ سر کے بال سفید ہو گئے، یہ خواب جب خدمتِ شیخ میں عرض کیا گیا تو جواب ملا :

''شاید اولاد کی بشارت ہو، واشتعل الراس شیبًا''

اس تعبیر کو پا کر تحقیق کی گئی تو بات بالکل صحیح تھی ...... اب ایک خواب اس ناکارہ کا اور اس کی تعبیر سنیئے :

راقم نے دیکھا کہ وہ اور مولانا عبدالجبار صاحب (حال مفسر ریڈیو پاکستان) راستہ سے چلے جا رہے تھے کہ ایک کافر مصیبت سے تڑپتا ہوا، کھائی دیا، میرے دل میں ہمدردی کا خیال پیدا ہوا ہی تھا کہ میری ہڈیوں کا ڈھانچہ ایک لکڑی کے تختہ پر ہوا میں معلق،

Marfat.com

ہے اور اس کافر سے قریب ہونا چاہتا ہے، مگر ہو نہیں سکتا، اس کے ساتھ ہی یہ بھی محسوس کیا کہ اپنے گوشت اور پوست کا پورا مجسمہ اپنے کندھے پر ڈالے مولانا کے ساتھ چلا جا رہا ہوں، آبادی بہت دور ایک قبر قد آدم سے زیادہ گہری کھدی ہوئی تھی، راقم نے اپنے گوشت و پوست کی لاش کو اس کے اندر ڈال دیا اور پھر ہم دونوں نے جلدی جلدی قبر کو مٹی سے بھر دیا۔ اس کے بعد آنکھ کھلی، تو طبیعت میں ایک سکون تھا ...... اس کی تعبیر جو ملی، ملاحظہ ہو۔

"یہ کافر نفس امارہ ہے۔ آپ کی اپنی لاش، آپ کا مرتبہ فنا کے قریب ہونے پر دال ہے، حدیث میں ہے۔ **عد نفسک من الاموات** ، یہ کیفیت اسی مرتبۂ فناء کی طرف اشارہ ہے۔ **بحمداللہ**"۔

حضرت کا آخری حال :

احقر کے فہم ناقص میں حضرت والاؒ کا رنگ چشتی نہیں بلکہ نقشبندی تھا، وجد و حال کی جگہ سکون و وقار قیل و قال کی جگہ اتباعِ سنت کا اہتمام حضرت کا خاص شعار تھا، پھر بھی منصب ارشاد پر متمکن ہونے کے بعد چند برس تک یہ حالت تھی کہ جب بولنے پر آتے تو سوز و گداز کے دریا بہا دیتے۔ آہ ! آج بھی اس تقریر کی یاد سے ایک کیفیت طاری ہو رہی ہے، جب حیدر آباد میں مولوی محمد مظہر صاحب مرحوم کی کوٹھی پر یہ احقر بھی حاضر تھا، اور مولانا سید عبدالجبار صاحب (حال مفسر ریڈیو پاکستان) کے علاوہ اور بھی چند عقیدت کیش موجود تھے، شیخ نے نہ جانے کس سوز میں ڈوب کر فرمایا :

"اللہ تبارک و تعالیٰ کے پاس کس چیز کی کمی ہے، مقام صدیقیت کیوں نہیں طلب کرتے یہ تو آپ کے ظرف کی کوتاہی ہے، حوصلوں کو بلند کیجئے"۔

ان جملوں سے سارے حاضرینِ محفل کی آنکھیں اشک بار اور دل شعلہ نگار ہو گئے تھے، لیکن آخر کے تین چار برس میں دریائے پرشور ایک بحر ذخار بن گیا تھا، دراصل ۵۰ء کے حجِ بیت اللہ کے بعد حضرت والاؒ کو عبدیت کاملہ اور نزولِ تام حاصل ہو گیا اور

Marfat.com

پانی اس تپش پر پہنچ گیا کہ بظاہر جوش کے سارے آثار ختم ہو گئے۔ ہاں جو چھو لیتا اس کو پتہ چلتا کہ حقیقتِ حال کیا ہے۔

دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ اپنی ساری نزاکت و نفاستِ طبع کے باوجود حضرتِ والاؒ پر دورانِ قیام مکہ عبودیت کا اس قدر غلبہ رہا کہ صرف ایک کرتہ اور پاجامہ یا تہبند میں ملبوس برہنہ چلچلاتی دھوپ میں طواف کرتے دکھائی دیتے تھے اور اس پیرانہ سالی اور ضعف قویٰ کے باوجود اپنا سارا کام خود ہی کرتے تھے۔ راقم نے خود حضرت سے سُنا کہ ایک روز اسی سادگی سے صحنِ حرم میں بیٹھے تسبیح پڑھ رہے تھے کہ کسی عرب عالم نے سلام کیا اور پوچھا کہ اے شیخ ہم نے سنا ہے کہ آج کل آپ تصوف کا شغل رکھتے ہیں؟ ...... حضرت فرماتے تھے کہ اس وقت کچھ تائید غیبی ایسی شامل حال ہوئی کہ مسلسل آدھ گھنٹہ تک قرآن و حدیث ہی کی تائیدات سے تصوف کو ثابت کرتا چلا گیا، جس کا ماحصل یہ تھا کہ رذائلِ نفس سے پاکی اور فضائل اخلاق کا حصول واجب ہے۔ وہ عرب عالم اس گفتگو سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ انہوں نے اقرار کرلیا کہ اگر تصوف ہے تو اس سے کس کو انکار ہے ...... غرض مکہ معظمہ میں شیخ کو جو فیوض حاصل ہوئے اور جو انشراح نصیب ہوا، اس کا اندازہ اُن کی نظم کے دو ایک شعر سے لگا لیجئے، جو اسی فضا میں کہی گئی تھی، فرماتے ہیں ؎

دیدۂ دل اگر ہو باز، راز رہے نہ راز میں
جھانکتی ہیں حقیقتیں آئینہ مجاز میں
اس کے کرم کے ہیں نثار، اس کی عطا کا کیا شمار
دید یا عاصیوں کو بار اپنے حریم راز میں

اب مکہ معظمہ سے فارغ ہو کر دیارِ رسول ﷺ میں پہنچے، بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر سیرت نگار رسول ﷺ نے چند نعتیہ اشعار کہے، جس پر شیخ کے کلام کا غالباً خاتمہ ہے۔ اس نعت کا آخری شعر ان کی حالت کا آئینہ دار ہے۔ استدعا کرتے ہیں ؎

Marfat.com

بجھ جائے تیرے چھینٹوں سے اے ابرِ کرم آج
جو آگ مرے سینہ میں مدت سے دبی ہے

عاشقِ رسول کی یہ استدعاء قبول ہوگئی۔ ایک رات حضور انور ﷺ کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ اپنے آپ کو قدوم رسالت پر گرادیا، رحمت عالم ﷺ نے اپنے شیدائی کو اٹھالیا، اور ایک طویل دعا پڑھ کر سینہ پر دم کردی ...... حضرت والاؒ کی آنکھ کھلی تو حضور انور کی دعا یاد تھی۔ اپنی اہلیہ محترمہ کو بلا کر وہی دعا اُن پر دم کردی اور پھر سارا ماجرا سنایا...... غالباً اس واقعہ کے بعد ہی وہ سکونِ خاطر اور عبدیت مطلقہ نصیب ہوئی، جو تا آخرِ حیات قائم رہی ...... اور اس نزول تام کی وجہ سے ان کی عظمت و مرتبت کی معرفت ہی مشکل ہوگئی۔ مولانا محمود الغنی صاحب سہارنپوری ثم پاکستانی جو حکیم الامتؒ کے قدیم خلفاء میں سے ہیں، اکثر فرمایا کرتے تھے کہ لوگ مولانا کو تو پھر بھی پہچان لیں گے، مگر حضرت سید صاحبؒ کے کمال کو پہنچانا بہت دشوار ہے اور پھر فرمایا کہ ایک مرتبہ حضرت سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور سلام کر کے کمرہ میں داخل ہی ہوا تھا کہ وہ کیفیت محسوس ہوئی جو حضرت حکیم الامت کی رحلت کے بعد پھر کبھی حاصل نہ ہوئی تھی۔

اب آخر میں دو لفظ مرض الموت سے متعلق عرض کر کے اس صحبت کو مجبوراً ختم کرنا ہے۔ ۲۲ر نومبر ۵۳ء کے دن (جس کے بعد شام کو حضرتِ والاؒ داغِ مفارقت دے گئے) بعد نمازِ ظہر حضرت کی اہلیہ محترمہ حسب معمول حضرت والا کی صحت کے لئے دعا مانگ رہی تھیں کہ یکایک ایک سفید پوش ہستی نمودار ہوئی اور اُس نے ایک دودھیا رنگ کا گلاس محترمہ کی خدمت میں پیش کیا، محترمہ نے گھبرا کر ہاتھ چھوڑ دیئے اور پیچھے مڑ کر حضرت والا ــــ (جو پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے) عرض کیا کہ آپ نے کچھ دیکھا؟ ...... جواب ملا کیا ہوا اہلیہ محترمہ نے واقعہ سنایا تو خلافِ عادت پورے اطمینان سے یہ ارشاد فرمایا:

''یہ آپ کی تسکین کا سامان کیا گیا ہے''۔

Marfat.com

اس سے گمان ہوتا ہے کہ شاید حق تعالیٰ نے اپنے محبوب بندے کو کوچ کا اشارہ فرما دیا تھا ...... دن گذر گیا، مغرب کی نماز پڑھ کر داہنی کروٹ ٹھیک مطابق سنت لیٹ گئے۔ راقم کی نظریں چہرۂ انور پر جمی ہوئی تھیں، دفعتہً ایک ہچکی آئی اور روحِ سلیمانی لبیک کہہ کر اپنے مولیٰ کے حضور حاضر ہوگئی۔ **الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیھم و لاھم یحزنون** کا مشاہدہ کھلی آنکھوں ہوگیا۔ روح کی مفارقت کے بعد اس عاشقِ رسول کے جسم میں کوئی تغیر تو کیا آتا، چہرۂ مبارک اس قدر منور و تاباں ہوگیا اور سکینت و فرحت کے ایسے جلوے نمودار ہوئے کہ جس کی بھی نظر پڑی اُس کے دل نے سید الملت کے ولی اللہ ہونے کی تصدیق کی ...... آہ! ہندوستان کی تاریخ میں دوسرا "ولی اللہ" پیدا ہوا تھا، سو وہ بھی آج زینتِ تاریخ بن گیا ......

عمرہا در کعبہ و بتخانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

علماء احناف کے حیرت انگیز واقعات

تالیف : مولانا عبدالقیوم حقانی

امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ کی سیرت و سوانح، تعلیم و تربیت، خدا پرستی، شوقِ مطالعہ، تقویٰ و ریاضت، جوشِ جہاد، نادر تحقیقات، اسلامی ریاست کے خدوخال، عدل و انصاف کے ایمان آفرین نمونے، بے باک فیصلے اور مستاج انتخاب اُمت کی گرانقدر مساعی پر حیرت انگیز واقعات۔ کمپیوٹرائزڈ ٹائٹل، عمدہ طباعت، بہترین کاغذ۔

صفحات : 272 ....

القاسم اکیڈمی جامعہ ابوہریرہ برانچ پوسٹ آفس خالق آباد، ضلع نوشہرہ، سرحد، پاکستان

Marfat.com

جمالِ یوسف

تصنیف : مولانا عبدالقیوم حقانی

محدث العصر حضرت مولانا محمد یوسف بنوری کا تذکرہ وسوانح، تحصیل وتکمیلِ علم، فقرو درویشی ،عبدیت وانابت، عشقِ رسول ﷺ واتباعِ سنت، درس وتدریسِ حدیث، محدثانہ جلالتِ قدر، عظیم فقہی مقام، فضل وکمال، دینی وعلمی کارنامے، سیرت واخلاق، مجاہدانہ کردار، دعوت وتبلیغ، تصنیف وتالیف، قادیانیت کا فاتحانہ تعاقب، اعلاء کلمۃ الحق کے لئے مساعی وجہاد ...... الغرض دلچسپ، جامع اور بعض زلادینے اور عملِ صالحہ کی انگیخت کرنے والے حیرت انگیز واقعات ......

صفحات : 304 .... قیمت : 120روپے

القاسم اکیڈمی' جامعہ ابوہریرہ' برانچ پوسٹ آفس' خالق آباد ضلع نوشہرہ

سوانح قائد ملت حضرت مولانا مفتی محمودؒ

تصنیف : مولانا عبدالقیوم حقانی

تذکرہ وسوانح، سیرت واخلاق، تحصیل علم وتکمیل، درس وافادہ، ذوقِ علم اور شوقِ مطالعہ، علمی انہماک، زہد وتقویٰ، عشقِ رسول ﷺ واہتمام سنت، تواضع وعبدیت، عزیمت وتوکل، بے نفسی و فنائیت، سیاسی بصیرت وعظمت، علمی ، دینی اور سیاسی کارنامے، حکمت وبصیرت، لطائف وبذلہ سنجیاں، مرزائیت کا تعاقب ور دفرقِ باطلہ، اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے جہاد اور مساعی مسلسل، قید وبندکی صعوبتیں ...... الغرض ایک تاریخ، ایک تحریک اور انقلاب کی داستان ۔ مضبوط جلد بندی اور شاندار طباعت، کمپیوٹرائزڈ ٹائٹل۔

صفحات : 320 .... قیمت : 120روپے

القاسم اکیڈمی' جامعہ ابوہریرہ' برانچ پوسٹ آفس' خالق آباد ضلع نوشہرہ

Marfat.com

جناب ڈاکٹر نثار احمد فاروقی

سیّد سلیمان ندویؒ کا مسلک طریقت

قرآن کریم میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے ابتلا اور قبولِ توبہ کے بعد عنایات خداوندی کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے :

ولقد فتنا سليمن و ألقينا على كرسيه جسدا ثم أناب ○ قال رب اغفرلى وهب لى ملكا لا ينبغى لأحد من بعدى إنك انت الوهاب ○ فسخرنا ناله الريح تجرى بأمره رخاء حيث أصاب ○ والشطين كل بناء و غواص ○ اخرين مقرنين فى الاصفاد ○ هذا عطآؤنا فامنن أو امسك بغير حساب ○ و ان له عندنا لزلفى و حسن مآب ○ (۳۸ص،۳۴-۴۰)

یعنی ..... "ہم نے سلیمان کو آزمائش میں ڈالا اور ان کے تخت پر ایک ہیولیٰ بٹھادیا، پھر انہوں نے توبہ کی اور التجا کی: "یارب مجھے ایسا ملک عطا کر جو میرے بعد کسی کو نصیب نہ ہو، تو یقیناً بڑا بخشش کرنے والا ہے۔ تو ہم نے اس کے لئے ہوا کو مسخر کردیا کہ وہ ان کے اشاروں پر چلنے لگی اور سارے شیطان جن میں معمار اور غوطہ خور اور دوسرے زنجیروں میں بندھے ہوئے تھے، سب ان کے لئے مسخر کردیئے۔ تو یہ ہے ہماری عطاء اس پر تم شکر گذاری کرو یا اسے بغیر حساب اپنے پاس رکھو اور ان کے لئے ہمارے پاس حسنِ خاتمہ اور قربتوں کی نعمت بھی ہے"۔

میں نے یہاں اس آیت کو سرنامہ بنایا ہے، تو یہ اظہار مقصود ہے کہ توبہ و انابت کرنے والا ایک پیغمبر ہو اور بے حساب بخشش کرنے والا ایک کریم مطلق تو اسے نہ ہم اپنی

Marfat.com

تو بہ پر قیاس کر سکتے ہیں، نہ عطائے ربانی کو اپنی محدود اور ناقص فہم سے ناپ سکتے ہیں۔ یہ بے حساب بذل و عطا اتنی عام اور بیکراں ہو جاتی ہے کہ کبھی صرف اسی نسبت سے بھی وہ انوار و برکات حاصل ہونے کا ہم مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ شمالی ہندوستان کی مسلم سوسائٹی نے اس صدی میں کئی سلیمان پیدا کیے، جن کے قومی، مذہبی یا علمی کاموں کو دیکھ کر یقین ہوتا ہے کہ ان پر دعائے پیغمبری هب لی ملکا لا ینبغی لاحد من بعدی کا سایہ پڑا تھا اور یہ بھی اُمید ہے کہ انہیں وعدۂ صادقۂ الٰہی إن لہ عندنا لزلفیٰ و حسن مآب سے بھی ضرور نوازا گیا ہوگا۔

پنجاب میں حضرت شاہ محمد سلیمان تونسویؒ چشتی نظامی (۱۷۷۰-۱۸۵۰ء) نے شمع روحانیت کو روشن کیا اور نہایت نامساعد حالات میں، تونسہ جیسے غیر معروف قصبے کو اشاعت دین اور اصلاح و تربیت کا مرکز بنا دیا تو بہار میں حضرت شاہ سلیمان پھلواریؒ نے اشاعت علوم کے شاندار کارنامے انجام دیے۔ میرے استاد و پیر و مرشد حضرت شاہ سلیمان احمد چشتی امروہویؒ (سجادہ نشین حضرت شاہ عبدالہادی چشتیؒ) بھی ایسے بزرگ تھے کہ ان کے کمالات ظاہری و باطنی کو یاد کر کے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اب کسی کا ایسا ہونا بہت دشوار ہے۔

حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ کی انگوٹھی کے عقیق پر بھی یہی دعائے سلیمانی کندہ تھی۔ هب لی ملکا لاینبغی لأحد من بعدی ...... ظاہر ہے کہ سلطان المشائخ کے تخت پر پھر کوئی ایسا شان والا نہ بیٹھ سکا۔

حضرت سید سلیمان ندویؒ علم و دانش کی ہفت اقلیم کے تاجدار تھے۔ تفسیر، حدیث فقہ، سیرۃ، منطق و کلام، تاریخ، ادب اور تصوف ہر قلم رو میں ان کا سکہ چلتا تھا۔ سلیمان پیغمبر کی طرح اللہ نے ان کے لئے بھی شہرت و ناموری کی ہواؤں کو مسخر کر دیا تھا اور خواہ وہ معاند مستشرقین ہوں یا خام کار محققین ان کے سامنے مقرنین فی الاصفاد ہی نظر آتے ہیں۔

Marfat.com

کہتے ہیں کہ علم کی ابتداء حیرت ہے اور فلاسفہ کے لئے اس کا انجام بھی حیرت کے سوا کچھ نہیں ہے، لیکن جو علماء جویائے حق ہیں اور کہتے ہیں، ربنا أرنا حقیقة الا شیاء کما ھی ان کا علم منزلِ معرفت وحقیقت کا راستہ بن جاتا ہے۔ حضرت سید سلیمان ندوی کو اللہ نے وہ علم نہیں دیا تھا، جو شہرت یا رزق کمانے کے کام آتا ہے۔ اس علم سے نوازا تھا جو معارف کا زینہ ہے اور لاانتہا کی سیرِ بے نہایۃ تک پہنچا دیتا ہے۔ اسی کو عارف رومی نے یوں کہا ہے: ؎

صد کتاب و صد ورق در نار کن
سینہ را از نورِ حق گلزار کن

ان راہوں سے اس منزل تک ایسی سُبک روی اور سرخ روئی کے ساتھ پہنچنے کی مثالیں بہت ہی کم ہیں، چھٹی صدی میں امام محمد غزالیؒ ہیں، جنہوں نے علم کی پستی سے اوپر اُٹھ کر معرفت کی منزل اعلیٰ تک جانے کی داستان المنقذ من الضلال میں لکھی ہے۔ ساری عمر درس و تدریس اور شغل کتاب وتصنیف میں منہمک رہنے والے کا ضمیر اچانک جاگ اٹھتا ہے اور علم وفضل کا سارا طمطراق ہکا بکا ہو کر سنتا ہے کہ یہ کیا آواز آ رہی ہے:

فصارت شهوات الدنيا تجاذبنى بسلاصلها الى المقام و منادى الايمان ينادى الرحيل الرحيل فلم يبق من العمر الا قليل و بين يديک السفر الطويل ، وجميع ماأنت فيه من العمل والعلم رياءٌ و تخليل ، فان لم تستعد الآن للآخرة فمتى تستعر و ان لم تقطع الان هذه العلائق فمتى تقطع ؟

خواہشاتِ دنیا نے مجھے اپنی زنجیروں میں باندھ کر کھینچنا شروع کیا کہ میں قیام کروں اور ایمان کی ندا دینے والا کوچ کی صدا دے رہا تھا، عمر تھوڑی رہ گئی ہے اور تیرے سامنے ایک طویل سفر ہے اور جن چیزوں میں تو پھنسا ہوا ہے علم اور عمل یہ سب ریا اور تخیل ہے، اگر آج آخرت کے لئے تیاری نہیں کرے گا تو پھر کب کرے گا اور آج ان علائق سے

Marfat.com

دامن نہیں چھڑائے گا، تو پھر کب چھڑائے گا؟

آخر تلاش وتحقیق اور علم وتدقیق کا اضطراب ایک ایسی سکینۃ وطمانیت کے عالم تک لے گیا، جس کی تمنا بہتوں نے کی ہے، مگر پایا کم ہی خوش نصیبوں نے ہے:

اے خدا بنا تو جاں را آں مقام
کاندراں بے حرف می روید کلام

اس مقام سکینۃ کے راہرو تو ہمیں نظر آجاتے ہیں، مگر ان حدود تک پہنچ جانے والوں کی پرچھائیں کا ہم ادراک نہیں کرسکتے۔ بس عارف رومی ہی اس کا کچھ بیان کرسکتا ہے کہ ......

من زتن عریاں شدم او از خیال
می خرام در نہایات الوصال

ہماری صفوں میں عالموں، محققوں، دانشوروں، مفکروں کی کمی نہیں ہے۔ علم کا ایک حصہ وہبی ہے اور خدا کی بخشش لازوال ہے، وہ آج بھی ہے، کل بھی ہوگی، دوسرا حصہ کسبی واختیاری ہے، اس میں بھی انسان کی جدوجہد کا عمل بقدرِ توفیق جاری رہتا ہے، لیکن وہ علم جو سبب معرفت بنتا ہے اور جو ایک منزل پر پہنچ کر ہیچ وپوچ معلوم ہونے لگتا ہے، انھیں خواص ہی کے حصے میں آتا ہے۔ تصوف کی راہ میں سب سے افضل مرتبہ سالکِ مجذوب کا ہے، جسے دوسرے لفظوں میں فقیہِ صوفی بھی کہا گیا ہے۔ یہ وہ منزل ہے، جہاں علم مغلوب ہوجاتا ہے۔

حضرت نظام الدین اولیاؒ، جب حضرت بابا فرید گنج شکرؒ سے بیعت ہوئے تو اپنے شیخ سے عرض کیا کہ میں ایک طالب علم ہوں، ابھی سلسلۂ تعلیم جاری ہے، اسے یوں ہی جاری رکھوں یا چھوڑکر اوراد ووظائف میں لگ جاؤں؟

شیخ نے فرمایا کہ میرا یہ طریقہ نہیں کہ کسی کو تحصیل علم سے باز رکھوں، اور درویش

Marfat.com

کے لئے بھی تھوڑا علم ضروری ہے۔ تم دونوں شغل جاری رکھو اور پھر دیکھو کون غالب رہتا ہے۔ حضرت نظام الدینؒ نے ایک زمانے کے بعد اپنی مجلس میں فرمایا کہ "میں نے نہ کسی کو غالب دیکھا، نہ مغلوب پایا"۔ کہنے کو یہ ایک سادہ سا چھوٹا سا جملہ ہے، مگر ایک انتہائی دشوار مقام کی طرف اشارہ کر رہا ہے، جہاں ظاہر و باطن میں ایک توازن پیدا ہو جائے یہی وہ استقامت ہے، جسے فوق الکرامۃ کہا گیا ہے۔ یہی توازن ہمیں سید سلیمان ندویؒ کی شخصیت میں نظر آتا ہے۔ وہ ایسے فقیہ صوفی ہیں، جنہوں نے علم ظاہر و باطن میں توازن پیدا کیا اور مستقیم رکھا۔

سید صاحبؒ کا یہ سفر حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمۃ کے آستانے پر آ کر تمام ہوا .... ؎

آن دل کہ رم نمودے از خوبرو جواناں
دیرینہ سال پیرے بردش بیک نگاہے !

وہ مرید جو قرآن کی حکمتوں کا جاننے والا، اسرارِ حدیث کا شناسا اور اسلامی فکر کے قاموس کا شناور تھا، اس نے مرشدِ روحانی کا انتخاب کرنے میں کیسی کچھ چھان بین نہ کی ہوگی۔ خود فرماتے ہیں :

"کامل دس برس تک چپکے ہی چپکے ہندوستان سے عرب تک نظر دوڑاتا رہا، لیکن کوئی ہستی ایسی نظر نہ آتی تھی، جو میرے درد کی درمانی کر سکے۔ بعض بزرگ ملے بھی تو طبیعت کو ان سے مناسبت نہیں ہوئی۔ بار بار یہی خیال آتا تھا کہ کاش حاجی امداد اللہ صاحبؒ حیات ہوتے"۔

حضرت حاجی امداد اللہ فاروقی مہاجر مکی علیہ الرحمۃ (متوفی) اپنے زمانے میں آیۃ من آیات اللہ تھے۔ آج ہر طرف انہیں کا روحانی فیضان ہے، جس نے دین و دانش کی شمعوں کو اجال رکھا ہے۔ وہ دار العلوم دیوبند ہو یا مظاہر العلوم سہارنپور، ندوۃ العلماء ہو یا

Marfat.com

مدرسہ صولتیہ (مکہ معظمہ) جامعہ نظامیہ (حیدر آباد) ہو یا جامعہ اشرفیہ (لاہور) سب کی نسبت ان ہی سے جڑی ہوتی ہے۔ سر سید احمد خاں پر بھی ان کی چشم عنایت تھی اور انہوں نے فرمائش کر کے سر سید سے ایک رسالہ بھی ترجمہ کرایا تھا۔ پچھلی صدی میں کوئی ممتاز عالم دین، کوئی درویش، کوئی خانقاہ ایسی نہیں ہے، جسے بالواسطہ یا بلا واسطہ حضرت حاجی صاحب کا فیضان عمیم نہ پہنچا ہو۔

وہ نقش بندی سلسلے میں حضرت شاہ نصیر الدین نقش بندی سے بیعت ہوئے تھے، پھر چشتی سلوک کی تکمیل حضری میاں جی نور محمد جھنجھانوی سے کی۔ میاں جی نور محمدؒ کو نعمت باطنی حضرت سید عبدالرحیم ولایتی فاطمی شہیدؒ بالاکوٹ سے ملی تھی، جنہیں خلافت واجازت حضرت شاہ عبدالباری چشتی امروہویؒ (متوفی ۱۱ر شعبان ۱۲۲۶ھ) سے حاصل تھی، اور امروہہ سے مجاہدین کا ایک مختصر سا دستہ لے کر جہاد میں حضرت سید احمد شہیدؒ رائے بریلویؒ کے ساتھ ہی شہادت پا کر سرخرو ہوئے ......

بنا کر دند خوش رسمے بخاک و خون غلتیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقاں پاک طینت را

سید صاحبؒ کا دل اگر حاجی صاحبؒ کی طرف کھنچتا تھا، تو یہ خود اخلاص اور طلب صادق کی دلیل تھی۔ برسوں سے اشتیاق کی آگ سلگ رہی تھی۔ ۱۹۲۹ء میں انہوں نے حضرت حاجی صاحبؒ کو عالم رویا میں دیکھا تو سید صاحبؒ نے ان کے سینے کی طرف اپنی انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے عرض کیا کہ ''اس کو ایسا کر دیجئے''۔ حضرت حاجی صاحبؒ نے مسکرا کر فرمایا ''اب تو میں ایسا نہیں کر سکتا''۔ اشارہ واضح تھا کہ شیخ کا عالم ظاہر میں ہونا ضروری ہے اور اب جسے اس کی باطنی نعمت ملی ہو وہی مقامات سلوک طے کرا سکتا ہے، تھانہ بھون میں حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ خانقاہ امدادیہ میں مسند ارشاد پر جلوہ فرما تھے اور اللہ نے انہیں ظاہر و باطن کی ایسی خوبیوں سے آراستہ کر دیا تھا کہ حضرت حاجی

Marfat.com

صاحبؒ کی روحانی نعمتوں کو انہوں نے ہر مستحق اور طلب گار تک پہنچا دیا۔ وہ صرف ایک مرشد ہی نہیں تھے، بے مثال عالم دین، فقیہ، متکلم، مفسر اور مصلح و مجدد بھی تھے۔ امراضِ روحانی اور خبائث نفسانی پر ایسی دقیق و عمیق نگاہ رکھنے والا تو پوری تاریخِ تصوف میں کوئی نظر نہیں آتا۔ یہی کہنے کو جی چاہتا ہے کہ ...... ع خوش طبیبے است بیا تا ہمہ بیمار شویم

جس طرح ایک طبیب امراضِ جسمانی کی تشخیص کرتا ہے اور بتدریج ان کا علاج کرتا ہے، اسی طرح مولانا تھانویؒ کا روحانی مطب بھی چلتا تھا۔ اُن کے مواعظ اور ملفوظات بھی اتنی کثرت سے اور اتنے اہتمام سے جمع ہوئے ہیں کہ دوسرے کسی درویش کے ملفوظات جمع کرنے کا وہ اہتمام آج تک نہیں ہوا۔

مگر کیا کریں کہ مولانا اشرف علی تھانویؒ ایسے جغرافیائی علاقے میں، ایسے تاریخی سیاق میں اور ایک ایسی روبانحطاط سوسائٹی میں پیدا ہوئے کہ ہم نے ان کی عظمت اور رفعت کو جاننے کا بھی حق ادا نہیں کیا۔ جسے دینِ اسلام سے، دقائق شریعت سے، فکرِ اسلامی سے، نظامِ عبادات اور تصوف کے عملی و نظری مباحث سے دلچسپی ہو اور ان کو سمجھنے کے لئے استقامت فکر کا طالب ہو، اس نے اگر مولانا تھانویؒ کے مواعظ اور ملفوظات کا فیض نہیں اٹھایا، تو اس کے سوا کیا کہا جائے کہ بڑی ہی محرومی ہے۔ یہی مولانا تھانویؒ اگر مغرب کی مادہ پرست سوسائٹی میں پیدا ہوئے ہوتے تو ان کا فیضانِ روحانی جو ہوتا سو ہوتا، مگر ان کی زندگی اور کارناموں پر ایک پورا کتب خانہ وجود میں آ گیا ہوتا۔

مولانا تھانویؒ حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ سے ان کے آخری زمانۂ حیات میں مستفید ہوئے تھے اور یہ فرماتے تھے کہ "ہم نے حاجی صاحبؒ کے پکے پھل کھائے ہیں"۔ خود مولانا تھانویؒ کے شجر معرفت سے پکے ہوئے پھل مولانا سید سلیمان ندویؒ کے حصے میں آئے۔ مقالاتِ سلوک تو سید صاحبؒ طے کر کے ہی وہاں پہنچے تھے۔ کسی ریاضت یا مجاہدے کی ضرورت تو نہیں ہوتی ہے، جو خامی میں پختہ ہو جاتے ہیں، سید صاحبؒ کو تو پاک باطن درویشوں کے اس سلسلۃ الذھب میں شامل ہونا تھا۔ اس نسبت کا حصول ہی

Marfat.com

کرتا تھا۔ کہتے ہیں کہ شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ صرف ۱۷ دن حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کی خانقاہ میں رہے اور خلافت سے مشرف کر کے رخصت کر دیئے گئے۔ بعض درویش برسوں سے مجاہدے کر رہے تھے، انہوں نے شیخ سہروردیؒ سے دبے لفظوں میں شکایت کی ہوگی کہ یہ امتیازی سلوک کیسا؟ تو انہوں نے فرمایا کہ زکریا سوکھی لکڑیاں لایا تھا، میں نے آگ دکھادی۔ تم ابھی گیلی لکڑیاں لیے بیٹھے ہو۔

ہمارے سید صاحبؒ تو میں کہوں گا آگ بھی خود ہی لگا چکے تھے، بس کسی کے دامن کی تھوڑی سی ہوا درکار تھی، وہ کام خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں ہوگیا۔

صوفیا کے ہاں خلافت کی بھی بہت سی قسمیں ہیں۔ سب سے اعلیٰ مرتبہ خلافتِ رحمانی ہے، جو اشارہ غیبی سے کسی کو دی جاتی ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو ایسی ہی خلافت ملی تھی۔ تبھی تو انہیں دیکھ کر حضرت بابا فریدؒ نے یہ شعر پڑھا تھا

اے آتش فراقت دلہا کباب کردہ
سیلاب اشتیاقت جانہا خراب کردہ

سید صاحبؒ کو بھی یہ خلافتِ رحمانی بارگاہِ اشرفی سے عطا ہوئی۔ سید صاحبؒ نے لکھا تھا:

> ''مجھے فخر یہ ہے کہ لوگوں نے مولانا تھانویؒ کو اپنی طرف کھینچا اور مجھے خود مولانا تھانویؒ نے بار بار اپنی طرف کھینچا (بعالم رویا)''۔ یہ اسی خلافتِ رحمانی کی کشش تھی''۔

حضرت سید سلیمان ندویؒ کی نسبت تمام تر عشق ہے اور ان کا باطن چشتی انوار سے معمور ہے، لیکن وفورِ علم نے اس کو حبِ عقلی بنا دیا ہے، جو زیادہ پائیدار ہوتی ہے۔ یہاں سلوک کا کوئی نصاب مقرر نہیں اور لطائف کی چھان میں بھی نہیں ہے۔ حضرات چشتیہ کے ہاں سب سے اہم لطیفہ قلب ہے اور یہی قرآنی سلوک بھی ہے۔

من اتی اللہ بقلبٍ سلیم۔

Marfat.com

شیخ الحدیث حضرت مولانا فیض احمد صاحب مدظلہ، ملتان

چند حسین یادیں

جامع الکمالات الظاہرۃ والباطنہ مخدوم العلماء وقدوۃ العرفاء حضرت علامہ سید سلیمان ندوی قدس سرہٗ جامعہ خیر المدارس ملتان کے سالانہ جلسہ میں شرکت کے لئے تشریف لایا کرتے تھے۔ مدرسہ کی انتظامیہ کی طرف سے بندہ راقم سطور آنمحترم کی خدمت پر مامور ہوتا تھا اور اسے اپنی سعادت سمجھتا تھا۔ وہ عجیب منظر آج بھی آنکھوں کے سامنے ہے کہ ایک مرتبہ سید صاحبؒ خیر المدارس کے برآمدہ میں ایک چارپائی پر دوپہر کے وقت لیٹے ہوئے تھے اور حضرت اقدس مولانا خیر محمد صاحب جالندھری قدس سرہٗ آہستہ آہستہ آپ کے پاؤں دبا رہے تھے۔ ہم سب خوشگوار حیرت کے ساتھ یہ دیکھ رہے تھے اور زبانِ حال سے کہہ رہے تھے کہ حضرت مہتمم صاحب قدس سرہٗ اپنے پیر بھائی کے پاؤں دبا رہے ہیں، جو ہم خدام کے لئے ایک عملی سبق اور تربیت کا نرالہ اور انوکھا انداز ہے۔

نمازِ استسقاء :

اُس وقت خیر المدارس کا سالانہ جلسہ مارچ کے مہینہ میں باغ عام وخاص میں منعقد ہوتا تھا۔ اکثر جلسہ کے ایام میں بارش ہو جایا کرتی تھی۔ ایک دفعہ حضرت سید صاحب نے فرمایا یہ خیر المدارس کا جلسہ ہوتا ہے یا نمازِ استسقاء ہوتی ہے کہ جب بھی جلسہ ہوتا ہے بارانِ رحمت برستی ہے۔

Marfat.com

نمازِ تہجد :

ایک رات حضرت سید صاحبؒ آخر شب میں نمازِ تہجد کے لئے اٹھے۔ بجلی بند تھی۔ فوراً بندہ نے اُٹھ کر پانی کا انتظام کیا۔ بارش جاری تھی۔ بیت الخلاء دور تھا۔ ایک چھتری پیش خدمت کی اور لالٹین روشن کر کے ساتھ ہولیا۔ حضرت اقدس آہستہ آہستہ قدم رکھتے ہوئے بیت الخلاء تشریف لے گئے اور پھر بعد از فراغت اسی حالت و کیفیت کے ساتھ واپس تشریف لائے۔ اس وقت فلش سسٹم نہیں تھا۔ جمعدار صفائی کرتا تھا۔

عرس کی جگہ جلسہ :

ہر سال ''قلعہ کہنہ'' پر مخدوم مرید حسینؒ متولی خانقاہ حضرت بہاء الدین ذکریا ملتانیؒ عرس کرایا کرتے تھے۔ ایک سال مخدوم صاحب نے حضرت اقدس مولانا خیر محمد صاحب قدس سرہٗ کی معرفت علماء حقانیہ و مشائخ ربانیہ کو بلا کر اصلاحی جلسہ کا پروگرام بنایا۔ ان مدعوین بزرگوں میں حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ اور حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ بہت ممتاز اور نمایاں تھے۔ سید صاحب نے مجھ سے استفسار فرمایا کہ حضرت بہاؤ الدین زکریاؒ کے حالات پر کوئی کتاب ہے؟ بندہ نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

رو دیئے :

ایک مرتبہ خیر المدارس کے جلسہ پر تقریر کرتے ہوئے سید صاحبؒ رو دیئے اور کافی دیر گریہ طاری رہا۔ یاد نہیں کہ آپ کی تقریر کا موضوع کیا تھا۔

اللہ :

حضرت سید صاحب قدس سرہٗ مجلس میں بیٹھے بیٹھے وقفہ وقفہ سے ٹھنڈا سانس لے کر فرماتے ''اللہ'' جس کا سامعین و حاضرین پر خاص اثر ہوتا تھا۔ (یہ ۱۹۵۰ء، ۱۹۵۱ء کے واقعات ہیں)

Marfat.com

ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی [۱]

ذوقِ شعر و ادب

علم و ادب کی تاریخ میں علامہ سید سلیمان ندوی ایک باکمال عالم و محقق اور مؤرخ و سیرت نگار کی حیثیت سے شہرۂ آفاق ہوئے اور اس حیثیت سے ان کی شہرت و عظمت کے سامنے ان کی دوسری مثلاً ادبی، شعری اور تنقیدی حیثیتوں کا چراغ روشن نہ ہو سکا۔ اب رفتارِ زمانہ نے انہیں ایک ادیب و انشاء پرداز کی حیثیت سے تو تسلیم کرا بھی لیا ہے، لیکن ان کے بلند شعری ذوق اور معیاری مذاق سخن گوئی کا علم اب بھی خال خال ہی لوگوں کو ہے۔ حالانکہ سید صاحب نے کلام میں ناسخ کی مہارت زبان، شوکتِ الفاظ، بلند پروازی اور نازک خیالی، آتش کی مرصع سازی اور جوہر مردانگی، شاہ نصیر اور ذوق کی صنعت گری اور فنی کاوش، داغ کا منفرد لب و لہجہ، امیر مینائی کی شستگی اور بیان کی صفائی اور جلال کا سحر زبان' غرض وہ سب کچھ ہے، جن کا لکھنوی دبستانِ شاعری کے نمایاں اور اہم ممیزات میں شمار ہوتا ہے۔

اس کے گوناگوں وجوہ ہیں۔ دراصل سید صاحب ایک باکمال شاعر ہونے کے باوجود خود کبھی اس کا اظہار پسند نہیں کرتے تھے اور ہمیشہ اپنے ذوق کو ایک ''جرم'' اور ''عیب'' قرار دے کر ''رمز'' و اشارہ کے پردے میں چھپانے کی سعی کرتے رہے۔ (سید سلیمان ندوی: ''میں جن سے متاثر ہوا'' (مضمون) معارف جولائی ۱۹۵۰ء ص ۶) لیکن ان کے ایک مسترشد غلام محمد نے ''ارمغانِ سلیمان'' کے نام سے ان کا مجموعہ کلام مرتب کر کے کراچی سے ۱۹۶۶ء میں شائع کر دیا۔ اس طرح یہ بند خزانہ اب وقف عام ہو گیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر سید صاحب نے شاعری کے کوچہ کو خیرباد نہ کہہ دیا ہوتا،

Marfat.com

تو اس میدان میں بھی ان کا قدم کسی سے پیچھے نہ رہتا، مگر ان کے صحیفہ تحقیق و تصنیف نے صحیفہ شاعری کو منسوخ کر دیا اور علمی و تحقیقی کارناموں کی آب و تاب میں ان کی شاعری ماند پڑ کر رہ گئی۔ (شاہ معین الدین احمد: ارمغان سلیمان (مضمون معارف جولائی ۱۹۷۱ء ص ۱۲)

سید صاحب کے دفتر کمال کی اس حیثیت کی جانب ابھی تک کسی نے خاطر خواہ اعتنا نہیں کیا ہے۔ غالباً سب سے پہلے ان کے خویش سید حسین احمد نے معارف کے سلیمان نمبر میں ''حضرت قبلہ کا عارفانہ کلام'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا، جس میں سید صاحب کے صرف اس عہد کے کلام کا جلوہ دکھایا گیا ہے، جب انہوں نے اپنی جبینِ نیاز آستانہ اشرفی پر جھکا دی تھی اور ان کے جذبات و وارداتِ قلبی شعر کے قالب میں ڈھل رہے تھے۔ اُس کے بعد غلام محمد نے اپنے مرتبہ ارمغان سلیمان کے مقدمہ میں سید صاحب کی شاعری پر مختصر مگر جامع تبصرہ کیا ہے۔ تیسرا اور غالباً آخری مضمون شاہ معین الدین ندوی کا ہے، جو رسالہ معارف جولائی ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا تھا، جس میں نسبتہً وضاحت کے ساتھ سید صاحب کے مرتبہ شاعری اور ان کے ذوق شعر و سخن کی تعیین و تفہیم کی کوشش کی گئی ہے۔

(۲)

سید سلیمان ندوی کو صغر سنی میں بیت بازی سے بہت دلچسپی تھی اور وہ اس میں پیش پیش رہتے تھے۔ شعر و شاعری سے ان کے ذوق کی بنیاد ابتدائی تعلیم کے زمانہ میں اسی بیت بازی سے پڑی۔ (سید ابوظفر: بچپن اور طالب علمی کے کچھ واقعات (مضمون) مشمولہ معارف سلیمان نمبر، ص ۴۸) بقول مناظر احسن گیلانی آج سے ساٹھ ستر برس پہلے بہار میں یہ عام دستور تھا کہ کسی گاؤں میں جب دوسرے گاؤں سے بارات آتی تھی، تو طرفین کے بچے عموماً شعر لڑایا کرتے تھے۔ اس علمی معرکہ کا نام اس زمانہ میں ''بیتا بحث'' تھا۔ برات آنے سے چند ماہ پیشتر مکتب خانے کے بچے اس بیتا بحث کی تیاریوں میں مشغول ہو جاتے۔ کبھی ایک ہی مکتب کے طلبہ دو جماعتوں میں تقسیم ہو کر بیت بازی کرتے اور کبھی دو

Marfat.com

مکتبوں کا ایک دوسرے سے مقابلہ ہوتا تھا۔ اس زمانے میں کچھ کتابیں بھی اس سلسلہ میں مروّج تھیں۔ جن سے اس معرکہ کو سر کرنے میں مدد ملتی تھی۔ ان ہی کتابوں کے اشعار لڑکے زبانی یاد کرتے تھے۔ (مناظر احسن: سید الملت کی مکتبی زندگی (مضمون) مشمولہ ریاض کراچی سلیمان نمبر ص ۲۲) سید صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے وطن کے جن مکاتب میں حاصل کی ان میں بیت بازی کا بڑا زور تھا۔ وہ ان میں نہ صرف پوری تیاری اور ذوق وشوق سے شریک ہوتے بلکہ اپنے گروہ کے امام و سرخیل بنائے جاتے۔ ابوظفر ندوی لکھتے ہیں:

> ''علامہ سید سلیمان ندوی کے مکتب میں بھی دو پارٹیاں تھیں۔ جہاں تک مجھے یاد ہے ایک پارٹی کے امیر علامہ موصوف اور ان کے مشیر خاص حکیم نجم الہدیٰ ندوی تھے اور دوسری کے مولوی محمد قاسم۔ اس کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ علامہ موصوف کو شاعری سے خاص لگاؤ ہو گیا اور ہزاروں اشعار ان کو زبانی یاد ہو گئے''۔ (سید ابوظفر: بچپن اور طالب علمی کے کچھ واقعات (مضمون) مشمولہ معارف سلیمان نمبر ص ۴۹)

بیت بازی کے سلسلہ میں سید صاحب نے ایک بیاض بھی تیار کی تھی، جس میں بلا مبالغہ ہزاروں اشعار درج تھے۔ اس بیاض کے ایک جانب عربی اور دوسری جانب اردو اشعار تھے۔ (ایضاً ص: ۵۳) چونکہ بیت بازی میں حریف خود ساختہ اشعار بھی پیش کرتے تھے، اس لئے سید صاحب کو تقطیع کی طرف بھی خاص توجہ کرنا پڑی اور اس کے باعث ان کو فن عروض پر اس قدر عبور حاصل ہو گیا تھا کہ علماء میں اس کی مثالیں کم ہی ملیں گی۔

(ایضاً ص: ۴۹)

گاؤں کی مکتبی زندگی سے نکل کر وہ ۱۸۹۸ء میں مزید تحصیل کے لئے پھلواری شریف (پٹنہ) آئے۔ یہاں خانقاہ مجیبی میں قوالی کی محفلیں برابر ہوتی رہتی تھیں، جس کے اثر سے پورے قصبہ میں شعر و سخن کا ذوق عام تھا۔ (شاہ معین الدین احمد: حیات سلیمان ص: ۷ و

Marfat.com

سید نجم الہدیٰ: سید صاحب کی یاد میں، معارف نومبر ۵۹ء) مزید برآں پھلواری میں سید صاحب کا قیام جس کمرے میں تھا، اس کے پاس ہی ایک بزرگ مولوی عبداللہ رہتے تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی مولوی معشوق ایک پُرگو شاعر تھے۔ ان کے کمرے میں ہر وقت شعر و شاعری کا چرچا رہتا تھا۔ سید صاحب بھی بہت دلچسپی اور شوق سے اس مجلس میں شریک رہتے۔ ان کو بیت بازیوں سے اس کا چسکہ تو پہلے ہی پڑ چکا تھا۔ اب یہاں کی قوالی کی محفلوں میں شرکت اور اس ماحول نے ان کے شعر و سخن کو اور جلا عطا کی۔ وہ خود اپنے ایک ریڈیائی مضمون میں رقمطراز ہیں:

> ''یہاں (پھلوری شریف) خانقاہ میں ہر ہفتہ قوالی ہوتی تھی۔ اس کے اثر سے اس قصبہ میں شعر و شاعری کا چرچا تھا اور ہے۔ میں نے بھی اس فضا میں سانس لی اور یہیں میں نے مولوی عبدالحلیم شرر کا ناول ''منصور موہنا'' دیکھا۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ جس وقت کتاب ختم کی، خوب پھوٹ پھوٹ کر رو دیا''۔ (سید سلیمان ندوی: ''میں جن سے متاثر ہوا'' (مضمون) مشمولہ معارف جولائی ۱۹۵۰ء ص ۷)

بہار کی مختلف درسگاہوں میں تعلیم کے ابتدائی مراحل طے کرنے کے بعد جب ۱۹۰۱ء میں سید صاحب دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ کے لئے لکھنؤ پہنچے تو گویا شعر و سخن کے اصل گہوارہ میں آ گئے۔ خود ندوہ میں شعر و شاعری کا بڑا چرچا تھا۔ طلبہ اکثر مشاعرہ کرتے تھے، جس میں رکن الدین دانا، تجمل حسین شاہ جہانپوری، مصطفیٰ خان ملیح آبادی، عبدالغفور شرر، سید عثمان گیلانی، ظہور احمد وحشی، اور مولانا عبدالسلام شمیم (صاحب شعرالہند) خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ سید صاحب بھی ان مشاعروں میں شریک ہوتے اور اپنا طرحی یا غیر طرحی کلام سناتے تھے۔

(نجم الہدیٰ: سید صاحب کی یاد میں (مضمون) معارف نومبر ۵۹ء ص ۳۴۲)

Marfat.com

لکھنؤ کی اس شعر پرور فضا میں ان کی شاعری کا نشہ دو آتشہ ہو گیا اور ان کا ذوق سخنوری نکھر کر درجۂ کمال کو پہنچ گیا۔ شاہ معین الدین احمد ندوی رقم طراز ہیں :

"جس زمانہ میں سید صاحب مزید تعلیم کے لئے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے، لکھنؤ کی پوری فضا پر شاعری چھائی ہوئی تھی۔ اس فضا نے سید صاحب کی شاعری کا نشہ تیز کر دیا اور وہ خود بھی شعر کہنے لگے"۔

(شاہ معین الدین: ارمغان سلیمان معارف جولائی ۱۹۷۱ء ص ۱۰)

سید ابوظفر ندوی لکھتے ہیں :

"...... اس زمانہ کے اساتذہ میں داغ، امیر، جلال، ریاض اور مضطر وغیرہ بقید حیات تھے۔ عشرت لکھنوی کا نام طلبہ میں زیادہ معروف تھا۔ پیام یار نامی رسالہ طرحی اور غیر طرحی غزلوں کے ساتھ ہر ماہ نکلتا تھا۔ مرثیے کی محفل اور مشاعرے بکثرت ہوتے تھے۔ علامہ موصوف ان میں شرکت کرتے کرتے خود بھی شعر کہنے لگے اور بالآخر ایک باکمال شاعر بن گئے"۔

(ابوظفر: بچپن اور طالب علمی کے واقعات، معارف سلیمان نمبر ص ۵۴)

(۴)

سید صاحب کا عہد لکھنؤ میں شعر و سخن کی بہار کا زمانہ تھا۔ پوری فضا امیر، داغ اور جلال کے نغموں سے گونج رہی تھی۔ سید صاحب امیر مینائی سے بہت متاثر تھے۔ چنانچہ جب ندوہ میں طلبہ مشاعرہ کرتے تو جہاں بعض لڑکے اس میں داغ کی نقل کرتے سید صاحب امیر مینائی کا روپ بھرتے۔ امیر کا دیوان مراۃ الغیب برابر ان کے مطالعہ میں رہتا تھا۔ وہ اپنے اشعار میں اسی رنگ تغزل کا چربہ اتارنے کی کوشش کرتے تھے۔ سید صاحب نے امیر مینائی سے اپنے تاثر کے آغاز کی وضاحت کرتے ہوئے خود لکھا ہے کہ "میں نے

Marfat.com

جب آنکھ کھولی تو ملک میں امیر و داغ کے معرکے تھے، میرے ایک استاذ شمس العلماء مولانا حفیظ اللہ جو جنرل عظیم الدین خان کے زمانے میں رام پور میں رہے تھے اور وہاں منشی امیر احمد کی صحبت برسوں اٹھائی تھی، وہ اکثر امیر مرحوم کے تذکرے کیا کرتے تھے اور ان کے شعر سناتے تھے۔ ایک اور اتفاق یہ ہے کہ حضرت امیر مینائی کے جلیل القدر شاگرد جلیل مانکپوری کے بڑے صاحبزادے مولوی صدیق میرے ساتھ دارالعلوم ندوہ میں پڑھتے تھے۔ ان کے ذریعہ امیر مرحوم کی بہت سی غزلیں میری نظر سے گذریں اور دل میں امیر مینائی کی قدر و منزلت نے گھر کر لیا"۔

(سید سلیمان ندوی: میں جن سے متاثر ہوا (مضمون) مشمولہ معارف جولائی ۵۰ء ص ۱۱)

سید صاحب کو امیر مینائی کے سینکڑوں اشعار نوکِ زبان تھے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی امیر کے ماہر فن ہونے اور تحقیق لغت و زبان کے تو معترف تھے، لیکن ان کی غزل گوئی کے زیادہ قائل نہ تھے، لیکن سید صاحب کی زبان سے امیر کے منتخب اشعار سن کر ان کو اپنی رائے میں تبدیلی کرنی پڑی۔ اس سلسلہ میں انہوں نے اپنے ایک مضمون میں اپنا اور سید صاحب کا ایک دلچسپ مکالمہ نقل کیا ہے۔ اس مکالمہ کو نقل کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں:

> "سید صاحب سے ربط و رسم ایک مدت سے قائم تھا۔ ان کے علم و فضل کا سکہ کئی سال سے دل پر بیٹھا ہوا تھا۔ یہ کیا خبر تھی کہ الندوہ کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو سنبھالنے والا اور الہلال کو وقت کی ظلمتوں میں چمکانے والا کلامِ امیر کا حافظ نکلے گا۔ مرآۃ الغیب کا آئینہ دار، صنم خانہ عشق کا پرستار یہ پہلی بار کھلا کہ حضرت بایں زہد و تقویٰ اور شعر و سخن کے رسیا ہیں اور اردو غزل و تشبیب کے متوالے"۔ (عبدالماجد دریابادی: نقوش سلیمانی (مضمون) معارف سلیمان نمبر ص ۲۳۰)

اسی باعث سید صاحب کے ابتدائی دور کے کلام پر امیر مینائی کے رنگ و سخن کے

Marfat.com

بہت نمایاں اور گہرے اثرات ملتے ہیں۔ وہی کلام کی ندرت، تازگی اور لطافت اور وہی حسنِ زبان، نزاکت اور لوچ جو امیر کے امتیازی خصائص شعری شمار ہوتے ہیں، سید صاحب کے ابتدائی دور کے کلام میں درجہ کمال پر ملتا ہے۔

امیر مینائی کی پُرگوئی اور قادر الکلامی پر تو تمام نقاد متفق ہیں، لیکن ان کا رنگ سخن کافی متنازعہ فیہ مسئلہ ہے، لیکن میرے نزدیک یہ کہنا زیادتی کی بات ہے کہ ناسخ اور داغ کے رنگ کی بے جا تقلید کے باعث امیر کی اپنی انفرادیت ابھر نہ سکی۔

(احمر لاری: حسرت موہانی حیات اور کارنامے ص ۲۱۲ (ادبستان گورکھپور ۷۳ء)

اسی طرح یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے کہ امیر کا پہلا دیوان ''مرأۃ الغیب'' خالص ناسخ و اسیر کے رنگ میں ہے۔ (احسن اللہ ثاقب: مکاتیب امیر مینائی، مقدمہ ص ۵۲ (نسیم بک ڈپو لکھنؤ ۶۴ء) بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس میں ہر رنگ کے شعر موجود ہیں۔ (ممتاز علی آہ: امیر مینائی ص ۱۶۴ (ادبی پریس لکھنؤ ۴۱ء)

بحیثیت مجموعی امیر کی غزل گوئی پر لکھنؤ اسکول کی روایات کا اثر نمایاں ہے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ جہاں لکھنویت کے دائرہ میں رہ کر انہوں نے اپنے کلام میں ندرت، تازگی اور لطافت پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کی، وہاں ان کے فن نے ارتقاء کی منزلیں طے کر کے اپنی انفرادیت کا پرچم بھی لہرایا۔ (ابو محمد سحر: مطالعہ امیر ص ۱۵۴ (نسیم بک ڈپو لکھنؤ ۶۵ء) ڈا، لکھتے ہیں:

> ''مرأۃ الغیب میں رعایت لفظی اور صنعت گری کے وہ نمونے موجود نہیں ہیں، جو آتش اور ناسخ کے شاگردوں کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ البتہ بعض اشعار میں خارجی رنگ موجود ہے، لیکن بالعموم امیر نے جذبات نگاری کی طرف توجہ دی ہے''۔

(ابواللیث صدیقی: لکھنؤ کا دبستان شاعری ص ۵۹۹)

Marfat.com

۱۲ء میں جب علامہ شبلی نے نئی اردو شاعری کی طرح ڈالی، تو سید صاحب نے اس میں بھی استاذ کی اتباع کا حق ادا کیا اور علامہ شبلی کی رحلت کے بعد متعدد نظمیں ہو بہو شبلوی رنگ میں لکھیں اور اہل فن سے استاذ کی ہم رنگی پر داد پائی۔ چنانچہ "نوحۂ استاذ" کے بارے میں نواب عماد الملک نے انہیں لکھا تھا:

"آپ کی نظمیں علامہ شبلی کی یاد تازہ کرتی ہیں"۔

(غلام محمد: ارمغان سلیمان مقدمہ ص ۲۳۲)

(۴)

جس طرح سید صاحب کے علمی و تحقیقی فضل و کمال کے سامنے ان کی شاعرانہ حیثیت گم ہو کر رہ گئی، اسی طرح ایک عرصۂ دراز تک ان کے شعری جواہر ریزے بھی پردۂ گمنامی میں رہے۔ عبدالماجد دریابادی نے ۵۵ء میں مجلہ معارف کے سلیمان نمبر میں سید صاحب کی شاعری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

"سید صاحب کی شاعری پر تبصرہ کے لئے ایک مستقل مقالہ درکار ہے اور یہ منزل تو پھر بعد کی ہے۔ پہلے کوئی شاگرد ذرا تلاش و تفحص سے کام لے کر ان کا سارا کلام یکجا تو کر لے"۔

(غلام محمد: ارمغان سلیمان مقدمہ ص ۱۲)

مقامِ مسرت ہے کہ اس تحریک کے ٹھیک دس سال کے بعد سید صاحب کے ایک مسترشد غلام محمد نے جولائی ۱۹۶۶ء میں کراچی سے ارمغان سلیمان کے نام سے ان کا مجموعہ کلام مرتب کر کے بڑے اہتمام سے شائع کیا۔ یہ مجموعہ متوسط تقطیع کے ۱۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ شروع میں مرتب کے قلم سے ایک مختصر مگر جامع مقدمہ بھی شامل ہے، جس میں سید صاحب کے شاعرانہ مرتبہ کو نمایاں و متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مرتب کو اعتراف ہے کہ "یہ مجموعہ سید صاحب کے مشق سخن کا پورا سرمایہ نہیں، بلکہ

Marfat.com

ان کی قلمی بیاض کی پوری پوری نقل ہے، اگر اضافہ ہے تو چند ایک قطعات یا ان نظموں کا جو کہیں اور چھپی ہوئی مل گئیں"۔ (غلام محمد ارمغان سلیمان مقدمہ ص ۱۱)

ارمغانِ سلیمان میں دورِ آخر (جو روحانی شاعری پر مشتمل ہے) کا کل خزانہ محفوظ ہوگیا ہے، لیکن دورِ اوّل کی قدیم ترین غزل اس مجموعہ میں ۱۹۰۴ء کی ملتی ہے، جبکہ گذشتہ صفحات میں ذکر آچکا ہے کہ سید صاحب نے پھلواری شریف کے زمانہ قیام (۱۸۹۹ء) ہی سے طرحی اور غیر طرحی مشقِ سخن شروع کر دی تھی۔ اس زمانہ کے کلام کا سراغ نہیں ملتا۔ مولوی غلام محمد نے لکھا ہے :

"دورِ اول کے ذخیرہ کے متعلق یقین نہیں آتا کہ شعر وسخن کی گرم بازاری اور سخن سنج جواں عمری کا حاصل صرف اتنا ہی ہوگا۔ ممکن ہے خاصا حصہ محفوظ نہ رہ سکا ہو۔ اس گمان کو تقویت یوں بھی ملتی ہے کہ اس مجموعہ میں ایک غزل بھی ایسی نہیں ملتی، جس میں کہیں تخلص بھی آیا ہو"۔ (غلام محمد: ارمغانِ سلیمان ص ۱۱)

ایسا قیاس ہوتا ہے کہ جس قلمی بیاض سے یہ مجموعہ مرتب کیا گیا ہے، اس کے علاوہ بھی کوئی اور بیاض سید صاحب کے پاس رہی ہوگی، جو مرورِ زمانہ سے معدوم ہوگئی یا سید صاحب ہی نے بعد میں ایسے کلام کو جو خالص لکھنوی رنگ کا آئینہ دار تھا۔ ثقاہت ومتانت کے منافی خیال کر کے تلف کر دیا ہو۔ بہر کیف سید صاحب کا جتنا کچھ بھی کلام ذوق شناسانِ ادب کے سامنے ہے وہ ان کے ذوقِ شعری اور مرتبہ سخنوری کا اندازہ لگانے کے لئے کافی ہے۔

سید صاحب کے تخلص کا معاملہ بھی بڑا اہم ہے۔ عبدالماجد دریابادی نے "رمزی" تخلص لکھا ہے۔ (عبدالماجد دریابادی: نقوشِ سلیمانی (مضمون) مشمولہ معارف سلیمان نمبر ص ۲۳۱) موصوف اپنے اس خیال میں بالکل منفرد ہیں۔ غالباً مولوی غلام محمد نے بھی ان ہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

"علامہ کے رفقاء کا کہنا ہے کہ وہ "رمزی" تخلص سے غزلیں کہا کرتے

Marfat.com

تھے''۔(غلام محمد: ارمغان سلیمان مقدمہ ص ۱۲)

راقمِ سطور کے خیال میں علامہ سید سلیمان ندوی کا کوئی تخلص نہ تھا۔عبدالماجد صاحب کا''رمزی''تخلص قرار دینا غلط فہمی پر مبنی ہے اور اس کی بنیاد یہ ہے کہ سید صاحب اپنا بعض کلام معارف میں شائع کرتے تو اس کے نیچے واوین میں''رمزی''لکھا کرتے تھے۔ مثلاً نظم''متاعِ حق گوئی کی بازار جہاں میں ارزانی''(معارف فروری ۱۸ء)اور''درسِ مساوات''(معارف اگست ۱۸ء)کے آخر میں بائیں جانب''رمزی''لکھا ملتا ہے۔اسی طرح اکتوبر ۱۶ء کے معارف میں''رمزیات''کے عنوان سے کچھ اشعار درج ہیں اور اس کے نیچے بھی''رمزی''تحریر ہے۔اس سے یہ قیاس کیا گیا ہے کہ شاید سید صاحب کا تخلص یہی ہے، حالانکہ اس لفظ کو انہوں نے محض''سخن کا پردہ''بنایا تھا، جیسا کہ سید صاحب خود ہی لکھتے ہیں :

''اگر کبھی دل کے تقاضے سے مجبور ہو کر کچھ کہا تو اس کو عیب کی طرح چھپایا۔اگر چھپ نہ سکا، چھپ گیا تو نام کو رمز واشارہ بنا دیا''۔(سید سلیمان ندوی: میں جن سے متاثر ہوا(مضمون)معارف جولائی ۱۹۵۰ء ص ۶)

شاہ معین الدین احمد ندوی رقمطراز ہیں :

''وہ ایک عرصہ تک محض تفنن طبع کے طور پر شاعری کرتے رہے اور اس کو انہوں نے کوئی اہمیت نہیں دی۔اس لئے کوئی تخلص اختیار نہیں کیا اور جو غزلیں اور نظمیں شائع کیں، وہ''رمزی''کے پردے میں ہیں''۔(شاہ معین الدین احمد: ارمغان سلیمان(مضمون)معارف جولائی ۷۱ء)

یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ نواب صاحب (عماد الملک) کی تنبیہ سے پہلے سید صاحب اپنے اشعار میں تخلص استعمال کرتے تھے اور بعد میں اس کو ترک کر دیا، اگر ایسا ہوتا تو پھر پیشِ نظر مجموعہ میں ۱۵ء سے پہلے جو تین غزلیں شامل ہیں، اس میں رمزی تخلص مذکور

Marfat.com

ہونا چاہئے تھا، کیونکہ نواب صاحب موصوف کی تنبیہ تو ''نوحۂ استاذ'' (۱۵ء) کی اشاعت پر عمل میں آئی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ''رمزی'' محض ایک مفروضہ تخلص ہے، جس کا حقیقت سے کوئی علاقہ نہ تھا بلکہ واقعہ یہ ہے کہ صرف ایک چلمن تھی، جس کے پیچھے سید صاحب خود کو چھپانے کی کوشش ضرور کرتے، مگر ارباب نظر کی نگاہوں سے مستور نہ ہو پاتے تھے۔

(۵)

سید صاحب کے پیش نظر مجموعۂ کلام میں قدیم ترین اشعار ۱۹۰۴ء کے ہیں اور مؤخر ترین اشعار ۱۹۴۹ء کے۔ اس طرح ان کی شاعری کی مدت تقریباً نصف صدی پر محیط ہے۔ اس طویل عرصہ میں ان کی شاعری کا سوتا دوسرے ہم عصر باقاعدہ شعراء مثلاً حسرت موہانی، فانی، اصغر اور جگر کی طرح بلا انقطاع مدت مسلسل جاری نہیں رہا۔ بلکہ درمیان درمیان میں اس کی خشکی کے وقفے بھی آتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک زمانہ میں شعر گوئی سے طبیعت بالکل ہٹ گئی تھی۔ صرف مولانا تھانوی کے حلقۂ ارادت میں داخل ہونے کے بعد سے ان کی رحلت تک کے درمیانی سوا سالہ زمانہ میں سید صاحب کے جذبات اور واردات قلبی میں جو جوش اور اُبال پیدا ہوا، اس کے نتیجہ میں ایک وافر سرمایۂ شاعری وجود میں آ گیا۔ جو باقی عہد کے ذخیرۂ سخن پر کمیت اور کیفیت دونوں حیثیت سے فوقیت رکھتا ہے اسی لئے ارمغان سلیمان کے مرتب نے سید صاحب کے کلام کو دو ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ دور اول میں ۱۹۰۴ء سے ۱۹۳۵ء تک کا کلام شامل ہے اور دور آخر کا کلام اپریل ۴۲ء سے دسمبر ۴۹ء تک پر مشتمل ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ سید صاحب کے رنگ سخن اور ذوق شعری کے تدریجی ارتقاء کو پورے طور پر سمجھنے کے لئے اس کو تین ادوار میں منقسم کرنا چاہئے۔

(شاہ معین الدین احمد: ''ارمغان سلیمان'' (مضمون) معارف جولائی ۷۱ء)

پہلا دور زمانہ طالب علمی کی شاعری اور مشق سخن پر مشتمل ہے۔ اس دور کو ان کا

Marfat.com

تربیتی دور کہا جا سکتا ہے۔ جب سید صاحب لکھنوی رنگ تغزل کے دلدادہ اور امیر مینائی کے مرأۃ الغیب کے پرستار تھے۔ اسی کی کامیاب نقالی و تقلید میں ساری طباعی صرف کرتے، چنانچہ ان کے ابتدائی عہد کا کلام بھی اسی رنگ و آہنگ کا مکمل نمونہ ہے۔ زبان و بیان کی سلاست و صفائی کے ساتھ اشعار میں نزاکت اور لوچ ملتا ہے۔ علاوہ ازیں لکھنوی دبستانِ سخن کا طغرائے امتیاز یعنی خارجیت کا میلان اور رنگینی، شوخی اور رعنائی خیال کی خصوصیات اس پر مستزاد تھیں۔ اس عہد کی غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ....

دست نازک سے اٹھاتے ہیں وہ میت میری
بعد مرنے کے ٹھکانے لگی محنت میری
چین سے بیٹھنے دے گی نہیں ہم دونوں کو
تجھ کو یہ شوخی تیری، مجھ کو یہ وحشت میری
چاہے تم آج نہ ہو میری وفا کے قائل
پر تمہیں یاد آئے گی کبھی الفت میری

....

بجلی کی طرح قبر پہ آئے چلے گئے
اب تک ہمارے دل کو تڑپائے جاتے ہیں
پہلے تو چھیڑتے تھے تصور میں بار بار
اب کیوں شب وصال وہ شرمائے جاتے ہیں

....

اُدھر گلچیں خفا ہے اور ادھر بیتاب ہے بجلی
خدا حافظ ہے اے بلبل ترے اب آشیانے کا
اڑا لیتے ہو دل تم عاشقوں کا باتوں باتوں میں
نیا انداز یہ سیکھا ہے تم نے دل اڑانے کا

Marfat.com

سید صاحب کی شاعری کا دوسرا دور قیام دارالمصنفین (۱۴ء) کے بعد سے شروع ہوا اور مولانا اشرف علی تھانوی کی ارادت یعنی ۴۲ء تک قائم رہا۔ اس دور کے کلام میں نمایاں تبدیلی نظر آتی ہے۔ اب ان کی شاعری محض گل وبلبل اور ہجر ووصال کی داستان نہیں رہ گئی، بلکہ ان کے جذبات میں لطافت اور خیالات میں معنویت اور گہرائی پیدا ہوگئی۔

سید صاحب نے ۱۹۱۶ء میں ایک غزل اعظم گڑھ کے کسی مشاعرہ کے لئے کہی تھی، جس کا مطلع ہے ......

عجب طرح کا ایک پیچ گفتگو میں ہے
وگرنہ "میں" میں وہی بات ہے جو "تو" میں ہے

یہ غزل جب ڈاکٹر اقبال کی نظر سے گذری تو سید صاحب کو اس کی داد دیتے ہوئے ایک خط میں لکھا:

"آپ کی غزل لاجواب ہے، بالخصوص یہ شعر مجھے بڑا پسند آیا ......

ہزار بار مجھے لے گیا ہے مقتل میں
وہ ایک قطرۂ خوں جو رگ گلو میں ہے

(اقبال نامہ حصہ اول مرتبہ شیخ عطاء اللہ ص ۷۷ (ناشر شیخ محمد اشرف لاہور)

اسی غزل کا درج ذیل شعر بیت الغزل کہلانے کا مستحق ہے ......

دھن میں تیغ کے ہے اب بھی تشنگی باقی
عجیب لذت پنہاں میرے لہو میں ہے

اس غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ......

ہے کائنات کا ہر ایک ذرہ گردش میں
پتہ جو مل نہ سکا تیری جستجو میں ہے

Marfat.com

خطاب غیر میں گو لاکھ احترام رہے
مگر وہ لطف کہاں ہے جو لفظ "تو" میں ہے
نگاہِ لطف ادھر ہو کہ آچلا ہے کیف
بچا نہ رکھ مرے ساقی جو کچھ سبو میں ہے

جون ۱۹۱۷ء میں مولانا محمد علی جوہر نے ایک غزل عبدالماجد دریابادی کو جیل سے لکھ کر بھیجی تھی، جس کا ایک شعر یہ ہے ......

ہو حسن طلب لاکھ مگر کچھ نہیں ملتا
ہو صدق طلب پھر اثر آہ رسا دیکھ

اس غزل سے متاثر ہو کر اس کے تتبع میں مولانا دریابادی اور سید صاحب دونوں نے بڑی مرصع غزلیں کہہ ڈالیں۔ سید صاحب کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں......

تشہیر کا باعث نہ ہو دامان قبا دیکھ
لائے نہ کہیں رنگ یہ خون شہداء دیکھ
یہ عالم امکاں ہے تماشا گہ قدرت
جو کچھ یہاں دکھلائے تجھے دستِ قضا دیکھ
تاثیر وفا دعوئے باطل ہے سراسر
اب شوخ ستمگار پہ کچھ کر کے جفا دیکھ
بیکار ہے دشواری منزل کی شکایت
بے راہروئ خضر راہِ نما دیکھ
انکار تھا تجھ کو میری تاثیر دعا سے
اب میری طرف دیکھ تو تاثیر دعا دیکھ

Marfat.com

نکلے گا وہ خورشید جمال آج ادھر سے
اڑ جائیں مری خاک کے ذرے نہ صبا دیکھ
مقبول ہو اے یوسف زنداں مراتحفہ
لایا ہے جو پیغام ہر شہر سبا دیکھ

اگست ۴۷ء میں سید صاحب نے ایک نظم نما غزل ''راز درون پردہ'' کے عنوان سے کہی ہے، جو خیالات کی رفعت اور پاکیزگی سے بھری ہوئی ہے۔ اس زمانے میں جب وہ کہیں سفر پر جاتے اور ٹرین پر سوار ہوتے تو ان کے ذوقِ شعری کے دبے ہوئے جذبات ابھر آتے اور وہ اپنی بیاض نکال کر اس میں اشعار قلمبند کرتے جاتے۔ ان کے کلام کا بیشتر حصہ اسی طرح دورانِ سفر وجود میں آیا ہے۔ چنانچہ ''راز درون پردہ'' مظفر پور کے سفر کے دوران کہی گئی۔ اس کے کچھ اشعار یہ ہیں ....

یہ کیسی بے کسی ضبط محبت کی الٰہی ہے
کہ اس کا نام بھی میری زباں تک آنہیں سکتا
تمہیں کو کس طرح میری محبت کا یقیں آئے
قسم تک تو تمہارے نام کی میں کھا نہیں سکتا
نہ ہمدم کوئی ہو سکتا نہ مونس کوئی ممکن ہے
کہ لب تک ایک حرف اس داستاں کا آنہیں سکتا
بہ شکل نافہ اس کو بندھ کر دل میں رہنا ہے
میں اس بوئے محبت کو کہیں پھیلا نہیں سکتا
نظر اپنی سر بزم اس کی جانب اٹھ نہیں سکتی
کہ اسرار دروں میں برملا بتلا نہیں سکتا
اس اخفائے محبت میں جو لطف روح پرور ہے
کسی صورت سے وہ ضبط بیاں میں آنہیں سکتا

Marfat.com

یہ ہم دونوں سمجھتے ہیں کہ ہم دونوں سمجھتے ہیں
کہ جوراز دروں ہے کوئی اس کو پا نہیں سکتا

اس کے بعد ۱۹۲۸ء تک سید صاحب کی کل اٹھارہ غزلیں ملتی ہیں، جوتقریباً سب کی سب سفر کے دوران کہی گئی ہیں۔ان غزلوں کے کچھ منتخب اشعار ملاحظہ فرمائیں

عقل کہتی ہے کہ ناداں نہ ہو گمراہ نہ ہو
عشق کہتا ہے کہ کیا لطف اگر چاہ نہ ہو
سوزشِ عام ہو تب آگ سے اٹھتا ہے دھواں
عشق کامل کا جو دعویٰ ہے تو پھر آہ نہ ہو

....

حرف مطلب کہا نہیں جاتا
بے کہے بھی رہا نہیں جاتا
نگہ لطف سے نہ دیکھ مجھے
یہ ستم بھی سہا ، نہیں جاتا
عشق کی تازگی ہے آنسو سے
بے سبب تو بہا نہیں جاتا

....

نازک بہت ہے عشق و محبت کا آئینہ
سایہ پڑے بھی غیر کا اس پر تو ٹوٹ جائے
یہ آبگینے مجھ کو نہایت عزیز ہیں
اے خار دشت آبلہ کوئی نہ پھوٹ جائے

....

پھر چھیڑنے کو آئی ہے بادِ بہار آج
مدت کے بعد لائی ہے پیغامِ یار آج

Marfat.com

الٹا مجھی سے ترک ملاقات کا گلہ
طرز ستم نئی ہے تغافل شعار آج

....

یہ کیسی آگ ہے سینہ میں دب دب کر سلگتی ہے
ذرا دامن سے دی تم نے ہوا اور دلمیں لگتی ہے
نہ بجھ جانے کی رخصت ہے نہ جل جانے کی ہمت ہے
سلگ کر پھر وہ بجھتی ہے وہ بجھ کر پھر سلگتی ہے

....

یہ دل وہ شیشہ نازک ہے میرے سینے میں
نظر سے بھی جو گرے پاش پاش ہوجائے
نگاہ شوق ذرا دیکھ بھال کر اٹھے
چھپا ہے راز جو دل میں نہ فاش ہوجائے
شکست رونق بت خانہ ہو نہیں سکتی
خلیل خود ہی اگر بت تراش ہوجائے

....

اظہارِ جذبِ عشق پہ مائل تو ہوگئے
تیرا اثر کہ آج وہ گھائل تو ہوگئے
مضطر وہ برق وش تھا الٹنے کو خود حجاب
ہم آپ درمیاں میں حائل تو ہوگئے
میرے انوارِ تجلی سے فضا پر نور ہے
میں جو ہوں مسرور تو سارا جہاں مسرور ہے

Marfat.com

وہم سے بڑھ کر نہیں فرق جبر و اختیار
غور سے دیکھو کہ جو مختار ہے مجبور ہے

....

دعویٰ غلط ہے عشق کی تمکین و ہوش کا
ممکن نہیں کہ حسن سے ہو بے نیاز عشق
کتنی ہی مختصر ہو یہ کہانی حیات کی
کھولے اگر نہ حسن کی زلف دراز عشق

مذکورہ بالا اشعار سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ مرورِ ایام سے گو سید صاحب کے خیالات میں رفعت، جذبات میں شدت اور زبان و بندش میں صفائی اور پختگی پیدا ہوتی گئی، لیکن بنیادی طور پر سید صاحب اب بھی اس رنگ و آہنگ سے ہم رنگ رہے، جسے شعر و ادب کی تاریخ میں ''لکھنویت'' کا نام دیا جاتا ہے۔ فنی اعتبار سے ہم ان اشعار کو معیاری قرار دے سکتے ہیں، لیکن اس کے مطالعہ سے یہ احساس ہوتا ہے کہ سید صاحب کی شاعری کا پہلا دور ہو یا دوسرا، دونوں کی مشق سخن تمام تر تفریحی اور روایتی ہے اور وہ خود بھی اس کو ''رسمی و نقلی'' شاعری کا نام دیتے ہیں (غلام محمد: ارمغانِ سلیمان مقدمہ ص ۷)

امیر مینائی کے گہرے اثر کے باعث وہ کلی طور پر ''لکھنویت'' سے اپنا دامن دوسرے دور میں بھی نہ چھڑا سکے، جس کے ابتذال و سطحیت، خارجیت و معاملہ بندی اور حد سے زیادہ شوخی و رنگینی کے باعث لکھنوی اسکول کے شعراء موردِ نقد و جرح ہیں۔ اس کے نشانات سے با ایں زہد و تقویٰ سید صاحب کا کلام بھی خالی نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو ......

کل شب مرے نہ آنے سے خفگی بجا سہی
ہے کیوں نگاہ ناز مگر شرمسار آج

....

Marfat.com

دست گستاخ کو اجازت دو
منہ سے کھل کر کہا نہیں جاتا

....

ہماری پاکبازی کی سند پر مہر ہوتی ہے
مجھے جب بوسہ لب سے کبھی وہ شاد کرتے ہیں

....

وہ رفتہ رفتہ اور بھی دیں گے اجازتیں
ان کے گلے میں ہاتھ حمائل تو ہو گئے

گیسو سنگھا کے ہوش میں کیوں لا رہا ہے تو
یوں ہی تو چھوڑ دے مجھے اے یار چھوڑ دے

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ تمام اشعار تقلیدی اور روایتی طور پر کہے گئے ہیں۔ شاعر کے اصل مزاج کے آئینہ دار ہرگز نہیں۔ بقول غلام محمد "وہ ایک سراسر دینی خانوادہ کے چشم و چراغ تھے اور خود ان کا شخصی "شاکلہ" تمام تر دینی رنگ قبول کئے ہوئے تھا۔ اس لئے اس زمانے میں جو کچھ مشق سخن کی وہ (بجز ایک نعت اور دو نوحوں کے) محض رواج اور ماحول کی مطابقت کے لئے تھی۔ (غلام محمد ارمغان سلیمان مقدمہ ص ۷) چنانچہ ان روایتی اور تقلیدی غزلوں میں بھی سید صاحب کے بنیادی مزاج کی جھلکیاں کہیں کہیں بہت صاف دیکھی جا سکتی ہیں۔ مثلاً اس شعر میں خدا ترسی کی جھلک ....

لب پہ ہے نام خدا دل میں ہے سودائے صنم
مجھ کو اللہ کرے دیکھنا اللہ نہ ہو

اسی طرح درج ذیل اشعار میں سید صاحب کے اصل مزاج اور مصنوعی مذاق میں کس طرح کشمکش اور اضطراب پیدا ہوتا ہے اور راہِ سلوک و معرفت کے ابتدائی دور میں وہ

Marfat.com

کیسی خلش وتپش، اضطراب و بے چینی، حیرانی وسراسیمگی اور طلب وتمنا کے حالات سے دوچار ہوتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں......

بت پرستی بھی کروں اور بت شکن بھی میں بنوں
کیش، براہیم رکھ کر پیشہ آذر کروں
دل میں بت خانہ بسا ہے آنکھ ہے کعبہ کی سمت
حیف اس مومن نما کافر کو گر رہبر کروں
آنکھ میں توبہ کے آنسو دل میں اس بت کی ہوس
ہائے گنگا جل کو کیسے زمزم و کوثر کروں

اس دور میں سید صاحب نے غزلوں کے علاوہ دوسرے اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ آئندہ صفحات میں ان کا جائزہ لیا گیا ہے۔

(۶)

سید صاحب کی شاعری کے تیسرے اور آخری دور کا کلام کمیت اور کیفیت دونوں اعتبار سے مستقل عنوان کا مستحق ہے۔ اس میں انہوں نے علم کی اقلیم سے نکل کر آسمان معرفت کی سیر اور بادۂ وساغر کے پردے میں ''مشاہدۂ حق'' کی گفتگو کی ہے۔ سید صاحب کا دور آخر کا یہ کلام تمام تر عارفانہ اور متصوفانہ رنگ میں ہے۔ اس رنگ کا آغاز مولانا تھانوی کی ارادت سے کچھ پہلے ہوا اور ان کی حلقہ بگوشی پر عروج وکمال کو پہنچا۔ اس سے پہلے سید صاحب کا مشغلۂ سخن محض تفریح خاطر اور تفنن طبع کے لئے جاری تھا۔ اس لئے اس میں موزونی طبع اور قادر الکلامی تو ملتی ہے، مگر ''از دل خیزد بر دل ریزد'' کی کیفیت معدوم ہے، لیکن آستانہ اشرفی سے تعلق کے بعد ان کے جذبات شوق میں جو شدّت اور وفور پیدا ہوا، وہ زبان سے شعر ونغمہ بن کر ابلنے لگا۔

اس زمانے کے مقرب عینی شاہدین کا بیان ہے کہ ارادت کے بعد سید صاحب

Marfat.com

میں اتنا غیر معمولی تغیر ہو گیا کہ وہ ہر مجلس میں بلکہ ہر وقت نغمہ خوانی کرتے رہتے تھے، جب کہ اس سے پہلے یہ حالت نہ تھی۔ (سید حسین: حضرت قبلہ کا عارفانہ کلام (مضمون) مشمولہ معارف سلیمان نمبر ص ۳۲۷) جذبات کی شدت و فراوانی اور اشعار کی کثرتِ آمد کا یہ عالم تھا کہ کبھی ایک دن میں کئی کئی غزلیں موزوں ہو جاتی تھیں، جب کسی نشست میں وہ عارفانہ اشعار پڑھتے تھے تو سامعین کو تڑپا دیتے تھے۔ اس عہد کے وفور جذبات کے بارے میں غلام محمد خود سید صاحب کا یہ بیان نقل کرتے ہیں:

> ''میری اس دور کی شاعری کا آغاز حضرت والا (تھانوی قدس سرہٗ) کے تعلق سے ہوا اور انجام بھی حضرت کی رحلت ہی پر ہو گیا۔ بعد میں مشکل سے دو چار غزلیں ہوئیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت کی موجودگی میں جذبات کا وفور رہتا تھا، جو پھر باقی نہ رہا''۔ (غلام محمد: تذکرہ سلیمان ص ۱۲۲)

سید صاحب نے اپنے عارفانہ کلام کے مجموعہ کا نام ''غزل الغزلات'' خود تجویز کیا تھا، جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے لاہوتی نغمات کا عنوان تھا۔ (غلام محمد: ارمغان سلیمان مقدمہ ص ۹) اس اشتراک اسمی سے فائدہ اٹھانا ان کے حسنِ ذوق کا بیّن ثبوت ہے۔ لفظی اور معنوی دونوں اعتبار سے یہ کلام اس نام کا مستحق ہے۔ ''غزل الغزلات'' کو سید صاحب اپنا ''روحانی سفرنامہ'' کہا کرتے تھے اور فی الواقع اس میں راہِ سلوک و معرفت کے ہر مرحلہ کے نشانات ملتے ہیں۔ (شاہ معین الدین: ارمغان سلیمان (مضمون) مشمولہ معارف جولائی ۱۹۷۱ء ص ۱۴) ارمغانِ سلیمان کا یہ حصہ ۳۹ غزلیات، ۳ قطعات اور ایک فرد پر مشتمل ہے اور ہر ایک کے خاتمہ پر تاریخ اور مقام تحریر درج ہے۔ کل اشعار کی مجموعی تعداد ۳۱۶ ہے۔ ان اشعار سے شاعر کے روحانی ارتقاء اور عارفانہ مشاہدات کی تفصیل بخوبی معلوم ہو جاتی ہے۔ شاہ معین الدین احمد ندوی رقمطراز ہیں:

> ''اس دور کا کلام تمام تر قلبی واردات کا ترجمان اور بادۂ عرفان کا چھلکتا ہوا

Marfat.com

جام ہے۔ اس میں طور کی تجلیاں اور وادیٔ ایمن کی شرر باریاں نظر آتی ہیں''۔

(شاہ معین الدین: ارمغانِ سلیمان (مضمون) معارف جولائی ۱۹۷۱ء ص ۱۴)

سید صاحب نے اپنے اشعار میں معرفت اور تصوف کے مسائل کو محض روایتی طور پر نظم نہیں کیا ہے بلکہ درحقیقت وہ ان کے ذاتی مشاہدات و تجربات پر مبنی ہے۔ سید صاحب بادۂ تصوف اور مئے عرفان سے مست و سرشار تھے اور انہوں نے اپنے وارداتِ عشق اور سفر معرفت کی روداد ہی کو شعر کے قالب میں پیش کیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس عہد کے کلام میں انہوں نے محض موزونی طبع اور قدرتِ بیان کا کرشمہ نہیں دکھایا ہے بلکہ ان کی زندگی اور شخصیت سے اس کا گہرا تعلق ہے، چنانچہ خود کہتے ہیں......

جو شعر بھی سپرد قلم کر رہا ہوں میں
سب وارداتِ عشق رقم کر رہا ہوں میں

....

فیض ہے یہ کس ولی وقت کا
اب میرا جو شعر ہے الہام ہے

اردو شاعری میں دوسری بہت سی روایات کی طرح تصوف کی روایت بھی فارسی شاعری کے زیر اثر آئی۔ ''فارسی شاعری نے تصوف کی شراب کو اپنے پیمانوں میں اتار چایا، بسایا اور چھلکایا کہ وہ ایک طرف معرفت و سلوک کا نشہ بن کر چمکی، دوسری طرف عشقِ مجازی کی رگوں میں خون بن کر دوڑی اور تیسری طرف انسان دوستی کا وہ لہو بنی جو رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ساتھ ساتھ سینہ سنگ میں شرر بن کر تڑپا''۔

(وحید اختر: خواجہ میر درد، تصوف اور شاعری ص ۲۹۶ (انجمن ترقی اردو علی گڑھ ۱۹۷۱ء)

یوں تو یہ روایت اردو شاعری میں ہمیشہ پروان چڑھتی رہی، لیکن صاحبانِ دل شعراء نے اس کو وارداتِ دل کی زندہ تصویر بنا دیا اور توحید و معرفت کے تمام راز پردۂ شعر

Marfat.com

میں فاش کئے۔ دکن میں شیخ عین الدین گنج العلم، خواجہ گیسودراز، میران جی شمس العشاق اور شاہ صبغت اللہ کے خانوادۂ تصوف نے شعروادب پر بلاشبہ بہت گہرے نقوش چھوڑے اور تصوف کا اثر عام زندگی پر اتنا مضبوط ہوگیا کہ اس عہد کے وہ شعراء بھی جو صاحبِ معرفت نہیں کہلائے جاسکتے، کسی نہ کسی درجہ میں تصوف کا رنگ قبول کرنے پر مجبور رہے، پھر جب ولؔی نے دہلی پہنچ کر اردو شاعری کا صور پھونکا تو وہ خود چونکہ شاہ گلشن کے حلقہ بگوش تھے، اس لئے انہوں نے بادۂ عرفان کے چھلکتے ہوئے جام سے ہر نفس کو شاد کام کیا اور پھر اس کی روایت اتنی مقبول عام ہوئی کہ جو شعراء صوفی نہ تھے، انہوں نے بھی تصوف کو ''برائے شعر گفتن خوب'' قرار دے کر رسم زمانہ کے مطابق مسائل تصوف کو جامۂ شعر پہنانا ضروری خیال کیا۔

لیکن اردو شاعری کے اس روایتی تصوف سے قطع نظر ایسے شعراء کے نام محض انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ جنہوں نے رسماً نہیں بلکہ محرم راز ہوکر مسائلِ تصوف کی ترجمانی کی ہے اور جو خود مئے معرفت کے لذت شناس، عارف باللہ اور سالک راہِ طریقت تھے۔ ان شعراء نے اپنے کلام میں تصوف کے جن اسرار ورموز کا گنجینہ پیش کیا اور جس طرح اس کو گلہائے معرفت سے سجایا ہے، وہ ''از دل خیزد بر دل ریزد'' کا صحیح مصداق ہے۔ ڈاکٹر سید اعجاز حسین لکھتے ہیں:

> ''یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ دورِ قدیم میں جن شعراء کے کلام میں صوفیانہ جذبات ملتے ہیں، وہ خود بھی حقیقی معنوں میں صوفی اور عارف باللہ تھے''۔ (اعجاز حسین: آئینہ معرفت ص ۱۷۸ (لالہ رام نرائن لعل بک سیلرز الہ آباد ۳۲ء)

ایسے گنتی کے شعراء میں ولی، مرزا مظہر جانِ جاناں، میر درد، آتش، نیاز بریلوی، آسی غازی پوری، حسرت موہانی، اصغر گونڈوی اور جگر مرادآبادی کے نام نمایاں ہیں، جن

Marfat.com

ے ذوقِ سخن کی آبیاری یا تو تصوف کے سرچشمہ سے ہوئی یا پھر وہ زندگی کے کسی مرحلہ میں اس نئی لذت سے آشنا ہوئے، خصوصاً خواجہ میر درد نے جس طرح مضامینِ معرفت و سلوک کو شاعری میں سمویا ہے۔ اس کی مثال کم از کم اردو شاعری میں مفقود ہے۔ بلاشبہ ان کا اردو کلام بادۂ عرفان سے لبریز ہے۔ (وحید اختر: خواجہ میر درد، تصوف اور شاعری ص ۳۱) انہوں نے بقول آزاد'' چھوٹی بحر کی غزلوں میں گویا تلوار کی آبداری نشتر میں بھر دی ہے۔ (محمد حسین آزاد: آب حیات ص ۱۸۹ (الہ آباد ایڈیشن) اسی لئے ڈاکٹر اعجاز حسین نے انہیں صوفیانہ شاعری کا سرتاج قرار دیا ہے۔ (اعجاز حسین: آئینہ معرفت ص ۲۳)

اوپر جن معدودے چند صاحبانِ دل اور سالکانِ طریقت اردو شعراء کا ذکر ہوا، علامہ سید سلیمان ندوی کا عہد آخر کا کلام انہیں بھی اسی صف میں جگہ دلاتا ہے، لیکن راقم سطور کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ سید صاحب کا شاعرانہ مرتبہ میر درد، آتش، یا حسرت اور اصغر کے برابر ہے بلکہ عرض صرف یہ کرنا ہے کہ غزل الغزلات کے اشعار تمام تر درون بینی، داخلیت اور حقیقی جذبات واحساسات کا شاہکار ہیں۔ اسی باعث وہ خود کہتے ہیں ......

سمجھیں مرے کلام کو جو ہوش مند ہیں
مستی مری یہ بادۂ انگور کی نہیں

اب ذیل میں اس روحانی سفرنامہ کی کچھ جھلکیاں پیش کی جاتی ہیں۔ تصوف کا دار و مدار عشق پر ہے۔ بغیر اس کے منزل مقصود تک پہنچنا محال ہے۔ بالخصوص چشتیہ عالیہ سلسلہ میں تو اوّل و آخر بس عشق ہی عشق ہے۔ اس لئے سید صاحب کی روح بھی وادی سلوک و معرفت میں آکر سوز و گداز عشق اور وجد و کیف سے معمور ہوگئی ہے اور پھر ان کی روح کے تار کو جو زخمہ بھی لگا وہ زبان کا نالہ یا دل کا نغمہ بن گیا۔ خود ہی کہتے ہیں ......

نغمہ اللہ سے طبع حزیں موزوں ہوئی
جو کبھی گاتی نہ تھی وہ وجد میں گانے لگی

سید صاحب کے عارفانہ اشعار میں بھی عشق مجاز کا رنگ پیدا ہوگیا ہے۔ وہ اپنے

Marfat.com

مرشد اور محبوب حقیقی کو بھی مجازی محبوب تصور کر کے ان سے اظہار محبت کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں ...

جس دن سے مرے دل میں تیری یاد بسی ہے
ہر ایک کو میں تیرے سوا بھول گیا ہوں
ہر سمت نظر آتے ہیں ہر وقت وہ مجھ کو
دوری مسافت کا گلہ بھول گیا ہوں

....

سجدے میں رکھ کے سر ترے پائے خیال پر
تعمیر ایک بہشت ارم کر رہا ہوں میں
کہہ کہہ کے دل فریب، دل آرا و دل نشیں
تردید قصہ ہائے ستم کر رہا ہوں میں

....

معلوم نہیں کس دم فرمائیں مجھے وہ یاد
نام اُن کا نہ ہو اے دل، ایک لمحہ فراموش
حاصل ہے تصور میں کیفیت معراج
کیا کیا نہ مزہ پایا، پایا جو ہم آغوش

....

یاد ان کی دم بدم آتی نہیں
کیا مزاج یار برہم ہوگیا

....

گاہ دیکھا تھا مری چشمِ تصور نے تمہیں
اب وہی تصویر میری ہمدم و دمساز ہے

Marfat.com

دل ہے اے ناداں تجلی گاہ دوست
کیوں نگاہ شوق سوئے بام ہے

مرشد سے کمال محبت، اس کی خانقاہ کے در و دیوار سے عقیدت، شیخ کی محفل اور ''چشم ساقی'' کے اثرات کے بے حد دلکش مرقعے ''غزل الغزلات'' کے ہر ورق پر ورقِ گل کی طرح بکھرے ہوئے ہیں۔ عارفانہ غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ....

ہر چیز میں جس کی ہے کیفیت مستانہ
آباد رہے یا رب تا حشر وہ مے خانہ
زاہد نے کہاں پائی، زاہد نے کہاں پی لی
گفتار ہے رندانہ، رفتار ہے مستانہ
حاصل رہے کیفیت ہر وقت حضوری کی
آ دل میں مرے چھپ جا اے صورت جانانہ

....

ذرہ ذرہ عالم محسوس کا خاموش ہے
یار ہے گرمِ سخن، محفل سراپا گوش ہے
چشمِ ساقی میں بھری کیا بادۂ سر جوش ہے
جس طرف آنکھ اُٹھ گئی وہ مست ہے مدہوش ہے

....

کیا بھری تاثیر میں مطرب تیری آواز ہے
جو تری محفل میں بیٹھا وہ سراپا ساز ہے
نام ان کا ہر نفس میں لب پہ یوں آیا کیا
تن میں جیسے روح بسمل مائل پرواز ہے

....

Marfat.com

حیاتِ نو مجھے اس کی نگاہِ ناز نے بخشی
بھرا ہے آب حیواں کاسۂ زہر ہلاہل میں
جو موسیٰ بھی ہوں تو بھی اتباع خضر لازم ہے
ہدایت منحصر ہے اتباع شیخ کامل میں

دل کے انوار وتجلیات سے معمور ہو جانے کے بعد خارجی دنیا کے تمام مظاہر اور سرمایۂ خرد ہیچ نظر آنے لگے۔ یہاں تک کہ برسوں کی محنت شاقہ کے بعد ہوش و خرد کا جو خرمن جمع کیا تھا، اس کو بھی آگ لگانے کو تیار ہو گئے ...... ؎

میرے ہوش و خرد نے جمع جو خرمن کیا برسوں
لگا دے برق ایمن آگ تو اس میرے حاصل کو

ساقی میخانہ سے نہایت مستی اور سرشاری کے ساتھ مخاطب ہو گئے ...... ؎

تیرے اک چھینٹے سے اے ابر بہاری ان دنوں
سبز ہے، شاداب ہے، سیراب ہے، گلزارِ دل
دور ہوتی جارہی ہے ہر کھٹک جو دل میں تھی
تیری سوزن سے نکلتے جارہے ہیں خارِ دل
عشق کا رہبر دلیل راہ جس دن سے بنا
بن رہا ہے آپ ہی انکار دل، اقرار دل
ہوش ہے، گرمی و مستی ہے، وفورِ شوق ہے
شکر ہے رونق پہ ہے امروز کاروبارِ دل

مہر و محبت سید صاحب کی شخصیت کے فطری جوہر تھے، جس کے گوناگوں جلوے آپ دیکھ چکے ہیں۔ ارادت کے بعد یہ جذبہ معرفت کی بھٹی میں تپ کر اور بھی کندن بن گیا ہے۔ کیوں کہ صوفیانہ شاعری میں عشق و محبت کا تصور ارضی وجسمانی محبت سے آگے بڑھ کر

Marfat.com

ایک پاکیزہ اور ارفع و اعلیٰ عنصر کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ اس تصورِ محبت کے زمزمے سید صاحب کی عہد آخر کی غزلوں میں بکثرت سامعہ نواز ہوتے ہیں۔ ان کی دنیائے محبت میں افلاک کی وسعت تھی اور وہ اس کو کونین کی دولت، ''آبِ حیات'' سمجھتے تھے اور ''اندوہ محبت'' کو ''گنجینۂ عشرت'' خیال کرتے تھے ....

اس فقر میں بھی عاشق کیا صاحبِ دولت ہے
اک ذرہ محبت کا کونین کی دولت ہے
آباد ہے اک عالم ہر گوشۂ خاطر میں
دنیائے محبت میں افلاک کی وسعت ہے
اک گھونٹ میں بھولا ہے میخوار دوعالم کو
کیا تند نشہ تیرا اے جامِ محبت ہے

....

ترے نام ہی میں حلاوت ملے
جو ذوقِ محبت کی دولت ملے
محبت تو اے دل بڑی بات ہے
یہ کیا کم ہے اس کی جو حسرت ملے
یہی زندگی جاودانی بنے
جو آبِ حیات محبت ملے
کشش پر ہے قائم نظام وجود
یہ گھر اک محبت سے معمور ہے
اک غم نے بنایا ہے ہر غم سے مجھے فارغ
اندوہ محبت بھی گنجینہ عشرت ہے

کثرتِ ذکر سے جب رگ و پے میں حق ہی حق سرایت کر جاتا ہے، تو ہر چیز میں

Marfat.com

حق کا ظہور اور ہر آواز میں حق کی پکار محسوس ہونے لگتی ہے اور ہر موئے بدن سازِ حقیقت بن جاتا ہے۔ صوفیہ کی اصطلاح میں اس کو "سلطان الاذکار" کہتے ہیں .... ؎

کس نے پھر دی یہ صدائے دل نواز
ہر رگ جاں ساز الا اللہ ہے
کوئی ہو آواز میرے کان میں
ہر صدا آواز الا اللہ ہے
ہے اسی کی سانس انفاسِ حیات
جو کوئی دم ساز الا اللہ ہے
دل سے ہوتا ہے ترانہ خود بلند
قلب ذکر ساز الا اللہ ہے
وجد میں جاں ہے تو اعضاء رقص میں
جام مئے آواز الا اللہ ہے

۱۹۴۹ء میں سید صاحب آخری بار سفر حج کے لئے مکہ معظمہ پہنچے تو اس ارضِ قدس میں قدم رکھتے ہی ان کے ذوق و شوق کے سمندر میں طغیانی آ گئی اور اس عالم میں ایک نہایت والہانہ غزل کہی، جس کے اوپر اپنے قلم سے "بوقتِ حاضری مکہ معظمہ" تحریر کیا ہے۔ نمونہ کے چند اشعار پیش خدمت ہیں ...... ؎

دیدۂ دل اگر ہو باز راز رہے نہ راز میں
جھانکتی ہیں حقیقتیں آئینہ مجاز میں
ان کے کرم کے ہم نثار، ان کی عطا کا کیا شمار
دے دیا عاصیوں کو بار اپنے حریم ناز میں
دل کو نصیب ہو گداز، جاں کو عطا ہو سوز و ساز
ہے یہ دعا بصد نیاز درگہ بے نیاز میں

Marfat.com

وحدۃ الوجود کے مسئلہ کو درج ذیل قطعہ میں کس کیفیت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔
یہ قطعہ ''اللہ نور السموات والارض '' کی تفسیر اور سید صاحب کے ''سیر الی اللہ '' کا آئینہ دار ہے ....

جہاں دیکھیں وہیں پائیں جہاں دیکھیں وہیں تو ہے
تجھے جو یاد کرتا ہے اسی کا ہم نشیں تو ہے
تری ہی روشنی ہر چار سو پھیلی ہے عالم میں
کہیں مہر فلک تو ہے، کہیں نورِ زمیں تو ہے

وجدانی کوائف اور عارفانہ معارف و حقائق سے معمور چند اشعار ملاحظہ فرمائیں.......

سما جا مرے دل میں ارمان ہو کر
دوئی دور کردے مری جان ہو کر
تصور میں کیا کیا عنایت ہے ان کی
مرے گھر میں آئے ہیں مہمان ہو کر

....

دل حریف نگہ یار کہاں سے لاؤں
جو نہ بے خود ہو وہ میخوار کہاں سے لاؤں
قطرۂ اشک میں ہوں دل کے بھی ٹکڑے شامل
فطرتِ دیدۂ خونبار کہاں سے لاؤں
ذکر حق سے صیقلِ کامل ہوا
محو دل سے نقش ہر باطل ہوا
دیکھ کر سب کو اسی کو چن لیا
جو نگاہ ناز کے قابل ہوا

Marfat.com

مولانا تھانوی کی وفات (جولائی ۴۳ء) کے بعد سید صاحب کا چشمۂ سخن بالکل خشک ہو گیا اور شاعرانہ جذبات سرد ہو کر رہ گئے تھے۔ اس کے بعد کے دس سال کی طویل مدت میں انہوں نے صرف دو نعتیں اور سات آٹھ غزلیں کہیں، لیکن جو جذباتی ہیجان ارادت کے بعد ان میں پیدا ہوا تھا، اس کا جلوہ پھر تادمِ واپسیں نظر نہ آ سکا۔

سید صاحب کا اس دور کا کلام بظاہر سلیس اور آسان معلوم ہوتا ہے، لیکن درحقیقت معنوی اعتبار سے بہت عمیق اور دقیق ہے۔ اسی لئے سید صاحب نے "غزل الغزلات" کے حاشیہ میں بہت سے اشعار کے رموز و کنایات کی تشریح کر دی ہے اور بعض مقامات پر ان کے مذاق آشنا مرتبِ دیوان نے بھی حاشیہ آرائی کی ہے۔

سید صاحب کے عارفانہ کلام کا جو نمونہ اوپر پیش کیا گیا ہے، اس سے اربابِ نظر کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ یہاں معرفت اور مسائل تصوف کا بیان محض "برائے شعر گفتن" نہیں ہے، بلکہ شاعر نے اپنے دل کی دنیا میں ڈوب کر یہ اشعار کہے ہیں۔ ان میں جو سوز و گداز، جذبات کی شدت و فراوانی اور صداقت و واقعیت موجود ہے، وہ ان کے نکتہ چینوں کو بھی اعترافِ حقیقت پر مجبور کر دیتی ہے۔ اگر شاعری جذبات کی بہترین ترجمانی کا نام ہے تو بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ سید صاحب کے عہدِ آخر کا کلام اس کا نہایت اعلیٰ نمونہ ہے۔

(۷)

سید صاحب نے غزل کے علاوہ نعت، قومی نظمیں، مراثی، قطعات اور رباعیات بھی کہی ہیں، جن سے ان کی قدرتِ کلام کا اندازہ ہوتا ہے۔ ۴۹ء میں آخری بار سفر حج کے موقع پر جب وہ مدینہ منورہ حاضر ہوئے تو روضۂ اطہر کے روبرو پہنچتے ہی ان کا چشمۂ حبِ رسول نعت کی شکل میں اُبل پڑا، چونکہ وہ نرے شاعر نہ تھے بلکہ مقامِ نبوت کے مرتبہ شناس اور اوصاف و خصائص نبوت کے عارف و امین بھی تھے۔

Marfat.com

(شاہ معین الدین احمد: ارمغانِ سلیمان (مضمون) معارف جولائی ۱۹۷۱ء)

اپنی زندگی کی بہترین صلاحیتیں سیرتِ نبوی ﷺ کی خدمت اور اس کے احیاء و اشاعت میں صرف کر دیں۔ اس لئے ان کی نعتوں میں شاعری سے زیادہ حقیقت کا بیان ہے۔ مدینہ طیبہ کی حاضری کے وقت بارگاہِ رسالت میں جو نعت پیش کی، اس کے چند اشعار یہ ہیں .... ؎

آہستہ قدم ، نیچی نگہ ، پست صدا ہو
خوابیدہ یہاں روحِ رسول عربیؐ ہے
اے زائر بیت نبوی یاد رہے یہ
بے قاعدہ یاں جنبش لب بے ادبی ہے
کیا شان ہے اللہ رے محبوب نبی کی
محبوبِ خدا ہے وہ جو محبوب نبی ہے

اور پھر جب حج سے فارغ ہو کر وطن واپس آرہے تھے، تو خسرو جہاز پر ایک دوسری نعت کہی، جس کے چند اشعار یہ ہیں .... ؎

عشق نبویؐ درد معاصر کی دوا ہے
ظلمت کدہ دہر میں وہ شمع ہدیٰ ہے
آمد تری اے ابرِ کرم رونقِ عالم
تیرے ہی لئے گلشن ہستی یہ بنا ہے
فرمان دو عالم تری توقیع سے نافذ
تیری ہی شفاعت پہ رحیمی کی بنا ہے
بل جائے گا رہرو کو وہ منزل سے بہت دور
جو جادہ سفر کا ترے جادہ کے سوا ہے

Marfat.com

ایک زمانہ تک صنف مرثیہ واقعات کربلا کے ساتھ مخصوص و محدود رہی ۔ مولانا حالؔی نے اپنے شہرۂ آفاق مقدمہ شعروشاعری کے ذریعہ جہاں اردو شاعری کے بہت سے دوسرے نقائص پر ضرب کاری لگائی وہیں اس بات پر بھی زور دیا کہ مرثیہ کو شہدائے کربلا کے ذکر تک محدود نہ رکھا جائے ، بلکہ اس میں مشاہیرِ قوم اورارباب کمال کی موت پر بھی ان کے اوصافِ حمیدہ کا ذکر کیا جائے ۔(حالؔی: مقدمہ شعروشاعری ص ۵)

چنانچہ حالؔی نے مرثیہ غالب لکھ کر شخصی مراثی کے سرمایہ میں ایک نہایت گراں قدر اضافہ کیا۔ سید صاحبؒ نے بھی اپنے استاذ علامہ شبلی کی وفات پر نہایت دلدوز اور اثر انگیز مرثیہ کہا۔ یہ مرثیہ ترکیب بند میں ہے اور سات بندوں اور باسٹھ اشعار پر مشتمل ہے۔ سید صاحب کو اپنے استاذ سے جو غیر معمولی قلبی محبت اور عقیدت تھی ، وہ اس کے لفظ لفظ سے تراوش کرتی ہے۔ اس میں ان کے سینہ کا گداز ،قلب کا سوز ،محبت واخلاص اور درد و اثر کوٹ کوٹ کر بھر گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ پورا مرثیہ غم کا تاج محل ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں .... ے

اے متاعِ عزت پیشیں کے پچھلے کارواں
آہ وہ بھی مٹ گیا باقی جو تھا تیرا نشاں
جس کے لب کی جو صدا تھی نوحۂ اسلاف تھی
جس کی ہر فریاد تھی صوت درائے کارواں
جس کی اک اک بات تھی روحِ بلالی کی اذاں
جس کی رگ رگ میں تھیں سوز درد کی چنگاریاں
جس کے خامہ کی روانی میں نہاں رودِ فرات
جس کے ہر صفحہ کا دامن رشک دریائے عماں

....

Marfat.com

کیا فریب صبر کھائے غم نصیب دلفگار
جس کی دولت لٹ گئی کب اس کو دل پر اختیار
جس کے دم سے تھی تسلی جب وہی جاتا رہا
پھر دل اندوہ گیں کو کس طرح آئے قرار
یاد آئے جب وہ اس کا فقرہ نا مختتم
''آہ سیرت آہ سیرت'' چھوڑ کر سب کاروبار
پھر رُکے کس طرح پر شوری قلب مضطرب
کس طرح رُک جائے خوں نابی چشم اشکبار

....

کون اب بتلائے مجھ کو طرز اعجاز بیاں
کون پھونکے اب مرے بے جان سے فقروں میں جاں
اب پر پرداز معنی کون بخشے گا مجھے
پست مضموں کون پہنچائے گا اب تا آسماں
کون دیکھے گا مرا اب زور بازوئے قلم
کون دیکھے گا میری جولانی طبع رواں
کس کے نامہ کا بناؤں اب میں عنوانِ خطاب
سیدی ، مولائی ، استاذی ، غزالی الزماں

جب یہ مرثیہ معارف نومبر ۱۶ء میں شائع ہوا تو عزیز لکھنوی، مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی، مولانا حمید الدین فراہی اور اکبر الہ آبادی نے اس کو پڑھ کر مرثیہ نگار کی سخنوری، اور نوحہ سنجی کی داد دی۔ اکبر نے اپنے ایک مکتوب میں سید صاحب کو لکھا :

''نظم پہنچی، نہ صرف آپ کی قابلیت کی شاہد ہے، بلکہ آپ کا دلی جوش ظاہر ہوتا ہے اور دل پر اثر پڑتا ہے ......

Marfat.com

ع مرکز امید تھا جو جب وہی جاتا رہا ...... الخ

ع اب پر پرداز معنی کون بخشے گا مجھے ...... الخ

ع کون کھولے گا مرا اب عقدۂ اشکالِ فن ...... الخ

ع کون دیکھے گا مرا اب زور بازوئے قلم ...... الخ

کیا لاجواب شعر ہیں۔ معنی اور الفاظ دونوں لحاظ سے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو سکونِ خاطر عطا فرمائے۔

اسی طرح جب ۱۹۰۷ء میں سید صاحب کی پہلی بیوی نے داغِ مفارقت دیا تو دل کے پر درد نالے اشعار میں ڈھل گئے۔ اپریل ۱۹۰۷ء کے معارف میں ''مرگِ یار'' کے عنوان سے ۱۴ اشعار کا یہ دردناک مرثیہ شائع ہوا، جس کے چند اشعار یہ ہیں ......

درد اٹھ اٹھ کے مرے دل میں ٹھہر جاتا ہے
کیوں رگِ دل کی جگہ سینہ میں نشتر نہ ہوا

یہ تماشائے جہاں خواب پریشاں ہی سہی
پر یہ کیوں خواب مرے واسطے شب بھر نہ ہوا

کس سے کیجئے دلِ شیدا گلۂ تنہائی
مسند آرا میرے پہلو میں جو دلبر نہ ہوا

حیف اس خون کی قیمت جو مژہ سے ٹپکے
قطرۂ اشک ہوا گوہر احمر نہ ہوا

ڈاکٹر اقبال نے اپنے ایک مکتوب مورخہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۱۶ء میں سید صاحب کو لکھا تھا کہ ''مولانا شبلی مرحوم و مغفور نے تاریخی واقعات کو نظم کرنا شروع کیا تھا اور جو چند نظمیں انہوں نے لکھی تھیں نہایت مقبول ہوئیں۔ غزل کے ساتھ وہ سلسلہ بھی جاری رکھئے۔ سید صاحبؒ نے اس نصیحت و مشورہ پر عمل کرتے ہوئے شبلی کے رنگ میں متعدد تاریخی نظمیں لکھیں۔ چنانچہ ''درسِ مساوات'' کے عنوان سے ایک تاریخی نظم میں خلیفہ ہارون الرشید کا

Marfat.com

درج ذیل واقعہ نظم کیا ہے :

''ہارون الرشید ایک بار مدینہ گئے۔ شاہزادہ امین و مامون بھی اس کے ہمراہ تھے۔ وہاں اس وقت حضرت مالک بن انس کا حلقۂ درس حدثنا واخبرنا کے زمزموں سے گونج رہا تھا۔ خلیفہ کی خواہش ہوئی کہ یہاں آکر اس کے لختِ جگر حدیث کے اس چشمۂ حیواں سے تشنہ کام نہ جائیں۔ چنانچہ اس نے امام مالکؒ کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ میرے لڑکے مجمع عام میں جا نہیں سکتے، اس لئے آج ''ایوان شہی'' میں درسِ حدیث دیں ......

آرزو تھی یہ خلیفہ کو مدینہ جا کر
جائیں محروم نہ اس در سے میرے لختِ جگر
حکم پہنچا یہ خلافت سے کہ اے ابن انس
مجمع عام میں جا سکتے نہیں میرے پسر
اس لئے آج یہ بہتر ہے کہ تعلیم حدیث
آپ دیں خاص انہیں ایوانِ شہی میں آکر

امامِ مالکؒ نے ارشاد فرمایا ....

سن کے فرمانِ خلافت کا یہ ارشاد ہوا
اے خلیفہ تری تعمیل ضروری ہے مگر
ہے یہ علمِ نبوی تیرے ہی گھر کی دولت
خواہ حرمت اسے دے خواہ اہانت اسے کر

ہارون نے امام صاحب کا یہ جواب سن کر ان کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ اچھا ٹھیک ہے آپ تشریف نہ لائیں، لیکن جب شاہزادے سماعتِ حدیث کے لئے حاضر ہوں تو اس وقت کوئی دوسرا شریک درس نہ ہو ......

Marfat.com

سن کے ہارون نے دربار امامت کا جواب
بھیجا پیغام کہ خیر آپ نہ آئیں گے اگر
خود یہ شہزادے وہاں درس میں حاضر ہوں گے
مگر اوروں کا نہ ہو بزم میں اس وقت گذر

امام مالکؒ نے اس تجویز کو اسلامی شانِ مساوات کے خلاف قرار دے کر کمالِ استغنا سے رد کر دیا اور پوری جرأت سے خلیفہ کو کہلا بھیجا .... ۔

مالکؒ ابن انس نے اسے کہلا بھیجا
مرے کاشانہ میں ممکن نہیں تمیزِ بشر
درسگہ خاص نہیں درسگہ عام ہے یہ
ہو مساوات بشر معنی اسلام ہے یہ

اسی طرح جو ۱۹۱۶ء میں سید صاحب نے ایک نظم "سر الحیات" کے عنوان سے لکھی، جس میں قوم کی زبان سے مسلمانوں کی غفلت اور ان کے انحطاط کا ذکر کر کے ان کی نشأۃ ثانیہ کی اصل روح بیان کی ہے اور "چشمۂ حیات" اور "قوت بشر" کی نشاندہی کی ہے۔

اک شور ہے کہ قوم میں اب زندگی نہیں
شیرازۂ جماعت قومی ہے منتشر
قوت نہ بازوؤں میں، نہ سر میں بلند فکر
کچھ اضطراب قلب نہ کچھ کاوش جگر
اے چارہ گر تغافل دیریں سے ہوشیار
معلوم ہے نہ رمز حیات امم مگر
مانا کہ آبلوں سے ہیں تلوے بھرے ہوئے
چرکے لگے ہوئے ہیں بہت جسم از و بر

Marfat.com

یہ سب صحیح ، پر ہے ضروری بقائے روح
لازم ہے فکر زخم جگر سب سے پیشتر
وہ جذب مذہبی ہے وہ ملت کو جوش ہے
جو چشمۂ حیات ہے اور قوتِ بشر
پیدا ہو جب وہ آگ کے شعلہ کی شکل میں
ہو جائے جب وہ برق کی صورت میں جلوہ گر
ان ست بازوؤں میں پہاڑوں کا زور ہے
ان مضمحل قویٰ میں ہو طوفان کا اثر

رولٹ بل کے خلاف جس زمانے میں پورے ہندوستان میں بے چینی اور اضطراب برپا تھا۔ سید صاحب نے ''انڈمنٹی بل اور رولٹ بل کے عنوان سے ایک طویل نظم کہی تھی، جو اکتوبر ۱۹ء کے صبح امید لکھنؤ میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد جلیانوالہ باغ کا حادثہ خونیں پیش آیا۔ سید صاحب مولانا محمد علی کے ساتھ خلافت کا وفد لے کر انگلستان گئے۔ وہاں سے واپسی میں جہاز کے عرشہ بحر عرب کا منظر دیکھ کر ان کے جذبات میں تلاطم پیدا ہو گیا اور پندرہ سولہ اشعار کی ایک دلکش نظم معرض وجود میں آ گئی۔ چند اشعار حسب ذیل ہیں .... ؎

بحر العرب ! مبارک تیری روانیاں ہیں
سطروں میں تیری لکھی اگلی کہانیاں ہیں
ہر سمت تو ہی تو ہے ، تیری ہی گفتگو ہے
ہاں قطرہ قطرہ تیرا ، ساز انا وہو ہے
کیا تیرے جزو کل میں وحدت کا اک سماں ہے
تو یا محیط ہستی ، یا سایۂ خدا ہے

Marfat.com

جولائی ۳۳ء میں سید صاحب راندیر اور سورت کے ایک علمی سفر پر تشریف لے گئے اور جب وہاں سے بھروچ جا رہے تھے، تو راستہ میں دریائے نربدا کو دیکھ کر بے حد متاثر ہوئے اور اُن کو اپنے کاروان رفتہ کی یاد آئی اور اسی عنوان سے ایک نظم کہہ ڈالی، جس کے شروع میں کہتے ہیں .... ہ

نربدا، اے نربدا ، اے جادۂ بحر عرب
گرچہ تو ہندی ہے لیکن زادۂ بحر عرب
ہاں گذشتہ کارواں کا تو نشانِ راہ ہے
ہند میں اسلام کی تاریخ سے آگاہ ہے
جانتا ہے تو مری تاریخ کا پوشیدہ راز
تیرے دروازے پہ ٹھہرا تھا مرا پہلا جہاز
ہند میں اسلام کے انجام کا آغاز تو
چار صدیوں تک رہا اسلام کا دمساز تو
اے بھروچ ، اے خاتم انگشت رود نربدا
عہد ماضی کی تری عزت رہے قائم سدا

رباعیات وقطعیات میں بھی سید صاحب کی فکرِسخن نے اپنی جولانی دکھائی ہے۔ چنانچہ ۱۷مئی ۱۹۰۷ء کو علامہ شبلی کا مشہور حادثۂ پا پیش آیا تو اس پر مولانا حالی، نواب علی حسن خان، خواجہ عزیز الدین، اقبال سہیل، اور مولانا عبدالسلام ندوی نے متعدد رباعیاں کہیں، جن میں اس واقعہ کی عجیب عجیب لطیف توجیہات کی گئی تھیں۔ علامہ مرحوم نے یہ تمام رباعیاں سید صاحب کو دے دیں، جنہوں نے ان کو ستمبر و اکتوبر ۱۹۰۷ء کے الندوہ میں شائع کر دیا۔ اسی سلسلہ میں خود سید صاحب نے بھی اپنے محسن و مربی کے اس عظیم المیہ پر دلی تاثرات شعر سانچے میں ڈھالے تھے۔ خود رقمطراز ہیں :

Marfat.com

''خاکسار شاعر نہیں، اس پر بھی کچھ کہا تھا جس کو اد بأ یا مولانا کی تنقید کے ڈر سے پیش نہیں کیا۔ اسی مہینہ موازنہ انیس ودبیر شائع ہوئی تھی، اسی کو پیش نظر رکھ کر کہا تھا ...... ۔

تنقید مراثی کے صلہ میں استاد
دربارِ حسینی میں سعادت بخشی
پر سر سے ابھی کام تھا لینا باقی
اس واسطے پاؤں کو شہادت بخشی

(سید سلیمان ندوی: حیات شبلی ص ۴۷)

مولانا عبدالماجد دریابادی کے نکاح کے موقع پر سید صاحب نے جو قطعات موزوں کئے تھے، ان میں سے دو قطعات ملاحظہ فرمائیں ...... ۔

لایا ہے پیام یہ خوشی کا قاصد
نوشاہ بنیں گے آج عبدالماجد
اللہ کرے وہ دن بھی جلد آجائے
بن جائیں گے وہ جب کسی کے والد ماجد

....

دنیا پہ کرے جو غور کوئی تھوڑا
پائے گا ہر ایک شے کو جوڑا جوڑا
دعویٰ تھا مرے دوست کو یکتائی کا
اللہ نے اب غرور ان کا توڑا

سید صاحب نے اردو کے علاوہ فارسی اور عربی میں بھی شاعری کی ہے۔ باب اول میں ذکر آچکا ہے کہ ۱۹۰۳ء میں جب نواب محسن الملک دارالعلوم ندوہ کی تعلیم کا معائنہ

Marfat.com

کرنے تشریف لائے تو سید صاحب نے جو اس وقت طالب علم تھے، نواب صاحب موصوف کی شان میں ایک قصیدہ کہہ کر سنایا جسے سن کر نواب صاحب بہت محظوظ ہوئے۔

(شاہ معین الدین ندوی: حیات سلیمان ص ۱۹)

اسی طرح ۱۹۰۵ء میں جب علامہ شبلی حیدر آباد کی ملازمت سے قطع تعلق کر کے ندوہ میں مستقل قیام کے لئے تشریف لائے تو سید صاحب نے اُن کے خیر مقدم میں ایک طویل قصیدہ فارسی میں کہا جس کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ....

بیانش ابر باراں است می بخشد چو می بارد
بیوم شور سربزی و سبزہ را فراوانی
مسیحا دم باعجاز قلم جاں زگر بخشد
بحکم قم باذن العلم آں تن راکہ شد فانی
بخواہم از خداوندے کہ ناش حی و قیوم است
بماند زندہ جاوید ایں شبلی نعمانی
نوشتم چوں مدیح حضرت الاستاذ برخواندم
ندا آمد مرا از پردۂ ناموس ربانی
دلیل فضل ممدوحت زمدح تو ہویدا شد
بہ پیش مورسر تہ نہی کہ ہمنام سلیمانی

۱۹۴۹ء میں سید صاحب نے فارسی میں ایک الہامی غزل کہی تھی۔ اس کے نیچے گوشہ میں ''بوقتِ خاص'' مرقوم ہے۔ اس اشارہ کی رمز کشائی کرتے ہوئے وہ خود فرماتے ہیں کہ ''انیسویں شب رمضان کو نماز تہجد پڑھ کر ذکر کرنے بیٹھا ہی تھا کہ دفعتاً یہ پوری غزل قلب پر وارد ہوئی۔ فارسی میں میری صرف یہی ایک غزل ہے۔ اس مرصع غزل کو دیکھ کر ایک سخن سنج نے کہا تھا کہ ''اس پر تو عراقی کے کلام کا گمان ہوتا ہے''۔

Marfat.com

(غلام محمد: تذکرہ سلیمان ص ۳۵۳)

چند اشعار بطورِ نمونہ پیش ہیں ....

شیوۂ صید زبونم آرزو ست
سینہ آغشتہ بخونم آرزو ست
گوش می جوید پیام از وصل دوست
ارجعی و راجعو نم آرزو ست
خوش نمی آید سجود بے حضور
فی صلوٰۃ خاشعو نم آرزو ست
از حصار ایں و آں بیروں کشد
آں نگاہ پر فسونم آرزو ست
خبر من ہست آنچہ تو فرمودہ
آنچہ فرمودی ہمونم آرزو ست

(۸)

سید سلیمان ندوی کے اعلیٰ ذوق سخن اور اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں میں قدرت کلام کے تمام تر اعتراف کے باوجود یہ کہنا پڑتا ہے کہ انہوں نے علم وادب، اور تحقیق وتصنیف کے میدان میں جو روشن اور لافانی کارنامے انجام دیئے ہیں، ان کے مقابلہ میں ان کی شاعری کم مایہ اور فروتر ہے۔ سید صاحب اگر صرف شاعری کی طرف توجہ کرتے تو وہ اپنے عہد کے آتش وحسرت نہ سہی، امیر مینائی اور جلال ضرور ثابت ہوتے، لیکن بصورتِ موجودہ سیرت النبی، ارض القرآن، خیام، عرب وہند کے تعلقات، اور حیاتِ شبلی کی رنگا رنگی نقش آرائیوں کے سامنے ''ارمغانِ سلیمان'' کی چاندنی بے کیف اور گہن آلود محسوس ہوتی ہے۔

Marfat.com

یہ حقیقت ہے کہ سید صاحب جس درجہ کے مصنف و محقق اور ادیب تھے، اس مرتبہ کے شاعر نہ تھے اور نہ وہ خود اس درجہ کے شاعر بننا ہی چاہتے تھے، وہ صرف اس حد تک شاعر تھے کہ جب کبھی ان کا جی چاہتا یا ان کے واردات قلبی اُمنڈ پڑتے یا کسی واقعہ اور خبر سے متأثر ہو جاتے تو اپنی دلی کیفیات کو شاعری کے سانچے میں ڈھال دیتے تھے اور بس۔ غالباً یہی سبب ہے کہ نہ تو خود سید صاحب نے زندگی بھر کبھی اپنی شاعری کو اہمیت دی اور نہ دوسرے سوانح نگاروں اور نقادوں نے ہی اس کو لائقِ اعتنا خیال کیا۔

کشکولِ معرفت (جلد اول، دوم)

تالیف : مولانا عبدالقیوم حقانی

شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے خلیفۂ اجل، معروف سکالر اور عظیم روحانی پیشوا حضرت مولانا قاضی محمد زاہد الحسینی نوراللہ مرقدہٗ (اٹک) کے گرانقدر اور وقیع مکاتیب کا مجموعہ، جو پانچ، چھ سال تک مولانا عبدالقیوم حقانی کے نام لکھے جاتے رہے اور جن میں شریعت و طریقت، علم و عمل، دین و دنیا کی فلاح، مشکلات میں نجات کی راہ، مختلف اوقات کے مسنون وظائف، علم کے تقاضے، عمل کی برکات، دسیوں مفید کتابوں کا تعارف اور زندگی کے مختلف میدانوں میں کامیابی کے راستوں کی نشاندہی کی گئی ہے، جنہیں مولانا عبدالقیوم حقانی نے موزوں عنوانات، حسین ترتیب اور مفید تحشیہ کے ساتھ مرتب کر لیا ہے۔

صفحات : 500 ....

القاسم اکیڈمی جامعہ ابو ہریرہ

برانچ پوسٹ آفس خالق آباد، ضلع نوشہرہ، سرحد، پاکستان

Marfat.com

جناب ڈاکٹر غلام محمد صاحب

غزل الغزلات

یہ حضرت والا کا عارفہ کلام ہے۔ اس حسنِ ذوق کی داد دیجئے کہ کس قدر موزوں نام اپنے اس مجموعۂ کلام کا تجویز فرمایا ہے کہ لفظی و معنوی دونوں مناسبتیں جمع ہوگئیں۔ ''غزل الغزلات'' دراصل حضرت سلیمان علیہ السلام کے لاہوتی نغمات کا عنوان تھا (یہ روایت بھی حضرت والا ہی کی زبانی ملی ہے) اشتراکِ اسمی سے حضرت والا نے یہاں بھی فائدہ اٹھالیا۔

یہ مجموعۂ کلام وہ آئینہ ہے، جس میں حضرتِ والاؒ کی روحانی سیر کے منازل اور مقامات دکھائی دیتے ہیں۔ خود فرماتے تھے کہ ''یہ تو میرا سفرنامہ ہے''...... اس سفرنامہ کی ہر غزل پر تاریخ درج ہے، جس سے سالکِ طریق کے تدریجی ارتقاء اور اس کے مشاہدات کا حال معلوم ہوتا ہے۔

اس مجموعۂ نغمات میں کل اڑتالیس غزلیں تین قطعے اور ایک فرد ہے، ان میں سے ایک غزل ایک قطعہ اور ایک شعر فارسی زبان میں ہے اور باقی سارا کلام زبانِ اردو کے حصہ میں آیا ہے۔

غزل الغزلات' حضرت والاؒ کی نشأۃ ثانیہ یا روحانی انقلاب کی یادگار ہے۔ چنانچہ شیخ الشیوخ حضرت مولانا تھانویؒ کی حلقہ بگوشی سے اس کا آغاز ہوتا ہے۔ پہلی غزل جس پر ۵/اپریل ۱۹۴۲ء کی تاریخ درج ہے، اس کا اول و آخر شعر اس تاریخیت پر گواہ ہے، فرماتے ہیں ....

Marfat.com

پا کر تجھے اپنے کو میں کیا بھول گیا ہوں
ہر سود و زیانِ دوسرا بھول گیا ہوں
الٹا ہے ورق آج سے افسانۂ نو کا
افسانۂ پارینہ دلا بھول گیا ہوں

ان نغمات روحانی کا جائزہ لینے سے پہلے ایک اصولی بات ذہن نشین ہو جائے، تو اچھا ہے، اکثر دیکھا گیا ہے کہ عارفانہ کلام پر نقد و تبصرہ کرتے ہوئے ادب کے طالب علم سے ایک بے ادبی ہو جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ عرفانیت کو پرکھنے کے لئے وہ وہی معیارِ نظر لے بیٹھتا ہے، جس سے غیر عارفانہ کلام کو جانچ رہا تھا، حالانکہ ہیرے جواہر بننے کی ترازو میں نہیں تُلا کرتے، زرِ خالص کی خوبی عام پتھر پر کس کے معلوم نہیں کی جا سکتی، ہر شئے کی کسوٹی الگ اور ہر جنس کا پیمانہ جدا ہوتا ہے، بھلا عرفی و قاآنی کی شاعری اور حافظ و رومی کی نغمہ سرائی میں اشتراکِ رسمی کے سوا کوئی حقیقی نقطۂ اتحاد بھی ہے؟ ان کا سارا دار و مدار تو تخیل کے زور محاکات کی ندرت اور مبالغہ کی شدت پر ہے اور یہاں ان ظاہر داریوں کی طرف التفات جرمِ عظیم، عارف رومیؒ فرماتے ہیں ......ے

قافیہ اندیشم و دلدار من گویم مندیش جز دیدار من

محبوبِ ازلی کی نامکرر تجلیات (کل یوم ھو فی شان) پر نظر جمائے رکھنا، ان میں محو ہو کر حالتِ بیخودی میں گنگنانے لگنا یہ عاشق ربانی کی مختصر روداد ہے، اس کو فنِ شاعری کے بکھیڑوں سے کیا واسطہ؟

اسی عارفین کی اس مجبوری کو سامنے رکھ کر معیارِ نظر کو بدلنا ہوگا۔ اب وہ خورد بین لگانی پڑے گی، جو لفظوں سے گذر کر ان کے پس پردہ حقیقتوں کو دیکھ سکے۔ اپنے اندر وہ ذوق پیدا کرنا ہوگا، جو کلام کی معارف نوازی، اس کی مستی و سرشاری اور اس پُر تاثیری اور انقلاب آفرینی کو پا سکے اور پرکھ سکے۔ بقول حضرت والا کے ....ے

Marfat.com

سمجھیں مرے کلام کو جو ہوشمند ہیں مستی مری یہ بادۂ انگور کی نہیں

خیر یہ تو ایک ضروری فقرۂ معترضہ تھا۔ بات یہ ہو رہی تھی کہ حضرتِ والا کا زیرِ نظر کلام دفیض روحانی کا ایک کرشمہ ہے، ذہنی تخلیق سے اس کا کوئی تعلق نہیں، خود فرماتے ہیں۔

فیض ہے یہ کس ولیِ وقت کا
اب مرا جو شعر ہے الہام ہے

ایک اور جگہ تصریح فرمائی ہے ....

جو شعر بھی سپردِ قلم کر رہا ہوں میں
سب وارداتِ عشق رقم کر رہا ہوں میں
دیوانگانِ عشق کو دے کر صدائے عام
آراستہ یہ مجلسِ جم کر رہا ہوں میں

اس لئے اس کلام کو ''دیوانہ گانِ عشقِ الٰہی'' کے ذوق اور معیارِ نظر سے دیکھیئے، کیا عجب کہ آپ کی روح بھی سرشار ہو جائے اور کچھ دیر کے لئے مادی کثافتوں سے نکل کر سرمدی لذتوں کا کیف آپ بھی محسوس کر جائیں۔

سفرنامہ کی حیثیت سے کلام کا جائزہ :

آیئے پہلے اس نقطۂ نظر سے اس کلام کا جائزہ لیں، جس کی طرف خود صاحبِ کلام نے اشارہ کیا ہے کہ ''یہ تو میرا سفرنامہ ہے'' ...... سیرِ افغانستان یا سفرِ یورپ کا نہیں، بلکہ سیر الی اللہ اور سیر فی اللہ کا!

راہِ طریقت کے واقف کاروں کا کہنا ہے کہ اس راہ میں پہلا مرحلہ 'حبِ شیخ' کا آتا ہے۔ یہ طے ہو جائے تو ''حبِ رسول'' کی منزل آتی ہے، پھر اس سے گذر کر ''حبِّ الٰہی '' کے مقام کو پاتا ہے، یہاں اسکو پہلے صفات کی نیرنگیاں نظر آتی ہیں اور وہ ان میں محو ہو جاتا ہے، اس کو سیر الی اللہ سے تعبیر کرتے ہیں، پھر حب سالک کا مشاہدہ اور قوی ہوتا ہے

Marfat.com

تو اس کا منتہائے نظر صرف ذات الٰہی رہ جاتی ہے، اور اب وہ اس مشاہدہ میں مستغرق ہو جاتا ہے۔ اسی کو سیر فی اللہ کا نام دیا گیا ہے، جو نامحدود ہے، ہمارے حضرت والاؒ نے راستے کے یہ منازل جس برق رفتاری سے آناً فاناً طے فرمائے کہ اچھے اچھے سالک بھی ان کی قوتِ پرواز پر دنگ تھے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے سفر نامہ روحانی میں خطِ فاضل لگا لگا کر منازل کو الگ الگ کر کے کم دکھانا کم از کم اس طفلِ طریقت کے لئے تو ناممکن ہے، البتہ ملے جلے جو احوال اس میں نظر آتے ہیں، ان میں سے ایک ایک حال کو ایک ایک مقام سے متعلق کر کے دکھانا زیادہ دشوار نہیں اور اسی کی سعی یہاں کی جارہی ہے۔

ہم کو حضرت والا کی ارادتِ شیخ اور کمالِ محبت میں کوئی فصل نہیں ملتا، ہاتھ میں ہاتھ دیا، تو دل و جان بھی نذر کر دی ہے، اب محبوب کی گفتار و رفتار، طرزِ نشست و برخاست، بلکہ اس کے بیٹھنے کی جگہ تک محبوب بن گئی، چنانچہ شیخ کی ایک اور خانقاہ کے در و دیوار تک کی جاذبیت کلام میں نمایاں نظر آتی ہے۔ دیکھئے خانقاہ میں مریدوں کے اجتماع اور اُن کے حسنِ ادب، شیخ کے افادات اور ان کی پُر تاثیری کا نقشہ کس حسنِ ادا اور جوش و محبت سے کھینچا ہے ......

ذرّہ ذرّہ عالمِ محسوس کا خاموش ہے
یا رہے گرمِ سخن محفل سراپا گوش ہے
چشمِ ساقی میں بھری کیا بادۂ پُر جوش ہے
جس طرف آنکھ اُٹھ گئی، وہ مست ہے، مدہوش ہے
حبذا پیرِ مغاں دَریا دل و دَریا نوال
جمع ہیں میخوار میخانے میں نوشا نوش ہے
تیرے میخواروں کے ساقی کچھ عجب انداز ہیں
دل سراپا جوش ہے لیکن زباں خاموش ہے

Marfat.com

اب تو مے نوشی ہے عین شروع برفتوائے شیخ
اب وہی ہوگا فقیہ شہر جو مے نوش ہے

ایک اور بحر میں اسی طوفانِ عشق و محبت کا منظر دیکھئے ....

ہر چیز میں جس کی ہے کیفیتِ مستانہ
آباد رہے یارب تا حشر وہ میخانہ
چھائی ہے یہاں مستی ہر ایک نمازی پر
حیرت ہے یہ گھر اے دل مسجد ہے کہ میخانہ

اس سراپا جذب واثر ماحول میں پہنچ کر خود حضرت والاؒ کو جو سرور ونشاط حاصل ہوگیا، اس کی تصدیق بھی ملاحظہ ہو ....

سازگار اب گردشِ ایام ہے دور میں ہشتاد سالہ جام ہے

یہاں "ہشتاد سالہ جام" سے مراد اسی سالہ پیرا عارف ہے ...... آگے اپنے انجذاب کا ذکر ہے ....

تھی جو آزادی تو ہر سو دوڑ تھی
قید میں آرام ہی آرام ہے
اب درِ پیر مغاں چھوٹے نہیں
اس کی مٹی میں بھی کیف جام ہے

اب شیخ کے لطفِ نگاہ اور حلاوتِ کلام کی کچھ تفصیل بھی زبانِ عشق سے سنئے:

حضرت تھانویؒ وفورِ حیا سے آنکھ میں آنکھ ملا کر دیکھ نہ سکتے تھے، بس ذرا پلک اُٹھا کر دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں، کبھی کسی سمت ترچھی نظر دوڑائی اور فوراً سمیٹ لی۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ اس "دزدیدہ نگاہی" کے لطف سے کسی کو محروم نہ فرماتے تھے اور اس اچٹتی نگاہ میں تاثیر اس بلا کی تھی، کہ جس پر پڑی اس کو بیتاب کردیا۔ اس کیفیت کو حضرت والاؒ کی زبانِ

Marfat.com

محبت سے سنئے اور محسوس کیجئے ....

بزم میں دیکھا کئے اس ناز سے
جس طرف دیکھا نشانہ دل ہوا
اس کی دزدیدہ نگاہی کے نثار
آج ہی آغاز کا انجام ہے

دوسرے شعر کا دوسرا مصرعہ کس غضب کا ہے۔

شیخ کی نگاہ یہی نہیں کہ تڑپا جاتی تھی بلکہ جس پر پڑتی، اس کو حیاتِ عشق بخش دیتی تھی، حضرت والا اپنا تجربہ سنا رہے ہیں ....

حیاتِ نو مجھے ان کی نگاہِ ناز نے بخشی
بھرا ہے آب حیوان کاسۂ زہر ہلاہل میں
دل اس پیری میں بھی غرقِ ہوسنا کی ورندی ہے
پھنسی ہے کشتی عمر رواں گردابِ ساحل میں

ایک اور اسلوب میں اسی کیفیت کو یوں ادا فرمایا ہے:

تری نظر ہے تاثیر مستیِ صہبا
تری نگاہ جسے چاہے بادہ خوار کرے
تری نگاہ میں دونوں خواص رکھے ہیں
وہ چاہے مست کرے چاہے ہوشیار کرے

یہاں مستی وہشیاری سے مراد سکر وصحو ہے۔

حضرت مولانا تھانویؒ کو اللہ تعالیٰ نے علم ومعرفت کے ساتھ حسنِ صورت اور حسنِ بیان بھی ایسا عطا فرمایا تھا کہ اس کی نظیر نایاب نہ ہو تو نادر ضرور تھی، ہوا میں جوارتعاش ان کی پراثر آواز سے پیدا ہوتا تھا، اس کی ایک ایک لہر سامعہ نواز اور وجد آفریں تھی۔ حضرت والاؒ

Marfat.com

کی توصیف فرمارہے ہیں ....

کیا بھری تاثیر میں مطرب تری آواز ہے
جو تری محفل میں بیٹھا وہ سراپا ساز ہے
باغ میں صحرا نظر آتا ہے اور صحرا میں باغ
اب مرے جوشِ جنوں کا اور ہی انداز ہے

حضرت تھانوی کے بیان کا ایک وصف عالی یہ بھی تھا کہ اس سے ذہنی الجھنیں مٹتیں، وساوس کافور ہوجاتے اور ایمان وایقان بڑھ جاتا تھا، اس کا اعتراف حضرت والاؒ کی زبانی سنئے ....

ایسے کچھ انداز سے تقریر کی
پھر نہ پیدا شبہٗ باطل ہوا
آج ہی پایا مزاہ ایمان کا
جیسے قرآن آج ہی نازل ہوا
کھول کر کیا جانئے کیا دے دیا
حلق سے اترا کہ شیدا دل ہوا

جادو بیانی کا تذکرہ ختم کرکے اب شیخ تھانویؒ کی سحر نگاری پر آیئے ...... مرشد تھانویؒ کے ہاں حضرات نقشبندیہ کا طریقِ توجہ تو نہ تھا، مگر خط وکتابت کے تعلق سے اس کمی کو پورا فرماتے تھے، اور اسی لئے اس کی پابندی پر پورا ازور دیا جاتا تھا، ان کی اس مجتہدانہ تدبیر سے سالکین کو عجیب وغریب فائدے حاصل رہے۔ ہمارے حضرت والاؒ بھی اس ''مکتوم توجہ' سے فیض یاب رہے۔ اس لئے تصدیق فرمارہے ہیں ....

نسخۂ اکسیر ودار وئے شفا تیرے ہاتھوں کا لکھا مکتوب ہے

ایک مرتبہ ایسے ہی اکسیر صفت مکتوب کو پڑھ کر مکتوب الیہ کی روح فرطِ نشاط سے

Marfat.com

جھوم گئی اور یوں مترنم ہوئی .... ؎

قوتِ جاں قوتِ دل سرمۂ بینشِ تحریر
روح افزا و دل آویز و دلآرا مکتوب
روشنائی نظر آئے گی سوادِ خط میں
دیدۂ کور بھی دیکھے جو تمہارا مکتوب
سر بسر شوق و ہمہ درد ہماری تحریر
سر بسرمایۂ تسکیں ہے تمہارا مکتوب

شیخ سے کمالِ محبت سے سالک کی نگاہِ معرفت وا ہوئی، عمر گذشتہ پر افسوس ہونے لگا کہ ہائے اتنی عمر اس میخانہ سے دوری میں کیوں بسر ہوگئی۔ اب تھوڑی سی مدت میں طویل غفلت کی تلافی کیسے ہو؟ شیخ عالی مقام سے بار بار التجا کرتے ہیں کہ اپنی ہمتِ عالی سے مجھ کو آگے بڑھائیے۔ تنہا میری جد و جہد سے تو کام نہیں بنے گا .... ؎

جام پر جام مجھے دے کے بناوے سرمست
صبر سرجوشیٔ اذکار کہاں سے لاؤں
دیر سے آیا ہوں ساقی دور سے آیا ہوں میں
ہو عطائے خاص مجھ کو جو عطائے عام ہے

راقم نے ڈاکٹر صاحب مدظلہٗ سے سنا کہ ایک روز خانقاہ اشرفیہ کے دروازے پر کھڑے حضرت والاؒ یوں فرما رہے تھے کہ جو کچھ پڑھا لکھا تھا، سب ان بڑے میاں کے (یعنی حضرت شیخ کے) قدموں پر ڈالا۔ اسی کیفیت کو حضرت کا یہ شعر بے نقاب کر رہا ہے۔ ؎

میرے ہوش و خرد نے جمع جو خرمن کیا برسوں
لگا دے برقِ ایمن آگ تو اس میرے حاصل کو

اور یہ جو برسوں کے جمع کردہ خرمنِ ہوش کو پھونکنے بیٹھ گئے، تو کچھ تو دل کی دولت

Marfat.com

مل گئی تھی۔ سارا سرمایۂ خرد ہیچ نظر آ رہا تھا...... ذرا مستی و سرشاری تو دیکھئے، ساقی میخانہ سے مخاطب ہیں ....

تیرے اِک چھینٹے سے اے ابرِ بہاری ان دنوں
سبز ہے' شاداب ہے' سیراب ہے گلزار دل
عشق کا رہبر دلیلِ راہ جس دن سے بنا
بن رہا ہے آپ ہی انکارِ دل اقرارِ دل
جوش ہے گرمی و مستی ہے وفور شوق ہے
شکر ہے رونق پہ ہے امروز کاروبارِ دل

یہ ۱۳/ اپریل ۱۹۴۲ء کی غزل ہے۔ اس کے دوسرے ہی دن یعنی ۱۴/ اپریل ۴۲ء کو بھوپال سے لکھنؤ جاتے ہوئے ٹرین پر ایک اور غزل ہوئی، جو سلطان الاذکار کی کیفیت کا آئینہ ہے۔ فرماتے ہیں ....

کس نے بھر دی یہ صدائے دل نواز
ہر رگِ جاں سازِ الا اللہ ہے
کوئی ہو آواز میرے کان میں
ہر صدا آوازِ الا اللہ ہے
کار فرما ایک آتا ہے نظر
منکشف اب رازِ الا اللہ ہے
اس تجلّی گاہ کا ہر نازنیں
کشتۂ اندازِ الا اللہ ہے
ہے اُسی کی سانس انفاسِ حیات
جو کوئی دمسازِ الا اللہ ہے

Marfat.com

دل سے ہوتا ہے ترانہ خود بلند
قلب ذاکر ساز الا اللہ ہے
وجد میں جاں ہے تو اعضاء رقص میں
جامِ مئے آواز الا اللہ ہے

یہ جوش وانبساط تو اُس وقت تک ہے، جب تک کہ سالک کی نظر انوار و تجلیات پر ہے، مگر جہاں اس کا رُخ خود اپنی ذات اور اپنی بے بضاعتی کی طرف ہوا اور وہ تڑپنے لگا، بلبلانے لگا، یہ تغیرِ احوال بھی نعمتِ عظمٰی ہے کیونکہ بقولِ عارفِ رومیؒ .... ؎

گریۂ ابر است و سوزِ آفتاب
اُستنِ دنیا ہمیں دو رشتہ تاب
گر نہ بودے سوزِ مہر و اشکِ ابر
کے شدے اجسامِ مازفت و سطیر

چنانچہ یہی معاملہ یہاں بھی پیش آیا۔ جتنے اونچے ہوئے گئے، بلندیاں پست نظر آنے لگیں، اپنا ہر عمل خام اور طاعت ناکام نظر آنے لگی۔ نگاہ جس اُفق تک پہنچ رہی تھی، وہ اپنی قوتِ پرواز سے بہت دور نظر آ رہا تھا، اسی کرب و اضطراب میں دل سے آہیں، جو اُٹھیں تو زبان پر آ کر نالہ بن گئیں۔ شکستہ دلی کا شاہکار ملاحظہ ہو۔ (حضرت والا کی غزلوں میں، میں سمجھتا تھا کہ اُن کی غزل .... ؎

سما جا میرے دل میں ارمان ہو کر
دوئی دور کر دے میری جان ہو کر

قلبِ والا کی سب سے بہترین ترجمان ہے، لیکن جب زیرِ نظر موضوع پر اپنی استطاعت کے موافق لکھ رہا تھا، تو عالمِ رویا میں حضرت والا کی زیارت سے مشرف ہوا، مسرور تھے اور دستِ مبارک میں "غزل الغزلات" کا مجموعہ تھا، فرمایا ہماری سب سے اچھی غزل یہ ہے

Marfat.com

...... ع دل حریفِ نگہِ یار کہاں سے لاؤں؟ آنکھ کھلنے پر خیال آیا کہ واقعی شکستگی اور عبدیت ہی تو حضرتِ والاؒ کا وصفِ خاص تھا)

دل حریفِ نگہِ یار کہاں سے لاؤں
جو نہ بیخود ہو وہ مئے خوار کہاں سے لاؤں ؟
نور ہی نور جدھر دیکھو نظر آتا ہے
تابِ نظارۂ انوار کہاں سے لاؤں ؟
اُف رے دریائے معاصی کی تلاطم خیزی
وہ سفینہ جو کرے پار کہاں سے لاؤں ؟
فیضِ ساقی ہے باندازۂ ظرفِ میخوار
دل حریفِ مئے بسیار کہاں سے لاؤں ؟
ٹوٹ ہی جاتی ہے ہر موسمِ گل میں توبہ
جو نہ ٹوٹے میرے غفار کہاں سے لاؤں ؟
قطرۂ اشک میں ہوں دل کے بھی ٹکڑے شامل
فطرتِ دیدۂ خونبار کہاں سے لاؤں ؟
توبہ توبہ میری توبہ بھی ہے کوئی توبہ
ٹوٹ جائے جو نہ ہربار کہاں سے لاؤں ؟
مدرسہ چھوڑ خرابات میں آکر بیٹھا
دوسرا سایۂ دیوار کہاں سے لاؤں ؟
جام پر جام مجھے دے کے بناوے بدمست
صبر سر جوشیٔ اذکار کہاں سے لاؤں ؟

(۱۲؍اپریل ۱۹۴۲ء)

Marfat.com

جناب سید حسین صاحب

عارفانہ کلام اور تصوف میں مقام

حضرت قبلہ سید صاحب کے ذکو کو اُنہی کے شیخ کے اس مصرعہ سے شروع کرتا ہوں...... ع از سلیماں گیر اخلاص عمل

یہ ایک شعر کا مصرعۂ اولیٰ ہے اور مصرع ثانی محفوظ نہیں۔ اس کو خود حضرت قبلہ کی زبانِ مبارک سے سُنا تھا۔

غالباً ماہ اکتوبر ۱۹۴۲ء کی آخری تاریخوں میں سے کوئی تاریخ اور شوال ۱۳۶۱ھ کا آخری عشرہ تھا۔ میں اس زمانہ میں لمبیا سے رخصت پر دارالمصنفین اعظم گڑھ گیا ہوا تھا۔ حضرت قبلہ کے قیام کا کمرہ تھا۔ عصر و مغرب کے درمیان کا وقت تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ حضرت قبلہ کو تھانہ بھون سے گہرا ربط اور حضرت مولانا تھانویؒ سے خط و کتابت کا اصلاحی سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ حضرت قبلہ اس وقت کن مقامات سے گذر چکے تھے اور کن حالات سے عبور کر رہے تھے۔ اس کا جاننے والا بجز رب العزت کے اور کوئی نہیں۔ شیخ کامل و اجل و طالب صادق و بے بدل دونوں اس دار فانی سے دار البقا میں پہنچ چکے ہیں، انہوں نے اصول طریق کے مطابق اس چیز کو راز میں رکھا، مگر عادۃ اللہ ہے کہ جن حالات سے مخلوق کو آشنا کرنا چاہتے ہیں، اس کے لئے غیب سے سامان مہیا کر دیتے ہیں، ورنہ بزرگان پیشین کے حالات ہم تک نہ پہنچتے۔

چنانچہ اس دن حضرت قبلہ کے خط کا جواب حضرت تھانویؒ کے درست مبارک کا لکھا ہوا موصول ہوا، چونکہ حضرت قبلہ کے علم میں تھا کہ اس ناچیز کو بھی حضرت حکیم الامت

Marfat.com

سے عقیدت ہے۔ اس لئے فرمایا کہ حضرت مولانا کا والا نامہ آیا ہے اور خود حضرت کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس زمانہ میں حضرت مولاناؒ بوجہ ضعف خطوط کے جواب عموماً خود نہیں تحریر فرمایا کرتے تھے، بلکہ دوسروں سے لکھوا دیتے تھے، لیکن حضرت قبلہ سے اس درجہ خصوصیت تھی کہ خود ہی جواب تحریر فرمایا تھا۔ یہ سن کر میں متوجہ ہوگیا کہ اگر کوئی خاص بات ہوگی تو خود ہی بتلائیں گے۔ میری توجہ کو دیکھ کر فرمایا۔ حضرت مولانا کبھی کبھی اشعار میں جواب فرماتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ چار پانچ شعر حضرت مولانا تھانویؒ کے تحریر کردہ اس مکتوب پر تھے، مگر مجھے زیادہ قریب سے دیکھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ میرا اشتیاق دیکھ کر اس کا ایک شعر پڑھ کر سنایا، جس کا مصرعہ اولیٰ اوپر تحریر کیا گیا، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ نے اس کی تصدیق فرمادی کہ حضرت قبلہ اخلاص عمل کی منزل کو طے کر چکے تھے اس پر رسوخ ہو چکا تھا، اور دوسروں کے لئے ان کا اخلاص عمل نمونہ بن چکا تھا۔ حضرت تھانویؒ کو جن لوگوں نے دیکھا ہے اور اُن کے معیار و مسلک سے آگاہ ہیں۔ وہ اس کو سمجھ سکتے ہیں کہ حضرت کا یہ فرمانا کہ فلاں شخص سے اخلاصِ عمل کا سبق لو معمولی بات نہ تھی۔ یہ خط اب بھی یقیناً اُن کے کاغذات میں ہوگا۔

میرا قیام اعظم گڑھ ہی میں تھا کہ حضرت قبلہؒ نے الٰہ آباد کا سفر کیا اور اثنائے راہ میں یہ غزل وارد ہوئی، جو کسی حد تک اُن کے اس وقت کے جذبات کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

براہِ الٰہ آباد ۲۴ راکتوبر ۱۹۴۲ء ....

ابھی تو مشق فغاں کنج میں ہزار کرے
اثر کے واسطے کچھ اور انتظار کرے

جو آج لذتِ درد نہاں کا جویا ہے
وہ پہلے سوز سے دل کو تو داغدار کرے

Marfat.com

اُنہی کے دینے سے ملتا ہے جس کو ملتا ہے
وہی نہ چاہیں تو کوشش کوئی ہزار کرے
ادب سے دیکھ لیں عشاق درد سے ان کو
محال ہے جو انہیں کوئی ہمکنار کرے
سنا تو دے اُسے افسانۂ غم ہجراں
وہ اعتبار کرے یا نہ اعتبار کرے
وہ اپنے کان سے سنتے ہیں میرے نالوں کو
وہ طرزِ نالہ ہو جو ان کو بے قرار کرے
پلا دے ساغر سرشار مجھ کو وہ ساقی
خزان کو ایک اشارہ میں جو بہار کرے
تری نظر میں ہے تاثیر مستی صہبا
تری نگاہ جسے چاہے بادہ خوار کرے
تری نگاہ میں دونوں خواص رکھے ہیں
وہ چاہے مست کرے چاہے ہوشیار کرے

(۱) بمعنی گوشہ خمل وخمول یا خلوت شب (۲) مراد خود طالب اپنی ذات ہے (۳) مراد الحاح وزاری (۴) رضائے حق)

اس غزل سے ثابت ہوتا ہے کہ باوجود شیخ کے اس ارشاد......

ع ازسلیمان گیر اخلاص عمل

وہ اپنی حالت پر مطمئن نہیں ہیں اور آثار جذب وعشق سے پوری غزل اس کیفیت سے لبریز ہے۔ دوسرے ہی دن حضرت سید صاحب قبلہ نے الہ آباد سے لکھنؤ کا سفر فرمایا اور اس سفر میں غزل ارقام فرمائی، جو لکھنؤ کے تعزیتی جلسہ منعقدہ ۲۶، ۲۷ر دسمبر ۵۳ء کو مولانا حمید

Marfat.com

صاحب مرحوم نے پڑھ کر سنائی تھی، جس سے حاضرینِ جلسہ پر وہ حالت طاری ہوئی، جو دیکھنے والے ہی جانتے ہیں، اور اس کا بیان کرنا کم از کم میرے لئے مشکل ہے۔ وہ غزل یہ ہے .... براہ لکھنؤ ۳ راکتوبر ۱۹۴۲ء

صدق احساس کی دولت مرے مولا دے دے
غمِ امروز بھلا دے غمِ فردا دے دے
دھن کچھ ایسی ہو فراموش ہو اپنی ہستی
دلِ دیوانہ و سودائی و شیدا دے دے
اپنے میخانہ سے اور دستِ کرم سے اپنے
دونوں ہاتھوں میں مرے ساغر و مینا دے دے
کھول دے میرے لئے علم حقیقت کے در
دل داتا دل بینا دلِ شنوا دے دے
قول میں رنگِ عمل بھر کے بنادے رنگیں
لبِ خاموش بنا کر دلِ گویا دے دے
دلِ بیتاب ملے دیدۂ پر آب ملے
تپِ آتش مجھے دے دے نمِ دریا دے دے
دردِ دل سینہ میں رو رو کے ٹھہر جاتا ہے
جو نہ ٹھہرے مجھے وہ درد خدایا دے دے

یہ غزل اپنی کیفیات کے اعتبار سے سید صاحب قبلہ کی بہترین غزلوں میں اور ان کی کیفیات کے عروج و کمال کی آئینہ دار ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گذشتہ اشعار میں جو عرض درگاہ قاضی الحاجات میں کی گئی تھی، وہ مقبول ہوگئی۔ اس کو پڑھ کر بے ساختہ حضرت خواجہ حافظ رحمۃ اللہ علیہ کی یہ غزل یاد آتی ہے۔ اس کا بھی شان ورود کچھ اسی قسم کا ہے۔

Marfat.com

دوش وقتِ سحر از غصہٗ نجا تم دادند
دندراں ظلمتِ شب آبِ حیاتم دادند
بے خود از شعشہٗ پرتوِ ذا تم کر دند
بادہ از جامِ تجلی بہ صفا تم دادند
من اگر کامروا گشتم و خوش دل چہ عجب
مستحق بودم و ایں ہا بزکاتم دادند
کیمیائیست عجب بندگی پیر مغان
خاکِ او گشتم و چندیں درجاتم دادند

ایک مرتبہ لکھنؤ سے قبلہ کا سفر تھانہ بھون کا ہوا۔ اور شیخ کی بارگاہ میں تشنگی کو سیرابی عطا ہوئی۔ اس کی مرقع ایک غزل اور ایک نعت ہے۔ نعت یہ ہے ......

تھانہ بھون ۲۰ رشوال ۱۳۶۱ھ ...... مطابق ۴ رنومبر ۱۹۴۲ء

نام محمد صل علی نور محمد صلِّ علٰے
خد مودو صلِّ علٰی قد و صلِّ علٰی
رحمتِ عالم صلِّ علی فخر آدم صلِّ علٰی
مرسل اکرم صل علی ، اسمک احمد صل علٰی
چہرۂ انور شمس ضحیٰ زلف معنبر لیل سجی
قلب مطہر عین ہدی ذکر محمد صل علی
شاہد عالم شاہِ امم ہادی اعظم شمع حرم
صاحب لطف و جود و کرم حق سے موید صل علٰی

راقم کا گمان غالب ہے کہ اس قیام تھانہ بھون میں قبلہ علیہ الرحمۃ فانی فی الرسول ہوگئے اور سیرت نگارِ نبوی ﷺ کے فنافی الشیخ ہونے کے بعد فنافی الرسول ہونے میں کیا

Marfat.com

دیر لگ سکتی ہے، جس شخص نے حضور انور ﷺ کی مقدس زندگی کے ہر ہر پہلو پر سالہا سال کے غور وفکر کے بعد قلم اٹھایا، اور اس کو مدلل ومبسوط طریقہ سے ضبط کر کے دنیا کے سامنے پیش کیا ہو، کیا یہ ممکن ہے کہ اس نے اپنے حالات واخلاق کو اسی سانچہ میں ڈھالنے کی سعی نہ کی ہوگی، جن لوگوں کو حضرت علیہ الرحمۃ اور ان کی نشست وبرخاست، ان کے رہن سہن، ان کے خندہ وتبسم اور ان کے خورد ونوش، ان کی رفتار وگفتار، اُن کے حالات وکردار، اُن کے معاملات، ان کے صبر وتحمل، اُن کی جود وعطا وغیرہ کو دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ وہ اس کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ اُن کے جملہ حالات میں اسوۂ رسولؐ کی کتنی جھلک تھی۔ اس کے علاوہ حضرت نجیب الطرفین سید تھے اور ان کے اسلاف میں سلسلہ بسلسلہ دولتِ ولایت ودیعت ہوتی چلی آئی تھی، خود اُن کے ذاتی حالات اظہر من الشمس ہیں۔ اُن کو قریب سے دیکھنے والوں کا جن میں ہر طبقہ، ہر جماعت اور ہر خیال کے لوگ شامل ہیں۔ اس پر اتفاق ہے کہ سیرت نگار نبویؐ کے ظاہری وباطنی، اخلاق واعمال پر خلق نبوی کا کتنا گہرا اثر تھا۔ خود حضرت مولانا تھانویؒ نے پہلی ہی ملاقات میں اپنے خاص متعلقین سے فرمایا تھا کہ :

''بھائی ان کے اندر کس بات کی کمی ہے، ان کی مثال تو بارود کی سی ہے، محض دیا سلائی لگانے کی دیر ہے''۔

تھانہ بھون میں دس بارہ روز کے قیام کے بعد جب لکھنؤ واپسی ہوئی تو مجھے بھی اُن کے پروگرام کی اطلاع ہوئی۔ رخصت پر تو تھا ہی اپنے نجی کام سے لکھنؤ گیا اور بعد فجر ندوۃ العلماء کے مہمان خانہ پر پہنچا۔ وہاں قبلہ کو موجود پایا۔ آپ کے حالات وکیفیات کو یہ ناچیز کیا سمجھ سکتا، لیکن اتنا اندازہ ضرور ہوا کہ حضرت بے حد مسرور وشاداں ہیں۔ دار العلوم کے اساتذہ، طلبہ اور دیگر حضرات مہمان خانہ میں حضرت کے گرد جمع تھے اور آپ اپنے مخصوص انداز میں گفتگو فرما رہے تھے۔ چائے آئی، میں بھی شریک ہوا، چائے کے بعد مخصوص حضرات وہاں رہ گئے تھے، جن میں زیادہ دار العلوم ہی کے اساتذہ اور طالب علم تھے۔ اس

Marfat.com

مجلس میں قبلہ نے اپنی غزل مورخہ ۲ رنومبر جو اوپر درج ہو چکی ہے، لوگوں کو سنائی۔ یہ مجلس تقریباً دس گیارہ بجے ختم ہوئی۔ کھانا کھایا گیا، قدرے قیلولہ کے بعد نمازِ ظہر مسجد دار العلوم میں جماعت کے ساتھ ہوئی۔ اس کے بعد پھر مہمان خانہ میں مجلس ہوئی۔ اس مجلس میں بھی کچھ غزلیں سنائیں، حاضرین میں سے چند حضرات کو میں نے علیحدہ کہتے ہوئے سنا کہ سید صاحب قبلہ میں غیر معمولی تغیر ہے، یہ باتیں ان میں نہ کبھی دیکھی تھیں اور نہ کبھی سنی تھیں۔ اس سے اُن کی مراد یہ تھی کہ ان کو کبھی اس طرح شعر پڑھتے نہیں سنا تھا، اس لئے متعجب تھے ۔ دو یا تین دن دار العلوم میں قیام رہا، اس درمیان میں برابر اس قسم کی مجلس ہوتی رہی، پھر لکھنؤ سے قبلہ کے ساتھ میں بھی ہم سفر ہوا، ریل میں یہ غزل ارقام فرمائی۔

براہِ شاہ گنج ۱۶ رنومبر ۴۲ء

ہر بات میں جس کی ہے کیفیتِ مستانہ
آباد رہے یارب تا حشر وہ میخانہ
چھائی ہے یہاں مستی ہر ایک نمازی پر
حیرت ہے یہ گھر اے دل مسجد ہے کہ میخانہ
زاہد نے کہاں پائی زاہد نے کہاں پی لی
گفتار ہے رندانہ رفتار ہے مستانہ
دستارِ فضیلت ہو یا دلق مرقع ہو
ہوتا ہے اسے اک دن نذرِ مے و میخانہ
ہر قطرہ ندامت کا جو دیدۂ تر میں ہے
ہر دامن خالی کا وہ گوہر شاہانہ
وہ چشم محبت تو جویائے محبت ہے
دیکھے تو ذرا کر کے اس سے کوئی یارانہ

Marfat.com

معشوق یگانہ ہے عاشق بھی یگانہ ہو
یعنی کے جو اُن کا ہو وہ سب سے ہو بیگانہ
حاصل رہے کیفیت ہر وقت حضوری کی
آ دل میں مرے چھپ جا اے صورتِ جانانہ

جو شعر لکھتے تھے، اس کو کمترین کو سناتے تھے، کچھ اشعار ظہر کی نماز سے پہلے لکھے، کچھ اس کے بعد اور عصر سے پہلے غزل مکمل ہوگئی اور شاہ گنج ہوتے ہوئے ہم لوگ ۸ بجے شب کو اعظم گڑھ پہنچے۔ آخری شعر کے علاوہ پوری غزل میں یا تو شیخ کے فیوض و برکات کا ذکر ہے یا خود اپنی ذاتی کیفیت و حالت کا بیان ہے۔ آخری شعر خاص طور پر کئی حیثیتوں سے قابل غور ہے۔ اس میں فنافی اللہ کی دلالت پائی جاتی ہے۔

حضور دوام کی تمنا کے ساتھ محبوبِ حقیقی سے دل میں سما جانے کی التجا عروج کا انتہائی مقام ہے، جس کے بعد سیر فی اللہ شروع ہوتی ہے، جس کی انتہا نہیں۔ اسی مقام کو کسی عارف نے اس شعر میں ظاہر کیا ہے ....

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جان شدی
تاکس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

اس کے بعد ۲۸ر نومبر ۴۲ء کو اعظم گڑھ ہی میں یہ غزل ہوئی۔

کیا بھری تاثیر میں مطرب تری آواز ہے
جو تری محفل میں بیٹھا وہ سراپا ساز ہے
باغ میں صحرا نظر آتا ہے اور صحرا میں باغ
اب مرے جوشِ جنون کا اور ہی انداز ہے
پاؤں تو حد ادب سے عشق میں باہر نہ رکھ
وہ ہمہ خوبی و محبوبی سراپا ناز ہے

Marfat.com

نام اُن کا ہر نفس میں لب پہ یوں آیا کیا
تن سے جیسے روح بسمل مائلِ پرواز ہے
دیکھیے ملتی ہے کب دولت سکونِ عشق کی
ہائے ہوئے جوش تو سرمایۂ آغاز ہے
گاہ دیکھا تھا مری چشم تصور نے تمہیں
اب وہی تصویر میری ہمدم دمساز ہے
جو نہیں معلوم ہے اس کو کوئی جانے گا کیا
جب کہ جو معلوم ہے وہ بھی سراسر راز ہے

اس غزل کا بھی قریب قریب وہی انداز ہے، جو اس سے پہلے کی غزل کا ہے۔

اب سید علیہ الرحمۃ فانی فی اللہ ہو چکے تھے۔ اُن کا کلام اسی نہج پر قائم ہو گیا۔

دسمبر ۴۲ء کی پہلی یا دوسری تاریخ کو حضرت تھانویؒ کا والا نامہ آیا۔ عصر کی نماز کے بعد حسبِ معمول کمرہ میں چائے آئی۔ سب اعزہ جمع ہوئے چائے پی کر سب لوگ چلے گئے، مگر میں وہیں بیٹھا رہا۔ قدرے سکوت کے بعد ارشاد فرمایا کہ حضرت مولانا کا والا نامہ آیا ہے۔ تحریر فرمایا کہ من جانب الٰہی وارد ہوا ہے کہ آپ کو طریق قادریہ نقشبندیہ سہروردیہ و چشتیہ میں اجازتِ بیعت کی دوں۔ چنانچہ اس واردِ غیبی کے تحت آپ کو اس کا اہل پاتے ہوئے اجازت بیعت دیتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ برکت وصبر عطا کریں اور آپ کے فیوض کو عرصۂ دراز تک جاری رکھیں۔ آپ اس کی اطلاع اپنے ملنے والوں اور دوستوں کو بھی کر دیں تا کہ لوگوں کو علم ہو جائے اور ان کو افادہ ہو۔

یہ خبر سنانے کے بعد اپنے مخصوص انداز میں فرمایا کہ بھائی میں تو بالکل خام ہوں، لیکن حضرت کے ارشاد کی تعمیل میں تم کو اس کی خبر کرتا ہوں، تم اپنے عزیز بھی ہو، اور حضرت سے تم کو عقیدت بھی ہے، میں سن کر باغ باغ ہو گیا۔ اس کے بعد بھی میرا قیام تقریباً ۳ ہفتہ

Marfat.com

اعظم گڑھ میں رہا اور برابر قبلہؒ کی صحبت میسر رہی اور بہت قرب سے اُن کے حالات مشاہدہ میں آئے، جن کا پوری طرح تحریر میں لانا میرے لئے مشکل ہے اور اس کی اس مختصر مضمون میں گنجائش بھی نہیں ہے۔ اس لئے صرف نمونہ مشتے از خروارے پیش کرتا ہوں کہ اُن سے محبت کرنے والوں کے اشتیاق کو کچھ سیری ہو سکے۔

سب سے بڑی بات جو میں نے دیکھی وہ یہ تھی کہ اس کے بعد بڑی تیزی سے ماسوا سے قلب کا رہا سہا علاقہ بھی منقطع فرمالیا۔ پہلے دارالمصنفین کے کاموں سے خالی اوقات کا کافی حصہ اہل وعیال کے ساتھ دینی مذاکروں میں صرف فرماتے، یا چھوٹے بچوں سے بذلہ سنجی میں، اب ان اوقات کا بڑا حصہ خلوت میں گذرتا، خواہ مسجد میں ہو یا اپنے مسکونہ کمرے میں۔ پہلے عصر کے بعد چائے رفقائے دارالمصنفین کے ساتھ نوش فرماتے اور مغرب تک اُن سے مختلف مسائل پر گفتگو فرماتے، یہ مجلس بھی تقریباً ختم ہوگئی، کبھی اعزہ اہلیہ محترمہ سے اشتیاق ظاہر کرتے کہ قبلہ سے کچھ باتیں سنوا دیجئے۔ عرصہ ہوا اُن کی صحبت جی بھر کر نہیں میسر آئی، تو وہ جا کر گوشۂ خلوت سے لے آتیں اور کچھ دیر کے لئے آپ تشریف لے آتے۔ اہل وعیال واحباء کی درخواست بہت کم مسترد فرماتے تھے۔ اس لئے اُن کی دلجوئی واستمالت کے لئے برآمدہ یا آنگن میں تشریف رکھتے، مگر دل کہیں اور ہی ہوتا، سب کی خیر وعافیت دریافت فرماتے، اور جلد ہی اُٹھ کر جانا چاہتے، اگر کوئی اصرار کرتا، تو تھوڑی دیر کے لئے رُک بھی جاتے، لیکن سب کو یہ محسوس ہوتا ......

چسکا لگا ہے جام کا شغل ہے صبح و شام کا
اب میں تمہارے کام کا ہم نفسو نہیں رہا

یہ صورت دیکھ کر لوگوں نے اصرار کرنا ترک کر دیا، اور حضرت قبلہ کا اہل وعیال سے ملنا جلنا بھی دس پانچ منٹ کا رہ گیا۔ باہر کے سفر بھی ترک فرما دیئے۔ ایم اے وغیرہ کے امتحانات کی ممتحنی وغیرہ سب چھوڑ دی۔ دارالمصنفین کے کام کے اوقات کے علاوہ خلوت کو

Marfat.com

زیادہ عزیز رکھنے لگے۔

خورد و نوش اور لباس وغیرہ میں بڑی تبدیلی ہوگئی۔ پہلے کے لباس فاخرہ سب بکسوں ہی میں بند رہ گئے۔ نادر شاہ کی عطا کردہ خلعت کو کیڑوں نے چاٹ لیا۔ اکثر اہلیہ محترمہ یاد کر کے ہر دوسرے دن کپڑے نکال دیتیں اور اگر کاموں کی مشغولیت سے انہیں خیال نہ رہتا، تو خلافِ معمول تین تین دن تک ایک ہی کپڑا پہنے رہتے، بعض لوگ جن کو مزاج عالی میں درخور تھا کبھی عرض کرتے کہ حضرت تصوف کے یہ معنی تو نہیں کہ انسان کو کپڑا بدلنے کی بھی خبر نہ رہے، مسکرا کر فرماتے کہ اب بوڑھا ہوگیا ہوں، یاد نہیں رہتا، آپ یاد دلا دیا کریں۔

چوہدری اکبر حسین صاحب جج نے جن کو حضرت سے عقیدت تھی، تحریر فرمایا کہ حضرت آپ تو خود علوم و معارف کا سمندر ہیں، آپ کو مولانا تھانویؒ کے پاس جانے کی کیا ضرورت پیش آئی۔ دریا سمندر میں گرتا ہے نہ کہ سمندر دریا میں اور بھی بعض لوگوں کے اسی قسم کے خطوط آئے۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگے کہ دیکھئے ان حضرات کو کہ ایک طرف مجھ سے دعویٰ عقیدت بھی فرما رہے ہیں، اور دوسری طرف اپنی تجویز بھی پیش کر رہے ہیں اور میرے فیصلہ پر تنقید بھی ہے۔ عقیدت کے تو یہ معنی ہیں کہ اُن کو یہ سمجھنا چاہئے کہ وہ میرے متعلق جو کچھ کہتے ہیں، اگر وہ سب صحیح ہو تب بھی اُن کو غور کرنا چاہئے کہ میں نے جو کچھ کیا ہے، وہ سوچ سمجھ کر اور درست جان کر کیا ہوگا۔ یہ تو ایک اصولی بات ہے کہ اگر ایک فن میں مجھے مہارت نہیں اور کوئی اس فن کا مجھ سے زیادہ واقف کار ہے، تو اس سے اس بات کے دریافت کرنے میں کونسی بات خلافِ عقل ہے۔ یہ کیا ضروری ہے کہ ایک انسان میں سارے علوم موجود ہوں۔ تمام کمالات تو اللہ پاک ہی کے لئے ہیں اور یہ تو نص سے بھی ثابت ہے کہ (فَضَلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ) اس لئے ان کا یہ اعتراض میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا، مگر یہ بیچارے معذور ہیں۔ اُن کی نیت بُری نہیں ہے، کبھی کسی پر تعریض نہیں فرماتے۔ بات کو منقح

Marfat.com

کرنے کے بعد فیصلہ سامع پر چھوڑ دیتے، خود قطعی حکم نہ لگاتے، عجیب محتاط اور صاحبِ خلق و مروّت انسان تھے۔ اکثر فرماتے کہ بھائی کیا میرے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ میں اپنے کپڑے بھی خود سی لیا کروں، یہ تو فن کی بات ہے۔ حضرت مولانا تھانویؒ کو اللہ پاک نے فن تصوف میں اس دور میں بڑی مہارت عطا فرمائی ہے، اس لئے ان کی مہارت سے اگر فائدہ اٹھایا جائے تو اس میں کونسی عیب کی بات ہے۔

انہی ایام میں اکثر دیکھا کہ حضرت قبلہ فرش زمین پر بیٹھے ہیں کہ لوگ آ گئے۔ آپ وہیں بیٹھے بیٹھے گفتگو فرمانے لگے، کبھی بعد نمازِ مغرب دارالمصنفین کی مسجد کی شمالی چاردیواری پر ایک کونہ میں ذکرِ حق میں مشغول ہوتے، کبھی مکانِ مسکونہ کے باہر برآمدہ میں تخت پر بغیر کسی فرش کے، کبھی مکان کے کسی اور گوشہ میں متوجہ الی الحق پائے جاتے، کھانے کا وقت آتا یا کسی اور ضرورت سے لوگ تلاش کرتے ہوئے پہنچتے تو اس حالت میں دیکھ کر عرض کرتے کہ اس طرح کیوں تشریف رکھتے ہیں۔ فرمادیئے ہوتے تو فرش بچھا دیا جاتا، یا قالین کی جانماز بچھا دی جاتی۔ سردی کا موسم ہے، ٹھنڈک نہ لگ جائے، فرماتے کہ ان ظاہری باتوں میں کیا رکھا ہے، خود قبلہ کا شعر اس موقع پر یاد آیا۔

جون پور ۲۷/اکتوبر ۱۹۴۳ء

ہم ایسے رہے یٰں کہ ویسے رہے
وہاں دیکھنا ہے کہ کیسے رہے
خیالِ دو روزہ کا کیا عیش و غم
سفر کا بھی کیا جیسے تیسے رہے

یہ اس شخص کا حال ہے، جو اس دور میں نفاستِ مزاج میں مرزا جانِ جاناں شہید کی مثال اور ظاہری و باطنی حسن اخلاق کا مجسمہ تھا، جس کا رہن سہن اور لباس شاہانہ رہ چکا تھا، جس کی سیرت نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرونِ ہند بھی مقبول ہو چکی تھی۔ وہ دارالعلوم ندوۃ

Marfat.com

العلماء کا درخشندہ ستارا جس کی علمی شہرت ساری دنیائے اسلام میں تھی، وہ صاحبِ علم جس کے قلم کا لوہا یورپ کے مستشرقین تک مانتے تھے، جس کے زورِ قلم نے الہلال کو بدرِ کامل بنا کر چمکایا، جس کی معارف نوازی نے علم وفن کے دریا بہا دیئے، جس نے استاد مرحوم کی وصیت کو اس درجہ نباہا کہ اعظم گڑھ جیسے ویرانے کے ایک گوشہ میں ساری عمر گذار دی۔ اس چھوٹے سے مقام کو علم وفن کا مرکز بنا دیا اور دارالمصنفین کی علمی شہرت ساری دنیا میں پھیلا دی، جس کی زیارت کے لئے دور دور کے اہلِ کمال آتے تھے۔

وہ جامع العلوم جس کو نادر شاہ نے کابل یونیورسٹی کا نصاب بنانے کے لئے منتخب کیا، اُس نے اپنی عربی دانی کا سکہ عربوں پر بٹھا دیا، جس نے پیرس اور روم ولندن وغیرہ کے علمی حلقوں سے خراجِ تحسین حاصل کیا۔ وہ مؤرخ اعظم جو اپنے دور میں مدتوں معیار تاریخ سمجھا گیا، وہ قدیم وجدید کا سنگم جس کی ذات میں دونوں کی حدیں ملتی تھیں، وہ پرتو صفاتِ نبویؐ، وہ نمونۂ اخلاق اسلامی، وہ جامع الکمالات انسانی۔ وہ جسے دنیا کی ہر قسم کی جاہ و شہرت بے طلب حاصل تھی، دفعۃً جب مقامِ فنا سے گذرتا ہے، تو اپنے آپ کو ایسا مٹاتا ہے کہ موتوا قبل ان تموتوا کا مصداق بن جاتا ہے۔ حضرت قبلہ کی ایک غزل ان حالات کی بہترین ترجمان ہے۔

پا کر تجھے اپنے کو میں کیا بھول گیا ہوں
ہر سود و زیانِ دوسرا بھول گیا ہوں
جس دن سے مرے دل میں تری یاد بسی ہے
ہر ایک کو میں ترے سوا بھول گیا ہوں
آتا ہے خدا بھی ترے صدقہ میں مجھے یاد
گویا کہ بظاہر میں خدا بھول گیا ہوں
عالم کے تماشے نہیں اب جاذب دل ہیں
ہر لذتِ ہستی کا مزا بھول گیا ہوں

Marfat.com

ہر سمت نظر آتے ہیں ہر وقت وہ مجھ کو
دوریٔ مسافت کا گلہ بھول گیا ہوں
اب مسئلۂ کثرت و وحدت کو میں سمجھا
پا کر تجھے سب تیرے سوا بھول گیا ہوں
سجدہ طرفِ کعبہ ہے، دل تیری طرف ہے
اب قبلہ بھی اے قبلہ نُما بھول گیا ہوں
حل جب سے ہوا فلسفۂ حُسنِ حقیقت
ہر مسئلہ اے ذہنِ رسا بھول گیا ہوں
ہے آہ سحرگاہ میں وہ ذوق لب و گوش
چنگ و نئے بربط کی صدا بھول گیا ہوں
منظور تری چشم رضا جب سے ہوئی ہے
امیدِ جزا خوف سزا بھول گیا ہوں
اے رہبر توفیق مجھے راہ بتا دے
نقشِ قدمِ راہ نما بھول گیا ہوں
اے خضر مرا قافلہ کس سمت گیا ہے
تمیز صدا ہائے ذرا بھول گیا ہوں
اُلٹا ہے ورق آج سے افسانۂ نَو کا
افسانۂ پارینہ و لا بھول گیا ہوں

یہ غزل حضرت مولانا تھانویؒ سے بیعت ہونے کے بعد ہفتہ عشرہ کے اندر ہی کہی تھی، اس زمانہ میں جو کیفیات اُن پر طاری ہوئیں، ان کی ترجمانی اس سے بہتر اور کسی غزل میں نہیں پائی جاتی۔

Marfat.com

تصوف میں حضرت کا جو مقام تھا، اس کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے، مگر اس فن میں حضرت کو جو دستگاہ حاصل تھی، اس کا کسی قدر اندازہ حضرت کے اقوال سے کیا جا سکتا ہے۔ ایک بار میں نے استفسار کیا کہ حال و مقام کیا ہے اور مراتبِ سلوک کسے کہتے ہیں، اس کے جواب میں تحریر فرمایا:

حال:- سالک کے قلب پر جو عارضی کیفیت اس کے اختیار کے بغیر طاری ہو جائے۔

مقام:- وہ مرتبۂ سلوک جس پر سالک رسوخ قدم کے ساتھ قائم ہو جائے۔

مراتب سلوک:- یعنی مقامات جیسے صبر و شکر، توکل، استقامت علی الحق، زہد، رجا، وغیرہ۔

ایسے جامع کمالات کا تذکرہ جس کے قلم نے صدہا انسانوں کو زندۂ جاوید کر دیا۔ مجھ جیسے ہیچ میرز انسان کے بساط سے باہر ہے، لیکن اُن کی جو شفقت اس ناچیز پر تا دمِ آخر رہی، اس کو کسی طرح بھولا نہیں جا سکتا اور یہ کمترین فرد خانوادۂ سلیمانی اس وقت بھی اُن کے فیوض کو اپنے اوپر اس طرح پاتا ہے، جس طرح اُن کی حیات میں پاتا تھا اور انہی کی روحانی برکت سے یہ چند سطور اس ناچیز کے قلم سے تحریر میں آ گئیں۔

اب میں اس ذکر کو حضرت قبلہ کے خواجہ تاش حضرت مولانا عبدالصمد صاحب مدظلہٗ دامت برکاتہم کی اس تحریر پر ختم کرتا ہوں، جو انہوں نے حضرت قبلہ کی وفات کے وقت مجھ کو لکھی تھی:

”ایک خبر جانکاہ ریڈیو سے ۲۲ر نومبر کی شب میں پاکستان سے نشر ہوئی تھی کہ ہمہ صفت علوم درسیہ و ادبیہ و تاریخ و تصوف کے آں موصوف کے ارتحال کی تھی۔ اس کا صدمہ بہت ہے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ اُن کو بہتر ٹھکانا جنت الفردوس میں عطا فرمائیں اور ان کے درجات عالیہ ہر روز وہاں بلند فرماتے رہیں، موت تو اس عالمِ آب و گل کے ہر بساطِ ہستی کے لئے لازم ہو چکی ہے، مگر موصوف ہمہ صفت پر کیا ماتم کا حق ادا ہو سکے، سوا اس بات کے کہ ہند کی سرزمین کا ایسا فرد جو علمی و ادبی عالم میں مایۂ نازِ ہستی تھا، جس

Marfat.com

کی تلافی اس عالم میں ماحول کا اندازہ لگاتے ہوئے دشوار ہی نہیں بلکہ محال ہے۔ اللہ تعالیٰ آں موصوف کو اعلیٰ علیین میں بلند مقام پر فائز فرمائیں۔ اور ہم پسماندگان کے لئے اُن کی ذات اقدس کو نمونہ بنا کر درسِ عمل کی توفیق بخشیں۔ آپ کی بہت سی خصوصیات اکتسابی وغیر اکتسابی نوادرات میں سے تھیں، جو قابلِ مطالعہ وسبق ہیں۔ اللہ تعالیٰ صبرِ جمیل عطا فرمائیں۔

حضرت قبلہ مرحوم میرے محترم بڑے پیر بھائی تھے، جن کا صدمہ مجھے بہت زیادہ ہے۔ اس کی تلافی تو بس اللہ تعالیٰ کی ذات پاک بن سکتی ہے"۔

سوانح شیخ الحدیث

حضرت مولانا عبدالحقؒ

تالیف : مولانا عبدالقیوم حقانی

<☆☆☆>

☆ عصر حاضر کے جلیل القدر عالم ☆ محدثِ کبیر ☆ شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحقؒ کے حالاتِ زندگی، علمی و عملی کمالات، نمایاں صفات، اندازِ تعلیم وتربیت، دینی و اصلاحی ☆ قومی وملی اور ملکی خدمات کا دلآویز اور ایمان افروز تذکرہ

القاسم اکیڈمی جامعہ ابوہریرہ خالق آباد ضلع نوشہرہ

Marfat.com

پروفیسر محمد اشرف سلیمانی

عشقِ رسول ﷺ

نعتیہ کلام کی روشنی میں

میرے آقا سید الانبیاء حضرت محمد ﷺ بزم نبوت کے صدر نشین، چرخ رسالت کے مہر منیر، انسانیت کا سرِ امتیاز، زبدۂ کون و مکاں اور اولین و آخرین کے امام و پیشوا ہیں۔ نبوت آپؐ پر زمانی و مکانی، رتبی ہر اعتبار سے ختم ہوگئی، چونکہ ازل ہی میں حکمت الہیہ نے آپ ﷺ کو آفرینش کا سبب اور باعثِ تخلیق کائنات قرار دیا تھا۔ اس لئے جملہ محاسن و محامد، کمالات و فضائل جو مخلوق میں ممکن ہو سکتے تھے، آپؐ کی ذاتِ پاک میں ودیعت فرمادئے گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو ایسا سنوارا اور نکھارا تھا کہ حسن و جمال، خیر و کمال، سخاونوال، عدل و اعتدال، غرض ہر خوبی و محبوبی نے آپؐ ہی سے حقیقت و معنی پائے...... ؎

تو ہے مجموعۂ خوبی و سراپائے جمال
کون سی تیری ادا دل کی طلبگار نہیں

نام پاک مصطفیٰ ﷺ "محمد" ہے، جو اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے کہ آپ کی ذات سزاوار حمد و تعریف ہی ہے اور عین خوبی و کمال اور مجموعۂ مزایا و حسنات ہے۔

آپ ﷺ کے کمالات و صفات کا احاطہ بشر کے بس کی بات نہیں، اس لئے

Marfat.com

عارف رومی نے بہ بانگ دہل کہا ....

لا یمکن الثناء کما کان حقہ

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

ہمارے ایک بادہ خوار شاعر نے کیا خوب کہا ہے :

غالب ثنائے خواجہ بیزداں گذاشتم

کہ آں ذات پاک مرتبہ شناس محمدؐ است

حقیقت یہ ہے کہ اللہ جل جلالہ ہی حضور انور ﷺ کے کما حقہٗ قدر شناس اور ثناخواں ہیں، خود قرآن کریم آپ ﷺ کے کمالات کا برملا اعلان کرتا ہے اور صدیقہ الکبریٰ کے اس ارشاد ''کان خلقہ القرآن'' کی تائید کرتا ہے۔ صحیفۂ ربانی نہ صرف آپ کے کمالاتِ روحانی و باطنی کا کشاف و مُظہر ہے بلکہ آپؐ کے جسمانی اعضاء و جوارح کا ذکر جس محبت و پیار اور عظمت و وقار کے ساتھ کیا گیا ہے، وہ خود حبیب خدا ﷺ کی جلالتِ شان کا گواہ ہے۔ ایک آیت مثالاً پیش کرتا ہوں۔ قرآن کس فصیح و بلیغ انداز میں آپؐ کے چہرۂ اقدس کا ذکر اور آپؐ کی ''مرادیت'' کا اظہار کر رہا ہے :

''قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا''۔

(سورۃ بقرہ: ۱۴۴)

غرض دیدۂ بینا قرآن کریم میں جہاں انوارِ الٰہیہ کی جلوہ سامانیاں اور کلامِ ربانی کی جمال آرائیاں دیکھتی ہے، وہاں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی عظمت و کمال، شوکت و جمال اور خیر وخوبی کے مناظر پاتی ہے، وہ کیا کلیجہ تھا جو قرآن کے نزول کو برداشت کر گیا...... وہ کلام جو اگر پہاڑوں پر اُترتا تو ریزہ ریزہ ہو جاتے، آسمان پر اُترتا تو پھٹ جاتا، زمین اُسے سہار نہ سکتی، سمندر اُسے اپنا نہ سکتے، ''قلب اقدس پر'' قرآن اترا بائے بسم اللہ سے ''مین الناس'' تک اترا قلب نے اُسے لیا، اپنایا، رگ رگ میں رچا، بسا، انوار و

Marfat.com

تجلیات روح و بدن میں سموئیں، جن پر قرآن اُتر رہا تھا، وہ سراپا قرآن بن رہے تھے، زبانِ پاک سے تلاوتِ قرآن کو سُنا جا رہا تھا اور دل شہادت دے رہے تھے کہ آپؐ نرے قاری ہی نہیں بلکہ قرآن ہیں، ان کا وجود انوارِ قرآنی کا آئینہ ان کے اعمال قرآنی احکام کا عملی ظہور ان کے ارشادات وحی ربانی سے فیضیاب۔ ایک قرآن وحی متلو' دوسری ذاتِ پاک ﷺ چلتا پھرتا مُجسد قرآن' جن کی ہر بات وحی کی ترجمان اور انسانوں کے لئے نجات وفلاحِ دارین کا آخری پیغام' ان کی اطاعت اللہ کی اطاعت، ان کی فرمانبرداری محبوبیت رب کی سند، جس نے انہیں اپنایا، خدا کو پایا، جس نے ان کو دیکھا اور مانا شرف صحابیت پر پہنچا اور ''رضی اللہ عنهم و رضوا عنه'' کے فوز عظیم سے نوازا گیا، وہ ذات عالی جسے ''ورفعنا لک ذکرک'' .... کی رفعتوں پر پہنچایا گیا، وہ ذات پاک، جس کے سینۂ اقدس کو اولین وآخرین کے علوم ومعارف کا امین بنایا گیا، جس کے قلب پاک کو'' فاوحٰی اِلٰی عبدہٖ ما اوحٰی '' کے لامتناہی حقائق کا خزینہ بنایا گیا۔

اس کی (حضرت محمد رسول اللہ ﷺ) کی رفعت ذکر کا جب پرچم کھلا، تو اس کے سایہ میں مشرق ومغرب، شمال وجنوب، زمین کا چپہ چپہ تھا، ان کی محاسن ومحامد کے چرچے تھے، ان کی صفات ونعت کے ترانوں سے کرۂ ارض گونج رہا تھا، عرب وعجم، ایرانی وافغانی، ہندی و پاکستانی، افریقی وایشائی، کالے وگورے، زرد وسُرخ ہر رنگ وہر نسل، ہر قوم وقبیلہ اپنی اپنی زبان میں عشقِ رسالتؐ اور محبت نبوتؐ کے جذبات کا اظہار کر رہا تھا۔

نعت رسولِ مقبول ﷺ اسلامی اصناف شاعری کی ایک صنف بن کر اُبھری جو حمدِ ربانی اور مناجاتِ الٰہی کے بعد سب سے زیادہ پاکیزہ ولطیف، مؤثر ودلستان پُرکشش و دل نشین تھی، نعت عشاقِ نبویؐ کے قلوب کی ترجمان ان کے دردمند دلوں کی فغاں اور سوختہ سامانوں کے لئے راحتِ جان تھی، کہیں یہ محبت کی پُکار تھی، کہیں درد کا اظہار، کہیں مہمیز شوق تھی اور کہیں تسلی ذوق، کہیں وارفتگی کا علاج تھی، تو کہیں ناصبوری کا مداوا، کہیں کیف حضوری

Marfat.com

کی داعی تھی، تو کہیں بے خودی کا سبب، غرض نعت اپنی گوناگوں جلوہ طرازیوں سے اہل ظاہر ہوں یا اہل باطن، رند بادہ خوار ہوں یا زاہد شب زندہ دار، علماء عالی وقار ہوں یا زاویہ نشینان والا تبار، ہر ایک کو اس کے ظرف کے مطابق نوازتی، برماتی، گرماتی رہی اوران میں عشقِ نبویؐ کی آگ سلگاتی اور بھڑکاتی رہی۔ اردو شاعری بھی دولت نعت گوئی سے محروم نہیں رہی، اس میں بڑے بڑے نعت گو شعراء پیدا ہوئے، جن کا کلام دلوں میں حبیب پاک ﷺ کی محبت کو سموتا رہا۔

ہمارے حضرت سیدی اور مرشدی علامہ سید سلیمان ندوی نور اللہ مرقدہٗ کی تمام عمر سید ہمہ عالم حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت طیبہ اور کمالات نبوت کے اظہار و اعلان میں گزری۔ گویا نعت منشور آپ کی زندگی کا شغل و سرمایہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کو شاعرانہ کمالات سے بھی نوازا تھا اور حق یہ ہے کہ اگر آپ نے اپنی پوری توجہ شعر وشاعری کو دی ہوتی، تو اس فن میں بھی آپ اپنا سکہ منوا لیتے، تاہم جب بھی کچھ کہا خوب کہا، سیرت نگار نبویؐ کی شاعری نعت رسول ﷺ سے کیونکر اور کیسے خالی رہ سکتی تھی، جو صفات نعت کے لئے آپ ضروری سمجھتے تھے، وہ سب اللہ تعالیٰ نے آپ میں ودیعت کر رکھی تھیں، اس لئے جب اس کوچے میں آئے تو بہتوں پر سبقت لے گئے ......

یہ کون آیا کہ مدھم پڑ گئی لَو شمع محفل کی
پتنگوں کے عوض اُڑنے لگی چنگاریاں دل کی

آپ کے نعتیہ کلام پر کچھ کہنے سے پیشتر آپ کی نعت کے بارے میں رائے نقل کرنی مناسب معلوم ہوتی ہے۔ ارشاد سلیمانی ہے .....

''نعت کی راہ شاعری کی سخت ترین راہوں میں سے ہے اور تمام اصناف شاعری سے مشکل ہے۔ بقول عرفی: ''آہستہ کہ رہ بر دمِ تیغ است قدم را'' اس کے لئے اول قلب کا عشق بندی سے معمور ہونا شرط ہے، پھر تعبیر و اظہار پر قدرت، پھر فصاحت و بلاغت اور

Marfat.com

شاعری کے جملہ اُصول ولوازم کی رعایت، شعراء میں امیر خسرو اور مولانا جامی کو یہ دولت ملی تھی"۔

حضرت سید الملۃ نوراللہ مرقدہٗ خانوادۂ سادات کے گوہر شب چراغ تھے، عشق و محبت ان کے قلبِ پاک کا جوہر اور درد و سوز صفت تھی، جس کی لذت آشنائی کی بنا پر اللہ تعالٰی سے مانگا جارہا تھا :

دلِ بے تاب ملے دیدۂ پُر آب ملے
تپش آتش دیدے غم دریا دیدے
دردِ دل سینے میں آ آ کے ٹھہر جاتا ہے
جو نہ ٹھہرے مجھے وہ درد خدایا دیدے

دوسری جگہ ارشاد ہے :

جو آج لذتِ دردِ نہاں کا جویا ہے
وہ پہلے سوز سے سینہ تو داغ دار کرے

عشق و محبت اور درد و سوز جو نعت گوئی کی پہلی شرط ہے، آپ میں فطرتاً بدرجۂ اتم موجود تھا۔ سیرت نگاری کے شغف نے اُسے حُبِّ نبویؐ میں کُلّیۃً مبدّل فرمادیا، اور وہ دل جو حضور انور ﷺ کی محبت سے خالی ہو، اس کے متعلق ارشاد فرمایا :

نقش جس قلب پہ نامِ شہِ ابرار نہیں
سکۂ قلب ہے ، وہ درخور بازار نہیں

حضرت سید صاحبؒ اردو کے مسلمہ ادیب تھے، شعروشاعری کا ذوق بچپن ہی میں مکتب کی بیت بازی سے پیدا ہوچکا تھا، شاعری کے اصول ولوازم، عروض وقوافی، بحور و اوزان کی مہارت اس درجہ تھی کہ اقبال کو اس کی مثنویوں، اسرار و رموز میں اصلاحی مشورے دیتے رہے۔ غرض ایک شاعر کو شعر کہنے کے لئے جن کمالات و محاسن کی ضرورت ہے، آپ

Marfat.com

میں موجود تھے۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کے تعلق نے اسے مزید جلا بخشی، مدت کے خوابیدہ جذبات بیدار ہوئے، اور غزل الغزلات کا وہ شعری مجموعہ وجود میں آیا، جس کے بارے میں ارشادِ سلیمانی ہے :

"یہ میرا غزل نامہ نہیں، بلکہ سفر نامہ ہے"۔

آپ کی نعتوں کی کل تعداد پانچ ہے، جو اڑتیس اشعار پر مشتمل ہے، لیکن ہر شعر اپنی جگہ انتخاب ہے۔ یہ نعتیں اعظم گڑھ، تھانہ بھون، مدینہ منورہ اور جہاز خسرو پر بوقتِ واپسی حج کہی گئی ہیں۔

فقیر نہ شاعر ہے، نہ ناقد، نہ فنِ عروض سے واقف، حضرت سید صاحبؒ کے مائدۂ کرم کا ایک ادنیٰ زلہ رُبا ہوں، اس لئے نقد و تبصرہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ بقول رومی .... ؎

خود ثنا گفتن زمن ترک ثنا است
کین دلیل ہستی و ہستی خطاء است

میرے لئے تو ہر ایک شعر یُمن و برکت اور خیر و ہدایت کا سامان ہے، جو محبتِ رسولؐ اور عظمتِ پیغمبر ﷺ کو مہمیز کرتا ہے۔ آپ کی ہر نعت بلکہ اس کا ہر شعر نبی انور ﷺ کی ذاتِ پاک اور آپؐ سے نسبت رکھنے والی ہر چیز کے ساتھ ایک ایسے والہانہ تعلق کی گواہی دیتا ہے، جو کسی عاشقِ صادق ہی کا حال و کمال ہو سکتا ہے۔ سب سے پہلی نعت کے دوسرے شعر میں کیا معجز مدح فرمائی ہے : ؎

تو ہے مجموعۂ خوبی و سراپائے جمال
کون سی تیری ادا دل کی طلبگار نہیں

روضۂ پاک جس سکون و وقار اور سکینت کی جگہ ہے، اس کے بارے میں کیا

Marfat.com

خوب فرماتے ہیں ....

مجلسِ شاہ میں ہے نغمۂ تسلیم و درود
شورِ تسبیح نہیں شورشِ اذکار نہیں

مدینہ منورہ کے بارے میں ارشاد ہے :

ذرہ ذرہ ہے مدینہ کا تجلی گہ نور
دشتِ ایمن یہ نہیں جلوہ گہ ناز نہیں

انصار کی محبت کا ذکر کس شان و انداز سے کر رہے ہیں :

جان دے دے کے خریدار بنے ہیں انصار
عشق زارِ نبویؐ مصر کا بازار نہیں

عظمتِ نبوت و محبتِ رسالت کا اندازہ کیجیے، بادِ صبا کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد ہے :

ہر قدم بادِ صبا حسنِ ادب سے رکھنا
بوئے گیسوئے نبیؐ نافۂ تاتار نہیں

اس شعر میں حُسنِ ادب کی ترکیب کیا خوب ہے۔

جیسے عرض کر چکا ہوں کہ حضرت کی ہر نعت کا ہر شعر انتخاب ہے۔ اس مختصر مجلس میں سب اشعار نہ نقل کیے جا سکتے ہیں، نہ ان پر بات کی جا سکتی ہے۔ اس مؤقر مجمع میں مختلف نعتوں سے چند اشعار کا پیش کرنا کافی ہوگا۔ سامعین خود ان کی خوبی جزالت وندرت، گہرائی اور گھراو، شیرینی اور کمال کا اندازہ فرما لیں :

چہرۂ انور شمس ضحیٰ ، زلف معنبر لیل سجی
قلب مطہر نور ہدیٰ ، ذکر مجدد صلِ علیٰ

Marfat.com

شاہد عالم شاہِ امم ' ہادیٔ اعظم شمعِ حرم
صاحبِ لطف وجود و کرم حق سے مؤید صلِ علیٰ
شافعِ محشر نام ترا ' سب کی شفاعت کام ترا
عرشِ معظم بام ترا ' خلق کا مقصد صلِ علیٰ
ساغر کوثر جام ترا ' سیراب تشنہ کام ترا
خوانِ کرم پیغام ترا ' اسمِ محمد صلِ علیٰ

....

آدم کے لئے فخر یہ عالی نسبی ہے
مکی ' مدنی ' ہاشمی و مطلبی ہے
پاکیزہ تراز عرش و سماء ' جنت و فردوس
آدم گہر پاک رسولِ عربیؐ ہے
کیا شان ہے اللہ رے محبوبِ نبیؐ کی
محبوبِ خدا ہے وہ جو محبوبِ نبیؐ ہے
بجھ جائے ترے چھینٹوں سے اے ابرِ کرم
وہ آگ مرے سینے میں مدت سے دبی ہے

....

عشق نبویؐ درد معاصی کی دوا ہے
ظلمت کدۂ دہر میں وہ شمع ہُدیٰ ہے
پڑھتا ہے درود آپ ہی تجھ پر ترا خالق
تصویر پہ خود اپنی مصور بھی فدا ہے
بندہ کی محبت سے ہے آقا کی محبت
جو پیرو احمدؐ ہے وہ محبوبِ خدا ہے

Marfat.com

آمد تیری اے ابر کرم رونقِ عالم
تیرے ہی لئے گلشنِ ہستی یہ بنا ہے
فردوس و جہنم تری تخلیق سے قائم
یہ فرق بد و نیک ترے دم سے ہوا ہے
فرمانِ دوعالم تری توقیع سے نافذ
تیری ہی شفاعت پہ رحیمی کی بنا ہے
لے جائے گا رہرو کو وہ منزل سے بہت دور
جو جادہ سفر کا ترے جادہ کے سوا ہے

ہدایہ اور صاحبِ ہدایہ .... تصنیف : مولانا عبدالقیوم حقانی

ہدایہ اور صاحب ہدایہ کا تذکرہ و سوانح، اقران و اماثل، مرتبہ و مقام، خدمات و تصنیفات، کتاب ہدایہ کی خصوصیت و جامعیت، اسلوب بیان، فضل و امتیاز، اصطلاحات، رموز و اشارات، احادیث ہدایہ کے متعلق مباحث اور بعض مسامحات، شروح و حواشی اور تعلیقات، اپنے موضوع پر دلچسپ، جامع، اساتذہ اور طلبہ کے لئے ایک نادر علمی تحفہ۔

صفحات : 74

میرے حضرت میرے شیخؒ .... تصنیف : مولانا عبدالقیوم حقانی

شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحقؒ کی حیاتِ طیبہ، علم و عمل، سیرت و کردار، صفات و کمالات، علمی، دینی، روحانی، تجدیدی، جہادی اور اصلاحی کارنامے، ذوق علم و شوق مطالعہ، سفر آخرت کے عبرت انگیز احوال، ایمان آفریں مجالس اور روح پرور ارشادات و افادات کا دلچسپ، جامع اور حسین مرقع۔ صفحات : 260

القاسم اکیڈمی جامعہ ابوہریرہؓ برانچ پوسٹ آفس خالق آباد، ضلع نوشہرہ، سرحد، پاکستان

Marfat.com

اربابِ علم وکمال اور پیشۂ رزقِ حلال

رشحاتِ قلم : مولانا عبدالقیوم حقانی

دورنگہ ٹائٹل اپنے موضوع پر اردو زبان میں سب سے پہلی منفرد اور لاجواب کتاب ، ماہنامہ الحق اور پاکستان کے دینی جرائد کے علاوہ مرکزِ علم دارالعلوم دیوبند کے ماہنامہ "دارالعلوم" میں بھی بالاقساط شائع ہوتی رہی۔ موچیوں ، کسانوں ، چرواہوں ، صنعتکاروں ، کاریگروں ، تاجروں ، درزیوں ، دھوبیوں ، قصابوں ، روغن سازوں ، حلوائیوں ، صیقل گروں ، ریشم سازوں ، لوہاروں ، بڑھیوں ، لکڑہاروں اور مزدوروں کے طبقہ اور پیشوں سے تعلق رکھنے والے علماء، فضلاء، مفسرین، مشائخ اور ائمہ اسلام کا تذکرہ وتعارف، مضبوط جلد بندی، لیمینیشن ٹائٹل، عمدہ طباعت، بہترین کاغذ ....

صفحات : 232 ....

ناشر

القاسم اکیڈمی ، جامعہ ابوہریرہ

برانچ پوسٹ آفس خالق آباد، ضلع نوشہرہ، سرحد، پاکستان

Marfat.com

سید ابو عاصم ایڈوکیٹ

سفرِ آخرت

دم سرد ہے آہ پر آہ ہے
تسلسل حوادث کا جانکاہ ہے

پہلی مرتبہ ۱۹۴۵ء میں مجھے اطلاع ملی کہ چچا جان کی طبیعت ناساز ہے۔ سیدھا اعظم گڑھ پہنچا، بیچ کا کمرہ حسب قاعدہ فرش وقالین سے مزین ہے۔ مسہری پر چچا جان لیٹے ہیں، سب عزیز واقارب پہنچ چکے تھے، مجھے دیکھا، مسکرا کر فرمایا :

ع کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو

علالت کی نوعیت یہ معلوم ہوئی کہ سینہ میں شدید درد تھا، جس نے کئی رات مسلسل سونے نہیں دیا۔ ڈاکٹر حفیظ صاحب کا علاج تھا، اُن کی تجویز تھی کہ قلبی شکایت ہے، فوراً بمبئی جا کر علاج ہو، مگر ڈاکٹر حفیظ صاحب ہی کے علاج سے جب افاقہ ہو گیا تو مزید جانچ نہ ہو سکی"۔

اسی سال جاڑوں میں راقم کے یہاں کبھی کبھی تشریف لاتے، رات کا وقت تھا کہ یک بیک تنفس کی تکلیف شروع ہو گئی، مگر مالش وغیرہ سے فوراً ہی یہ تکلیف جاتی رہی۔ اُس کے بعد یہ شکایت کبھی کبھی ہو جاتی تھی، اور معمولی ہومیوپیتھی دواؤں سے چلی جاتی تھی، اس وقت اس کی تشخیص نہ ہو سکی کہ اس کی نوعیت کیا ہے۔ ہمیشہ یہی خیال رہا کہ حلق کی خرابی ہے

Marfat.com

اور سانس کی نالی میں بلغم پھنس جاتا ہے، جس سے یہ تکلیف ہو جاتی ہے۔

اتفاق سے اسی زمانہ میں بھوپال اور حیدر آباد سے بلانے کی گفتگو جاری تھی، حیدر آباد میں اگرچہ تنخواہ زیادہ تھی، لیکن بھوپال سے ایک تو شعیب قریشی صاحب مدظلہ کا اصرار تھا، دوسری طرف بقولِ شعیب صاحب قاضی ریاست کا عہدہ تو ان کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکا، لیکن تعلیم عربی کی اصلاح کی خدمت کے موقع کو وہ انکار نہ کر سکے۔ وہ بھوپال میں قاضی القضاۃ اور امیر جامعہ احمدیہ کی حیثیت سے بلائے گئے تھے اور بالآخر جولائی ۱۹۴۶ء میں وہ بھوپال تشریف لے گئے اور ۱۹۴۹ء اکتوبر تک مسلسل اُن کا قیام وہاں رہا اور صحت اچھی رہی، کچھ لوگوں کو اُن کے دارالمصنفین چھوڑنے پر اعتراض تھا، اُن کی مظلومیت کی یہ انتہاء ہے کہ خود مظلوم موردِ الزام بنایا جا رہا ہے، اس کے باوجود اس نے اپنی زندگی میں کبھی بھی کسی کو بُرا کہنا تو بڑی بات ہے، کسی کا نام بھی اپنی زبان پر آنے نہیں دیا ....

ع کبھی فرصت سے سُن لینا بڑی ہے داستاں میری

یوں تو وہ دو مرتبہ حرمین شریفین کی زیارت کر چکے تھے، لیکن اُن کے دل میں یہ بات کھٹکتی تھی کہ وہ دونوں سفر سیاسی تھے۔ اس سے پہلے ۱۹۲۴ء اور پھر ۱۹۲۶ء میں وفد حجاز میں ہندی مسلمانوں کے نمائندہ بن کر تشریف لے گئے تھے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ وہ بھی رضائے الٰہی کے لئے نہ تھے، لیکن اللہ کے بندے اور رسول ﷺ کے عاشق نے ان کے دربار میں صرف انہیں کا نام لے کر حاضری مناسب سمجھی۔ چنانچہ ۱۹۴۹ء اکتوبر میں حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے۔

واپسی شاید دسمبر میں ہوئی۔ راستہ ہی میں طبیعت خراب ہوگئی۔ بمبئی میں یوں تو بہت سے لوگ اپنا مہمان بنانے کے متمنی تھے، لیکن بمبئی کے مشہور مخیّر تاجر بھائی عزیز صاحب کی بے پناہ محبت سب پر غالب آئی، کسی کو سوچنے کا موقع دیئے بغیر وہ اُن کو کرسی پر بٹھا کر اٹھا لائے اور اپنی گاڑی میں بٹھایا، اپنے گھر لے آئے، جس خلوص، محبت اور تن دہی

Marfat.com

سے انہوں تیمارداری کی ہے۔ حق یہ ہے کہ اس نے بہت سے قریبی عزیزوں کو بھی شرمندہ کر دیا، وہاں ڈاکٹروں کی تشخیص یہ ہوئی کہ دوسری شکایتوں کے ساتھ دل بھی بڑھ گیا ہے، لیکن انہوں نے اس کو کوئی اہمیت نہیں دی، بلکہ یہی کہا اس عمر میں عموماً دل بڑھ جایا کرتا ہے۔

اسی زمانہ میں پاکستان آنے کی خبر گرم ہو چکی تھی۔ ہندوستان کے متعدد اخبار لکھ رہے تھے کہ وہ ہجرت کرنے والے ہیں، حالانکہ حقیقت اس وقت صرف اس قدر تھی کہ یہاں سے دعوت ضرور دی گئی تھی، مگر انہوں نے اب تک قبول نہیں فرمائی تھی، بلکہ پیشکش کی مزید تشریح چاہی تھی، وہ بستر پر بیمار تھے، لوگ چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے، اتنے میں ایک اخبار کے نامہ نگار صاحب تشریف لائے اور انہوں نے سوال کیا کہ آپ پاکستان تشریف لے جا رہے ہیں، اس کے جواب میں انہوں نے صرف یہ شعر پڑھا ......

رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی
تو کس اُمید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے

نامہ نگار صاحب تو اسی شعر کا مزہ لیتے ہوئے رخصت ہوگئے، جب صحت ہوگئی، تو وہ بھوپال تشریف لے گئے، وہاں سے سبکدوش ہو کر لکھنؤ اعظم گڑھ اور کانپور میں چند مہینے قیام رہا۔

میں ۱۹۴۸ء کے اوائل ہی میں کراچی آ گیا تھا، اُن کے یہاں آنے سے پہلے ایک مرتبہ اُن کے پاس بھوپال اور والدہ کے انتقال پر وطن اور بھی گیا، اُن کو پاکستان کا مشتاق اور دعا گو پایا، مگر آنے کے متعلق مجھے یقین نہیں تھا۔ ۱۳ر جون ۱۹۵۰ء کی صبح کو میں نے اخبار میں یک بیک یہ خبر پڑھی کہ چچا جان لاہور تشریف لے آئے ہیں اور ۱۴ر جون کو کراچی تشریف لانے والے ہیں۔ ہم لوگ کینٹ اسٹیشن گئے اور ان کو ڈار منزل لائے، ڈار منزل خواجہ شہاب الدین جوان دنوں وزیر داخلہ تھے، اُن کی عنایت خاص کی وجہ سے مجھے پہلے ہی مل چکا تھا، وہ ایک خاص ولولہ کے ساتھ تشریف لائے تھے، اُن کی گفتگو میں کتنی اُمید

Marfat.com

اور کتنی آرزو جھلکتی تھی۔

ڈار منزل جہانگیر روڈ کی ایک شاخ چمن سٹریٹ پر واقع ہے۔ یہ ایک پچھم رُخ کا مکان ہے، پھاٹک سے داخل ہوتے ہی سامنے پندرہ فٹ بے آب وگیاہ میدان ہے۔ اس کے بعد پندرہ فٹ کا پختہ صحن ہے۔ اسی سے ملحق تین کمرے سڑک کے رُخ پر ایک سلسلہ سے ہیں، پھاٹک کے سامنے کا کمرہ ملاقات کے لئے مقرر ہوا، اس کے بعد بیچ کا کمرہ اُن کی خوابگاہ بنا اور آخری کمرہ میں میرا قیام تھا۔ کلفٹن کوارٹرز کے پاس ایک مسجد تھی، لوگوں نے اس کا نام جامع مسجد سلیمانیہ رکھنا چاہا، انہوں نے اس کو ناپسند کیا، لیکن لوگ نہ مانے۔ آخر وہ اسی نام سے مشہور ہو گئی۔ وہاں روز صبح بعد نماز درس **قرآن کا سلسلہ شروع** ہوا۔ اس مرتبہ میں نے ایک بات یہ دیکھی کہ تنفس کا دورہ عموماً رات کو کبھی کبھی پڑ جاتا تھا، ہومیوپیتھی دوا سے فوراً سکون بھی ہو جاتا تھا، یہ تکلیف کھانے کے بعد تقریر کرنے یا کوئی حرکت کرنے سے ہو جاتی تھی۔ اس لئے ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ یہ تکلیف ریاح اور سوءِ ہضم کا فساد ہے۔ اسی لئے ساری توجہ ریاح اور اصلاحِ معدہ کی طرف رہی۔

ایک مرتبہ مسجد سلیمانیہ میں درس دے رہے تھے۔ اسی دوران میں اُن کی آواز مدھم ہوتی گئی اور انہوں نے گردن جھکا لی۔ فوراً لوگوں نے پکڑ لیا، اور اٹھا کر گاڑی پر گھر لائے اور ڈاکٹر میجر حسن کو ٹیلیفون کیا، میجر حسن فوراً تشریف لائے۔ لوگوں کو خیال ہوا کہ فالج کا حملہ تھا، میجر حسن صاحب نے معائنہ فرمایا، سب سے پہلے خون کا دباؤ دیکھا، وہ بجائے زیادہ ہونے کے معمول سے بھی کم تھا، جس سے اس خیال کی تردید ہوئی۔ تلوؤں میں تھوڑی سی بے حسی ضرور تھی۔ چچا جان کو شدت سے انکار تھا کہ ان پر کسی قسم کا حملہ تھا، وہ کہتے تھے رات کو نیند نہیں آئی تھی۔ اسی لئے آنکھ لگ گئی تھی۔ بہر حال احتیاطی طور پر میجر صاحب نے انجکشن دینے شروع کئے، انہوں بڑی محبت، خلوص اور شرافت کا ثبوت دیا، جب میں نے فیس پیش کی اور اصرار کیا تو انہوں نے سختی سے انکار کیا اور فرمایا کہ مجھے کمانے

Marfat.com

کے مواقع تو بہت ملیں گے، لیکن آپ مجھے سعادت اور مسرت سے کیوں محروم کرتے ہیں۔ حقیقت یہی تھی کہ یہ اُن کے دل کی آواز تھی۔ اس میں ذرا بھی رسمی تکلف نہ تھا، وہ باوجود بے انتہا مشغول ہونے کے خود تشریف لاتے اور انجکشن دیتے، اُن کے علاج اور توجہ سے وہ کچھ صحت مند ہو گئے۔ یہ غالباً جنوری ۱۹۵۲ء کی بات ہے۔

۱۹۵۲ء کی گرمیوں میں بنیادی کمیٹی کا اجلاس نتھیا گلی میں طے پایا۔ چچا جان بھی تشریف لے گئے۔ آٹھ ہزار فٹ کی بلندی اُن کے قلب و اعصاب کے لئے ناقابلِ برداشت ہوگئی اور ان پر تنفس کا شدید دورہ پڑا۔ فوراً ڈاکٹر آئے، انہوں نے دیکھا اور کہا خون کا دباؤ بہت بڑھا ہوا ہے، خان عبدالقیوم خان اور میاں ممتاز دولتانہ نے اپنے خصوصی اثر سے فوجی ہسپتال راولپنڈی پہنچایا۔ وہاں کرنل سرور نے معائنہ کیا۔ دل کافی بڑھ چکا تھا اور سب سے پہلی بار تشخیص ہوئی کہ یہ تنفس کی تکلیف بھی قلب ہی کی وجہ سے ہے۔ وہاں سے لاہور تشریف لائے۔ لاہور کے ایک تجربہ کار ڈاکٹر صاحب نے بھی وہی تشخیص کیا اور نسخہ تجویز کیا اور نمک کا سخت پرہیز بتایا۔ اس کے بعد کراچی تشریف لے آئے۔ یہاں ڈاکٹر رحمان کی طرف رجوع کیا، انہوں نے بھی اسی علاج سے اتفاق کیا اور علاج ہوتا رہا اور تنفس جاتا رہا اور بہت دنوں تک کوئی شکایت نہیں رہی۔ ہاں حکیم محمد نصیر الدین صاحب ندوی نے جو اُن کے شاگرد بھی، شیدائی بھی، معالجِ خاص بھی اور محرمِ دردِ دل بھی ہیں، طاقت کی دوائیں ہمیشہ جاری رکھیں۔

فروری ۱۹۵۳ء میں ڈھاکہ میں مجلس تاریخ کی کانفرنس تھی۔ اس کے صدر منتخب ہوئے۔ ڈاکٹروں کا مشورہ تھا کہ اتنا طویل سفر نہ فرمائیں، لیکن نہ مانے اور بذریعہ طیارہ تشریف لے گئے۔ ڈھاکہ کے خطبۂ صدارت میں ایک تاریخی صداقت کے اظہار کے بعد وہاں کے طلبہ نے جو شرمناک سلوک اُن کے ساتھ کیا وہ سب کو معلوم ہے۔ ایک نیم جان قلب کے مریض ضعیف کے ساتھ ایسا سلوک انسانیت سے گذری ہوئی بات تھی۔

Marfat.com

جلسہ کے بعد محبی راحت رضوی صاحب کے یہاں چند دن قیام رہا اور وہاں سے کلکتہ تک ہوائی جہاز اور بذریعہ ریل لکھنؤ ہوتے ہوئے دہلی پہنچے، کہتے تھے کہ راہ میں بختیار پور جنکشن (جہاں سے ہمارے وطن کی ریل مڑتی ہے) پر ریل ٹھہری، بہت دیر تک حسرت بھری نگاہ ڈالتا رہا، پٹنہ جنکشن پر مقامی ندوی حضرات تشریف لے آئے تھے۔ کچھ دن لکھنؤ میں قیام رہا، اعظم گڑھ سے شاہ معین الدین صاحب اور سید صباح الدین صاحب بھی ملنے آئے۔ دونوں حضرات کو انکی ذات سے والہانہ محبت تھی، اس غیر متوقع ملاقات کا ذکر مزہ لے لے کر اپنے خطوط میں مہینوں کرتے رہے اور سیر نہ ہونے کا گلہ کرتے رہے، ان حضرات کو کیا معلوم تھا کہ یہ ملاقات اُن کے لئے آخری ثابت ہوگی اور ....

ع بوئے گل سیر، ندیدیم و بہار آخر شد

کا مصرعہ ان پر صادق آئے گا۔

اپریل ۱۹۵۳ء میں واپس کراچی تشریف لائے۔ کچھ ہی دنوں کے بعد تنفس کا پھر دورہ پڑا، وہی انجکشن دیا گیا، جس سے سکون ہوگیا۔ اس کے بعد سیاسی ہنگاموں کا طوفان اٹھا، بنیادی کمیٹی کا جلسۂ علمائے کرام کا اجتماع، کیا کچھ نہ ہوا، منتیں کیں، خوشامدیں کیں، روٹھ گیا کہ ان ہنگاموں سے آپ علیحدہ رہیں۔

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں
واں ایک خاموشی تری سب کے جواب میں

ایک دن تو مجھ سے چڑ گئے۔ وہ دن تھا اور آخری دن، میں نے زبان بند کرلی، میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میرے انداز کو دیکھ کر وہ سمجھ گئے، اکثر چھیڑا کرتے تاکہ میں کچھ بولوں، لیکن میں نے طے کرلیا کہ میں ہرگز ان کی گرانیِ طبع کا باعث نہ بنوں گا۔ اس لئے صرف تعمیل حکم میں نے اپنا فرض بنالیا۔ کوئی آتا میں اطلاع کردیتا، لوگ آتے اور گھنٹوں بیٹھ جاتے اور ہر قسم کے موضوع پر لمبی لمبی بحثیں ہوتیں۔ دل کھڑکتا، اکثر آنکھیں

Marfat.com

رو دیتیں، چہرہ متغیر ہو جاتا، پیشانی پر شکن پڑ جاتی، لیکن زبان بہر حال بند رہتی۔

اگست ۱۹۵۳ء کی کوئی تاریخ تھی کہ زکامی کیفیت محسوس ہوئی اور کچھ تنفس کی ہلکی سی تکلیف بھی، پھر حرارت آ گئی۔ یہ ۹۹۔ اور ۱۰۰ کے درمیان۔ ڈاکٹر رحمان کے یہاں خود تشریف لے گئے، انہوں نے کھانسی، زکام کا نسخہ دیدیا، دو چار دن میں بخار اتر گیا، لیکن تنفس کی تکلیف بڑھنے لگی، انہیں اے نین فائن کا انجکشن دیا گیا، تنفس کم ہو گیا۔ ایک دو دن اسمبلی بھی تشریف لے گئے، لیکن گاڑی میں اگلی سیٹ پر سر ٹیک دیا۔ میں نے بے قرار ہو کر پوچھا کوئی خاص تکلیف ہے، فرمایا نہیں، لیکن مجھے معلوم ہو رہا تھا کہ گھلتے جا رہے ہیں، کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں، میری خواہش ہوئی کہ ان کو تکلیف نہ کرنی پڑے، اور اُن کی خواہش ہوتی کہ اُن کے لئے کسی کو تکلیف نہ ہو، میری خواہش ہوتی کہ ڈاکٹر اُن کے پاس آتا، لیکن میں ذکر نہیں کرتا اس لئے کہ مجھے جواب معلوم تھا، وہ فرماتے مرض مجھ کو ہے یا کہ اُن کو اور پھر جو شخص جتنا کر دے، اس کا احسان ہے، نہ کرے تو اس کی کوئی شکایت نہیں، وہ پوچھتے تم کیسا ڈاکٹر چاہتے ہو، میں کہتا مجھے ایسا ڈاکٹر چاہئے جس کو جب جس وقت بلایا جائے، فوراً آ جائے، خواہ اس کے لئے وہ کوئی فیس لے، وہ مسکرا دیتے، بات ختم ہو جاتی، لیکن دوسرے دن کپڑے پہن کر مجھ سے پہلے گاڑی میں جا کر بیٹھ جاتے۔ اب میری بے بسی دیکھنے کے قابل ہوتی۔ میں تھوڑی دیر تذبذب کی حالت میں کھڑا رہتا، نہ کچھ کہہ سکتا، نہ کچھ کر سکتا، شکست کھا کر گاڑی میں بیٹھ جاتا اور گاڑی چل دیتی۔

ساری تکلیفیں خود اٹھانی ان کی فطرت بن چکی تھی، کسی کو اُن کی ذات سے تکلیف نہ ہو، اس کا بڑا خیال رکھتے تھے، اسی لئے ڈاکٹر کو گھر پر بلانے کی مخالفت کرتے تھے، کوئی ڈاکٹر اُن سے فیس نہیں لیتا تھا، اور سب انتہائی محبت سے پیش آتے تھے۔ ڈاکٹر فاروقی سے بالکل عزیزوں جیسے تعلقات تھے، وہ خود بھی اپنی ذات سے بڑے متواضع اور خلیق انسان ہیں۔ ہمارے گھر میں کسی کو کچھ تکلیف ہو، اطلاع ملتے ہی آ جاتے، دیکھتے انجکشن لگاتے،

Marfat.com

عثمان صاحب کمپونڈر کو متعین کر دیتے، عثمان صاحب بھی بڑے ہی شریف اور محبت والے آدمی ہیں، ان سب باتوں کے باوجود ان کی خواہش یہی ہوتی کہ کسی کو تکلیف نہ دی جائے۔

ڈاکٹر رحمان کے علاج کو ایک دو ہفتہ ہوا ہوگا کہ ایک دن مختار صاحب نے ٹیلیفون کیا کہ کرنل شاہ سید صاحب کو دیکھنا چاہتے ہیں، کس وقت تشریف لائیں، میں بہت خوش ہوا، کرنل شاہ کے اخلاق کی دل ہی دل میں تعریف کرتا ہوا چچا جان کو مطلع کیا، انہوں نے فرمایا جس وقت جی چاہے، تشریف لے آئیں، اُن کی عنایت ہوگی۔ چنانچہ اسی دن گیارہ بجے تشریف لائے اور بہت دیر تک معائنہ کرتے رہے۔ میں نے اُن کی رائے پوچھی، انہوں نے پورے وقار اور سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔ میں بھی کوئی رائے نہیں دے سکتا، کل اُن کو جناح ہسپتال لے آیئے، میں اُن کے قلب کا اکسرے اور کارڈ گراف لینے کے بعد کوئی فیصلہ کروں گا۔ چنانچہ دوسرے دن ٹھیک گیارہ بجے اُن کے دفتر پہنچ گیا۔ وہ دفتر میں نہیں تھے، چچا جان کو دفتر میں بٹھا دیا اور ڈاکٹر صاحب کی تلاش میں ہسپتال کا رُخ کیا۔ وہ ہسپتال کا چکر لگا کر آ ہی رہے تھے، جیسے ہی مجھے دیکھا، تیز تیز قدم بڑھاتے ہوئے گلے میں پڑے ہوئے اسٹتھ اسکوپ سے کھیلتے ہوئے دفتر کی طرف تشریف لائے اور بڑی تعظیم و تکریم اور تواضع سے پیش آئے اور دوسرے کمرے میں لے گئے۔ وہاں کارڈ گراف لیا گیا اور پھر وہاں اپنی گاڑی پر دوسری جگہ گیا، وہاں ایکسرے لیا گیا اور پھر تیسری جگہ خون کی جانچ کے لئے خون لیا گیا اور دوسری جانچ مکمل ہوئی۔

اتنی دوڑ دھوپ میں سانس کچھ تیز ہوگئی، لیکن بڑے حوصلہ اور ہمت سے سارا کام کرتے رہے، گھر پہنچے تو سب لوگوں نے گھیر لیا، جیسا کہ ہمیشہ سے قاعدہ تھا، جب کبھی وہ باہر سے آتے تھے، تو گھر کے سارے افراد اُن کے گرد جمع ہو جاتے تھے، لوگ تفصیل جاننا چاہتے تھے، لیکن وہ چند جملوں میں ساری بات کہہ جاتے تھے، جس سے گھر کے لوگوں کو تسلی نہیں ہوتی تھی۔ مزید تفصیل اور استفسار کے جواب میں ان کا ایک نیم تبسم بس تھا، چنانچہ اسی

Marfat.com

طرح اُن سے تفصیل کی فرمائش ہوئی، انہوں نے میری طرف اشارہ کر دیا اور خود پلنگ پر لیٹے اور زیرِ لب تبسم کے ساتھ اپنی ساری روئیداد لیٹے لیٹے سنتے رہے۔

دوسرے دن شام کو ڈاکٹر صاحب کا ٹیلیفون آیا کہ میں ساری رپورٹ لے کر خود آؤں گا اور دوا اور علاج تجویز کروں گا، چنانچہ جب وہ تشریف لائے تو کہا کہ قلب بڑھ گیا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ قلب کی کسی شریان میں ایک ایسی گرہ بن گئی ہے، جس سے دورانِ خون میں دقت ہوتی ہے اور قلب کو زور لگانا پڑتا ہے اور اسی سے تنفس کی تکلیف ہوتی ہے۔ کم و بیش تشخیص وہی تھی جو سارے اطباء اور ڈاکٹروں کی تھی، انہوں نے ایک ٹیکہ ڈیجاکسن کا اضافہ کیا۔ کچھ دوائیں کھانسی وغیرہ کی بھی دیں۔ دس بارہ دن کے علاج کے بعد حالت بظاہر اچھی خاصی معلوم ہونے لگی، اب وہ بستر سے ادھر اُدھر چلنے پھرنے لگے، پاخانہ جو ان کے کمرے سے کچھ دور تھا، خود سے جانے لگے اور فرماتے کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوتی۔

ڈاکٹروں کی شدید ہدایت تھی کہ کسی کو ملنے نہ دیا جائے تاکہ دل و دماغ کو مکمل آرام نصیب ہو، کسی قسم کی علمی اور سیاسی گفتگو میں حصہ نہ لیں، صرف انہی حضرات کو ملنے دیا جائے، جن کی باتوں سے دل خوش ہو، میں نے ڈاکٹر صاحب سے اپنی عاجزی اور بے بسی کا اظہار کیا اور ان سے استدعا کی آپ خود گوش گذار کر دیں، چنانچہ ایک دن ڈاکٹر صاحب نے کہنا شروع کیا کہ آپ نے زندگی میں بہت کام کئے ہیں، اتنی خدمت کی ہے جتنی کم ہی لوگوں نے کی ہوگی اور ابھی قوم کو آپ کی ضرورت ہے۔ اس لئے کچھ دنوں قومی، ملی اور علمی مصروفیتوں سے بالکل علیحدہ ہو جایئے، صحت کے بعد ان شاء اللہ پھر حصہ لے لیجئے گا، انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ کبھی مجھے اور کبھی ڈاکٹر صاحب کو دیکھ کر مسکراتے رہے۔

اُن کی علالت کی اطلاع قصداً اخبارات میں نہیں دی تھی۔ اس لئے کہ لوگوں کا ہجوم بس سے باہر ہو جاتا۔ اس پر بھی مشتاقوں، محبوں اور مخلصوں کا تانتا لگا رہتا تھا، سمجھدار

Marfat.com

لوگ صرف دریافتِ حال کے بعد چلے جاتے تھے۔ میں لوگوں سے کہہ دیتا تھا کہ ان کا یہ حال ہے، آپ کہیں تو اُن کو مطلع کردوں، کچھ لوگ کہتے میں اُن کی خیریت پوچھنے آیا ہوں، تکلیف دینے نہیں، بعض لوگوں کو اصرار ہوتا کہ آپ میری آمد کی اطلاع کردیجئے۔ میں جانتا تھا کہ اگر اطلاع کرائی گئی تو وہ ضرور بلالیں گے اور پھر کچھ نہ کچھ گفتگو بھی ہوگی اور موضوع اور عنوان کی کوئی حد بندی باقی نہیں رہے گی۔

شروع شروع جب لوگوں کو واپس کردیا گیا، اور انہیں علم ہوا تو بہت خفا ہوئے اور فرمانے لگے، تم لوگ مجھے وزیراعظم بنادینا چاہتے ہو، مجھے یہ پابندیاں پسند نہیں ہیں۔ میرے پاس جو آتا ہے، محبت اور خلوص سے آتا ہے، کسی غرض سے نہیں آتا ہے، کسی کو نہ روکو، چنانچہ جس کی بھی اطلاع کی گئی ضرور بلایا گیا اور اُن کے جسمِ ناتواں پر جتنا بھی وہ بار ڈال سکتا تھا، اس کو برداشت کرتے اور کبھی تکدر کا اظہار نہیں فرماتے۔

کراچی یونیورسٹی کے ایک لائق پروفیسر اسلامی تاریخ کے پروفیسر کے تقرر کے سلسلہ میں اُن سے مشورہ کرنے کے لئے تشریف لائے، انہیں ان کی علالتؒ کا علم نہیں تھا، ملازم کے ذریعہ انہوں نے اطلاع کرائی، فوراً بلالئے گئے چچا جان زنج کے ساتھ اس ملک میں علمی فقدان کا ذکر کرنے لگے اور فرمایا ہمارے پی ایچ ڈی زندگی میں صرف ایک مقالہ لکھتے ہیں اور ساری عمر اسی کو چومتے چاٹتے رہتے ہیں، حالانکہ پی ایچ ڈی ہونا صرف اس بات کی سند ہے کہ تم تحقیق کرسکتے ہو، محقق نہیں ہو، بعد میں مجھ سے پروفیسر صاحب نے فرمایا کہ علالت کا علم نہیں تھا، ورنہ کبھی تکلیف نہ دیتا، پھر بھی بیچارے پوری گفتگو کئے بغیر ہی اُٹھ گئے، لیکن احساس والے لوگ کم ہی آتے۔

ایک مرتبہ راجشاہی یونیورسٹی کے ایک لکچرار صاحب تشریف لائے۔ میں نے اُن کو ان کی حالت بتادی۔ کہنے لگے کوئی حرج نہیں، میں بھی علیگ ہوں، اس تعلق سے آپ ہی کے پاس تھوڑی دیر بیٹھ جاؤں گا چنانچہ مجھ سے برادرانہ گفتگو کرتے رہے، اتنے میں چچا

Marfat.com

جان اندر کے کمرے سے باہر تشریف لے آئے، لکچرار صاحب نے سلام کیا اور انہیں کے ساتھ صوفہ پر بیٹھ گئے۔ مزاج پرسی کے بعد انہوں نے وحدۃ الوجود کا مسئلہ چھیڑ دیا، پہلے تو انہوں نے معذرت کی کہ میں اپنی صحت سے مجبور ہوں، لیکن تھوڑی دیر بعد خود اُن سے نہیں رہا گیا اور تقریباً ایک گھنٹہ تک اس مسئلہ پر روشنی ڈالتے رہے، لکچرار صاحب الجھتے رہے اور ان کی تسلی نہیں ہو پائی تھی، انہوں نے پھر سوال کیا، فرمانے لگے بھائی! بس اب دم نہیں رہا، ہاں اس سلسلہ میں سعدی کا صرف ایک شعر سُن لیجئے ....ے

یکے قطرہ باران زِ ابر چکید
خجل شد چو پہنائے دریا بدید
کہ جائے کہ دریاست من نیستم
گراو ہست حقا کہ من نیستم

اس شعر کو سُن کر لکچرار صاحب جھومنے لگے، کہنے لگے کہ ہزاروں مرتبہ اس شعر کو سنا تھا، لیکن کبھی اس مطلب کو نہیں سمجھا تھا، اب وحدۃ الوجود کے مسئلہ کو سمجھ گیا۔ آپ سے صرف ایک گذارش ہے کہ کبھی خط و کتابت کی اجازت دید یجئے، فرمایا بڑے شوق سے سچ ہے ......ے

نہ کتابوں سے نہ کالج کے ہے در سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

کچھ دنوں کے بعد کراچی کے ایک پروفیسر صاحب تشریف لائے، انہوں نے اپنی علمی لیاقت کے متعلق کوئی تحریر چاہی، فرمایا کہ یہ تو ایک قسم کی شہادت ہے اور شہادت بغیر ذاتی واقفیت کے دینا دیانت کے خلاف ہے۔ اس کے بعد خاموش ہو گئے۔ پروفیسر صاحب کے چہرہ پر افسردگی چھا گئی، یہ بھی اُن سے دیکھا نہیں گیا، آخر میں اُن سے سوالات شروع کئے اور وہ جوابات دیتے رہے، اس کے بعد انہوں نے پوچھا کہ اس موضوع پر آپ

Marfat.com

نے کون کونسی کتابیں پڑھی ہیں، ان کا نام بتایئے، جو انہیں یاد تھا، بتاتے رہے، اس کے بعد خود عربی، انگریزی، اردو کتابوں کا نام لے کر پوچھنا شروع کیا، بیچارے پروفیسر صاحب کو پسینہ آ گیا، لیکن انہوں نے نہایت صفائی سے جوابات دیئے جو جانتے تھے، اس کو بتایا، جو نہیں جانتے تھے، اس کا اعتراف کرلیا، اس کے بعد تحریر کا وعدہ فرمالیا، پھر خود اس سوال کا جواب دینے لگے، سوال یہ تھا کہ اسلام کے اندر غیر اسلامی عنصر کہاں کہاں سے اور کب داخل ہوا، وہ گفتگو کر رہے تھے، ٹھہر ٹھہر کر جیسا کہ ان کا ہمیشہ کا قاعدہ تھا، لیکن تسلسل کا یہ عالم تھا کہ جیسے بند ٹوٹ چکا ہے، اور سیلاب تھمتے نہیں تھمتا، اسی سلسلہ میں قدیم و جدید فلسفہ یونانی فلسفۂ اسرائیلیات، سارے عالم کے فلسفہ کی تاریخ کی ارتقاء پر سیر حاصل بحث کرتے رہے کہ کس طرح یونانی (Logos) جس سے (Logio) وغیرہ مشتق ہیں، کلمہ، کلام، اور پھر علم کلام کی بنا پڑی۔ اس دن کی ساری گفتگو بڑی ہی پر از معلومات تھی، جو الحمدللہ محفوظ کرلی گئی۔

میں بار بار کھانے کے لئے کہہ رہا تھا، لیکن ان کی بات ہی نہیں ختم ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ میں نے ان کو سہارا دے کر اٹھایا اور دوسرے کمرے میں لے جانے لگا، پھر بھی وہ دو ایک بات بولتے ہی جاتے تھے، سانس تیز ہو چکی تھی، پیروں میں خود سے کھڑے ہونے کی طاقت نہیں تھی، ہاتھ میرے کاندھے پر تھا اور میں ان کو اپنے سہارے پر کھڑا کئے ہوئے تھا۔ صرف زبان اور دماغ میں طاقت موجود تھی، جو آخر وقت تک اسلام اور دین کی خدمت میں مصروف رہی۔

بنیادی کمیٹی کی سفارشات پر غور کرنے کے لئے اسمبلی کا اجلاس ہو رہا تھا۔ ''اسلام ریاستی مذہب'' قوم کا مطالبہ تھا، ان کے بیان کا ایک مسودہ اُن کے سامنے پیش کیا گیا، انہوں نے اس کو پڑھا اور رد کردیا، دوسری مرتبہ جب محترمی راغب احسن صاحب اور مولانا عبدالقدوس بہاری تشریف فرما تھے، انہوں نے خود سے اپنے بیان کی اصلاح کی اور

Marfat.com

اخبارات کو بھیجنے کی اجازت دی۔

اسلام کے ریاستی مذہب کی تائیدی جلسہ کی صدارت کے لئے انہوں نے پیر غلام مجدد سرہندی کو نامزد کیا۔ یہاں کے تمام علماء میں وہ پیر صاحب کے خلوص اور جوشِ جہاد کے بہت معترف تھے، اُن کی ذات پر انہیں بہت بھروسہ تھا۔

ایک مرتبہ رات کے گیارہ بجے تھے۔ ابھی ابھی ان کی آنکھ لگی تھی کہ کسی نے دروازہ پر دستک دی۔ دروازہ کھولا گیا تو دیکھا ایک مولوی صاحب اپنے ساتھی کے ساتھ ایک بیان پر دستخط لینے کے لئے تشریف لائے ہیں۔ اُن سے کہا گیا کہ ابھی آنکھ لگی ہے، ان حضرات کا اصرار ہوا کہ جگا دیا جائے اور ان کی شدید علالت اور اس کی نوعیت بتائی گئی تو بڑی مشکل سے واپس تشریف لے گئے۔ اس ہنگامہ میں اُن کی آنکھ کھل گئی۔ فرمانے لگے کہ مجھے صرف یہ بتادو کہ کون حضرات تشریف لائے تھے؟ اُن کی غرض نہ بتاؤ، جب انہیں نام معلوم ہوا تو ایک دم خاموش ہو گئے۔ صبح جب ڈان میں اُن حضرات کا بیان دیکھا تو فرمایا کیا اسی لئے آئے تھے؟ دوسرے دن ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب تشریف لائے، تو اُن سے بڑے دکھ کے ساتھ شکایت کی۔ ڈاکٹر صاحب نے ندامت سے اس طرح سر جھکا لیا، جیسے انہی سے یہ غلطی ہوئی ہو۔

ہمارے ایک عزیز لوہے کے تاجر ہیں۔ وہ ان سے ملنے کے لئے آئے۔ اُن سے تجارت کی حالت پوچھی۔ انہوں نے ملک کی اقتصادی بدحالی کا بہت ہی پر درد منظر کھینچا۔ وہ اُن کی بات بڑے غور سے سنتے رہے، جب وہ ختم کر چکے، تو فرمانے لگے' میں تو پاکستان کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوں، مشکلات فرد اور ملت کی آزمائش کے لئے ہوتی ہیں اور آزمائش ہی فرد اور قوم کو زندہ رکھتی ہے۔ مشکلات سے گھبرانا نہیں چاہئے، بلکہ مردانہ وار ان کا مقابلہ کرنا چاہئے۔

اب انہیں جلد جلد دورہ پڑنے لگا تھا، کرنل شاہ کی رائے ہوئی کہ اُن کو جناح

Marfat.com

ہسپتال میں داخل کر دیں، لیکن ہسپتال میں داخل کرنے کے لئے گھر کا کوئی فرد تیار نہیں تھا۔ وہاں کے ماحول اور بے بسی سے اور وحشت ہوتی تھی، آخر کرنل شاہ کی رائے کے مطابق ڈاکٹر عبدالصمد کانپور والے بھی علاج میں شریک کر لئے گئے، کرنل شاہ اور ڈاکٹر عبدالصمد میں مشورہ ہوا، دونوں بالکل متفق تھے، چنانچہ اسی نہج پر علاج ہوتا رہا۔

جمعرات یعنی ۱۹ر نومبر ۱۹۵۳ء کے دن وزیر شام ۴ بجے تشریف لائے اور انہوں نے ایک مسئلہ چھیڑ دیا چچا جان نے گفتگو شروع کی۔ بار بار کلام پاک سے حوالے دیتے جاتے، جب وہ تشریف لائے تھے، میں انجکشن کے لئے قیوم صاحب کو لانے جا رہا تھا، میں ان کو لے کر واپس آیا، تو وہ محوِ گفتگو تھے۔ حاضرین کی اجازت لے کر بستر پر لیٹ گئے۔ کمزوری اور ضعف کے سبب سے رگ کی تلاش میں بڑی دقت ہوتی تھی، کبھی کبھی غلط جگہ سوئی چبھ جاتی تھی، تو بڑی تکلیف ہوتی تھی، انتہائی ضبط کے باوجود آہ نکل جاتی تھی۔ ایک ہاتھ میں ناکامی ہوئی، تو دوسرے میں کوشش کی گئی۔ بارے اس میں کامیابی ہوئی۔ اس کے بعد وہ اُٹھ بیٹھے، گفتگو کا تار جہاں سے ٹوٹا تھا، وہیں سے شروع کر دیا۔ کس کو یقین آ سکتا تھا کہ یہ وہی شخص ہے، جو ابھی دو منٹ قبل درد اور تکلیف سے بے چین تھا۔ میرا دل کڑھ رہا تھا، لیکن زبان سے بول نہیں سکتا تھا، میں قیوم صاحب کو چھوڑ کر جب واپس آیا تو دیکھا گفتگو اب بھی جاری ہے۔ یہاں تک کہ مغرب کا وقت ہو گیا، وزیرِ شام نے باہر صحن میں نماز پڑھی، اس کے بعد کچھ دیر گفتگو کے بعد وہ رخصت ہوئے۔ ساری گفتگو عربی میں ہو رہی تھی۔ میں ان کو گاڑی تک رخصت کرنے گیا، وہ بڑے متحیر اور متاثر تھے۔

جمعہ ۲۰ر نومبر ۱۹۵۳ء کو ایک صاحب مجھ سے ملنے آئے، اُن کے ساتھ ایک اور صوفی منش بزرگ تھے۔ ان سے یہ طے تھا کہ ہم لوگ ماہر القادری صاحب کو دیکھنے جائیں گے، چنانچہ ان دونوں کو ملاقات کے کمرے میں بٹھا دیا اور خود کپڑا بدلنے چلا گیا اور فوراً واپس آ گیا۔ چچا جان اسی کمرے میں محوِ خواب تھے۔ ان صاحب نے مجھ سے روایت بیان

Marfat.com

کی کہ صوفی صاحب کہہ رہے تھے، عاصم صاحب جلد واپس آ گئے۔ سید صاحب پر انوار کی ایسی بارش ہو رہی تھی کہ اُٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔

ایک دن مجھ سے سوال کیا کہ تمہارے والد کا کس عمر میں انتقال ہوا۔ میں نے عرض کیا کہ رحلت کے وقت اُن کی عمر باسٹھ (۶۲) برس کی تھی، پھر پوچھا اور بڑے بھائی (حکیم سید ابو حبیب صاحب) کی عمر کیا تھی، ان کی عمر ترسٹھ (۶۳) برس تھی۔ پھر کہنے لگے کہ میں نے تو خاندان میں سب سے زیادہ عمر پائی۔

میں اُن کا مطلب سمجھ گیا، اسی لئے عرض کیا، لیکن بڑے دادا (یعنی ان کے والد سید ابو الحسن صاحب) کی عمر تو ۸۲ برس کی تھی، وہ مسکرا کر خاموش ہو گئے، لیکن میں اس گفتگو سے سہم گیا، پھر اپنا وہم سمجھ کر اس کو ٹال گیا۔

ایک دن حکیم نصیر الدین صاحب ندوی تشریف لائے، انہوں نے حسبِ عادت بڑے حوصلہ افزا الفاظ کہے ...... قلب کی حالت بہت اچھی ہے، الحمدللہ نبض بھی متوازن ہے، چہرہ بھی شگفتہ ہے، ماشاء اللہ بہت اچھی حالت ہے۔ وہ اُن کی باتیں سنتے رہے اور مسکراتے رہے، صرف یہ شعر پڑھ دیا ......

اُن کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

ایک مرتبہ شعیب قریشی صاحب کا لڑکا عمر جو سلمان کا ہم عمر اور مخلص دوست ہے، اُن سے ملنے آیا۔ اس کو اپنے پاس بلایا اور بٹھا کر فرمایا، تم تو محمد علی کی جوانی کی ہو بہو تصویر ہو۔

آخری دنوں میں اپنے گذرے ہوئے بزرگوں اور عزیزوں کی یاد بہت آنے لگی تھی۔ ہم لوگوں کو اپنے قریب بلاتے، سب لوگ اُن کے پلنگ کے پاس فرش پر بیٹھ جاتے، وہ اُن روحوں کو عجیب انداز سے یاد کرتے، کبھی اُن کے خلوص و محبت کو یاد کر کے بے چین

Marfat.com

ہو جاتے، کبھی اُن سے متعلق گذرے ہوئے واقعات اُن کو تڑپا دیتے، اُن کی آنکھوں میں اکثر محبت کے آنسو جھلکتے دیکھے، دور کے عزیزوں میں سے بھی کوئی ملنے آجاتا، تو سب سے پہلے اُس سے اپنا رشتہ بتاتے، پھر خاندانی تعلقات و روابط کے قصے اتنا مزہ لے لے کر بیان کرتے کہ سننے والے کی آنکھوں کے سامنے ان بیتے ہوئے دنوں کا نقشہ پھر جاتا اور اپنے پچھلے بزرگوں کی محبت اور عظمت دل میں جاگزیں ہو جاتی۔

جمعہ ۲۰/نومبر ۱۹۵۳ء کو اصرار غسل کیا اور مَل مَل کر بدن کو صاف کراتے رہے، غرض بڑی مکمل صفائی ستھرائی کرائی۔ ہفتہ کا دن سکون سے گذر گیا، پچھلے پہر رات کو یک بیک میری آنکھ کھل گئی، کان میں بڑی درد بھری ایک آواز آئی۔ غور سے سُنا تو چچا جان بڑے درد و کرب سے یہ شعر پڑھ رہے تھے ......

موت کا ایک دن مقرر ہے — نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

میں مضطرب ہو گیا، اتنے میں والدہ نے آواز دی، میں تڑپ کر بستر سے کودا اور اُن کے کمرے کی طرف گیا، دیکھا کہ تنفس کا زور ہے، چہرہ درد و کرب کا آئینہ دار ہے، لیکن مجھے دیکھ کر مسکرا دیئے، میں نے کہا میں ابھی ڈاکٹر کے پاس جاتا ہوں، کہنے لگے، ابھی نہ جاؤ، ڈاکٹر صاحب سو رہے ہوں گے، اُن کو تکلیف ہوگی، میں اب کچھ بہتر ہوں، نمازِ فجر کے بعد جانا۔ میں نے والدہ سے کہا مجھے کیوں نہیں اُٹھا دیا؟ انہوں نے فرمایا، وہ تو اب بھی مجھے روک رہے تھے۔

رات کی تاریکی دور ہو چکی تھی، سپیدۂ سحر نمودار ہو چکا تھا، ہوا تیز تھی، ٹھنڈ خاصی تھی، فضا میں ایک عجیب اداسی محسوس ہو رہی تھی۔ آج اتوار کا دن شروع ہو چکا تھا، میں نے فجر کی نماز پڑھی، بارگاہِ الٰہی میں اُن کی صحت عاجلہ و کاملہ کے لئے دعا مانگی۔ ڈرائیور کو بیدار کیا، اور ڈاکٹر کے پاس گیا۔ ان کا پھاٹک کھل چکا تھا، لیکن کسی آدمی کا پتہ نہ تھا، میں ہر طرف دیوانوں کی طرح بھٹکتا رہا تھا، اتنے میں ایک ملازم آیا، اُس نے کہا ڈاکٹر صاحب نمازِ فجر

Marfat.com

کے بعد سو گئے ہیں۔ میں نے کہا ڈاکٹر صاحب کو اٹھاؤ! لیکن وہ چلا گیا، تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر صاحب کے لڑکے نے مجھے دیکھا، میں نے اُن سے حال بیان کیا، انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو باہر بھیجا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا آپ جائیے، میں ابھی آتا ہوں، جب میں لوٹ کر آیا، تو ان کو پہلے بہتر دیکھا، انہوں نے ازخود کہا کہ مجھے دوا کی ایک ٹکیہ اور دیدو، چنانچہ دیدی گئی۔ اتنے میں ڈاکٹر صاحب آ گئے، انہوں نے کہا اچھا کیا کہ ٹکیہ کھالی، پھر پوچھا کہ دل میں درد تو نہیں؟ فرمایا الحمدللہ ذرہ برابر نہیں ہے۔

ڈاکٹر صاحب : پھر کوئی بات نہیں ہے۔

ڈاکٹر صاحب سے سوال کیا، ڈاکٹر صاحب! یہ مرض اچھا بھی ہو جاتا ہے؟

ڈاکٹر صاحب: کیوں نہیں، آپ اچھے ہو جائیں گے۔

پھر فرمایا میرے خیال میں کوشش بیکار ہے۔

ڈاکٹر صاحب: ایسی مایوسی کی بات نہیں ہے۔

میں ڈاکٹر صاحب کو لے کر باہر آیا، اُن سے پوچھا کیا حال ہے؟ کہنے لگے حملہ ہو گیا تھا، کمزور جسم ہے، میں نے پوچھا کوئی تشویش کی بات تو نہیں؟ کہنے لگے کوئی بات نہیں ہے۔ آج پھر انجکشن لگوا دیجئے گا، وہ چلے گئے، میں واپس آ گیا، اس کے بعد ہم لوگوں کے ساتھ مل کر انہوں نے ناشتہ کیا، دو توس جیلی لگے ہوئے اور ایک نیم برشت انڈا کھایا۔

تھوڑی دیر بعد سفیر حجاز آ گئے۔ میں نے کہا کہ اسی کمرے میں بلا لیجئے۔ کہنے لگے نہیں، مجھے ملاقات کے کمرہ میں لے چلو، میں نے ان کو سہارا دیا اور اس کمرہ میں پہنچا دیا، وہاں بھی بستر لگا رہتا تھا، اس پر لیٹ گئے، خطیب صاحب بستر کے قریب ہی بیٹھ گئے، اُن سے بھی اسی طرح گفتگو کرتے رہے، جیسے ابھی دورہ پڑا ہی نہ تھا، گیارہ بجے کے قریب انجکشن کے لئے قیوم صاحب کو لانے گیا۔ حالت اتنی بہتر ہو چکی تھی کہ انہوں نے کہا کہ اگر میں ایک گھنٹہ کے بعد آؤں تو کوئی حرج تو نہیں، میں نے کہا کوئی حرج نہیں، چنانچہ وہ ایک

Marfat.com

بجے آئے اور انجکشن لگا کر چلے گئے۔ ہم لوگ کھانے سے فارغ ہو کر اُن کے پلنگ کے پاس بیٹھ گئے۔ اس دن انہوں نے کھیر کی فرمائش کی تھی، تھوڑی سی کھائی باقی رکھوادی کہ بعد میں کھاؤں گا۔ شاید دو بجے ہوں، عادل میاں پینٹ وغیرہ پہن کر آئے اور نانا کے پاس بڑی شان سے السلام علیکم مولانا صاحب کہہ کر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے ابا ہم صاحب بن گئے ہیں، انہوں نے کہا تم صاحب بنو گے، مولوی نہیں بنو گے، انہوں نے اسی بے تکلفی سے فرمایا، نہیں ہم صاحب بنیں گے، متبسم ہو کر بولے تو پھر ہم تم سے رنج ہو جائیں گے۔ عادل میاں نے فوراً جواب دیا، اچھا تو نہیں بنیں گے، اس پر وہ ہنسنے لگے، اور عادل میاں پینٹ میں ہاتھ دے کر اٹھلاتے ہوئے چلے گئے اور وہ اس کو محبت بھری نگاہ سے دور تک دیکھتے رہے۔

اب اتفاق سے میں تنہا رہ گیا، مجھ سے مخاطب ہوئے اور بہت ہی سنجیدہ ہو کر کہا عاصم میاں!

میں نے کہا "جی"!

آپ کو والد صاحب کی خدمت کا موقع نہیں ملا۔

میں نے کہا جی نہیں!

پھر فرمایا تمہیں والدہ کی خدمت کا بھی موقع نہیں ملا، میں نے عرض کیا "جی نہیں"۔

پھر تھوڑی دیر توقف فرمایا اور مجھے عجیب نظروں سے دیکھتے رہے میں ان کا مفہوم مطلق نہ سمجھ سکا، ان کی باتوں میں عجیب بات نظر آئی۔ میں اس کو بیان نہیں کر سکتا ہوں، شاید آنکھیں پرنم تھیں، بڑے ہی درد میں ڈوبی ہوئی دھیمی آواز میں فرمایا، لیکن اس مرتبہ تمہیں موقع مل گیا۔

میں بلبلا اُٹھا اور بے اختیار زبان سے نکلا 'میرے باپ! میں نے تو آپ کی کوئی خدمت نہیں کی' وہ صرف مسکرا دیئے، اور مجھے دیکھتے رہے، میرا دل بھر آیا اور میں وہاں سے

Marfat.com

اُٹھ کر اپنے کمرہ میں چلا آیا۔ والد مرحوم کی یاد نے تڑپا دیا، اپنی کم فہمی پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے کہ میں بالکل نہیں سمجھا کہ یہ الوداعی فقرے تھے، ورنہ قدموں سے آنکھیں ملتا اور پیر پکڑ کر کہتا کہ مجھے بے سہارا چھوڑ کر نہ جایئے۔

کوئی چار بجے کے قریب والدہ سے مخاطب ہوئے اور کہنے لگے کہ آپ عاصم کے ساتھ مطمئن ہیں، وہ کہنے لگیں کہ یہ کوئی سوال ہے ...... ؟

فرمایا میرے سوال کا جواب دیجئے، فضول باتوں میں مت اُلجھایئے۔

والدہ نے ان کے سوال کا جواب دیا، ''بے شک''

پھر فرمایا الحمدللہ میرا قلب بھی بہت مطمئن ہے،

والدہ نے میرے پاس آ کر اُن کے فقروں کو دہرایا،

میں نے اُن کی تسلی کر دی،

لیکن خود اپنا دل کسی نامعلوم خوف سے دھڑکنے لگا،

مجھ پر ایک عجیب اضطراب کی کیفیت تھی، کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا، لیکن عجیب سناٹا سا معلوم ہوتا تھا جیسی اداسی تھی، وہ بیان سے باہر ہے میں اٹھا، پھر اُن کے کمرہ میں گیا، دیکھا کہ سلمان وضو کرا رہے ہیں، یہ خدمت اُن کی سب سے چھوٹی لڑکی کے لئے مخصوص تھی، ہمیشہ وہی وضو کرایا کرتی تھی، عصر کی نماز پڑھی، اور وہ کھانے کے وقت کی بچی ہوئی کھیر منگا کر نوش کی، پھر سلمان نے پان دیا، ان کا معمول تھا کہ ہر دو کھانے ناشتہ اور شام کی چائے کے بعد دو گلوری پان کھاتے تھے اور اقتدا خان مقتدا خان کا الائچی دانہ تمباکو نوش فرماتے تھے۔ اس مرتبہ پان کھانے کے بعد وہ مل نہیں رہا تھا، میں نے تلاش کر کے ان کو دیا، جب میں نے تمباکو دیا، تو انہوں نے مجھے بڑی عجیب نظر سے دیکھا اور جب تک کھڑا رہا، دیکھتے رہے، میں ان کا مفہوم کچھ بھی نہیں سمجھا، اب سمجھتا ہوں کہ شاید وہ حسرت بھری نگاہ تھی، رخصتی کا پیام تھا، فرقت کا پیغام تھا، آہ مجھ کو کیا خبر تھی ...... ۔

Marfat.com

کیا خبر تھی انقلابِ آسماں ہو جائے گا
باپ کا ملنا نصیبِ دشمنا ہو جائے گا

(یہ شعر اسی ترمیم کے ساتھ میری اہلیہ کی زبان سے بے ساختہ نکلا، عاصم)

ساڑھے پانچ بجے مشتاق جوہری ملنے آئے۔ وہ بھی چچا جان سے خصوصی محبت کرتے ہیں۔ اُن سے وہ بیان کرتے رہے کہ رات پھر تنفس کا دورہ پڑ گیا تھا۔ اب اچھا ہوں۔ اس کے بعد مغرب کی نماز کا وقت ہو گیا۔ سلمان نے نماز پڑھوائی، بیٹھے بیٹھے نماز ادا کی، جب نماز سے فارغ ہوئے تو مسکرائے، سلمان نے پوچھا کیا بات ہے ؟

فرمایا: آج میں نے شوکت علی کی نماز پڑھی۔

سلمان نے پوچھا کیا مطلب؟

فرمایا وہ اسی صورت سے نماز پڑھتے تھے،

اس کے بعد سلمان نے کہا، ابا سو جایئے، آپ رات کو بھی نہیں سوئے ہیں، انہوں نے فرمایا بہت اچھا، اس کے بعد وہ بستر پر لیٹ گئے اور روشنی بجھا دی، اس کے بعد سلمان دبے پاؤں آئے اور اُن کے سر سے ٹوپی اُتارنے لگے، انہوں نے پوچھا کون؟ سلمان نے کہا کوئی نہیں، اور پھر وہ سو گئے۔

میں نے باہر صحن میں مشتاق صاحب کے ساتھ مغرب کی نماز پڑھی۔ نماز کے بعد اسی چٹائی پر مشتاق صاحب سے باتیں کرنے لگا، اتنے میں تھوڑی دیر بعد غلام محمد صاحب آئے، اب تاریکی کچھ بڑھ چلی تھی، وہ بھی وہیں چٹائی پر بیٹھ گئے اور خیریت پوچھی، اُن کو حال بتاتا رہا، اتنے میں سلمان نے روشنی جلائی اور پکارا دیکھئے تو دیکھئے تو ہم لوگ دوڑ پڑے، دیکھا کہ وہ مٹھی بھینچ رہے ہیں اور گہری سانس لے رہے ہیں۔ فوراً ڈاکٹر عبدالصمد صاحب کو ٹیلیفون کیا، انہوں نے فرمایا، ابھی میرے پاس دو بچے ہیں، ہم لوگوں نے سمجھا کہ شاید وہ اس وقت نہ آسکیں گے۔ میں دوڑا کہ کسی دوسرے کو لاؤں، مگر گاڑی باہر گئی ہوئی

Marfat.com

تھی، پیدل ہی بھاگا، تھوڑی دور جا کر ٹیکسی لی اور مارٹن ہسپتال کے ڈاکٹر فاروقی کے پاس گیا۔ معلوم ہوا کہ وہ گھر پر نہیں ہیں اب وہاں سے پیر الٰہی بخش کالونی گیا، ایک ڈاکٹر صاحب سے حال بیان کیا، انہوں نے کہا یہ تو میرے مطب کا وقت ہے، میں نہیں جا سکتا، پھر پوچھا معالج کون ہیں، میں نے کرنل شاہ اور عبدالصمد کا نام بتایا، وہ کہنے لگے کہ ایسے ایسے ڈاکٹروں کے بعد میں کیا علاج کروں گا۔ میں نے کہا ڈاکٹر صاحب میں آپ کو علاج کے لئے کہاں کہہ رہا ہوں، میں تو صرف اس لئے آپ کو لے جانا چاہتا ہوں کہ آپ دیکھ کر مجھے یہ بتلا سکیں کہ ان کی حالت کیسی ہے، کہنے لگے کوئی بات نہیں نیند آ گئی ہوگی، میں نے کہا از راہِ کرم یہی بات وہاں دیکھ کر کہہ دیجئے گا۔ چنانچہ وہ راضی ہو گئے۔

نہ معلوم کیوں یک بیک دل کا سارا اضطراب، ساری بیقراری، ساری تڑپ، ساری دھڑکن ختم ہوگئی۔ جیسے سکون ہو گیا، دل نے کہا شاید اب بہتر حالت ہے۔ شاید اب وہ خطرہ سے باہر ہیں، شاید میں اُن کو دیکھ سکوں گا، اُن سے باتیں کر سکوں گا، ان کی نورانی صورت سے، اپنے قلب کو منور کر سکوں گا، اُن کی اس غفلت کی نیند پر اپنی پریشانی کا اظہار کروں گا، وہ مسکرا کر فرمائیں گے، آپ کیا سمجھے تھے، میں چل بسا، میں کہوں گا، میں قربان ایسا کیوں ہونے لگا، تھوڑی دیر تک اسی کا چرچا رہے گا، ٹیکسی اپنی پوری رفتار کے ساتھ گھر کی طرف لوٹ رہی تھی۔ میرے خیالات کی رواس سے بھی زیادہ تیز تھی۔

آہ! جب گھر پہنچا تو کیسی خاموشی تھی، موت کی خاموشی، تاریکی، بھیانک تاریکی، دل بیٹھنے لگا، تیز تیز قدم رکھتا ہوا دروازہ پر پہنچا، دیکھا غلام محمد صاحب اور مشتاق صاحب زمین پر پھیلے ہوئے بیٹھے ہیں، میں نے ان سے لرزتے ہوئے پوچھا ''خیریت''! انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا، صرف گردن ہلا دی، ان کا اترا ہوا چہرہ اور بہتی ہوئی آنکھیں سب کچھ بتلا چکی تھیں، کمرہ کے اندر قدم رکھا دیکھا کہ اُسی شان سے لیٹے ہوئے ہیں، اوپر سے چادر اوڑھا دی گئی ہے۔ عجیب قیامت کا منظر تھا، گھر کے سارے افراد اس شمع کے چار

Marfat.com

وں طرف پروانوں کی طرح کھڑے ہیں، سب کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہے، والدہ اُف چوڑی ندارد، چہرہ سفید، آنکھیں جل تھل، لیکن ضبط وصبر کی کوہِ پیکر بنی کھڑی ہیں، مجھے دیکھتے ہی لپٹ گئیں اور کہا بیٹا ضبط وصبر کا مقام ہے، میں نے کہا اماں میں ڈاکٹر کو لاتا ہوں۔

ہاں میرے لال تم ڈاکٹر کو لاتے ہو، لیکن وہ ڈاکٹر سے بے نیاز ہو چکے،

میرا سر چکرا گیا، معلوم ہوا جیسے دل کی دھڑکن بند ہو جائے گی، حلق خشک ہو گیا، والدہ نے مجھے اپنے کلیجہ سے لگا لیا، اور میرا سر اپنے شانے پر رکھ لیا۔ وہ میری پیٹھ پر تھپکی دیتی رہیں، اور زبان سے یہی کہتی رہیں، "صبر بیٹا صبر"۔

شمیمہ کو پکار کر مفرح منگوایا، اور مجھے دیا، پھر پانی پیتا رہا، یک بیک کچھ خیال آیا، میں ہوش میں آ گیا، ڈاکٹر صاحب باہر کھڑے تھے، اُن کو دکھلا دوں، شاید ان لوگوں کا خیال غلط ہو، بس میں تیر کی طرح باہر گیا، اور ڈاکٹر کو لے آیا، والدہ کہتی رہیں کہ ابھی ڈاکٹر عبدالصمد آ چکے ہیں اور اعلان کر چکے، لیکن دل نہیں مانا، ڈاکٹر صاحب نے دیکھا، آہ ! کتنا شاہانہ سکوت، کتنی پروقار نیند تھی، ابدی نیند، ہائے انہوں نے بھی دوسرا فیصلہ نہیں سنایا۔

ان کو رخصت کیا ہی تھا کہ سلمان ڈاکٹر رحمان کو لے کر آئے، اور آتے ہی چادر اُلٹ دی، اور اُن کی داڑھی چھو کر بے تابانہ پکارنے لگے، ابا ...... ابا ...... میرے ابا...... بولئے !

ڈاکٹر رحمان نے بھی دیکھا اور کھڑے ہو گئے، سلمان کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا صبر کرو صبر، اور رخصت ہو گئے۔

مجھ پر اب سکتہ کا عالم تھا، کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا ہوا اور کیا ہو رہا ہے، میں بُت بنا کھڑا تھا، سلمان بہت بے قرار ہو رہا تھا، والدہ سلمان کو پکڑ کر لائیں اور مجھ سے لپٹا دیا، میں نے اس کو سینہ سے چمٹا لیا میرے پاس الفاظ نہیں تھے، جس سے میں اُن کو تسلی دیتا،

Marfat.com

شاید دل کی بات دل تک پہنچ رہی ہو۔

میں سلمان سے علیحدہ ہوا اور صوفہ پر گر پڑا، والدہ نے مجھے پھر مفرح دیا اور کہا بیٹا تم اپنے آپ کو سنبھالو، دل کو مضبوط کرو، تم پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے، سب کام تم ہی کو انجام دینا ہے۔

اب میں نے دل کی قوت کو مجتمع کرنا شروع کیا، مجھے ہوش آ چکا تھا، اتنے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی، ریڈیو پاکستان کا ٹیلیفون تھا، انہوں نے پوچھا کہ ہم نے بہت ہی افسوسناک خبر سنی، کیا وہ سچ ہے،

آہ ! آپ نے جو کچھ سنا وہ سچ ہے۔

سب بچیاں سلمان، والدہ پلنگ کے چاروں طرف کلام پاک لے کر بیٹھ گئے اور تلاوت شروع کر دی، ریڈیو سے اعلان کے فوراً ہی بعد لوگوں کا تانتا شروع ہو گیا''۔

زہرہ آپا، مولانا محمد علی کی صاحبزادی، شوکت علی کی بہو، زاہد علی صاحب کی بیگم، روتی ہوئی آئیں اور کہنے لگیں، اللہ میرے چچا کو مجھے دکھا دو، پھر بیگم وسیم، گلنار آپا، (بیگم قریشی) تشریف لائیں۔

باہر لوگوں نے تجہیز و تکفین کے متعلق سوالات شروع کر دیئے، ان مسائل پر آہ میں نے کب سوچا تھا، کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا، اتنے میں شعیب قریشی کے داماد ڈاکٹر عابد نے کہا، آپ متردد نہ ہوں، جہاں ماموں یعنی عبدالرحمٰن صدیقی کا مزار ہے، وہیں انتظام کر لیں گے، مجھے کچھ تجربہ ہے، اور لوگوں کی رائے ہوئی کہ جہاں مولانا شبیر احمد صاحب مدفون ہیں، وہاں انتظام کیا جائے، اس لئے سب سے پہلے میں نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو ٹیلیفون کیا اور اس جگہ دفن کرنے کی اجازت مانگی، انہوں نے کہا مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ مولانا عثمانی کہاں مدفون ہیں، میں نے اُن کو بتایا کہ میونسپلٹی کی زمین ہے اور آپ اجازت دے سکتے ہیں، میرے دماغ میں تھا کہ نقوی صاحب چیف کمشنر کی وہ قائمقامی کر رہے ہیں،

Marfat.com

انہوں نے کہا آپ ان لوگوں سے ملیئے جنہوں نے مولانا عثمانی کی تدفین کا انتظام کیا تھا۔
مجھے فوراً مولانا عبدالقدوس بہاری کا خیال آیا، چنانچہ ان کو ٹیلیفون کیا۔ ان کو کوئی پتہ نہیں تھا۔ بیچارے ڈاکٹر عابد نے کہا میرے ساتھ چلئے، میں انہی کی موٹر پر مولانا عبدالقدوس بہاری اور دوسرے لوگوں کے یہاں سے ناکام ہوکر شعیب صاحب کے مکان پر پہنچا، اور وہاں سے ٹیلیفون کے ذریعہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے مکان کا پتہ چلایا اور اُن کی تلاش میں نکلا، کچھ دیر تک بھٹکتا رہا، بالآخر یہ معلوم ہوا کہ کلکٹر صاحب نے میونسپل کمشنر مسٹر چورانڈ سے اجازت مانگی، انہوں نے فرمایا کہ میرا ارادہ اس زمین کو قبرستان بنانے کا نہیں، اس لئے نہیں مل سکتی۔

اب میں اور عابد سید ھے اس قبرستان میں پہنچے، جہاں عبدالرحمٰن صدیقی سوئے ہوئے ہیں اور انہی کے قریب مسجد کے دامن میں قبر کھودنے کا حکم دے کر گھر لوٹے۔ یہاں معلوم ہوا کہ مولانا تمیزالدین خان نے نقوی صاحب چیف کمشنر کو ٹیلیفون کیا تھا، انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ ان شاءاللہ صبح تک انتظام ہو جائے گا۔ اس کے بعد طے پایا کہ کل ساڑھے آٹھ بجے اس عاشقِ رسول کا جنازہ اُٹھے گا۔ دس بجے کے قریب شعیب صاحب کا اندرونِ سندھ سے ٹیلیفون پہنچا کہ میں نمازِ جنازہ میں شرکت کی غرض سے صبح آؤں گا، لیکن راستہ میں اُن کی گاڑی خراب ہوگئی، اس لئے نمازِ جنازہ میں شریک نہ ہو سکے۔

اب اخبارات اور خبر رساں ایجنسیوں کے مسلسل ٹیلیفون آنے شروع ہوئے۔ کہیں سے جنازہ کے متعلق استفسار، کہیں سے تدفین کے متعلق، بعض اُن کے سوانحِ حیات جاننے اور چھاپنے کے لئے بے چین، اور اس پر لوگوں کا ہجوم، بس قیامتِ صغریٰ کا منظر تھا، اپنی بے بسی اور بیچارگی کو کیا کہوں کہ اتنی بھی فرصت نہیں ملی تھی کہ کہیں چھپ کر رو ہی لوں، دوڑتے دوڑتے پیر جواب دے چکے تھے، ایک بجے تک لوگ جمع رہے۔

رات بھر دعاؤں اور قرآن خوانی، اگر عود اور لوبان نے کیسا سماں کھینچا تھا، اس کا

Marfat.com

اندازہ وہی لگا سکتا ہے، جس کے گھر کا سب سے بیش قیمت سرمایہ، اس کی آنکھوں کے سامنے اس سے چھن گیا ہو، جب کبھی فرصت ملتی، میں اُن کے قریب جاتا اور اُن کی پیشانی کو بوسہ دیتا، اُن کے جسم کو غور سے دیکھتا، کیا کہوں یقین کرنے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا، بس یہی خیال ہوتا، اب اٹھیں گے، اب بولیں گے، اب عشاء کی نماز کے لئے پکاریں گے، اب وضو کے لئے بلائیں گے، رات ڈوبتی جارہی تھی، سناٹا بڑھتا جارہا تھا، اب ان کے تہجد کا وقت آ گیا، لیکن وہ تہجد میں ناغہ کریں گے، انہوں نے تہجد کبھی ناغہ نہیں کی ہے، اب وقت پر تہجد کی نماز کے لئے گھنٹی بجے گی، اب اُن کے جسم کو حرکت ہوگی، لیکن آہ کچھ بھی نہیں ہوا۔

اُف صبح ہوگئی، رخصت کی صبح، دائمی فرقت کی صبح، وداع کی صبح، آہ وہ صبح جس میں کوئی پیغامِ حیات نہیں، بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ساری فضاء نے کفن اوڑھ لیا ہے۔

آہ! ہم اس جسمِ اطہر کو اُٹھا کر بیچ کے کمرے میں لائے۔ قینچی سے کاٹ کاٹ کر سارے کپڑے علیحدہ کئے، بے اختیار جی یہی چاہتا تھا کہ بس لپٹ جاؤں اور کہوں

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب' قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

سب لوگوں نے مل کر تخت پر لٹایا، آہ سارا جسم کتنا نرم تھا، جس طرف موڑا جاتا تھا، مڑ جاتا تھا، چہرے پر وہی سنجیدگی، وہی وقار، وہی متانت، وہی تبسم، اب تک جو تھا، میں نے پھر پیشانی کو چوم لیا، ڈاکٹر عبدالحئی صاحب نے شہادت کی انگلی چوم لی، اور لرزتی ہوئی آواز میں کہا کتنی مبارک ہیں یہ انگلیاں، جو سرورِ کائنات ﷺ کی سیرت نگاری میں زندگی بھر مصروف رہیں۔ اندر میں اور شمون ماموں پانی ڈال رہے تھے، صوفی جی کپڑے سے طہارت کر رہے تھے؟ ڈاکٹر بتا رہے تھے، سلمان بُت بنا کھڑا تھا، کبھی پانی ڈالتا اور کبھی قریب آکر غور سے دیکھتا رہتا،

آخر آٹھ بجے رخصت کا لباس پہنایا گیا، داڑھی میں عطر لگایا گیا، کافور چھڑکا گیا،

Marfat.com

اور پلنگ پر لٹا دیا گیا۔

دوسرے کمرے میں سفیر مصر، سفیر حجاز، ڈاکٹر محمود حسین، سابق وزیر تعلیم، اور بہت سے لوگ تھے، وہ بلائے گئے، انہوں نے آخری زیارت کی، اور پھر کمرہ بند کر دیا گیا اور عورتوں کو بلا لیا گیا۔ باہر ہر طرف کمپونڈ میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ جمع تھے۔ ہر طرف دری بچھا دی گئی تھی، سب کلامِ پاک کے لئے قرآن خوانی میں مصروف تھے۔

ساڑھے آٹھ بجے گھر سے جنازہ نکلا، سڑک پر رکھا گیا، دو بڑے بڑے بانس دونوں طرف لگا دیئے گئے، تا کہ ہزاروں آدمی کاندھا دے سکیں، لوگوں نے پھول سے اُسے ڈھک دیا، اُس کے بعد جنازہ ایک جلوس کی شکل میں گھر سے رخصت ہوا، سفیر مصر سے کہا کہ آپ مسجد میں نماز کے لئے چلے جائیں، لیکن انہوں نے کہا مجھے اس سعادت سے کیوں محروم کرنا چاہتے ہیں، ہر شخص کاندھا دینے میں ایک دوسرے سے سبقت کرنا چاہتا تھا

آہ ! ان کے جنازہ کا منظر بھولتا ہی نہیں، امیر غریب، فقیر، سفیر، سب اس طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے، جیسے اُن کا باپ، اُن کا بھائی، اُن کا سب کچھ آج رخصت ہو رہا ہے، جس راستہ سے یہ جلوس گذرتا تھا، مکان کی چھتوں پر سے عورتوں کی آہ و بکا کی آوازیں آتی تھیں، ممالکِ اسلامیہ کی سفراء آگے بڑھ کر کاندھا دے رہے تھے، اُن کی آنکھیں غمناک اور لب کانپ رہے تھے، جیسے اُن کا عزیز ترین محبوب اُن سے چھن گیا ہو، یوں تو اُن کی محبوبیت کے بہت سے واقعات دیکھے، لیکن اس دن اندازہ ہوا کہ ہر خاص و عام کے قلوب میں ان کی کتنی جگہ تھی۔

سفیرِ حجاز خطیب صاحب نماز جنازہ کے آگے، ایک طرف مجھے اور دوسری طرف سلمان کو اپنی طرف لئے ہوئے تھے۔

پوری سڑک طے کرنے کے بعد نیوٹاؤن مسجد جہاں ایک مرتبہ انہوں نے بقرعید

Marfat.com

کی نماز پڑھائی تھی اور ایک دو جمعہ بھی پڑھائے تھے، وہ ابھی زیرِ تعمیر مسجد ہے، اس کی تعمیر کا سامان پھیلا ہوا تھا، اس کے وسیع احاطہ میں مسجد کے محرابی در کے سامنے جنازہ رکھا گیا اور ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی۔

آہ ! افسوس کسی کا گھر لٹ گیا اور کوئی اپنی شہرت کے لئے اس کو بھی وسیلہ بنانا چاہتا تھا، اسی لئے ڈاکٹر صاحب کا انتخاب کیا گیا، ان سے خلوص وموانست تھی، نماز کے بعد زیارت کے لئے لوگوں کا اصرار ہوا، اس کے لئے لوگوں کا ہجوم ہوا، پھر زائرین اور مشتاقین کی ایک قطار بنا دی گئی، جو یکے بعد دیگرے سامنے سے آتے، چہرۂ انور کو ایک نظر دیکھ کر گذر جاتے تھے، ہر شخص آتا اور ایک نظر دیکھتا، یا پھر شاید دیکھ بھی نہیں پاتا اور صرف محبت اورعقیدت کے آنسو ان کی بارگاہ میں پیش کر کے چلا جاتا۔ ایک انجنیئر صاحب چیخ چیخ کر پکار رہے تھے، زیارت کرتے جایئے اور چلتے جایئے۔

قطار کسی صورت سے ختم ہی نہیں ہو پاتی تھی، اُن کا چہرۂ انور نور سے معمور تھا۔ ایک طرف آفتاب کی روشنی اُن پر ...... پڑ رہی تھی۔ دوسری طرف خود اس آفتاب کی تابانی لوگوں کی نگاہوں کو خیرہ کئے ہوئے تھی۔ کتنا شاہانہ سکون، کتنا درویشانہ جلال، اور کتنا روحانی وقار تھا، سلمان اور میں اُن کے سرہانے کھڑے اس منظر کو دیکھ رہے تھے، میں دھوپ سے بچانے کے لئے چادر کا ایک کونہ پکڑے ہوئے تھا، تین طرف سے اور لوگ گھیرے ہوئے تھے۔ اس منظر کو دیکھ کر کلیجہ پھٹ رہا تھا۔ خیالات و جذبات کا سیلاب امنڈتا آرہا تھا، آنسو تھے کہ تھمتے نہ تھے، کلیجہ پھٹتا جاتا تھا، لیکن نگاہیں تھیں کہ اُن کے چہرۂ انور پر مرکوز تھیں کہ ....

جی بھر کے دیکھ لیں یہ جمال جہاں فروز
پھر یہ جمالِ نور تو دیکھا نہ جائے گا

کبھی جی چاہتا کہ چیخ چیخ کر روؤں اور مہینوں کے بند شکوؤں کے در کھول دوں۔

Marfat.com

اے عم محترم ! آج کیوں نہیں بولتے، دیکھئے آج کتنے آپ کے مشتاقان دید جمع ہیں، آپ نے کسی کو کبھی مایوس نہیں لوٹایا، آپ سے نصیحت سننے کے لئے لامتناہی سلسلہ کلمہ گویوں کا ٹوٹا پڑ رہا ہے، یہ تو وہی ہیں جن کے لئے آپ نے اپنے چین کو چین نہیں سمجھا، اپنی راحت کو راحت نہیں سمجھا، یہ کسی غرض سے نہیں آئے ہیں، یہ آپ سے محبت اور خلوص سے ملنے آئے ہیں، انجینئر صاحب کی آواز کانوں میں ہتھوڑے کی طرح پڑ رہی تھی۔

حلیم صاحب وائس چانسلر آئے، آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا گئیں، اور وہ گذر گئے، سابق وزیر یوسف ہارون، سابق وزیروں میں سے سب موجود' جبکہ وزیر اعظم ان دنوں پنجاب میں علیل تھے، اُن کا نمائندہ اور گورنر جنرل کا نمائندہ شریک تھا، خواجہ ناظم الدین باہر تھے۔

یہاں سے جنازہ اٹھا اور کئی فرلانگ کی مسافت طے کر کے اٹھارہ ہزار مربع گز زمین کا وہ وسیع رقبہ جس کے ایک طرف مولانا شبیر احمد کا مزار ہے، وہاں پہنچا، اُن کے مزار کے سامنے رکھا گیا اور چونکہ اجازت ملنے میں دیر ہوئی، اس لئے ابھی تک قبر تیار نہ تھی، مولانا عثمانی کے مزار پر میکروفون لگا دیا گیا تھا، شام کو ابوالخیر صاحب نے ایسی تقریر کی، جس نے سب کو رُلا دیا۔

اُن کی تقریر جذبات وخیالات اور معلومات سے لبریز تھی۔ آخری فقرہ تو ہمیشہ یاد رہے گا، انہوں نے کہا "اے سلیمان! تمہارے جانے کا اتنا غم نہیں ہے، جتنا اس گنجینۂ علم کا صدمہ جو تمہارے ساتھ دفن ہو رہا ہے"۔ اس کے بعد قبر تیا ہوئی۔

قبر کے اندر ایک طرف غلام محمد صاحب دوسری طرف میں اور میرے ساتھ صلاح الدین احمد صاحب ندوی اُترے، سلمان اوپر والے حصہ میں کھڑے تھے"۔

آہ ! اس کے بعد میں نے اپنے ہاتھوں سے اپنے سب سے قیمتی سرمایہ کو زمین پر لٹایا، آہ، جس کی نفاستِ طبع شکنِ بستر پر بےکلی محسوس کرتی تھی، آج وہ مٹی کی خوابگاہ میں

Marfat.com

سو رہا ہے۔

چہرہ کھول دیا گیا، پھر ڈھک دیا گیا،

میرے بڑے ابا حکیم سید ابوالحبیب صاحب کا نواسہ مصطفےٰ بیتابانہ چیخا۔

ارے میرے چھوٹے نانا کو ایک مرتبہ اور دکھلا دو۔

جس کو سردی سے گرمی سے، ہوا سے، لو سے ہمیشہ بچایا جاتا تھا، وہ آج منوں مٹی کے اندر چھپا دیا گیا، میرے لئے ہر طرف تاریکی، ہر طرف اندھیرا، ہر طرف سناٹا تھا ...... اللہ بس باقی ہوس ......

ٹھہرے گا دل تھمیں گے اشک
آہ! مگر، ابھی نہیں

ساعتے با اولیاء

تالیف : مولانا عبدالقیوم حقانی

جدید طرز کی ایک نئی اور اچھوتی تحریر سلف صالحین اور اولیاء اللہ کی مجالس اور بارگاہ رشد و ہدایت میں روحانی اور علمی و مطالعاتی حاضری کی دلچسپ تقریب امام غزالی، ابن الجوزی، مجدد الف ثانی، امام ابن تیمیہ، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، علامہ انور شاہ کشمیری، مولانا محمد الیاس اور کئی دوسرے اولیاء کرام سے کسب فیض اور استفادہ علم کا قریب ترین اور آسان راستہ۔ دورنگہ ٹائٹل، عمدہ چھپائی۔

صفحات : 270

القاسم اکیڈمی جامعہ ابوہریرہ برانچ پوسٹ آفس خالق آباد ضلع نوشہرہ، سرحد پاکستان

Marfat.com

ماہنامہ القاسم کی
گیارہویں خصوصی اشاعت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مکاتیب الکریم

مولانا عبدالقیوم حقانی

اکابر علماءِ دیوبند کے قافلۂ علم و عزیمت کے معتمد و رفیقِ خاص
شیخ التفسیر حضرت مولانا **قاضی عبدالکریم** صاحب کلاچوی فاضلِ دیوبند
کے مبارک ہاتھوں سے مولانا عبدالقیوم حقانی کے نام لکھے ہوئے
علمی، ادبی، تاریخی اور اصلاحی مکاتیب

خصوصی اشاعتوں میں پہلی مرتبہ کسی زندہ علمی شخصیت کا مکاتیب نمبر

ماہنامہ القاسم، جامعہ ابوہریرہ، برانچ پوسٹ آفس خالق آباد نوشہرہ سرحد پاکستان

Marfat.com

ا

سوانح مجاہد ملّت

حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ

تالیف

مولانا عبدالقیوم حقانی

تذکرہ و سوانح، تحصیل علم و تکمیل، خدمت علم و تدریس، دعوت و جہاد، شخصیت و کردار، اخلاص وللٰہیت، صبر و استقامت، فقر و ایثار، خوش طبعی و لطائف، روحانی مقام، اوراد و وظائف، فرق باطلہ کا تعاقب، قادیانیت، شرک و بدعت اور روافض کا رد، تحریک ختم نبوت میں مجاہدانہ کردار، قومی وملی اور سیاسی خدمات اور سفر آخرت کی ایمان افروز داستان

صفحات : 227

ناشر

القاسم اکیڈمی جامعہ ابوہریرہ

برانچ پوسٹ آفس، خالق آباد، ضلع نوشہرہ، سرحد، پاکستان

Marfat.com

تذکرہ و سوانح

الحاج مولانا محمد احمد صاحبؒ

تالیف : مولانا عبدالقیوم حقانی

ایک بندۂ خدا، درویش خدامست، فقر بوذرؓ و سلمانؓ کے وارث، رجوع و دعوت الی القرآن کے علمبردار، قرآن و سنت کی تعلیمات کے داعی اور اکابر علماءِ دیو بند کے مسلکِ اعتدال کے امین، تفسیر ''درسِ قرآن'' کے مؤلف الحاج حضرت مولانا محمد احمدؒ کا جامع سوانحی خاکہ ....

صفحات : 172 .... قیمت : 90 روپے

ناشر

القاسم اکیڈمی ' جامعہ ابوہریرہ

برانچ پوسٹ آفس خالق آباد، ضلع نوشہرہ، سرحد پاکستان

Marfat.com

القاسم اکیڈمی کی ایک اور عظیم تاریخی پیشکش

جمالِ انورؒ

تذکرہ و سوانح علامہ انور شاہ کشمیریؒ

مولانا عبدالقیوم حقانی

سلسلہ نسب، ولادت، والدین، تحصیلِ علم، تعلیم و تربیت، تذکرۃ الاساتذہ، دارالعلوم دیوبند میں سب فیض اور تدریس کا آغاز، کار علمی تجربے، بے مثال حافظہ، ذوق مطالعہ اور حیرت انگیز مطالعاتی یادداشتیں، طالبان علوم نبوت پر شفقت، تشجیع و تربیت، تسامح و عنایت، بے تکلفی و ظرافت، محدثانہ جلالت قدر، تدریسی خصوصیات، تجدیدی کارنامے، محققانہ مباحث، مجتہدانہ افاضات، درسی معارف و افادات، تصنیف و تالیف اور تحقیق کے نادر نمونے و شہ پارے، ذوق شعر و ادب، افادات، ملفوظات، رخ انور کی تابانیاں، حسن صورت و سیرت کا مرقع، دلبرانہ ادائیں، معصومیت، اتباع سنت کا اہتمام، خودداری و استغناء، مخلوق خدا پر شفقت، سلوک و تصوف اور صفائے باطن کا اہتمام، احترام و اطاعت اساتذہ، حضرت گنگوہی سے عشق و محبت، عبدیت و انابت، معاصی سے اجتناب اور نفرت، عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور قادیانیت کا تعاقب، حضرت امام کشمیری کا سفر آخرت، دو تاریخی دستاویزات ۱۔ مقدمہ بہاولپور کی تفصیلی رپورٹ ۲۔ علامہ رشید رضا کی آمد پر علماء دیوبند کے عقائد، مسلک و منہج پر مفصل خطاب۔

صفحات : 298 .... قیمت : 120 روپے

300 روپے بھیجنے پر "جمال انور" کے ساتھ ساتھ ماہنامہ "القاسم" بھی ایک سال کے لئے جاری کر دیا جائے گا۔

القاسم اکیڈمی جامعہ ابوہریرہ برانچ پوسٹ آفس خالق آباد نوشہرہ سرحد پاکستان

فون نمبر 0923-630237 فیکس 0923-630094

Marfat.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خصائل اور شمائل نبوی ﷺ

پر

مولانا عبدالقیوم حقانی

کی علمی اور عظیم تاریخی کاوشیں

شرح شمائل ترمذی (تین جلد مکمل)
صفحات: ۱۲۰۸...... قیمت: ۷۵۰ روپے

جمالِ محمد ﷺ کا دلربا منظر
صفحات: ۲۰۶ ...... قیمت: ۹۹ روپے

روئے زیبا ﷺ کی تابانیاں
صفحات: ۱۵۶ ...... قیمت: ۹۹ روپے

ماہتابِ نبوت ﷺ کی ضوافشانیاں
صفحات: ۲۱۰ ...... قیمت: ۹۹ روپے

آفتابِ نبوت ﷺ کی ضیاء پاشیاں
صفحات: ۲۰۲ ...... قیمت: ۹۹ روپے

محبوبِ خدا ﷺ کی دلربا ادائیں
صفحات: ۱۹۷ ...... قیمت: ۹۹ روپے

محبوبِ خدا ﷺ کی عبادت واعتدال
صفحات: ۱۸۷ ...... قیمت: ۹۹ روپے

خصائلِ نبوی ﷺ کا دلآویز منظر
صفحات: ۱۶۶ ...... قیمت: ۹۹ روپے

شمائلِ نبوی ﷺ کا ایمان افروز مرقع
صفحات: ۱۵۳ ...... قیمت: ۹۹ روپے

القاسم اکیڈمی جامعہ ابوہریرہ
برانچ پوسٹ آفس خالق آباد نوشہرہ سرحد پاکستان
Ph:0923-630237 --Mob:0333-9102770

Marfat.com

Marfat.com

مولانا عبدالقیوم حقانی کی تصنیفات

القاسم اکیڈمی جامعہ ابوہریرہ

برانچ پوسٹ آفس خالق آباد ضلع نوشہرہ

Marfat.com